محاسبۂ قادیانیت

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

جلد ۱۶

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب	:	محاسبہ قادیانیت جلد سولہ (۱۶)
مصنف	:	حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ
صفحات	:	۴۱۶
مطبع	:	طیب شمشاد پرنٹنگ پریس لاہور
طبع اوّل	:	جنوری ۲۰۲۲ء
ناشر	:	عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضوری باغ روڈ ملتان

Ph: 061-4783486

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان
۷	عرض مرتب (حضرت مولانا اللہ وسایا)
۱۵	شہادت القرآن (حصہ اوّل)
۱۶	دیباچہ شہادت القرآن
۱۸	دیباچہ (طبع چہارم) ...... حرف اوّل
۲۰	دیباچہ (طبع ثالث)
۲۵	شہادت القرآن
۲۵	تمہید
۲۷	مصنف کے بعض خواب
۲۹	وجہ تصنیف
۳۰	مقدمہ اولیٰ ...... دربیان امکان خرق عادت
۴۴	طریق ثبوت معجزات
۴۶	مقدمہ ثانیہ ...... درتشریح سنّت اللہ
۵۲	مقدّمہ ثالثہ ...... دربیان خصائص حضرت عیسیٰ علیہ السلام
۵۸	تنبیہ (دربارہ طریق بیان)
۵۹	فصل اوّل ...... دربیان عدم مصلوبیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام
۷۲	کسر صلیب کی دوسری آیت
۸۵	اس قاعدے کی دوسری مثال
۸۸	خلاصہ مطلب عبارات انگریزی جارج سیل صاحب
۹۶	کسر صلیب کی تیسری آیت

کسر صلیب کی چوتھی آیت	۱۰۳
فصل ثانی ...... دراثبات حیات ورفع عیسیٰ علیہ السلام	۱۰۴
تحقیق لفظ توفی	۱۰۵
ثانیاً برائے اثبات جہالت قادیانی	۱۱۲
نقشہ آیات توفی مع بیان قرینہ	۱۲۰
ورافعک الیّ	۱۲۸
وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۲۱	۱۳۷
کشف مغالطہ	۱۴۲
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عقیدہ حیات مسیح علیہ السلام	۱۴۳
رفع وتوفی کے بارہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب	۱۴۵
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حیات مسیح علیہ السلام	۱۴۸
تذییل وتتمہ	۱۴۸
علم نحو	۱۵۰
علم اصول	۱۵۰
علم بلاغت	۱۵۰
علم ادب	۱۵۱
بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ کی مراد	۱۵۳
وجہ اوّل برائے ابطال رفع روحی واثبات رفع جسمی	۱۵۵
وجہ ثانی برائے ابطال مزعوم قادیانی	۱۵۷
سائنس کا کمال	۱۶۷
وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ	۱۸۱
دلیل کی دوسری قسم مثبتہ حیات مسیح علیہ السلام	۱۹۷
حدیث اوّل	۱۹۹
دوسری حدیث	۲۰۱

تیسری حدیث شریف	۲۰۲
چوتھی حدیث شریف	۲۰۴
پانچویں حدیث شریف	۲۰۴
تیسری قسم	۲۰۵
تقریظ جناب حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی بر طبع اوّل	۲۱۰
شہادت القرآن (حصہ دوم)	۲۱۱
سبب تالیف	۲۱۲
دیباچہ طبع ثانی از مصنف	۲۱۳
شہادت القرآن حصہ ثانی	۲۱۴
یٰعیسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ	۲۱۴
وجہ اوّل	۲۱۵
دوسری وجہ	۲۱۷
تیسری وجہ	۲۱۸
چوتھی وجہ	۲۱۸
وجہ دوم	۲۲۸
وجہ سوم	۲۳۰
تحقیق لفظ خلت	۲۶۳
خطبۂ صدیقی	۲۷۰
سُلَّمُ الْوُصُوْلِ اِلٰی اِسْرَآءِ الرَّسُوْلِ ﷺ	۳۲۱
مقدمہ	۳۲۴
وصل	۳۲۶
موضع اوّل	۳۲۶
موضع ثانی	۳۲۷
موضع سوم	۳۲۷

موضع چہارم	۳۲۸
فصل اوّل ...... در بیان اثبات معراج جسمانی از قرآن وحدیث	۳۲۹
ائمہ مفسرین ومحدثین کی محققانہ عبارتیں	۳۳۸
حکمت معراج جسمانی	۳۴۴
فصل ثانی ...... در ازالہ بعض شبہات منکرین معراج جسمانی	۳۴۵
ازالہ شبہ ثانی	۳۵۵
ازالہ شبہ سوم	۳۵۷
نزول الملائکۃ	۳۵۹
فصل ثانی ...... در اثبات نزول ملائکہ از قرآن کریم وحدیث	۳۶۶
اعلان	۳۷۸
کھلی چٹھی (بخدمت دوست قدیمی مولوی غلام رسول راجیکی احمدی)	۳۷۹
رحلت قادیانی بمرگ ناگہانی	۳۸۳
تقسیم معجزات	۳۹۰
آمدم برسر مطلب	۳۹۵
اصول قادیانی	۳۹۵
وعدہ اور عہد پورا کرنے کی خوبی اور پورا نہ کرنے کی برائی	۳۹۶
قرآن میں عہد، وعدہ پورا کرنے کی تاکید، وعدہ خلافی اور عہد شکنی کی ممانعت	۳۹۷
عہد کا نبھانا امور تقویٰ میں سے ہے	۳۹۸
بدعہدی کی ممانعت اور مذمت اور اس کا مؤجب فساد ہوتا	۳۹۹
عہد شکنی کذب ہے اور مؤجب نفاق ہے	۴۰۱
عہد شکنی خلاف تقویٰ اور خیانت ہے	۴۰۱
عہد شکنی فسق ہے	۴۰۲
وعدہ خلافی موجب لعنت ہے	۴۰۲
وعدہ خلافی شیطان کی صفت ہے	۴۰۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

الحمد ﷲ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ. امابعد!

اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے محاسبہ قادیانیت کی جلد۱۶ پیش خدمت ہے۔

محاسبہ قادیانیت کی جلدنہم میں حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی کے مضامین جوملعون قادیان کے خلاف لکھے تھے، ان کوشائع کرنا شروع کیا۔اس کے عرض مرتب میں فقیر نے لکھا:

’’نقل حوالہ میں خلاف دیانت ادارہ سلفیہ لاہور کا عمل

ادارہ سلفیہ لاہور نے نومبر۱۹۸۶ء میں ’’پاک وہند کے علماء اسلام کا اوّلین متفقہ فتویٰ۔ مرزا قادیانی اوراس کے پیروکاردائرہ اسلام سے خارج ہیں‘‘ شائع کیا اس میں پہلی زیادتی تو یہ کی کہ اس کا نام بدل دیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس فتویٰ کا نام ’’فتویٰ علماء پنجاب وہندوستان بحق مرزاغلام احمد ساکن قادیان‘‘ رکھا تھا۔ادارہ سلفیہ نے مولانا بٹالوی کا قائم کردہ عنوان بدل دیا۔اوراس کا نام رکھا ’’پاک وہند کے علماء اسلام کا اوّلین متفقہ فتویٰ‘‘ دوسری تبدیلی یہ کی کہ اس کتاب میں اشاعۃ السنۃ ج۱۳، شمارہ۴،۵،۶،۷،۱۱،۱۲(۱۸۹۰ء) کے فتوی کوادارالدعوۃ السّلفیہ لاہورطبع نومبر۱۹۷۶ء کی اشاعت کے ص۱۶۲پر ’’کتبہ محمد اشرف علی‘‘ کی عبارت پرختم کیا ہے۔ جواشاعۃ السنۃ ج۱۳، شمارہ۱۲ص۱۴۷ کی پہلی پانچ سطروں پر موجود ہے۔ حالانکہ اسی اشاعۃ السنۃ کی اسی جلد، اسی شمارہ، اسی صفحہ۱۴۷ کی پہلی پانچ سطروں (جہاں ادارہ سلفیہ نے اس فتویٰ کوختم کیا ہے) کے بعداس صفحہ کی بقیہ۱۴ سطروں کوعمداً نقل نہیں کیا۔ پھراس کا صفحہ۱۴۸ بھی مکمل نقل نہیں کیا۔

فقیر نے ادارہ سلفیہ لاہور کے مولانا محمد حسین بٹالوی کے فتویٰ ’’پاک وہند کے علماء اسلام کا اوّلین متفقہ فتویٰ‘‘ کے آخری صفحہ کودیکھا۔ یہی فتویٰ جواشاعۃ السنۃ ج۱۳ شمارہ۱۲ میں شائع ہوا۔ اس کے اختتام کودیکھا۔ تو دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ بہت ہی حیرت ہوئی، کہ نقل حوالہ میں اتنی بڑی جسارت کہ قریباً آخری ڈیڑھ صفحہ سرے سے درج نہیں کیا،

حذف کر دیا۔ اور خلاف توقع اس جسارت پر سخت تعجب ہوا کہ ایسے بھی دنیا کرتی ہے؟ اب دونوں حوالہ جات سامنے تھے کسی بھی طرح کی کوئی تاویل سمجھ میں نہ آئی کہ اتنی بات کہ سب سے پہلے مرزا پر کس نے کفر کا فتویٰ دیا؟ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے مولانا محمد حسین بٹالوی کے عقیدہ کے لوگوں نے ہی ان کے اشاعۃ السنۃ کے رسالہ کے ڈیڑھ صفحہ کو غائب کر دیا۔ فیا للعجب!‘‘ (محاسبہ قادیانیت ج۹ص۱۸)

اس کے بعد فقیر نے متذکرہ جو حصہ ادارہ سلفیہ لاہور نے غائب کر دیا وہ درج کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین بٹالوی کے یہ سات حوالہ جات نقل کئے:

مولانا محمد حسین بٹالوی کے اعتراف حقائق

۱…… مولانا محمد حسین بٹالوی تحریر فرماتے ہیں: ’’اشاعۃ السنۃ کا خصوصیت کے ساتھ فرض ہے کہ وہ اس فتنہ کو روکے اور جملہ مضامین سابق کو چھوڑ کر بہمہ تن اسی کے دعاوی کے ردّ کے درپے ہو اس کے اصول باطلہ کا ابطال کرے اور اصول حقہ اسلامیہ کی حمایت عمل میں لاوے۔ اس کی موجودہ جماعت وجمعیت کو تتر بتر کرنے میں کوشش کرے اور آئندہ مسلمانوں خصوصاً اہل حدیث کو جن کا یہ خادم ہے اس جماعت میں داخل ہونے سے بچائے۔ کیونکہ اسی (اشاعۃ السنۃ) نے قادیانی کے سابق دعویٰ حمایت اسلام اور مقابلہ مخالفین اسلام و وعدۂ تائید دین بانشان ہائے آسمانی ونصرت اصول اتفاقی اسلامی سے دھوکہ میں آکر ریویو براہین احمدیہ مندرجۂ نمبرے وغیرہ جلدے میں اس کو امکانی ولی وملہم بنایا اور لوگوں میں اس کا اعتبار جمایا تھا۔ جس کو یہ حضرات اپنے دعاوی مستحدثہ کی تائید میں اب پیش کررہے ہیں۔ اور اس کی عبارات اپنی تحریرات ورسائل میں نقل کر کے ان سے فائدہ اٹھارہے ہیں اور اپنے دعاوی کی صحت ثابت کررہے ہیں۔ اشاعۃ السنۃ کا ریویو براہین اس کو امکانی ولی وملہم نہ بناتا تو وہ اپنے سابقہ الہامات مندرجہ براہین احمدیہ کی وجہ سے تمام مسلمانوں کی نظروں میں بے اعتبار ہوجاتا۔ کیونکہ بہت سے علماء مختلف دیار ہندوستان وپنجاب وعرب کا ان الہامات کے سبب اس کی تکفیر وتفسیق وتبدیع پر اتفاق ہوچکا تھا۔ صرف اشاعۃ السنۃ کے ریویو نے فرقہ اہل حدیث اور اپنے خریداران کے خیال میں اس کے الہام وولایت کا امکان جمارکھا۔ اور اس کو حامی اسلام بنارکھا تھا۔‘‘ (اشاعۃ السنۃ ج۱۳ ش۱ ص۳،۴)

اللہ رب العزت کی کروڑوں رحمتیں ہوں مولانا محمد حسین بٹالوی پر کہ وہ کس صفائی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ جب اشاعۃ السنۃ مرزا کو حامی اسلام بنارہا تھا ’’بہت سے علماء مختلف دیار ہندوستان وپنجاب وعرب کا اس (مرزا) کی تکفیر وتفسیق وتبدیع پر اتفاق ہو چکا تھا۔‘‘

لیجئے! حضرت مولانا مرحوم کا ’’علماء پنجاب وعرب‘‘ کا ذکر کرنا علماء لدھیانہ اور حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری کے فتاویٰ جات بابت کفر مرزا کا اپنے فتویٰ سے قبل کے فتویٰ ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ یہی اعتراف حق ہی دیانت کا تقاضہ ہے جو مولانا موصوف نے کیا اور یہی ان کی شان کے لائق تھا۔ آپ (حضرات ادارہ سلفیہ لاہور) کی رائے مبارک بھی اس حقیقت کو تسلیم کرے تو انسب ہوگا۔

۲...... مولانا محمد حسین بٹالوی اشاعۃ السنۃ ج۷،ش۶،ص۱۷۰ کے حاشیہ پر علماء لدھیانہ کے متعلق لکھتے ہیں: ’’اور یہ کہتے ہیں کہ براہین احمدیہ میں فلاں فلاں امور کفریہ (دعویٰ نبوت اورنزول اورتحریف آیات قرآنیہ پائی جاتی ہیں) اس لئے اس کا مؤلف کافر ہے۔‘‘

یہ مولانا کی عبارت براہین احمدیہ کے ریویو میں ہے اس میں مولانا محمد حسین اعتراف کرتے ہیں کہ علماء لدھیانہ اس کو اس وقت کافر کہتے تھے جب خود مولانا مرحوم، مرزا کی حمایت کررہے تھے۔

۳...... اس حوالہ مذکور کے ص۱۷۱ پر مولانا محمد حسین لکھتے ہیں: ’’بعض (لدھیانہ والے) ان کو کھلم کھلا کفر قرار دیتے ہیں۔‘‘ اس حوالہ میں مولانا نے خود لدھیانہ والے کے الفاظ اپنے قلم سے لکھے ہیں اور حاشیہ میں ان کے اسماء گرامی ’’مولوی عبدالعزیز، مولوی محمد وغیرہ پسران مولوی عبدالقادر‘‘ درج کئے ہیں، کہ یہ علماء لدھیانہ مرزا کو کافر کہتے ہیں۔ یہ براہین احمدیہ کے ریویو میں مولانا نے اعتراف کیا ہے۔

۴...... اشاعۃ السنۃ ج۷،ش۶،ص۱۷۲ پر براہین احمدیہ کے ریویو میں مولانا محمد حسین بٹالوی فرماتے ہیں: ’’(لدھیانوی مدعیان اسلام) اپنی تکفیر کی یہی وجہ پیش کرتے ہیں کہ ان الہامات میں مؤلف (مرزا قادیانی) نے پیغمبر کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو ان کمالات کا جو انبیاء سے مخصوص ہیں محل ٹھہرایا ہے اور ان آیات قرآنیہ کا جو خاص آنحضرتﷺ اور انبیائے سابقین کے خطاب میں وارد ہیں مورد نزول قرار دیا ہے۔‘‘

یہ حضرت مولانا بٹالوی موصوف براہین احمدیہ کے ریویو میں اعتراف کرتے ہیں۔
غرض واقعہ یہی ہے کہ براہین احمدیہ کے آتے ہی تحریر وتقریر، مباحثہ اور مقابلہ کے ذریعہ جو علماء سب سے پہلے ملعون قادیان کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے وہ علماء لدھیانہ تھے۔ سب سے پہلے عرب سے جنہوں نے فتویٰ منگوایا وہ مولانا غلام دستگیر تھے۔ یہ فتویٰ مولانا محمد حسین بٹالوی کے بھی خلاف تھا کہ وہ مرزا کی حمایت کررہے ہیں۔ فتویٰ آجانے کے بعد اس کی اشاعت سے قبل مولانا محمد حسین صاحب مرحوم نے مرزا کی تائید سے نہ صرف ہاتھ اٹھالیا بلکہ اس کے سامنے مخالفت میں سروقد ہوگئے تو مولانا غلام دستگیر صاحب نے عرب کے فتویٰ سے مولانا محمد حسین صاحب والا حصہ نکال دیا۔ اس کو کمال دیانت کہتے ہیں۔ سبحان اللہ!

قارئین! علماء لدھیانہ ہوں یا مولانا غلام دستگیر یا مولانا محمد حسین بٹالوی یہ مرزا قادیانی کے مقابل ہوئے غلطی اپنی جگہ، مگر بات کرنے میں کوئی بددیانتی نہیں دکھائی، ہمیشہ وہی کہا جو واقعہ کے مطابق تھا۔ ایک ہم ہیں کہ حوالہ نقل کرنے میں اپنے تحفظات کو دخیل کرکے اپنے بزرگوں کی عبارتوں کے صفحات کو غتربود کرجاتے ہیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی؟

۵...... مولانا محمد حسین بٹالوی تحریر فرماتے ہیں: ’’بعض علماء پنجاب نے اس پر کفر کے فتوے لگائے اور وہ یہ سمجھ گئے کہ یہ شخص اپنے لئے نبوت کا مدعی ہے ...... خاکسار (مولانا بٹالوی) نے اس (مرزا قادیانی پر) حسن ظن کرکے اس کو تکفیر سے بچایا۔ اور دھوکہ کھایا اور اس کی حمایت میں ریویو براہین احمدیہ لکھا۔ مجھے اس وقت تک اس کے خبث باطن کا (بحکم کہ: ’’خبث نفس نگردد بسالہا معلوم‘‘ علم نہ ہوا تھا۔ اور کیونکر ہوتا جب تک کہ وہ اپنے منہ سے اس نجاست کو جواب نکال رہا ہے نہ نکالتا۔ مجھے اس کا یہ حال وخیال اس وقت معلوم ہوتا تو میں سب سے پہلے اس پر کفر کا فتویٰ لگاتا۔‘‘ (اشاعۃ السنہ ج۱۵، ش۶، ص۱۱۹،۱۲۰)

کروڑوں رحمتیں مولانا مرحوم پر کمال دیانت سے جہاں اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں وہاں واضح برملا فرمارہے ہیں کہ مرزا پر اور حضرات نے کفر کا پہلے فتویٰ لگایا۔

۶...... اسی طرح مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اپنے رسالہ ’’تاریخ مرزا‘‘ میں لکھا ہے کہ: ’’جس زمانہ میں مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی مرزا قادیانی سے مانوس تھے اسی زمانہ میں مولانا حافظ عبدالمنان محدث وزیرآبادی ...... مولوی غلام دستگیر قصوری اور مولوی محمد وغیرہ

خاندان علماء لدھیانہ مرزا سے بدظن تھے۔ ہم حیران ہیں ان علماء کی فراست کس درجہ کی تھی کہ وہی ہوا جوان حضرات نے گمان کیا۔ ‘‘ (تاریخ مرزا ص۱۴)

۷...... مولانا بٹالوی نے لدھیانہ کے ان بھائیوں کا نام لے کر ذکر کیا ہے اور یوں لکھا ہے: ’’ناظرین ان کا یہ حال سن کر متعجب اور اس امر کے منتظر ہوں گے کہ ایسے دلیر اور شیر بہادر کون ہیں جو سب علماء وقت کے مخالف ہوکر ایسے جلیل القدر مسلمان (یعنی مرزا قادیانی۔ ناقل) کی تکفیر کرتے ہیں اور اپنے مہربان گورنمنٹ کے (جس کے ظل حمایت میں باامن شعار مذہبی ادا کرتے ہیں) جہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے دفع تعجب اور رفع انتظار کے لئے ان حضرات کے نام بھی ظاہر کر دیتے ہیں، وہ مولوی عبدالعزیز و مولوی محمد وغیرہ پسران مولوی عبدالقادر ہیں، جن سب کا سنہ ۵۷ء سے باغی و بدخواہ گورنمنٹ ہونا ہم اشاعۃ السنۃ نمبر۱۰ ج۶ وغیرہ میں ظاہر و ثابت کر چکے ہیں۔ ‘‘ (اشاعۃ السنۃ نمبر۶، ج۷، ص۱۷۱ حاشیہ)

مولانا بٹالوی کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱...... اس ریویو کے لکھنے کے وقت یعنی ۱۸۸۴ء میں صرف لدھیانہ کے یہی مولوی عبدالقادر صاحب کے فرزندان تھے، جنہوں نے مرزا قادیانی کی تکفیر کی تھی۔

۲...... اس وقت تک مولانا بٹالوی حسن ظن رکھتے ہوئے مرزا قادیانی کو’’ایک جلیل القدر مسلمان‘‘ ہی تصور کرتے تھے۔

حضرت مولانا بٹالوی کے ان سات حوالہ جات کے بعد ادارہ الدعوۃ السّلفیہ لاہور اپنی رائے پر نظر ثانی کرے۔ تو یہ صرف تاریخ پر ہی نہیں بلکہ مولانا بٹالوی کی روح پرفتوح سے بھی مبنی بر انصاف فیصلہ ہوگا۔ سات حوالے ’’ستے خیراں‘‘ ورنہ ست سری اکال!

(محاسبہ قادیانیت ج۹ ص۲۴ تا ۲۷)

اس کے شائع ہونے کے بعد فقیر کے کرم فرما اہل حدیث مکتب فکر کے مولانا محمد داؤد ارشد صاحب حفظہ اللہ نے ادارہ سلفیہ کی نقل حوالہ میں ’’کرم فرمائی‘‘ اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے سات حوالہ جات (چھ حوالہ جات مولانا بٹالوی کے اور ایک مولانا امرتسری کا) پیش کرنے پر فقیر کے اس ’’عرض مرتب‘‘ پر عنان قلم پھیرا اور رسالہ ’’الاعتصام‘‘ میں کئی قسطوں میں ایک مضمون لکھا۔ لطف و کرم کی بارش ملاحظہ ہو کہ خود تسلیم کیا کہ ادارہ سلفیہ کا عبارت حذف کرنا سہو

ہے۔(سہو یا عمداً اپنے مؤقف کے خلاف عبارت ’’کرم فرمائی‘‘ کی نذر کر دینا؟) رہے مولانا محمد حسین بٹالوی کے ’’واضح اعترافات‘‘ جس سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ علماء لدھیانہ کا فتویٰ پہلے کا ہے اور مولانا محمد حسین بٹالوی کا فتویٰ بعد کا ہے۔(علماء لدھیانہ کا فتویٰ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳،۱۸۸۴ء کا ہے اور مولانا محمد حسین بٹالوی کا ۱۹۹۰ء کا ہے)

ان حوالہ جات کو غلط ثابت کرنا اور ادارہ سلفیہ کی نقل حوالہ میں ’’کرم فرمائی‘‘ کو صحیح ثابت کرنا تو درکنار، مولانا محمد داؤد ارشد صاحب نے پورا زور اس پر صرف کر دیا کہ علماء لدھیانہ کا فتویٰ کہاں ہے؟ صورت مسئولہ کہاں ہے؟ جواب فتویٰ کہاں ہے؟ یہ کیوں نہیں، وہ کیوں نہیں؟ ادھر لاؤ، ادھر لے جاؤ، ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کیوں ہوگیا؟ وہ یہ، ہم یہ...... اور بعض واقعات کے نتائج میں بہت بگاڑ ہوگیا۔ جو کسی بھی طرح قابل فہم نہیں۔(مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور علماء لدھیانہ کی ملاقات) کا وہ نتیجہ کشید کیا گیا جو خود ان حضرات کی عبارت کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔اس پر بہت تعجب ہوا۔

حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی کی عبارات اور ادارہ کی اس ’’سہو‘‘ پر مولانا محمد داؤد ارشد صاحب مدظلہم نے جو مفاہیم اخذ کرنے کی سعی کی اس پر اسلام آباد کے ہمارے مخدوم جناب مولانا حافظ عبیداللہ صاحب نے جواب آں غزل میں کتاب لکھ دی، جس کا نام ’’مرزا قادیانی کی اوّلین تکفیر اور تاریخی حقائق، چند شبہات، اشکالات اور غلط فہمیوں کا ازالہ‘‘ ہے۔ ورلڈ ختم نبوت فورم سے کتاب شائع ہوئی جو سوا دو صد صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں دونوں حضرات کا ’’قال، اقول‘‘ کا مکمل ریکارڈ جمع ہوگیا ہے۔

قارئین! یقین فرمائیں، مجھے اس پر بہت ندامت ہوئی کہ میرے چند حوالہ جات پیش کرنے پر یہ بحث چھڑ گئی۔ آج پھر اپنی وضاحت میں وہی حوالہ جات اوپر ذکر کر دیئے ہیں کہ فقیر کے پیش کردہ نفس حوالہ جات کی تو کسی نے تغلیط نہیں فرمائی، نہ ہی فقیر کے ان حوالہ جات سے نتائج کی تغلیط کی۔ تو پھر جو کچھ اس پر کہا گیا اس میں فقیر راقم کو زیر بحث لانا کیسے روا رکھا گیا؟ اس لئے دل مسوس کر رہ گیا۔لیکن ساتھ ہی سوچ لیا کہ اس کا مداوا کرنا چاہئے کہ کم از کم جو خدمت کا پہلو رہ گیا ہے، وہ اختیار کر لینا چاہئے۔شدید حالت حرب میں مولانا محمد

داؤدارشد صاحب جب سراپا مصروف تھے تو فقیر نے ان کو فون کیا کہ کیا حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی کی کتاب ’’شہادۃ القرآن‘‘ کسی نے کمپیوٹر پر شائع کی ہے؟ جس میں جدید حوالہ جات بھی لگا دیئے ہوں۔ انہوں نے اس کی نفی کی تو فقیر نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ توفیق سے اس کا آغاز کرادیا۔ یادرہے کہ مولانا میر محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کے بارہ رسائل ہم احتساب قادیانیت جلد۱۹ میں شائع کر چکے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱...... فبهت الذی کفر (فروری۱۸۹۸ء)

۲...... الخبر الصحیح عن قبر المسیح (۱۹۰۸ء)

۳...... قادیانی مذہب بمع ضمیمہ خلاصہ مسائل قادیانیہ (۱۹۴۸ء)

۴...... صدائے حق

۵...... فیصلہ ربانی برمرگ قادیانی (ایڈیشن دوم۱۹۳۳ء)

۶...... ختم نبوت اور مرزا قادیان

۷...... فص ختم النبوة بعموم وجامعیة الشریعة

۸...... کشف الحقائق یعنی روئیداد مناظرات قادیانیہ

۹...... امام زمان، مہدی منتظر، مجدد دوراں

۱۰...... کھلی چٹھی نمبر۲

۱۱...... تردید مغالطات مرزائی نمبر۲

۱۲...... مسئلہ ختم نبوت

اوراب محاسبہ جلد ہذا (سولہ) میں مزید یہ کتب ورسائل شائع ہو رہے ہیں:

۱۳...... شہادت القرآن (ہر دو جلد)

۱۴...... سُلَّمُ الْوُصُوْلِ اِلٰی اِسْرَآءِ الرَّسُوْلِ ﷺ

۱۵...... نزول الملائکة

۱۶...... کھلی چٹھی (ا) یہ قادیانی غلام رسول راجیکی کے نام مولانا محمد ابراہیم نے لکھی

۱۷...... رحلت قادیانی بمرگ ناگہانی

یہ رسالہ نثر میں ہے جو پہلے شائع نہیں ہوئی، اب شائع کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک رسالہ پنجابی اشعار میں اسی عنوان پر ہے جو احتساب قادیانیت جلد۱۹ میں شائع ہو چکا۔ اس کا نام ’’فیصلہ ربانی برمرگ قادیانی‘‘ ہے۔

رسالہ ’’فص ختم نبوت‘‘ پر سلسلہ تبلیغ نمبر۲۸ درج ہے۔ باقی ۱تا۲۷ یا ۲۸ کے بعد اگر ہوں تو وہ نہیں مل رہے۔ یہ نمبرات شاید ماہنامہ الہادی سیالکوٹ کے ہیں۔ ان کی مکمل فائل مل جائے تو بہت کچھ مل جانے کی توقع ہے۔

مغالطات مرزائی پر نمبر۲ درج ہے۔ اس کا نمبر۱ اور اگر نمبر۲ کے بعد کوئی نمبر شائع ہوئے تو وہ نہیں مل رہے۔

ان مطلوبہ رسائل میں سے جس کے پاس جو مل جائے، خود شائع کر دیں کرم ہو گا۔ ہمیں بھجوادیں تو کرم ہوگا اور شائع کرنے میں ہم تاخیر نہ کریں گے، وعدہ رہا۔

اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی ہم مولانا میر محمد ابراہیم صاحب کے سترہ رسائل کی اشاعت سے عہدہ برا ہوئے۔ قابل ذکر ہے یہ بات کہ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں محفوظ کتب خانہ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری سے مولانا شاہ عالم گورکھپوری مدظلہم نے مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی کا رسالہ ’’سُلَّمُ الْوُصُوْلِ اِلٰی اِسْرَآءِ الرَّسُوْلِ ﷺ‘‘ بھی بھجوادیا۔ جس کی عرصہ سے تلاش تھی۔ اس پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ نیّتوں کے جاننے والے اور نیک اعمال کو قبول کرنے والے ہیں۔

افوّض امری الیٰ اللّٰہ تعالیٰ وبیدہ الخیر. وھو علیٰ کل شئ قدیر!

محتاج دعاء: فقیر اللہ وسایا ملتان

۹/جمادی الاوّل ۱۴۴۳ھ، ۱۴/دسمبر ۲۰۲۱ء

• • •

خاتم النبیین لا نبی بعدی
میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

شہادت القرآن

(حصہ اوّل)

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

دیباچہ شہادت القرآن

حصہ اوّل (طبع چہارم)

حصہ دوم (طبع سوم)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّانَبِیَّ بَعْدَہٗ

اَمَّـا بَـعْـد! اثبات حیات مسیح کے متعلق مولانا محمد ابراہیم صاحب میر فاضل سیالکوٹی کی قابل قدر کتاب ’’شہادت القرآن‘‘ کا پہلا حصہ رجب ۱۳۲۱ھ (اکتوبر ۱۹۰۳ء) میں مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں طبع ہوا۔ اس کے بعد اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جس میں مرزائے قادیانی کے دلائل متعلقہ وفات مسیح علیہ السلام کا مفصل اور معقول جواب درج ہے۔ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں مرزا قادیانی کی زندگی ہی میں طبع ہوگیا تھا۔ مگر انہیں ان دونوں میں سے کسی ایک حصے کے جواب کی ہمت نہ ہوئی۔

پہلا حصہ دوسری مرتبہ صفر ۱۳۳۰ھ مطابق فروری ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا اور دوسرا حصہ دوسری مرتبہ مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری کے اہتمام سے ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ مطابق اگست ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔

پہلا حصہ تیسری مرتبہ مصنف علّام نے ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق مئی ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد اس کتاب کی مانگ تو بہت زیادہ رہی مگر کثرت اشتغال وقلّت فرصت کے باعث فاضل مصنف اس کی طبع چہارم اپنی زندگی میں تو شائع نہ فرما سکے لیکن انہوں نے اتنا اہتمام ضرور کیا کہ حصہ اوّل کی طبع سوم کے ایک نسخے میں طبع چہارم کے لئے اپنے دست مبارک سے جگہ جگہ ضروری اضافے فرمادیئے اور کتاب کے سرورق پر ’’صحیح کردہ نسخہ طبع چہارم کے لئے‘‘ نیز تاکیداً تحریر فرمایا کہ اس نسخے کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ مصف علّام کی اس تحریر کی تاریخ ۲۸؍جنوری ۱۹۵۰ء بوقت شب مطابق ۹؍ربیع الاخر ۱۳۶۹ھ ہے۔

راقم الحروف نے انتہائی کوشش کی ہے کہ مصنف کی دلی آرزو کے مطابق حصہ اوّل کی طبع چہارم میں اس کے تجویز کردہ تمام اضافے اور ترمیمات اپنے اپنے مقام پر صحت کے ساتھ درج ہو جائیں۔

مصنف علّام ۱۲/جنوری ۱۹۵۶ء مطابق ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ کو اللہ کو پیارے ہوگئے[1]۔ لیکن یہ یقین کر لینا چاہئے کہ حصہ اوّل کی طبع چہارم گویا انہیں کی نگرانی میں شائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ناظرین کو اس سے نفع پہنچائے۔

ناشکری ہوگی اگر صمیم قلب سے اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے کہ شہادت القرآن کی یہ اشاعت کلیتًا حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت فیوضہم کی توجہ خاص کی رہین منت ہے۔ مولانا لال حسین صاحب اختر نے جس فیاضی سے کام لے کر شہادت القرآن کے ہردو حصص کتابت کے لئے پیش فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

عبدالقیوم میر برادرزادہ مولانا محمد ابراہیم
صاحب میر سیالکوٹی

۲۶/ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ، ۱۵/جولائی ۱۹۵۸ء

• • •

[1] (مرزا ہادی علی بیگ دامن رام پوری نے مولانائے مرحوم کی تاریخ وفات یوں تحریر فرمائی ہے: قالوا، ھادی، اکتب: الحق، موت العالِم موت العالَم ۱۳۷۵ھ
۱۹۵۶ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ (طبع چہارم)

حرف اوّل

اثبات حیات مسیح علیہ السلام کے عنوان سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کی معرکہ آراء تصنیف محتاج تعارف نہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ یکے بعد دیگرے۔ کئی مرتبہ اشاعت کے باوجود بازار سے نایاب ہوگئی اوراس کے بعد پھر زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ حسن اتفاق سے کتاب کا ایک نسخہ شیخ المشائخ، قطب العالم، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر مدظلہ العالی کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا تو حضرت اقدس زید مجدہٗ نے موضوع کی عظمت، مضامین کی بلندی اور دلائل کی پختگی سے متاثر ہوکر اس کتاب کو مختلف مجالس میں بالاقساط پڑھوایا۔ سماعت کے بعد حضرت اقدس زید مجدہٗ نے اس کتاب کی فوری اشاعت کی خواہش ظاہر فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کے بھتیجے مولانا عبدالقیوم صاحب مدظلہٗ سے (حضرت سید نفیس الحسینی کے توسط سے) مولانا مرحوم کا وہ ذاتی نسخہ حاصل کیا گیا۔ جس میں مولانا مرحوم نے طبع چہارم کے لئے جابجا ضروری اضافہ اور مناسب ترمیم کو بصورت حاشیہ قلم بند کر رکھا تھا۔ مگر انہیں اپنی زندگی میں اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا تھا۔ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور تردید مرزائیت کے سلسلہ میں موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کی اشاعت کے اہتمام وانصرام کی سعادت حضرت اقدس (رائے پوری) کی خواہش کے مطابق مجلس مرکزیہ تحفظ ختم نبوت پاکستان ملتان کو نصیب ہوئی۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ برمحل ہوگا کہ ملک بھر میں مجلس تحفظ ختم نبوت ہی ایسی

واحد جماعت ہے جو ذاتی اقتدار کی رسہ کشی اور غیر اسلامی سیاسی بکھیڑوں سے بے نیاز ہوکر خالصۃً اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ خدا کے فضل سے اس جماعت کا دائرہ کار پورے ملک میں وسیع و ہمہ گیر ہو رہا ہے۔ مغربی پاکستان کے اکثر بڑے شہروں میں اس جماعت کے مبلغین جماعتی خرچ پر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مجلس کے زیر اہتمام دینی مدارس بھی قائم ہیں۔ گویا پاکستان بھر میں یہی ایک جماعت ایسی ہے جو منظّم اور مؤثّر طریق سے عیسائیوں، مرزائیوں اور دیگر باطل تنظیموں کا پوری تن دہی اور مستقل مزاجی کے ساتھ نہ صرف مقابلہ کر رہی ہے۔ بلکہ اس کی دعوت روز افزوں مقبول و محبوب ہو رہی ہے اور زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ان سطور کے بعد دین دار عوام سے عموماً، علماء کرام اور مشائخ عظام سے خصوصاً استدعا ہے کہ وہ اپنا دینی اور اخلاقی فرض پہچانتے ہوئے، اس مفید ترین علمی تحفہ اور مؤثّر تبلیغی ہدیہ کی بڑھ چڑھ کر قدر افزائی کریں۔ تاکہ مسئلہ ختم نبوت کی عظمت و اہمیت بدرجہا زیادہ جاگزیں ہو اور اس کے اعزاز و اکرام کے صدقہ میں حق تعالیٰ ہماری تمام ذلتوں اور تباہیوں کو دور کر کے ہمیں دارین کی نیک نامیوں اور درجات کی بلندیوں سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین!

(دفتر مرکزیہ ملتان)

• • •

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ (طبع ثالث)

مُسمّٰی بِسَعَادَتِ الْاِقْرَانِ بِکَشْفِ بَعْضِ لِطَائِفِ شَهَادَتِ الْقُرْآنِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْاِکْرَمِ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ ۰ اَمَّا بَعْدُ!

صاحبان! شہادت القرآن کا پہلا حصہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی نو آیات قرآنیہ سے ثابت کی گئی ہے۔ اوّل مرتبہ ماہ رجب ۱۳۲۱ھ (اکتوبر ۱۹۰۳ء) میں طبع ہوا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ جس میں ان تیس دلائل کا جواب ہے۔ جو مرزا غلام احمد قادیانی مدعی مسیحیت ونبوت نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول پر بزعم خود قرآن شریف سے پیش کئے ہیں۔ مرزا قادیانی کی زندگی ہی میں رمضان ۱۳۲۳ھ (نومبر ۱۹۰۵ء) میں طبع ہوا۔ مرزا قادیانی ۲۴/ماہ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ بمطابق ۲۶/مئی ۱۹۰۸ء کو بروز منگل (سہ شنبہ) میلہ بھدر کالی کے دن بمقام لاہور فوت ہوئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی کو شہادت القرآن کا جواب لکھنے کے لئے کئی سال کی مہلت ملی۔ لیکن نہ تو جناب مرزا قادیانی آنجہانی کو ہمت ہوئی اور نہ ان کی زندگی میں ان کی جماعت کے کسی واقعی عالم یا مدعی علم کو جرأت ہوئی۔

پھر دوسری مرتبہ پہلا حصہ صفر ۱۳۳۰ھ میں مطابق فروری ۱۹۱۲ء اور دوسرا حصہ باہتمام حضرت مولانا المکرّم جناب مولوی ثناء اللہ صاحب (دامت برکاتہ) سردار اہل حدیث ذی الحج ۱۳۴۰ھ مطابق اگست ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا۔

ارادہ تھا کہ دوسری طبع میں اس کی بعض مشکلات کی تسہیل اور مجملات کی توضیح وتفصیل کر دوں گا۔ لیکن میری قلت فرصت (جو ہمیشہ شامل حال رہتی ہے) اور طالبین کی شدت شوق واستعجال نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا:

مَا کُلُّ مَا یَتَمَنَّی الْمَرْءُ مُدْرِکُهٗ وَتَجْرِیْ الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِیْ السُّفُنُ

اب تیسری طبع کی نوبت آ گئی ہے اور جس قدر شائقین کی طلب اور ’’دفتر اہل حدیث‘‘ کی فرمائش زیادہ ہورہی ہے۔ اسی قدر میری فرصت کم سے کم تر ہورہی ہے۔ ایسی قلّتِ فرصت کی حالت میں کہ متعدّد مشکل اور مطوّل تصانیف[1] کا سلسلہ جاری ہے۔ اس علاوہ[2] کو بھی ساتھ رکھ لیا۔ اب اللہ ہے کہ ان سب کو پورا کرادے۔ ’’ھُوَ حَسْبِیْ وَنِعْمَ الرَّفِیْق‘‘ خیال تھا کہ اس تیسرے ایڈیشن میں امکان خرق عادت کا مضمون مفصل لکھا جائے۔ چنانچہ وہ لکھ بھی ڈالا۔ لیکن وہ اتنا طویل ہوگیا کہ اگر اسے اس کتاب کا جزو بنایا جائے تو کتاب کا حجم بڑھ جائے۔ بنابریں مناسب جانا کہ اسے الگ ایک رسالہ کی صورت میں طبع کرادیا جائے۔

اہل علم نے اس کتاب (شہادت القرآن) کی جو قدر کی، وہ ان کی ذرہ نوازی اور علمی قدردانی ہے۔ ورنہ میری نظر سے وہ اس قابل نہ تھی کہ اہل علم اسے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے اور قادیانی مناظرات میں زیرنظر رکھتے۔

میں حضرات دیوبند کا خصوصیت سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنی علمی قدرشناسی اور فراخ دلی کا عملی ثبوت دیا۔ خصوصاً مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کا کہ وہ برابر اپنے طلباء اور محصّلین اور زیراثر شائقین کو اس کتاب کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ میں انسان ہوکر اس ناچیز خدمت کو بے عیب متاع کی طرح پیش نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن چونکہ ایمان وایمانیات میں اذعان ووثوق ضروری ہے۔ اس لئے اپنے ایمان واذعان کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس

[1] مثلاً تاریخ اہل حدیث، خلافت راشدہ کے دوسلسلے (ایک اخبار اہل حدیث میں) اور (دوسرا اخبار زمیندار میں) سیرت الرسول (آنحضرت ﷺ کے سوانح قدسیہ) تفسیر ثنائی کے ترجمۃ القرآن پرنظر ثانی۔ حسب فرمائش جناب مولانا المکرّم اور اپنی تفسیر مسمّٰی بہ توفیق الرحمٰن اور بلدیہ سیالکوٹ کے تعلقات اور لوگوں کے نج کے معاملات اور فصل خصومات اور ہندوستان بھر سے روزانہ خط وکتابت اور انشائے فتاویٰ کے اشغال تو گنتی میں نہیں۔ ’’اَللّٰھُمَّ تَمِّمْ کُلَّھَا بِالْخَیْرِ وَتَقَبَّلْھَا مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ‘‘ مزید برآں فروری ۱۹۲۷ء کا سارا مہینہ سفر میں گزرا۔

[2] علاوہ (بالکسر) عربی میں اس چھوٹی سی گٹھڑی کو کہتے ہیں جو لادو جانوروں پر ان کے اصلی بوجھ سے زائد اوپر رکھ لیتے ہیں۔

میں حق بیان کیا ہے اور اسے ایسے زبردست اور روشن دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اس کے جواب میں مرزا قادیانی اور ان کی جماعت کا قلم کیا دم بھی ٹوٹ گیا ہے۔ نہ تو جواب کی ہمت پڑی اور نہ ان شاء اللہ! پڑے گی۔ کیونکہ میں نے اس میں خدا کے فضل وتوفیق سے اصل دلیل کی بنا صرف قرآن کریم پر رکھی ہے اور اسے ادھر ادھر کی کھینچ تان اور ایچا پیچیوں سے سلامت رکھتے ہوئے بالکل منشائے الٰہی کے مطابق بیان کیا ہے اور باقی سب قسم کے دلائل کو اس کے ماتحت تائیدی شہادتیں اور تشریحیں بنایا ہے۔ ہاں! اس امر کا لحاظ شدت سے رکھا ہے کہ کسی آیت کے مفہوم کو کلام الٰہی کے امین اور صحیح مخاطب رسول اللہ ﷺ کے بیان قولی یا فعلی اور فصیح زبان عرب کے محاورات اور علمی قواعد استدلال واستنباط کے خلاف بیان نہ کروں۔

اہل علم وفہم اصحاب کی خدمت میں ان کے مذاق علم کی ضیافت کے لئے چند سطور ذیل میں پیش کرتا ہوں، جس سے ان کی دور رس نظر، اس امر کو بسہولت پالے گی کہ میں مقدس کتاب میں کیسی پختگی سے امور ضروریہ کو مرعی رکھا ہے اور مضمون کے مالہٗ وماعلیہ کو کس طرح نظر میں رکھ کر حق کا اثبات اور باطل کا ابطال کیا ہے اور مفہوم کلام کو خدائے حکیم کے منشاء کے مطابق بیان کیا ہے اور مقام احتجاج وتحقیق میں دفع الوقتی اور تساہل اور مقام تردید وتنقید میں اوچھے ہتھیاروں سے ہرگز کام نہیں لیا۔ بلکہ خدا کے فضل وحسن توفیق سے شہادت القرآن کے ہر دو حصوں میں خالص حق (بغیر کسی ملاوٹ کے) زبردست دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں مقام استدلال وتعلیل میں کسی امر کو بھی بغیر دلیل نہیں چھوڑا کہ کوئی مانع طلب کر سکے اور ہر دلیل کو قواعد علمیہ سے ایسا محکم کیا ہے کہ مخالف کو نقض کی گنجائش نہیں اور قواعد علمیہ کا اجراء اور استدلال کی بنا آیات قرآنیہ پر رکھی ہے اور یہ مسلّم ہے کہ ان کا معارضہ ممکن نہیں اور ہر نقل کو صحیح صحیح بغیر کمی بیشی یا تغییر مفہوم کے لکھا ہے۔ پس صحت نقل کا مطالبہ عبث ہے اور پھر مسلّمات نقلیہ کو میزان عقل پر بھی پورا کر دکھایا ہے کہ ہر دو جہت سے برہان قوی ثابت ہو۔ پس تعارض عقل ونقل کا عذر بھی نہیں ہوسکتا۔

دوسرے حصے میں مرزا قادیانی کے ’’دلائل وفات مسیح‘‘ کا جواب ہے۔ اس میں ان کی ہر فرضی دلیل کے ہر مقدمہ پر علم لغت ونحو واصول اور قرآن وحدیث صحیح سے نقض

کیا ہے اور ہر نقص میں شاہد پیش کیا ہے اور ان کے اپنے مسلّمات سے ان پر الزام قائم کئے ہیں۔ پس اپنی کم بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے اور محض خدا کے فضل پر اعتماد رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ شہادت القرآن کے حصہ دوم کے مطالعہ کے بعد مرزا قادیانی کے صاحب علم ہونے کا خیال باقی نہیں رہ سکتا۔

اگر ان کے کسی حامی کے سر میں پھر بھی خیال سمائے کہ مرزا قادیانی علم نحو واصول میں مہارت رکھتے تھے تو اس کا فرض ہے کہ ان علوم کے رو سے اس کتاب کے حصہ دوم کا جواب لکھ کر اپنے خیالات کو مرزا قادیانی کی تصریحات سے ثابت کرے جو ان شاءاللہ نہیں ہو سکے گا۔

مرزا قادیانی کی زندگی میں نہ تو ان سے اور نہ ان کے کسی ذی علم مرید سے ہو سکا کہ شہادت القرآن کا جواب لکھیں۔ آخر ان کی وفات کے کئی ماہ بعد ان کے ایک حواری مولوی ظہور الدین صاحب اکمل نے اس کے پہلے باب کا جواب بنام ''شہادت الفرقان'' چھپوایا۔ لیکن حقیقت میں وہ شہادت القرآن کا جواب نہیں ہے۔ اسی لئے خود ان کی جماعت میں بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ مولوی اکمل صاحب شہادت القرآن کے مطالب عالیہ اور لطائف علمیہ کو سمجھ نہیں سکے۔ بلکہ جن امور کو بالتصریح بیان کیا گیا ہے، ان کو بھی خیال میں نہیں رکھ سکے۔ بلکہ جو باتیں ان کی جماعت اور خود مرزا قادیانی اس سے قبل مسئلہ حیات وممات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان کیا کرتے تھے، وہی دہرادی ہیں۔ حالانکہ شہادت القرآن میں ان عذرات کی تردید صراحۃً یا اشارۃً موجود ہے اور خدا کے احسان سے خاکسار نے اس کتاب کو خاص اسی خیال سے ایسی مضبوطی اور خوبی کے ساتھ لکھا تھا کہ مرزا قادیانی اور ان کی جماعت کے علماء اس کے جواب سے عاجز رہیں۔ دیگر اس خیال سے کہ جو کچھ قادیانیوں کی طرف سے اس کے جواب میں نکلے، اس کا جواب بھی خود شہادت القرآن ہی ہو اور مجھے نیا جواب لکھنے کی ضرورت نہ پڑے:

قاصد کے آتے آتے میں خط اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

سوالحمدللہ! میرے دونوں خیال درست نکلے۔ نہ تو مرزا قادیانی اس کا جواب لکھ سکے اور نہ ان کے علماء اس کے دلائل کو توڑ سکے اور نہ مجھے جواب الجواب کے لئے شہادت القرآن سے

باہر جانا پڑا۔ چنانچہ ان شاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ یہ ہیچ مدان موقع بہ موقع اکمل صاحب کا جواب خاص شہادت القرآن ہی کی تصریحات اوراشارات سے دے گا۔ وَمَا تُوفِیقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ!

دوسری وجہ یہ کہ خاکسار نے شہادت القرآن کا پہلا باب رجب ۱۳۲۱ھ (اکتوبر ۱۹۰۳ء) میں چھپوایا اور دوسرا باب دوسال بعد رمضان ۱۳۲۳ھ (نومبر ۱۹۰۵ء) میں طبع کرایا۔ اس دوسال سے کچھ زائد عرصہ میں پہلے باب کا کوئی جواب نہیں لکھا گیا اوراس کے بعد بھی ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) تک خاموشی رہی اور مرزا قادیانی چل بسے۔ ساڑھے پانچ سال بعد صرف پہلے باب کا جواب طبع ہوا اور دوسرے باب سے (جس میں مرزا قادیانی کے ان دلائل کو جوانہوں نے وفات حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لکھے ہیں۔ لغت عرب اور قواعد علمیہ اوراحادیث نبویہ اور علوم الٰہیہ اور اصول استدلال سے ایسا غلط ثابت کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد مرزا قادیانی کی عیسویت کا رنگ تو کجا آپ کی علمیّت کا بھی سارا بھرم کھل جاتا ہے اور قطار علماء میں شمار نہیں ہوسکتے) استغنا کیا جائے۔ ایں چہ بوالعجبی؟ لہٰذا خاکسار اکمل صاحب کے جواب کو شہادت القرآن کا جواب نہیں کہہ سکتا۔

بنابریں مجھے اکمل صاحب کی کتاب کا جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ شہادت القرآن کی دوسری طبع نہایت عجلت وقلت فرصت اور کثرت سفر کی حالت میں ہوئی اور کے حاشیہ پر قادیانی کتاب کے متعلق ریمارک نہیں ہوسکے اوراب تیسری طبع پھر ہونے والی ہے۔ اس لئے مناسب جانا کہ ان شبہات کو بھی اٹھادوں جو اکمل صاحب کو شہادت القرآن کے نہ سمجھنے کے سبب پڑے ہیں تاکہ شہادت القرآن کے لطائف اور زیادہ ظاہر ہوں اور پیر کہن سال مولوی محمد احسن امروہی قادیانی کی وہ رائے درست ثابت ہو جوانہوں نے مولوی فیروز الدین صاحب فیروز ڈسکوی مرحوم کو مرزا قادیانی کی زندگی میں سیالکوٹ میں ان سے سوال کے جواب میں کہی تھی کہ اگر شہادت القرآن کا جواب لکھا جائے تو اس کی حیثیت اور بڑھ جائے گی۔ سومیں اس جواب الجواب کا نام جو بیشتر حاشیہ پر ہوگا ’’سعادت الاقران بکشف بعض لطائف شہادت القرآن‘‘ رکھتا ہوں اور ہر امر سہل وصعب میں خدائے کریم سے توفیق چاہتا ہوں۔

راقم: آپ کا صادق

ابوتمیم محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادت القرآن

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَنَتْ لِجَلَالِ عِزَّتِہٖ وُجُوْہُ الْاَبْطَالِ بِالذُّلِّ وَالْاِبْتِھَالِ وَتَخَشَّعَتْ لِکَمَالِ حِکْمَتِہٖ اَعْنَاقُ اَکَابِرِ الرِّجَالِ. یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلٰی الْاَرْضِ بِغَیْرِ اِحْتِیَاجٍ وَّیَخْلُقُ مَا یَشَآءُ بِلَا مِزَاجٍ وَّعِلَاجٍ اَعَزَّ لَدَیْہِ مَاوَیَ الْمُؤْتَضِیْنَ وَالْمُلْتَجِیْنَ اِلَیْہِ. وَاَکْرَمَ مَثْوَی الْمُنْقَطِعِیْنَ اِلَیْہِ وَالْمُتَوَکِّلِیْنَ عَلَیْہِ. لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ وَّلَا یُعْجِزُہٗ شَیْئٌ وَّھُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ. لَا یُعَقَّبُ عَلٰی مَا یَحْکُمُ وَلَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ. اَرْسَلَ الرُّسُلَ بِالْحَقِّ وَاَنْطَقَھُمْ بِالصِّدْقِ فَاَوْضَحَ الْمَحَجَّۃَ وَلَمْ یَدَعْ لِاَحَدٍ الْحُجَّۃَ. فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی جَمِیْعِھِمْ وَسَلَّمَ. اِنَّہٗ وَلِیُّ النِّعَمِ وَرَبُّ الْکَرَمِ خُصُوْصًا عَلٰی خِیَرَتِھِمْ وَصَفْوَتِھِمْ اَلْمَخْصُوْصِ بِعُمُوْمِ الدَّعْوَۃِ وَخِتَامِ النُّبُوَّۃِ الَّذِیْ نَصَبَ مَعَالِمَ الْھُدٰی لِلْوَرٰی وَرَقٰی فِیْ مَدَارِکِ الْعُلَآءِ وَمَعَارِجِ السَّمَآءِ اِلَی الْغَایَۃِ الْقُصْوٰی. اَخْبَرَ بِمَا یَکُوْنُ مِنَ الْخَیْتَعُوْرِ بِالْفِتَنِ وَالشُّرُوْرِ وَمُحَدَّثَاتِ الْاُمُوْرِ. وَاخْتَارَ اللّٰہُ لِتَصْدِیْقِہٖ کَلِمَتُہُ الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ الَّذِیْ یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ بِالْحُکْمِ وَالْعَلَمِ. وَعَلٰی اٰلِہِ الْاَطْھَارِ وَخُلَفَائِہٖ سَادَۃِ الْاَبْرَارِ الَّذِیْنَ بَلَّغُوْا عَنْہُ بِاللِّسَانِ وَالسِّنَانِ وَالْقَلَمِ وَضَرَبُوْا اَعْنَاقَ الْجَبَابِرَۃِ وَالدَّجَاجِلَۃِ اُوْلِی الْکَبَآئِرِ وَالْوَخَمِ. فَمَنِ اقْتَدٰی بِھِمْ فَقَدْ رَشَدَ وَاھْتَدٰی وَمَنِ ابْتَغٰی غَیْرَ سَبِیْلِھِمْ فَقَدْ ضَلَّ وَغَوٰی.

تمہید

اَمَّـا بَـعْـد ! پس بندۂ ضعف سمیّ خلیل اللہ الحنیف محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ارباب فطنت وتحقیق واصحاب خبرت وتدقیق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس زمان بغی اور طغیان میں ہر شخص جداگانہ مذہب وطریقہ بنائے۔ ایسی چھائی ہے کہ اپنے خیالات مخترعہ کی تصدیق کے لئے نہ تو کتاب آسمانی کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ قائد ربّانی، حکیم حقانی، رسول یزدانی ﷺ کے بیان وافی کی حاجت، باوجود قلت بضاعت اور قصور باع میدان اجتہاد کے

شہسوار بنتے ہیں اور انہیں اوہام باطلہ اور وساوس عاطلہ پر نجات کے متمنی، ایسے ہی لوگوں کے مناسب حال کسی نے کیا اچھا کہا ہے:

وَکُلٌّ یَدَّعِیْ وَصْلاً لِلَیْلٰی ۔۔۔ وَلَیْلٰی لَا تُقِرُّ لَهُمْ بِذَاکَا

’’ہر کوئی لیلیٰ کے وصل کا مدعی ہے، لیکن لیلیٰ کا ان میں سے کسی سے بھی اقرار نہیں۔‘‘

ہر ایک اپنے لئے الگ مسلک بنائے ہوئے ہے اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے مسلک کی ابتاع کو جن کے بار احسان سے ہم کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ چھوڑے ہوئے ہے ’’اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ‘‘! متقدمین اسلام کو اصول وشرائع سے ناواقف بتاتے اور خود وحی والہام کے دعاوی باطلہ جگاتے ہیں۔ چنانچہ حال میں مرزا غلام احمد قادیانی ساکن قادیان ضلع گورداسپور نے اپنے لئے مسند مسیحی تجویز کی اور رفتہ رفتہ منبر محمّدیت پر جا براجے۔

(تریاق القلوب ص۳، خزائن ج۱۵ ص۱۳۴)

مسیح زمان ومنم کلیم خدا ۔۔۔ منم محمد واحمد کہ مجتبیٰ باشد

اور پھر ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ (دافع البلاء ص۷، خزائن ج۱۸ ص۲۲۷) عوام کالانعام کو یہ دھوکا دیا کہ قرآن شریف کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام اسی جسم خاکی کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ بلکہ قرآن شریف کے کئی مقامات میں مسیح علیہ السلام کے فوت ہو جانے کا صریح ذکر ہے۔ (ازالہ اوہام ص۴۶، خزائن ج۳ ص۱۲۵)

جب ان لوگوں کو کوئی پچھلی تفسیر بتائی تو ’’اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْن‘‘ کہہ کہ جھٹ انکار کر دیتے ہیں اور اگر ان کے روبرو حدیث نبوی ﷺ پڑھیں تو اسے بوجہ بے علمی کے مخالف ومعارض قرآن بنا کر دور پھینک دیتے ہیں اور اپنی تفسیر بالرائے کو جو حقیقت میں تحریف وتاویل منہی عنہ ہوتی ہے۔ مؤیّد بالقرآن کہتے ہیں۔ بیچارے کم علم لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور ورطہ تردّدات وگرداب شبہات میں گھر جاتے ہیں۔

’’وَلَئِنْ فَسَبَّحَ اللّٰہُ فِیْ مُدَّتِیْ وَوَفَّقَنِیْ بِمَزِیْدِ کَرَمِهٖ لَاُ صَنِّفَنَّ فِی التَّوْفِیْقِ بَیْنَ الْحَدِیْثِ وَالْقُرْاٰنِ رِسَالَةً تَرْوِی الْغَلِیْلَ وَتَشْفِی الْعَلِیْلَ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْب‘‘ اور اگر خدا نے عمر میری بڑھائی اور اپنے مزید کرم سے توفیق بخشی تو میں قرآن وحدیث کی موافقت میں ایک ایسا رسالہ[1] لکھوں گا

[1] خدا کے کرم سے یہ مضمون تائید القرآن میں (ص۱۵۳ سے ص۱۹۰) تک مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

جو پیاسے کو سیراب کر دے اور بیمار کو شفا دے دے اور میں اسے خدا کی توفیق کے سوا انجام نہیں دے سکتا۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میری باطنی توجہ ہے۔

سو ایسے شبہات کے وقت میں اللہ عزیز حکیم نے مجھ عاجز کو محض اپنے فضل وکرم سے راہ حق کی ہدایت کی اور ہر طرح سے ظاہراً وباطناً ومعقولاً ومنقولاً مسئلہ حقہ سمجھا دیا۔

مصنف کے بعض خواب

خواب نمبر۱: چنانچہ شروع جوانی ۱۸۹۱ء میں (جب انگریزی سکول میں پڑھتا تھا) حضرت مسیح علیہ السلام کی زیارت بابرکت سے مشرف ہوا۔ اس طرح کہ آپ ایک گاڑی پر سوار ہیں اور بندہ اس کو آگے سے کھینچ رہا ہے۔ اس حالت باسعادت میں آپ سے مرزا قادیانی کے دعویٰ کی نسبت عرض کی۔ آپ نے زبان وحی ترجمان سے بالفاظ طیبہ یوں جواب فرمایا کہ: ''کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو جلد ہلاک کر دے گا۱''

بوجہ چند امور کے اس اشتیاق کو جنب میں رکھے ہوئے انگریزی تعلیم پاتا رہا۔ دفعۃً ۱۸۹۶ء میں قائد ازلی کے اشارے سے تمنائے قلبی کو پورا کرنے کے لئے کالج۲ چھوڑ دیا اور بہمہ تن علوم عربیہ کے حاصل کرنے میں مصروف ہوگیا۔ الحمدللہ! کہ تھوڑی مدت میں جو کچھ مقدّر تھا بھر پایا۔

ان دنوں مرزا قادیانی کا بہت چرچا تھا اور انہوں نے مسئلہ حیات ووفات عیسیٰ علیہ السلام کو بنائے دعویٰ قرار دے رکھا تھا۔ اس لئے خاکسار نے مسئلہ حیات ووفات عیسیٰ علیہ السلام کو کتب تفسیر وحدیث سے تحقیق کرنا شروع کیا تو سب کو رفع آسمانی اور نزول بار ثانی پر متفق پایا۔ مگر جب اس فرقہ کا یہ طریق دیکھا کہ وہ تفاسیر واحادیث کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں تو اتماماً للحجۃ صرف قرآن شریف ہی سے مسائل زیرنزاع کو حل کرنا شروع کیا۔ سوالحمدللہ کہ دامن مراد کو گوہر مقصود سے بھر لیا اور علوم عقلیہ کے ہر نامعقول اعتراض کو محض قرآن کریم ہی سے دفع کیا۔ جب علوم ظاہریّہ سے عقیدۂ حیات ونزول حضرت مسیح علیہ السلام کو صحیح ثابت کر لیا تو پھر باطنی طور پر فیضان الٰہی کا کرشمہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ شعبان ۱۳۱۹ھ میں

۱ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مرزا قادیانی ۲۶ رمئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں بعارضہ ہیضہ عالم جزا کو سدھارے۔

۲ خاکسار اس وقت ایف۔اے کے پہلے سال میں تھا۔

www.amtkn.com www.facebook.com/amtkn313 www.emaktaba.info

جب بندہ حفظ قرآن شریف میں مشغول تھا۔[۱] ایک رات بکمال تضرّع وابتہال درگاہ ایزد متعال میں عرض پرواز ہوا کہ خداوند! اس امر میں جو کچھ تیرے نزدیک حق ہے، مجھے دکھا اور اس کی قبولیت وپیروی کی توفیق عطاء فرما۔

خواب نمبر۲: پس خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت سفید کاغذ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جس پر الفاظ: ''اِنَّ عِیْسٰی حَیٌّ فِی السَّمَآءِ وَسَیَنْزِلُ عِنْدَ قُرْبِ السَّاعَۃِ'' (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے شک آسمان میں زندہ موجود ہیں اور وہ قیامت کے قریب ضرور اتریں گے) مکتوب تھے۔ میرے سامنے کیا گیا۔[۲] اس رویائے حقّہ سے بندہ کا سینہ باغ باغ ہوگیا اور نور اور معرفت کے پھولوں سے بھر گیا۔

القصّہ ۱۹۰۲ء میں شہر سیالکوٹ میں بمواقع کثیرہ بعض احباب کے اصرار سے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات فی السماء کو مع دیگر مسائل (معراج وغیرہ) بنصوص قرآنیہ بیان کیا۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے منکرین کو بالکل پست کر دیا اور بہت سے مذبذبین اور متردّدین کو شاہراہ عقیدت پر چلایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے شہروں میں آوازہ بلند ہوا اور خطوط طلبی آنے لگے۔ بندہ نے سمجھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گاڑی کو چلانے والا خواب سچا ہوا چاہتا ہے۔ لہٰذا برادران دینی کی استدعا کو بسروچشم منظور کر کے محض تبلیغ دین کے لئے کئی سفر کئے۔ چنانچہ وزیرآباد اور ضلع گجرات، شہر جہلم، شہر راولپنڈی، امرتسر اور پشاور میں سفر کر کے اس قدر وعظ کئے کہ اکثر لوگ مطمئن ہوگئے اور بعض مرزائی تائب ہوگئے۔ فرقۂ مرزائیہ کے بعض مدعیان علم سے پسرور، سیالکوٹ، وزیرآباد، کھاریاں اور موضع کملا (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات پنجاب) اور شہر جہلم[۳] مباحثات ومناظرات بھی ہوئے۔ ان سب مواضع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے

۱؎ الحمدللہ کہ اس کے فضل وتوفیق سے اس وظیفہ کے جاری رکھنے تک جو کہ آنحضرت ﷺ نے حفظ قرآن کے لئے حضرت علیؓ کو فرمایا تھا (ترمذی) میں نے صرف ایک مہینہ میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ والحمدللہ!

۲؎ کیفیت یہ تھی کہ وہ کاغذ عالم غیب سے میری آنکھوں کی اونچائی کے برابر میرے سامنے آیا اور سوائے دست قدرت کے کوئی اس کو تھامنے والا نہیں تھا۔

۳؎ شہادت القرآن کی تصنیف کے بعد بھی کئی ایک مقامات پر قادیانی علماء سے مباحثات ہوئے۔ مثلاً چنیوٹ، لاہور، مونگیر، (بہار۹) گوجرانوالہ، ڈیرہ بابا نانک صاحب۔ ان سب مقامات پر خداتعالیٰ نے خاکسار کی مدد کی اور نمایاں فتح دی۔

بندہ (خاکسار) کوغلبہ دیا اور مخالفین کو حجت میں مغلوب کیا۔ چنانچہ بعض کو ہلاک[1] کیا اور بعض کو بیماری[2] میں مبتلا کیا اور بعض کو ندامت[3] کے دریا میں غرق کیا۔ جہلم میں (مرزا قادیانی) کے[4] سامنے کھڑے ہوکر صدہا مسلمانوں کے درمیان مسئلہ حیات ورفع مسیح علیہ السلام صرف قرآن شریف سے بیان کیا اور مرزا قادیانی کو زبانی وتحریری طور پر تحقیق حق کی طرف دعوت بھی دی۔ مگر وہ اس پر ہاں نہ کر سکے، پر نہ کر سکے اور اب بھی نہ کر سکیں گے[5]۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

وجۂ تصنیف

آخرالامر صدر پشاور کے ایک مخلص دوست[6] کے مشورہ سے اس مضمون کو قلم بند کیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ گم گشتگان بادیۂ ضلالت کو قادیانی عقائد سے بچاکر شاہراہ عقیدت پر لائے اور نیز ہر محقق کے پاس دلائل ساطعہ وبراہین قاطعہ کا مجموعہ موجود رہے۔

اس کتاب میں تین مقدمات اور ایک تنبیہ اور دو فصلیں ہیں۔ مقدمہ اولیٰ در امکان معجزات۔ مقدمہ ثانیہ در تشریح سنت اللہ۔ مقدمہ ثالثہ در خصائص حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ تنبیہ در بیان طریق استدلال مصنف۔ فصل اوّل در بیان عدم مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام۔ اس کا نام ’’ضَرْبٌ بِالْیَمِیْنِ لِکَسْرِ صَلِیْبِ الْمُلْحِدِیْن‘‘ ہے۔ فصل ثانی در اثبات حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام ورفع جسمی۔

سو اس کتاب کو اللہ تعالیٰ ودود کے نام سے شروع کرتا ہوں اور ہر امر سہل وصعب میں صرف اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ’’وَالْاِلْتِمَاسُ مِنْ کِرَامِ النَّاسِ اَنْ یَّعْفُوْا الزَّلَلَ

۱؎ مثلاً مولوی قائم الدین صاحب سیالکوٹی اور شیخ چراغ دین صاحب گجراتی۔

۲؎ مثلاً مولوی مبارک علی صاحب کو مباحثہ جہلم میں۔

۳؎ مثلاً مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی کو پسرور میں اور فضل دین صاحب کو کھاریاں میں۔

۴؎ جب مرزا قادیانی مولوی کرم الدین صاحب کے استغاثہ پر جہلم میں تاریخ مقدمہ پر گئے تھے۔

۵؎ چنانچہ ایسا ہی ہوا تادم حیات طاقت نہ ہوئی۔ بلکہ جس روز مرزا قادیانی لاہور میں فوت ہوئے۔ اس سے ایک روز پیشتر ان کو میری طرف سے بوساطت ڈاکٹر ایم۔اے سعید صاحب دعوت مناظرہ کا خط پہنچ چکا تھا۔ وہ خط کیا تھا گویا پیام اجل تھا کہ دوسرے روز مرزا قادیانی فوت ہوگئے۔

۶؎ ڈاکٹر سید ابو محمد جمال الدین صاحب مقیم پشاور۔

وَیَسُدُّوا الْخَلَلَ لِاَنَّ جُهْدَ الْمُقِلِّ مَشْکُوْرٌ وَّبَاذِلُ الْوُسْعِ مَعْذُوْرٌ وَّاِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ وَهُوَ حَسْبِیْ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ. اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ. وَاغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنْتَ حَسْبِیْ وَاَنْتَ لِیْ نِعْمَ الْمُعِیْنُ''

خاکسار: ابوتمیم محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

مقدمہ[1] اولیٰ ...... دربیان امکان خرق عادت

خرق عادت (معجزہ وکرامت) کے متعلق مدت سے اختلاف چلا آتا ہے کہ آیا یہ ممکن ہے یا نہیں۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ اس کارخانہ قدرت میں جو کچھ ہم روزمرّہ دیکھ رہے ہیں اوراس کا جو نظام ہم سمجھ چکے ہیں۔ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ خدائے قدیر سب کچھ کرسکتا ہے۔ مگر اس کے افعال اس نظام سے باہر نہیں ہیں۔ اگر کوئی بات قرآن وصحیح حدیث میں اس کے برخلاف وارد ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی اور ظاہری معنی نہ لئے جائیں گے۔

ان کے مقابلہ میں دوسرا فریق ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم مقدورات باری کا احاطہ نہیں کرسکتے اور نہ قوانین قدرت پر ہمیں پوری اطلاع ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ نظام قدرت کے سمجھنے کا دعویٰ تو اس صورت میں کریں کہ اس کا اجرا ہمارے ہاتھ میں ہو''خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (نساء:۲۸)''(انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے) ہماری بنا ہے اور''وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ:۲۵۵)''(خدا کے علم میں کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ مگر اسی قدر جتنا وہ چاہے) ہماری بساط جب قدسیان درگاہ''سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (بقرہ:۳۲)''خداوند تو پاک ہے، ہمیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھا دیا کچھ بھی معلوم نہیں۔ بے شک تو ہی علیم (کل) اور

[1] ''مُقَدِّمَةٌ بِکَسْرِ الدَّالِ الْمَشَدَّدَةِ وَبِفَتْحِهَا اَیْضًا (ملا جلال الدین ومیر زاهد) وَقَالَ الزَّمَخْشَرِیُّ فِی الْفَائِقِ الْمُقَدِّمَةُ الْجَمَاعَةُ الَّتِیْ تَتَقَدَّمُ الْجَیْشَ مِنْ قَدَّمَ بِمَعْنٰی تَقَدَّمَ وَاسْتُعِیْرَتْ لِاَوَّلِ کُلِّ شَیْءٍ فَقِیْلَ مِنْهُ مُقَدَّمَةُ الْکِتَابِ وَمُقَدَّمَةُ الْکَلَامِ وَفَتْحُ الدَّالِ خَلْفٌ (ص۲۰)''

حکیم (مطلق) ہے) پکار اٹھے تو ہم کون ہیں کہ اس کی حکمتوں کے احاطہ کا دعویٰ کرسکیں۔ خواجہ حافظ صاحب اسی معنی میں فرماتے ہیں:

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمّا را

مرزا قادیانی دعویٰ مسیحیت سے پہلے تو اس دوسرے فریق کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ ان کی کتاب ''سرمہ چشم آریہ'' کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ لیکن جب مسیحیت کا دعویٰ کرنے کی سوجھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ورفع سماوی رستے میں حائل نظر آئی تو پڑی ہموار کرنے کے لئے جھٹ پہلے فریق کے ساتھ ہوگئے:

معشوق ما بمذہب ہر کس برابر است با ماشراب خورد وبزاہد نماز کرد

چنانچہ مرزا قادیانی اپنی بنیادی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' میں فرماتے ہیں ''ماسوا اس کے اور کئی طریق سے ان پرانے خیالات پر سخت سخت اعتراض عقل کے وارد ہوتے ہیں۔ ازانجملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ نیا اور پرانا فلسفہ بالاتفاق اس بات کو محال ثابت کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنے اس جسم خاکی کے ساتھ کرۂ زمہریر تک بھی پہنچ سکے۔''

(ازالہ اوہام ص۴۷، خزائن ج۳ ص۱۲۶)

حالانکہ جناب مرزا قادیانی آنجہانی دعویٰ مسیحیت سے پہلے سالہا سال تک عیسیٰ علیہ السلام کے نزول آسمانی کے برابر قائل رہے اور اپنی تصانیف میں جب کہ آپ کو الہام کا بھی دعویٰ تھا۔ اس کی تصریح کرتے رہے۔ چنانچہ ''براہین احمدیہ'' میں فرماتے ہیں: ''اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق واقطار میں پھیل جائے گا۔'' (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۹۹ حاشیہ خزائن ج۱ ص۵۹۳)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع سماوی اور آمد ثانی قرآن وحدیث کے رو سے محال وغلط ثابت نہیں ہوئی، بلکہ اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھنے کے لئے زمین صاف کی ہے۔

ہدایت: اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں ایک ایسا امر ودیعت کر رکھا ہے جو اسے ہر امر کی لمّ (کیوں؟) اور کیف (کس طرح؟) کی نسبت سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ سوال دو طرح پر ہوتا ہے۔ اوّل استفساراً جس کو دوسرے لفظوں میں اطمینان قلب کے لئے کہنا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے احیاء موتیٰ کی کیفیت کی

نسبت یہ سوال کیا تھا: ’’رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (بقرہ:۲۶۰) ‘‘ خداوند! مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردوں کو جلا کھڑا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا؟ (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے) کہا: کیونکہ نہیں! لیکن اس لئے دریافت کرتا ہوں کہ میرے دل کو (عینی شہادت سے) اطمینان ہو جائے۔

اسی لئے امام بخاری علیہ رحمہ اللہ الباری نے اس آیت کو اپنی صحیح میں ایمان کے کم وزیادہ ہونے کی دلیل میں پیش کیا ہے۔

دوم: اس طرح کہ جس امر کی بابت سوال ہے اس کی نسبت دل غبار شبہات سے مکدّر رہے۔ جیسا کہ منکرین حشر اجساد قیامت کی نسبت استبعادی سوال کرتے ہیں: ’’قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ (یٰس:۷۸) ‘‘ یعنی وہ (کافر) انسان کہتا ہے کہ ان ہڈیوں کو ان کے بوسیدہ ہونے پر کون زندہ کرے گا۔

سو پہلی صورت تو مدارج ایمانیہ میں سے ہے اور دوسری کفر وضلالت۔

ارشاد: چونکہ معجزہ اور کرامت کی نسبت ایک زمانہ وساوس میں قصور علم وفتور ایمان کے سبب مبتلا ہو رہا ہے۔ کوئی تو پہلی صورت میں زیادت علم اور جواب منکرین کے لئے تحقیقات میں لگا ہے اور کوئی دوسری صورت میں شبہات میں پھنس کر انکار پر مصر ہے۔ کوتاہ اندیش انسان، خدا کی قدرت کے ناپیدا کنار سمندر کو چلوؤں سے ماپنا چاہتا ہے۔

اور ’’ایاز قدر خود بشناس‘‘ کی نصیحت کو سامنے نہیں رکھتا۔ اس لئے خاکسار نے مناسب جانا کہ بقدر اس وسعت وہمت کے جو مجھے خداوند تعالیٰ نے عطاء کی ہے، جہالت وغلط فہمی کے پردے کو اٹھا کر کشف حقیقت کر دوں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ!

سو معلوم ہو کہ فلاسفہ کی طرف سے جو اعتراض تمام مادی وفعلی خوارق عادات پر آسکتا ہے۔ اس کی بنا علّت ومعلول، سبب ومسبّب اور خواص اشیاء کے مسئلہ پر ہے جو فلسفی خرق عادت کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کارخانہ قدرت تمام کا تمام سلسلۂ علت ومعلول۔ سبب ومسبب، تأثیر وتأثر سے وابستہ ہے، آگ جلاتی ہے، مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، پانی تر کرتا ہے، کوئی چیز بغیر علّت وسبب کے وجود میں نہیں آسکتی اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ علت تامہ موجود ہو اور معلول نہ پایا جائے اور معجزہ اور کرامت کے مان لینے سے یہ لازم آتا ہے کہ

(۱) کوئی چیز بغیر سبب وعلّت (معتادہ) کے وجود میں آ گئی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بلا باپ۔ (۲) یا اس کی ماہیت بدل گئی۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن گیا یا غیر علت علت بن گئی۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو اس پتھر سے پانی پھوٹ پڑا۔ (۳) یا یہ کہ کسی چیز کی خاصیت موجود ہوتے، وہ اپنے فعل سے بیکار رہ گئی۔ مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جلتی آگ میں ڈالے گئے، لیکن جلے نہیں۔ وغیرہ ذلک!

پس یہی ایک اصولی وجامع اعتراض ہے جو تمام فعلی ومادّی معجزات وکرامات پر وارد ہوسکتا ہے اور جس کے حل ہونے پر اس کا حل موقوف ہے۔

حل: خدائے قدیر نے نظام عالم ایسا مضبوط بنایا ہے کہ ہم اسے توڑ نہیں سکتے اور نہ اس نے اشیاء میں ایسے خواص رکھے ہیں کہ وہ ان سے منفک نہیں کئے جاسکتے۔ لیکن یہ تو اسی نظام میں سے ہے کہ اس نے ایک چیز کے مقابلہ میں دوسری اس کی ضد بنائی ہے جو پہلی کے اثر کو باطل کر دیتی ہے اور یہ اضداد کچھ تو ہمارے علم میں آ گئی ہیں اور جو علم میں نہیں آئیں، وہ بہت زیادہ ہیں اور کسی شئے کی جو علت ہمارے علم میں آ چکی ہے ضرور نہیں کہ کارخانہ قدرت میں اس کی وہی علت ہو اور اس کے علاوہ دیگر کوئی نہ ہو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ہو۔ پس اتنے ناقص علم کی بنا پر سلسلۂ کائنات کے احاطہ کا دعویٰ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

حقیقت میں سلسلۂ علت ومعلول اور سبب ومسبب ایک ایسا پیچیدہ گورکھ دھندا ہے کہ اس کی پیچیدگیوں کو کھولنا نہایت ہی دشوار ہے۔ کیونکہ جو کچھ انسان کے علم میں آیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اور جو اس سے پوشیدہ ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں[۱]۔ پس محدود سے بے حد پر رائے لگانی درست نہیں:

اے گرفتار سبب از مسبب غافلی ‏ ‏ ‏ سوئے ایں روتاب، زاں سومائلی

[۱] مولانا شبلی مرحوم الکلام میں لکھتے ہیں: ''۱۸۹۱ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے ایک جلسہ میں پروفیسر لودج نے جو بہت بڑا ریاضی دان ہے۔ ایک لیکچر دیا اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا کہ: ''اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مادی اور روحانی عالم میں اب تک جو حد فاصل تھی وہ ٹوٹ جائے۔'' جس طرح اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اس طریقہ سے ثابت ہوجائے گا کہ ممکنات کی کچھ انتہا نہیں اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں۔ وہ بمقابلہ ان چیزوں کے جو ہم کو معلوم نہیں ہیں کچھ بھی نسبت نہیں رکھتا۔'' (الکلام حصہ دوم ص۱۲۴)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب بنام ’’تہافۃ الفلاسفہ‘‘ لکھی ہے۔ اس میں اصولی طور پر بقدر ضرورت فلسفیوں کے تمام علوم کا ذکر کر کے ان میں سے چار مسئلے مخالف اسلام قرار دیئے ہیں۔ ایک یہ ہے، جس کا ذکر ہم علت ومعلول یا سبب ومسبب کے نام سے کررہے ہیں۔ چنانچہ امام ممدوح فرماتے ہیں: ’’وَاِنَّمَا نُخَالِفُهُمْ مِنْ جُمْلَةِ هٰذِهِ الْعُلُوْمِ فِیْ اَرْبَعَةِ مَسَائِلَ (اَلْاُوْلٰی) حُكْمُهُمْ بِاَنَّ هٰذَا الْاِقْتِرَانَ اَلْمُشَاهَدَ فِی الْوُجُوْدِ بَیْنَ الْاَسْبَابِ وَالْمُسَبِّبَاتِ. اِقْتِرَانٌ تُلَازِمُ بِالضُّرُوْرَةِ فَلَیْسَ فِی الْمَقْدُوْرِ وَلَا فِی الْاِمْكَانِ اِیْجَادُ السَّبَبِ دُوْنَ الْمُسَبِّبِ وَلَا وَجُوْدَ الْمُسَبِّبِ دُوْنَ السَّبَبِ وَاَثَرُ هٰذَا الْاِخْتِلَافِ یَظْهَرُ فِیْ جَمِیْعِ الطَّبِیْعِیَّاتِ (ص۶۴)‘‘ ہم ان (فلسفیوں) سے ان علوم میں سے صرف چار مسائل میں مخالفت کرتے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اقتران جو اسباب ومسببات میں دیکھا جاتا ہے ضروری ولازمی ہے۔ پس ممکن نہیں کہ کوئی سبب بغیر مسبب کے موجود ہو یا کوئی مسبب بغیر سبب کے پایا جائے اور اس اختلاف کا اثر جمیع طبعیات میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہر چہار اختلافی مسائل کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ’’وَیَلْزِمُ النِّزَاعَ فِی الْاُوْلٰی مِنْ حَیْثُ اِنَّهٗ یَنْتَفِیْ عَلَیْهَا اِثْبَاتُ الْمُعْجِزَاتِ الْخَارِقَةِ لِلْعَادَةِ مِنْ قَلْبِ الْعَصَا ثُعْبَانًا وَّاَحْیَاءِ الْمَوْتٰی وَشَقِّ الْقَمَرِ وَمَنْ جَعَلَ مَجَارِی الْعَادَاتِ لَازِمَةً لَزُوْمًا ضَرُوْرِیًّا اَحَالَ جَمِیْعَ ذٰلِكَ وَاَوَّلُوْا مَا فِی الْقُرْآنِ مِنْ اِحْیَاءِ الْمَوْتٰی وَقَالُوْا اَرَادَ بِهٖ اِزَالَةَ مَوْتِ الْجَهْلِ بِحَیَاتِ الْعِلْمِ وَاَوَّلُوْا تَلَقُّفَ الْعَصَا لِسِحْرِ السَّحَرَةِ بِاِبْطَالِ الْحُجَّةِ الْاِلٰهِیَّةِ الظَّاهِرَةِ عَلٰی یَدِ مُوْسٰی علیہ السلام شُبُهَاتِ الْمُنْكِرِیْنَ وَاَمَّا شَقُّ الْقَمَرِ فَرُبَمَا اَنْكَرُوْا وُجُوْدَهٗ وَزَعَمُوْا اَنَّهٗ لَمْ یَتَوَاتَر (ص۶۵)‘‘

پہلے مسئلہ سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی بناء پر معجزات کا اثبات نہیں ہوسکتا جو عادت کے خلاف ہوتے ہیں، یعنی عصا کا سانپ بن جانا اور مردوں کا زندہ ہوجانا اور چاند کا پھٹ جانا اور جو ان امور عادیہ کو ضروری ولازم گردانتے ہیں۔ وہ ان سب کو محال جانتے ہیں اور قرآن شریف میں مردوں کے زندہ ہونے کی بابت جو کچھ وارد ہوا ہے۔ اس کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد جہالت کی موت کو علم کی زندگی سے زائل کرنا مراد ہے اور جادوگروں کے جادو کو (موسیٰ علیہ السلام کے) سونٹے کے نگل جانے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ

ہے کہ خدا تعالیٰ کی حجت نے جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئی۔ منکرین کے شبہات کو باطل کر دیا باقی رہا۔ شق القمر سو کبھی تو اس کا انکار ہی کر دیتے ہیں کہ یہ خبر متواتر نہیں ہے۔

علمائے اسلام نے فلسفیوں کے اس اعتراض کے جواب میں دو طریق اختیار کئے ہیں:

طریق اوّل: کا بیان یہ ہے کہ اسلام نے تمام مسببات ومعلولات کی حقیقی علت ارادۂ خداوندی کو قرار دیا ہے اور تمام عالم کو اس کے امر تکوینی کا محل تصرف اور مظہر قدرت گردانا ہے اور بغیر اس کے کسی سبب وعلت میں قدرت مؤثرہ تسلیم نہیں کی۔ چنانچہ فرمایا: ’’اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (اعراف:۵۴)‘‘ یعنی خلق وامر صرف ذات باری کا خاصہ ہے۔ وہ رب العالمین بہت برکت وعظمت والا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے: ’’اِحْتَجَّ اَصْحَابُنَا بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ عَلٰی اَنَّہٗ لَا مُوْجِدَ وَلَا مُؤْثِرَ اِلَّا اللّٰہُ (تفسیر کبیر ج۴ ص۲۳۹)‘‘ ہمارے اصحاب (اہل سنت) نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ خدا کے سوائے کوئی مؤثر وموجد نہیں ہے۔

اسی کے مطابق امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے:

(مسئلہ۱۷) ’’اَلْاِقْتِرَانُ بَیْنَ مَا یُعْتَقَدُ فِی الْعَادَۃِ سَبَبًا وَمَا یُعْتَقَدُ مُسَبَّبًا لَیْسَ ضُرُوْرِیًّا عِنْدَنَا بَلْ کُلُّ شَیْئَیْنِ لَیْسَ ھٰذَا ذَاکَ وَلَا ذَاکَ ھٰذَا وَلَا اِثْبَاتُ اَحَدِھِمَا مُتَضَمِّنٌ لِاِثْبَاتِ الْاٰخَرِ وَلَا نَفْیُہٗ مُتَضَمِّنٌ لِنَفْیِ الْاٰخَرِ فَلَیْسَ مِنْ ضُرُوْرَۃِ وُجُوْدِ اَحَدِھِمَا وُجُوْدُ الْاٰخَرِ وَلَا مِنْ ضُرُوْرَۃِ عَدَمِ اَحَدِھِمَا عَدَمُ الْاٰخَرِ (تھافۃ الفلاسفہ ص۶۵)‘‘ جس چیز کو عادت میں سبب مانا جاتا ہے اور جس کو سبب سمجھا جاتا ہے، ہمارے نزدیک ان میں اقتران ضروری نہیں۔ بلکہ ہر دو میں سے نہ یہ وہ ہے اور نہ وہ یہ (یعنی حقیقت میں نہ تو مسبب سبب ہے اور نہ مسبب اس کا مسبب) اور نہ ان میں سے ایک کا اثبات دوسرے کے اثبات کا متضمن ہے۔ پس ایک کے وجود سے دوسرے کا وجود ضروری نہیں اور نہ ایک کے عدم سے دوسرے کا عدم ضروری ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس امر کو بہت تفصیل سے مع مثالوں کے بیان کیا ہے جو بخوف طوالت ہم درج نہیں کر سکتے۔

اسی طرح حضرت حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ میں کہا ہے:

’’وَالْقَوْلُ بِالْمُعْجِزَاتِ يَتَوَقَّفُ عَلٰى اِنْكَارِ اللُّزُوْمِ الْعَقْلِيِّ بَيْنَ الْاَسْبَابِ وَالْمُسَبِّبَاتِ (حجة الله البالغه ج ۱ ص ۹) ‘‘اور معجزات کا اقرار، اسباب ومسببات میں لزوم عقلی کے انکار پر موقوف ہے۔

حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اسباب ومسببات میں اقتران بطور تلازم نہیں، بلکہ بطور عادت ہے۔ جس کا خرق وخلاف ممکن وجائز ہے۔ لیکن ہر امر کے لئے ارادۂ الٰہی شرط ہے۔

دوسرے طریق کا بیان اس طرح ہے کہ معجزات وکرامات اور خوارق عادات کے بھی اسباب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مخفی ہوتے ہیں اور عام انسانی رسائی سے بالا ہوتے ہیں۔ کیونکہ عجائبات قدرت کی کوئی حد وانتہاء نہیں اور وہ بالتمام ہمارے احاطہ علم میں ہیں بھی نہیں۔ پس اگر ہم کو اپنے قصور علم کے سبب کسی امر کی علت معلوم نہیں ہوئی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعہ میں بھی اس کی علت کوئی نہیں۔ کیونکہ عدم علت اور عدم علم بالعلت میں فرق ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق پر بھی جواب دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ’’(اَمَّا الثَّانِیْ) فَھُوَ اَنْ نَقُوْلُ ذٰلِکَ يَكُوْنُ بِاَسْبَابٍ وَلٰكِنْ لَيْسَ مِنْ شَرْطِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ السَّبَبُ هُوَ الْمَعْهُوْدُ بَلْ فِیْ خَزَانَةِ الْمَقْدُوْرَاتِ عَجَائِبُ وَغَرَائِبُ لَمْ يُطَّلَعْ عَلَيْهَا، يُنْكِرُهَا مَنْ يَّظُنُّ اَنْ لَّا وُجُوْدَ اِلَّا لِمَا شَاهَدَهٗ كَمَا يُنْكِرُ طَائِفَةُ السِّحْرَ وَالتَّعَاجِيْبِيَّاتِ وَالطَّلِسْمَاتِ وَالْمُعْجِزَاتِ وَالْكَرَامَاتِ وَهِیَ ثَابِتَةٌ بِالْاِتِّفَاقِ بِاَسْبَابٍ غَرِيْبَةٍ لَايُطَّلَعُ عَلَيْهَا بَلْ لَّوْلَمْ يَرَالْاِنْسَانُ الْمَقْنَاطِيْسَ وَجَذْبَهٗ لِلْحَدِيْدَ وَحُكِیَ لَهٗ ذٰلِكَ لَااِسْتَنْكَرَهٗ وَقَالَ لَا يُتَصَوَّرُ جَذْبُ الْحَدِيْدِ اِلَّا بِخَيْطٍ يُشَدُّ عَلَيْهِ وَيُجْذَبُ فَاِنَّهُ الْمُشَاهَدُ فِی الْحِسِّ حَتّٰى اِذَا شَاهَدَهٗ تَعَجَّبَ مِنْهُ وَعَلِمَ اَنَّهٗ قَاصِرٌ عَنِ الْاِحَاطَةِ بِعَجَائِبِ الْقُدْرَةِ (تهافة الفلاسفة ص ۸۸)‘‘

دوسرے طریق کا بیان اس طرح ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اس کے اسباب تو ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اسباب وہی ہوں جو ہمیں معلوم ہیں بلکہ الٰہی خزانوں میں ایسے ایسے عجائبات بھی ہیں۔ جن پر کسی کو اطلاع نہیں۔ ان امور کا انکار وہی کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ صرف وہی کچھ ہوسکتا ہے جو میرے مشاہدے میں آجائے۔ جس طرح کہ بعض لوگ سحر (جادو) اور اعجوبہ نمائی اور طلسمات اور معجزات اور کرامات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان سب کا ہونا بالاتفاق ایسے نادر ومخفی اسباب سے ثابت ہے جن پر عام طور پر اطلاع نہیں۔ بلکہ

اگر کسی شخص نے کبھی سنگ مقناطیس کا لوہے کو کھینچنا نہ دیکھا ہو اور اس کے پاس اس بات کا ذکر کیا جائے تو وہ ضرور انکار کرے گا اور کہے گا کہ لوے کا کھینچا جانا ممکن نہیں۔ مگر اس صورت میں کہ اس سے ڈورا باندھا جائے اور اسے کھینچا جائے۔ کیونکہ مشاہدے میں یہی آیا ہے، حتیٰ کہ جب وہ اس امر کا مشاہدہ کر لے تو اس سے حیران رہ جائے گا اور سمجھ لے گا کہ میں عجائبات قدرت کے احاطہ کرنے سے قاصر و عاجز ہوں۔

اسی طرح علامہ خواجہ زادہ نے بھی اپنی کتاب ’’تہافۃ الخلافۃ‘‘ کی فصل ہشتم میں بحث طبعیات میں اعجوبہ نمائیوں اور اسرار قدرت کی بعض مثالیں جن کے اسباب مخفی یا باریک ہیں بیان کر کے لکھا ہے: ’’وَمَا اِنْکَارُ هٰذَا اِلَّا بِضِیْقِ الْحَوْصَلَةِ وَلْاُنْسِ بِالْمَوْجُوْدَاتِ الْغَالِبَةِ وَالذُّهُوْلِ عَنْ اَسْرَارِا لِلّٰهِ تَعَالٰى فِى الْخَلْقَةِ وَمَنْ اِسْتَقْرَأَ عَجَائِبَ الْعُلُوْمِ لَمْ یَسْتَبْعِدْ مِنْ قُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَا یُحْكٰى مِنْ مُعْجِزَاتِ الْاَنْبِیَآءِ علیہم السلام بِحَالٍ مِنَ الْاَحْوَالِ (ج دوم ص ۷۵)‘‘ اور معجزات کا انکار (ایمانی) حوصلہ کی تنگی اور اکثر موجودات سے مانوس ہونے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار سے غفلت و بے خبری کی وجہ سے اور جو کوئی علوم (عقلیہ) کے عجائبات کا استقراء کرے گا۔ وہ ان امور کو جو انبیاء علیہ السلام کے معجزات میں مروی ہیں، ہرگز ہرگز کسی حال میں بھی خدا کی قدرت سے بعید نہیں جانے گا۔

اسی طرح الشیخ الرئیس بوعلی سینا جو علوم عقلیہ میں اپنے بعد کے مشرقی علماء کے مسلّم پیشواء و امام ہیں۔ اپنی کتاب اشارات کے اخیر میں معجزات و خوارق عادات کے ذکر کے بعد بعنوان نصیحہ فرماتے ہیں: ’’اِیَّاكَ وَاَنْ تَكُوْنَ تُكَیُّسُكَ وَتَبَرُّءُكَ عَنِ الْعَامَّةِ هُوَ اَنْ تَبَرَّءَ مُنْكِرًا لِكُلِّ شَیْءٍ فَذٰلِكَ طَیْشٌ وَّعَجْزٌ وَلَیْسَ الْخَرْقُ فِیْ تَكْذِیْبِكَ مَالَمْ تَسْتَبِنْ لَكَ بَعْدَ جَلِیَّةٍ دُوْنَ الْخَرْقِ فِیْ تَصْدِیْقِكَ مَالَمْ تَقُمْ بَیْنَ یَدَیْكَ بَیِّنَةٌ بَلْ عَلَیْكَ الْاِعْتِصَامُ بِحَبْلِ التَّوَقُّفِ وَاِنْ اَزْعَجَكَ اِسْتِنْكَارُ مَایُوْعَاهُ سَمْعُكَ مَا لَمْ تَتَبَرْهَنْ اِسْتِحَالَتُهٗ[۱] لَكَ فَالصَّوَابُ اَنْ تَسْرَحَ اَمْثَالَ

۱؎ محال دو قسم پر ہے۔ عقلی و عادی۔ عقلی ممتنع ذاتی یعنی ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً اجتماع ضدین اور ارتفاع نقیضین اور شریک باری، لیکن عادی ممکن بالذات ہوتا ہے۔ اگر علل و اسباب موجبہ کے ساتھ خدا کا ارادہ منضم ہو گیا تو وہ صادر و حادث ہو گیا ورنہ نہیں ہوتا۔ مگر اپنی ذات میں ممکن ہی رہتا ہے۔

ذٰلِکَ اِلٰی بُقْعَةِ الْاِمْکَانِ مَالَمْ یَذُدْکَ عَنْهُ قَائِمُ الْبُرْهَانِ وَاعْلَمْ اَنَّ فِی الطَّبِیْعَةِ عَجَائِبُ وَلِلْقُوٰی الْعَالِیَةِ الْفَعَّالَةِ وَالْقُوٰی السَّافِلَةِ الْمُنْفَعِلَةِ اِجْتِمَاعَاتٌ عَلٰی غَرَائِب'' (شرح اشارات ج۲ص۱۴۳، مطبوعہ مصر)

(اے عقل مند!) تو اس امر سے پرہیز کر کہ عام لوگوں سے تیری ہوشیاری وبرأت کی امتیازی صورت یہ ہو کہ تو ہر امر سے انکاری بریت کرے۔ کیونکہ یہ طیش وعاجزی ہے اور تجھے جس امر کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی اس کی تکذیب کر دینا اس بات کی تصدیق کرنے سے کم (بے عقلی) نہیں ہے جس کی دلیل تیرے نزدیک قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ تجھ پر لازم ہے کہ تو توقف کی رسی سے اپنا بچاؤ کر لے۔ اگرچہ تجھے ان باتوں کا انکار جو تیرے کان میں پڑی ہیں پھسلا دے۔ جب تک کہ تجھے اس کا محال ہونا صاف طور پر واضح نہ ہو جائے۔ پس ٹھیک یہ ہے کہ تو ایسی باتوں کو امکان کے میدان میں لے جائے، جب تک کہ تجھے یقینی دلیل وہاں سے نہ روکے اور خوب جان رکھ کر طبیعت میں بڑے بڑے عجائبات ہیں اور اوپر کے اثر کرنے والے قوی اور نیچے کے اثر قبول کرنے والے قوی کے اجتماع میں بڑے بڑے نادر نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ ہم کو دو امر معلوم ہیں۔ اوّل معلوم کا وجود۔ دوم معلول کا بغیر علّت کے موجود نہ ہوسکنا۔ اگر معلوم نہیں تو صرف یہ کہ اس معلول کی علت کون سی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ساری علّتیں ہمارے علم میں نہیں آگئیں۔ بلکہ قدرت کے ہزارہا بلکہ بے شمار ایسے اسرار ہیں۔ جن کی علّتیں ہمارے احاطہ علم اور پرواز ادراک سے پرے ہیں۔ پس اس نقصان علم کے ساتھ کسی معلول کی علت کے معلوم نہ ہونے سے اس معلول کے وجود وقوع سے انکار کرنا اس اصول پر مبنی ہوگا کہ مجہول سے معلوم کا انکار ہوسکتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ استدلال کا صحیح طریق یہ ہے کہ معلوم سے مجہول کا علم حاصل کیا جائے نہ یہ کہ مجہول کی جہالت کی وجہ سے معلوم کا انکار کیا جائے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ آیت: ''وَأْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (بقرہ:۱۸۹)'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''تَفْسِیْرُهٗ اَنَّ الطَّرِیْقَ الْمُسْتَقِیْمَ الْمَعْلُوْمَ هُوَ اَنْ یُّسْتَدَلَ بِالْمَعْلُوْمِ عَلَی الْمَظْنُوْنِ فَاَمَّا الْاِسْتِدْلَالُ بِالْمَظْنُوْنِ عَلَی الْمَعْلُوْمِ فَذَاکَ عَکْسُ الْوَاجِبِ وَضِدُّ الْحَقِّ (تفسیر کبیر ج۲ ص۱۵۳)'' اس کی تفسیر یوں ہے کہ سیدھا اور معلوم طریق

استدلال یہ ہے کہ معلوم کے ذریعے مظنون کو معلوم کیا جائے اور مظنون سے معلوم کے انکار پر استدلال کرنا اس بات کا عکس ہے جو واجب ہے اور حق کی ضد ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس نازک مقام پر عدم العلم اور علم العدم میں فرق کرنا واجب ہے اور اسی کے ملحوظ نہ رکھنے سے لوگ غلطی کھاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ علت تامہ کا موجود نہ ہونا امر دیگر ہے اور اس کا ہمارے علم سے مخفی ہونا امر دیگر ہے[1]۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن مجید اپنے منکرین کی نسبت فرماتا ہے: ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ (یونس: ۳۹)'' یعنی ان منکرین نے اس شئے کو جھٹلایا جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہوا اور ابھی تک ان کو اس کی حقیقت یا انجام بھی معلوم نہیں ہوا۔

اسی طرح علامہ ابن رشد مغربی رحمۃ اللہ علیہ جن کو فلسفہ یونانی کے سمجھنے میں بے مثل مانا گیا ہے اور فرانس وغیرہ ممالک مغرب میں ان کی وفات کے صدیوں بعد تک بھی ان کی تحقیقات پر اضافہ کرنا منع خیال کیا جاتا رہا ''تھافۃ الفلاسفہ[2]'' میں فرماتے ہیں: ''اَمَّا الْكَلَامُ فِي الْمُعْجِزَاتِ فَلَيْسَ فِيْهِ لِلْقُدَمَاءِ مِنَ الْفَلَاسِفَةِ قَوْلٌ لِاَنَّ هٰذِهٖ كَانَتْ عِنْدَهُمْ مِنَ الْاَشْيَاءِ الَّتِيْ لَا يَجِبُ اَنْ يُّتَعَرَّضَ لِلْفَحْصِ عَنْهَا وَتُجْعَلَ مَسَائِلَ فَاِنَّهَا مَبَادِئُ الشَّرَائِعِ وَالْفَاحِصَ عَنْهَا وَالْمُشَكِّكُ فِيْهَا يَحْتَاجُ اِلٰى عُقُوْبَةٍ عِنْدَهُمْ (ص ۱۲۱)'' معجزات کی بابت تو یہ ہے کہ قدیم فلسفیوں کا (انکاری) قول ان کے متعلق کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ باتیں ان کے نزدیک ان چیزوں میں سے تھیں، جن کے احوال کی نسبت کرید و پڑتال ان کو مسائل (نظریہ) بنانے کے لئے واجب نہیں تھی۔ کیونکہ یہ شریعتوں کے ابتدائی (مسلمہ) امور ہیں اور میں بحث و کرید کرنے والا اور شک کرنے یا ڈالنے والا ان کے نزدیک سزا کا مستوجب ہے۔

[1] معجزات کے متعلق ان شاء اللہ! الگ رسالہ لکھوں گا جس میں زمانہ ماضی و زمانہ حال کے فلاسفروں کے اقوال سے امکان ثابت کیا جائے گا۔

[2] علامہ ابن رشد ۵۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے یہ کتاب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تہافتہ الفلاسفۃ'' کے مقابلہ میں لکھی ہے جس میں بعض مقامات پر طریق استدلال میں یا الزام خصم میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا ہے۔

پھر اس سے ذرا آگے فرماتے ہیں: ’’وَاَمَّا مَا حَکَاہُ فِیْ اِثْبَاتِ ذٰلِکَ مِنَ الْفَلَاسِفَۃِ فَھُوَ قَوْلٌ لَا اَعْلَمُ اَحَدًا قَالَ بِہٖ اِلَّا ابْنَ سِیْنَا (ص۱۲۲)‘‘ اور (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے) اثبات معجزات میں جو کچھ فلسفیوں سے نقل کیا ہے۔ سو وہ ایسی بات ہے جس کی بابت مجھے معلوم نہیں کہ ابن سینا کے سوائے کسی نے کہی ہو۔

اسی طرح اس سے چند صفحے آگے فرماتے ہیں: ’’وَلِذٰلِکَ لَا تَجِدُ اَحَدًا مِّنَ الْقُدَمَاءِ تَکَلَّمَ فِی الْمُعْجِزَاتِ مَعَ اِنْتِشَارِھَا وَظُھُوْرِھَا فِی الْعَالَمِ لِاَنَّھَا مَبَادِیُٔ تَثْبِیْتِ الشَّرَائِعِ وَالشَّرَائِعُ مَبَادِی الْفَضَائِلِ (ص۱۲۴، ۱۲۵)‘‘ اور اسی لئے تو قدیم فلسفیوں میں سے کسی کو بھی نہ پائے گا کہ اس نے معجزات میں (انکاری) کلام کیا ہو باوجود اس کے کہ معجزات کی اشاعت کا ظہور تمام عالم میں تھا۔ کیونکہ وہ سب شریعتوں کے ابتدائی امور (مسلمہ) ہیں اور شریعتیں (حصول) فضائل کے مبادی ہیں۔

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ قدیم حکماء معجزات کو مبادی مان کر ان میں خوض نہیں کرتے تھے۔ بلکہ منکر کو قابل سزا جانتے تھے۔ اس امر میں معقول ومنقول کی تطبیق کی روش الشیخ الرئیس بوعلی سینا نے نکالی ہے۔

علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا ہے وہ اصل مسئلہ یعنی امکان معجزہ میں نہیں۔ بلکہ طریق استدلال میں کیا ہے۔ جس کی بناء مذاق طبع پر ہے۔ کیونکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بہ سبب ایشائی ہونے کے ابن سینا کی روش پر تھے اور ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق فلسفہ بہ سبب یورپی (اسپینی) ہونے کے ابن سینا کے تابع نہ تھا بلکہ وہ خود بالاستقلال یورپ کا ابن سینا تھا۔

اسی طرح شرح مواقف جو علم کلام کی مشہور درسی کتاب ہے۔ اس میں سید شریف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’وَاَمَّا الْفَلَاسِفَۃُ فَقَالُوْا ھُوَ مَنِ اجْتَمَعَ فِیْہِ خَوَاصٌّ ثَلَاثٌ (اِحْدَاھَا) اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اِطِّلَاعٌ عَلَی الْمَغِیْبَاتِ (وَثَانِیْھَا) اَنْ یَّظْھَرَ مِنْہُ الْاَفْعَالُ الْخَارِقَۃُ لِلْعَادَۃِ تَکُوْنُ عَالَمُ الْعَنَاصِرِ مُطِیْعَۃً مُنْقَادَۃً لِتَصَرُّفَاتِہٖ انْقِیَادَ بَدَنِہٖ لِنَفْسِہٖ (وَثَالِثُھَا) اَنْ یَّرَی الْمَلَائِکَۃَ مُصَوَّرَۃً وَّیَسْمَعَ کَلَامَھُمْ وَحْیًا (شرح مواقف استنبول ج ثالث ص۱۷۴-۱۷۶)‘‘ فلسفیوں کے نزدیک نبی ورسول وہ ہے جس میں تین خواص جمع ہوں۔ (ایک) یہ کہ اسے غیب کی باتوں پر اطلاع ہو۔ (دوسرا)

یہ کہ اس سے ایسے افعال ظاہر ہوں کہ وہ عام عادت کے خلاف ہوں، اس وجہ سے عالم عناصر اس کے تصرفات کے لئے اس کا ایسا مطیع ومنقاد ہو جیسا کہ اس کا بدن اس کی روح کے تابع ہے (اور تیسرا) یہ کہ وہ (نبی ورسول) فرشتوں کو دیکھے اور بذریعہ وحی ان کا کلام سنے۔

علماء وحکمائے اسلام بھی انبیاء علیہم السلام میں ان ہر سہ امور کے قائل ہیں۔ قرآن مجید میں انبیاء کے بیانوں میں جابجا ان امور کا ذکر موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ فلسفیوں کے نزدیک نبوت کا حصول کسبی ہے اور ان امور عجیبہ کا ان میں پایا جانا ان کی ریاضت وتقدس کا نتیجہ ہے اور اسلامیوں کے نزدیک نبوت ایک وہبی چیز ہے۔ یعنی خدا کی بخشش سے حاصل ہوتی ہے۔ خدا اپنے علم وحکمت سے جسے چاہتا ہے، منصب نبوت کے لئے چن لیتا ہے اور اسے تقدس وپاک بازی کی حالت پر خاص حفاظت سے عصمت کہتے ہیں، قائم رکھتا ہے اور یہ امور عجیبہ ان کو بطور دلیل کے عطاء کرتا ہے۔ جن کا اظہار ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ بلکہ جب خدا چاہے اسے ظاہر کرے اور جب مصلحت نہ دیکھے نہ ظاہر کرے۔ ہر دو امر کے لئے آیت ذیل ملاحظہ ہو: ''قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (ابراهیم: ۱۱)'' ان (کفار) کو ان کے پیغمبروں نے کہا ہم تو تمہاری طرح بشر ہونے کے سواء اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (اسے رسول بنا کر) احسان کر دیتا ہے اور ہم میں تو یہ طاقت نہیں کہ (باختیار خود) خدا کے حکم کے بغیر کوئی نشان (معجزہ) لاسکیں۔

اس مضمون کی آیات اور بھی ہیں۔ لیکن ہم بنظر اختصار اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ نام کے معقولیوں کے پاس معجزات وکرامات کے انکار میں کوئی ایسی یقینی دلیل نہیں ہے کہ ہم اس پر اعتماد کر سکیں۔ بلکہ ہم تو یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ جس حد تک کہ ہر زمانہ میں اس کی ترقی ہوتی رہی ہے۔ خود فلسفیوں کے نزدیک بھی ہمیشہ ظنی رہا ہے۔ چہ جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مقابلہ میں ان کی تحقیقات ومعلومات وقواعد کو کوئی جگہ دے سکیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا علم خدا کی وحی کے سبب سے یقینی ہے اور ظنی کو یقینی پر ترجیح دینا درست نہیں۔

کیا آپ دیکھتے نہیں؟ کہ ہر قرن کے فلسفی اپنے متقدمین کی تغلیط کرتے اور ان کی تحقیقات پر مضحکہ اڑاتے رہے ہیں جو امور فلاسفہ متقدمین نے بڑی عرق ریزی اور غور وفکر

سے معلوم کئے تھے اور ان کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ میں اور کچھ عرصہ بعد بھی استاد کامل تسلیم کئے گئے تھے۔ وہ متاخرین کے نزدیک جہل ونادانی سے زیادہ قبیح القاب پاتے ہیں۔ مثلاً حکمائے یونان نے آگ، ہوا، پانی اور مٹی کو عنصر (بسیط) قرار دیا تھا اور اسی اصل پر اتنے اصول وفروع مرکب ثابت کر کے اس پرانی عمارت کو بالکل منہدم کر دیا اور بمصداق:

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

اصول جدیدہ وضع کئے۔ اکثر فلاسفہ پیشین فلک کو متحرک اور تعداد میں نو اور زمین کو ساکن جانتے تھے۔ حال کے نازک خیال سرے سے وجود آسمان ہی سے منکر اور حرکت ارضی کے قائل ہیں۔ ان کی تحقیق ایسی لغو ہے کہ کوئی ان میں سے قدم عالم کا قائل ہے اور کوئی وجود واجب والوجود ہی سے منکر ہے۔ کوئی نبوت کو نہیں مانتا اور کوئی قیامت پر یقین نہیں لاتا۔ اس قدر اختلاف وبداعتقادی کے ہوتے، کس کے مقلد بنو گے اور کس کو جاہل قرار دو گے؟

جب ان کی تحقیق مسلّم ہے تو قدم عالم کا اقرار اور نبوّت سے انکار کیوں نہیں کرتے؟ پس جب ان امور مذکورہ میں ان کو پیشواء نہیں جانتے تو تعلیم الٰہی کی تصدیق کے لئے ان کی آرائے فاسدہ اور اہوائے کاسدہ کی طرف کیوں رجوع کرتے ہو؟

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مرضیات ونامرضیات کی بابت انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل کی ہے۔ فلاسفہ کو اس کی اطلاع نہیں کی بلکہ فلاسفہ پر بھی اتباع اور اطاعت انبیاء فرض کی ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل ہونے کا ایمان ہے تو ان امور کا جو انبیاء علیہم السلام نے بوحی الٰہی تعلیم کئے ہیں۔ فلسفیوں کے اوہام باطلہ اور مغالطات عاطلہ کی بناپر کیوں انکار کرتے ہو؟ کیا انبیاء علیہم السلام کی وحی پر ان کی تحقیق کو جو حقیقت میں ظن ہے۔ ترجیح ہے؟ کہ اندھا دھندان کے قدموں پر دوڑے جاتے اور آثار نبویہ کو چھوڑے جاتے ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس فرقہ کے احوال سے قرآن شریف میں اکثر مقامات پر خبر دی ہے اور ان کے اہواء کو ضلالت اور بے علمی اور ظن اور خرص (اٹکل پچو تک لگانا) فرمایا ہے اور صرف وحی کو حکم مقرر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ انعام میں فرمایا: ''اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَماً وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام:۱۱۴)'' (اے پیغمبر! ان سے کہو) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو منصف قرار دوں۔ حالانکہ وہی تو ہے، جس نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) مفصل کر کے نازل کی ہے۔

اس کے بعد یوں فرمایا: ''وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (انعام: ۱۱۶)'' (اے پیغمبر!) اگر تو نے دنیا کے اکثر لوگوں کی اطاعت کی تو وہ تجھے خدا کی راہ سے بہکاویں گے۔ وہ تو صرف ظن کے پیچھے لگے ہیں اور ان کے پاس سوائے اٹکل کے کچھ نہیں۔

حقیقت میں سیل اسلامی کے سامنے ان کے اوہام باطلہ ایک تنکے کی بھی حقیقت نہیں رکھتے اور ایسے ہی ان کی تاویلات رکیکہ۔

۱...... ''رفع الی السمآء'' کے مقابلہ میں کشش ثقل کے ہزار عذر پیش کرتے ہیں۔ مگر جب انسان ضعیف البنیان اپنے ناتواں بازو سے ایک پتھر اوپر کو پھینک دے تو ہرگز انکار نہیں کرتے۔ کیا یہ رمی حجر (پتھر پھینکنا) اس امر کی بے حد طاقت کو مغلوب کر لیتا ہے تو کیا وہ عزیز ومتقدر مالک الملک، حضرت مسیح روح اللہ وحضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کے مبارک جسموں سمیت نہیں اٹھا سکتا؟ ''بَلٰی وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ قَدِیْر وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ'' (کیوں نہیں وہ ضرور ہر شئے پر قادر ہے اور میں اس بات پر منجملہ گواہوں کے ہوں)

۲...... پرندے باوجود کثیف الجسم[۱] ہونے کے جوّ سمآء میں اڑتے پھرتے آسمان کی طرف چڑھتے[۲] اور پھر اترتے ہیں۔ مگر یہ متعقل اتنا بھی تو نہیں سمجھتے کہ جس قدر ذوالجلال نے پرندوں کو یہ جناح (پر) دیئے ہیں اور یہ طاقت طیران (پرواز) بخشی ہے۔ اس نے فرشتوں کو بھی ''اُوْلِیْ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ'' (دودو، تین تین اور چار چار پر دیئے ہیں) تو ان کے نزول وصعود کو کون مانع ہے اور جس طرح وہ پرندوں کو اوپر جانے کی طاقت دینے پر قادر ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اوپر لے جانے پر قادر ہے[۳]۔

۱؎ مرزا قادیانی نے اپنے ازالہ اوہام میں معراج جسمانی کے انکار میں لکھا ہے کہ ''سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا۔'' (ازالہ اوہام ص۴۷، خزائن ج۳ حاشیہ ص۱۲۶) ''اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ سُوْءِ الْاَدَبِ'' (سعادت)

۲؎ اکمل صاحب قادیانی نے یہاں پر عجب گل افشانی کی ہے۔ کہتے ہیں کیا کوئی پرند آسمان پر موجود ہے؟ (ص۶) سبحان اللہ سخن فہمی عالم قادیانی معلوم شد (سعادت)

۳؎ اکمل صاحب اس پر سوال کرتے ہیں ''پرندوں کے اوپر جانے کو مسیح علیہ السلام کے صعود سے کیا نسبت ہے۔'' (ص۶) جواب: قرآن شریف میں سورہ نحل میں یہ امر (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۳...... کرۂ ہوائی سے باہر جا کر ہوا کے بغیر زندہ رہنے کو محال سمجھتے ہیں اور ’’اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِکُمْ[1]‘‘ (جب کہ تم اپنی اپنی ماں کے پیٹ میں جنین تھے) پر غور کر کے نہیں سمجھتے کہ جنین کا منہ بند ہوتا ہے اور اسے خوراک بطریق ناف پہنچتی ہے۔

۴...... ہزارہا حیوان بے مادر و پدر پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ متعقل اپنے ہی بطون (پیٹوں) سے خارج ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کا بے پدر پیدا ہونا ان کی باریک عقل میں نہیں سما سکتا۔ چنانچہ فرمایا: ’’سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ:۵۳)‘‘ ہم ان کو اپنے نشانات آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفسوں میں بھی ضرور دکھاتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ان کو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ برحق ہے؟

طریق ثبوت معجزات

انسان یا تو اپنے مشاہدہ و تجربہ یا استدلال سے علم حاصل کرتا ہے یا کسی مخبر صادق کی خبر سے۔ پہلی صورت کی نسبت یہ تفصیل بھی بالضرور یاد رکھنی ہوگی کہ بعض مشاہدات ومجربات مختص بمردمان ہوتے ہیں کہ خاص خاص اشخاص ان کو دیکھ کر فائدہ حاصل کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) خدائے تعالیٰ کی وسعت قدرت کی مثالوں کے سلسلہ میں مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ پہلے ’’اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر‘‘ کہا ہے۔ پھر ماں کے پیٹ سے بچے کا دل، آنکھ، کان والا کر کے نکالنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد پرندوں کا بحکم خداﷻ آسمان میں اڑنا ذکر کیا۔ ہم نے بھی اسی مناسبت سے خدا کی قدرت کی وسعت کا ذکر کر کے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کی رفع آسمانی کا ممکن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ نمرود میں ’’رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ‘‘ کے بعد فرمایا: ’’فَاِنَّ اللّٰهَ یَأْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (البقرہ:۲۵۸)‘‘ کے لانے میں جو ربط ہے اسے سمجھو تو شہادت القرآن کا یہ مقام بھی سمجھ لوگے۔ فافہم!

[1] اس آیت کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ جنین کی پرورش کے لئے منہ کے سوائے ایک خاص صورت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کو آسمان پر اٹھانے کے لئے کرّۂ ہوائی سے آگے جانے کی کوئی خاص صورت بنا دی۔ اکمل صاحب اسے سمجھ نہیں سکے تو کہتے ہیں (اس آیت) کو کرّۂ ہوائی سے باہر جانا زندہ رہنے کی تائید میں پیش کرنا فضول ہے۔ (ص۶)
جواب: کرہ ہوائی کے اندر یا باہر ہونا ملحوظ نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا اپنے ارادہ کے پورا کرنے میں قادر مطلق وحکیم مطلق ہونا ملحوظ ہے، جو آپ سمجھ نہیں سکے۔ (سعادت)

اور بعض مختص بمکان ہوتے ہیں کہ ان حوادث کا وقوع خاص خاص مقامات پر ہوتا ہے اور بعض مختص بزمان ہوتے ہیں کہ ان کا وقوع ایک زمان خاص سے متعلق ہے۔ پس بنی آدم کے مشاہدات و مجربات آپس میں مساوی نہیں ہوسکتے۔

پھر یہ بھی کہ طبائع جو علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔ استعداد میں متفاوت ہیں اور یہ امر فلسفیوں میں مسلّم ہے۔ اس لئے ہر شخص کے کسی امر کو حاصل کرنے کی کیفیت اور اس کے ادراک کی حقیقت بھی یکساں نہیں۔ پس اگر کسی وقت کسی جگہ کوئی امر عجیب حادث ہو۔ جس پر ہمارا سابق علم حاوی نہ ہو تو اسے خارج از قانون قدرت کہہ کر ٹال نہیں دیں گے۔ بلکہ لازماً واقعہ کی تصدیق کریں گے۔ اگرچہ اس کی علّت وسبب ہمارے علم میں نہ آئے۔

ہاں! جن لوگوں نے اسے اپنے مشاہدے سے نہیں دیکھا۔ ان کے اعتبار کے لئے سچی خبر کی ضرورت ہے۔ جس طرح کہ ہم دوسری بن دیکھی چیزوں کو محض خبر سے مانتے ہیں اور باطل و بے ثبوت کی پیروی سے بچنے کے لئے اس کی صداقت کو بھی جانچتے ہیں۔ پس اسی طرح معجزات کی خبروں کو بھی ان کے مخبروں کی حیثیت سے پرکھیں گے۔ سو قرآن کی نسبت تو مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ قطعاً یقیناً کلام الٰہی ثابت ہو چکا ہے۔ جو معجزات یا عجائبات قدرت اس میں مذکور ہیں۔ وہ بلاتردد و تامّل اسی طرح ماننے پڑیں گے۔ جس طرح کہ قرآن منوائے۔ ورنہ معاذ اللہ کذب باری لازم آئے گا یا قرآن مجید کی صحّت وقطعیّت میں فرق آئے گا اور یہ دونوں باتیں داخل کفر ہیں۔

باقی رہے وہ معجزات جو احادیث میں وارد ہیں، ان کی نسبت بھی یہی قاعدہ جاری ہوگا کہ اگر وہ روایات صادق ومتقی اور حافظ وضابط راویوں کے متصل سلسلہ سے خدا کے پاک رسول ﷺ تک پہنچ جائیں تو ان کے ماننے میں بھی کلام نہیں ہوگا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت خدا تعالیٰ نے فرمایا: ''وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِتَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ (بقرہ:۱۴۳)'' اسی طرح ہم نے تم کو عادل امت بنایا کہ تم (دیگر) لوگوں پر گواہ بنو۔

''(وقال) کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰)'' (نیز فرمایا) تم بہترین امت ہو جو دیگر لوگوں کے لئے (بطور نمونہ) چنے گئے ہو۔

اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو حجۃ الوداع میں خطبۂ منیٰ میں مخاطب کر کے

فرمایا تھا: ’’لِیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ مِنْکُمْ (صحیح بخاری کتاب العلم) ‘‘تم جو اس وقت حاضر ہو ان کو جو تم میں سے حاضر نہیں ہیں یہ دین پہنچا دینا۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ نے تبلیغ دین کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بعد کی امت کے لئے وکیل ومبلغ قرار دیا ہے۔ لہٰذا سب اصحاب عادل وصادق ہیں اور واقعات میں بھی ایسا ہی پایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف عمداً غلط بات کو منسوب نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جس کسی لفظ میں ان کو تردد وشک ہو اس میں بھی پرہیز کرتے تھے اور ظاہر کر دیتے تھے کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا تھا یا یوں فرمایا تھا۔

تنبیہ

لہٰذا معجزات حدیثیہ بھی مثل قرآن شریف واجب الاعتقاد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معجزات وخوارق عادت کے ثبوت کے لئے مخبر صادق کی سخت ضرورت ہے۔ امکان معجزات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام ہر ممکن امر کو محض اس کے امکان کی بنا پر واقعہ کی صورت میں بھی منواتا ہے، نہیں بلکہ اس کے امکان کے بعد اس کے وقوع کے لئے اس خبر کا پرکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ سچی ہے یا کیسی؟ سچی ثابت ہو جانے پر اس کی تسلیم وتصدیق سے اپنے خیالات وقیاسات سے جن کی بنا قصور فہم یا عدم علم یا نقص علم پر ہے۔ ان کا انکار نہ تو عقلاً صحیح ہے اور نہ شرعاً درست ہے۔ واللہ الهادی!

مقدمہ ثانیہ در تشریح سنّت اللہ

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم اس کارخانہ قدرت میں ایک خاص نظام دیکھتے ہیں۔ جس کا نام سنۃ اللہ بھی ہے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ’’وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (فتح: ۲۳) ‘‘یعنی خدا کی سنت (روش) بدلا نہیں کرتی۔ پس معجزہ وکرامت جن کی صورت سنت اللہ کے خلاف ہے، ممکن نہیں۔

اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل نظام قدرت کو ملحوظ رکھ کر عقلی جواب۔ دوم یہ کہ آیت پیش کردہ کا مطلب وہ نہیں جو منکرین معجزہ وکرامت نے سمجھا۔ پہلی صورت کے لحاظ سے کچھ جواب تو پہلے مقدمہ میں گزر چکا اور کچھ اس جگہ بھی بحسب ضرورت مقام لکھا جاتا ہے۔ سو معلوم ہو کہ کسی قاعدہ کو سنت اللہ یا خدا کا قاعدہ قرار دینے کے دو طریقے ہیں۔

ایک نقلی دوسرا عقلی۔ نقلی یہ کہ قرآن شریف یا حدیث صحیح میں اسے سنت اللہ کہا ہو اور عقلی یہ کہ ہم اس کارخانہ قدرت کے انتظام کے سلسلہ پر نظر کر کے کسی امر کو سنت اللہ قرار دے لیں۔ اسے علم منطق میں استقراء کہتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں: تام اور ناقص۔ تام اسے کہتے ہیں کہ تمام ہم قسم جزئیات پر نظریں اور ان میں ایک مشترک نظام پائیں اور اسے قاعدہ قرار دیں۔ ناقص یہ ہے کہ چند جزئیات پر نظر کر کے ایک امر کو قاعدہ قرار دیں۔ استقرائے تام جو عقلاً سب جزئیات کا حصر کرے، مفید یقین ہوتا ہے اور استقرائے ناقص مفید ظن ہوتا ہے۔

(مستفاد از ملا مبین بحث استقراء ج دوم ص ۲۴۹، نیز شرح مطالع مطبوعہ استنبول ص ۳۴۸ بحث استقراء)

کیونکہ تمام جزئیات کا حصر نہیں ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دیگر جزئیات جو ہمارے علم میں نہیں آئیں۔ اس نظام وقاعدہ کے ماتحت نہ ہوں جو ہم نے سمجھ رکھا ہے۔ پس اس قرارداد کو قاعدہ کہنا درست نہیں۔ کیونکہ قاعدہ وہ ہے جو جمیع جزئیات پر منطق ہو۔ لہٰذا وہ ہمارا سمجھا ہوا قاعدہ سنۃ اللہ نہ رہا۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ جس امر کو ہم نے سنۃ اللہ قرار دیا ہے۔ آیا اس کے متعلق خدا نے یا اس کے رسول ﷺ نے کہا ہے کہ یہ امر خدا کی سنت ہے؟ یا جو قاعدہ ہم نے اپنے استقراء سے بنایا ہے، وہ سب جزیات کو دیکھ کر بھال کر بنایا ہے؟ اور ہم اس کی مخلوقات کا احاطہ کر چکے ہیں؟ اور اس کی قدرت کے اسرار کو اور اس کے نظام کو کامل طور پر سمجھ چکے ہیں۔[2]

قرآن وحدیث کا واقف اور نظام قدرت پر صحیح نظر رکھنے والا بے شک گردن جھکا دے گا اور اس امر کو تسلیم کرے گا کہ ان قواعد کو جو ہم نے بنائے ہیں، خدا ورسول نے ہرگز سنۃ اللہ نہیں کہا اور ہمارا استقراء بالکل ناقص ہے۔[3] کیونکہ مخلوقات الٰہی اور اس کے عجائبات قدرت

[1] اکمل صاحب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کارخانہ قدرت پر نظر کر کے کسی امر کو صفت اللہ نہ کہنا چاہئے (ص۶) بس جب یہ مسلم ہے تو پھر جھگڑا کیا رہا۔

[2] اکمل صاحب کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کسی امر کو اپنی سنت کہے، کے ساتھ یہ ایزاد کر لیجئے کہ کسی امر کو بطور کلیہ فرمانا بھی سنت ہے۔'' اچھا جناب! تو پھر کیا؟ آپ کے مدعا کے مطابق تو قرآن میں کوئی کلیہ نہیں۔ ہے تو یہی ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' جو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔

[3] حاصل یہ ہے کہ ہم اپنے ناقص تجربہ ومشاہدہ کی بناء پر کسی امر کو سنت اللہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ مخلوقات وصنائع خالق کا استقراء کلی ناممکن ہے اور استقراء ناقص مفید ظن ہوتا ہے، نہ مفید یقین۔ فافہم وتدبر!

انسان کے احاطہ علم سے باہر ہیں۔ ہم کو ’’وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ (مدثر: ۳۱)‘‘ یعنی تیرے رب کے لشکروں کو اس کے اپنے سوا کوئی نہیں جانتا اور ’’وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً (بنی اسرائیل: ۸۵)‘‘ یعنی تم کو تو صرف تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے، کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ آیت: ’’وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً (فتح: ۲۳)‘‘ اور اس کی دیگر نظائر کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ان آیات میں سنۃ اللہ سے انبیاء کی نصرت اور ان کے دشمنوں کی تعذیب اور خذلان و ناکامی مراد ہے[1]۔ سو اس امر کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری یہ قدیمی روش ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہوگی[2]۔ اس بات کو سمجھنے کا آسان طریق یہ ہے کہ یہ آیات جہاں جہاں قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔ طالب مشتاق ان مواقع کو نکال کر ماقبل و مابعد پر نظر کرے تو ساتھ ہی انبیاء علیہم السلام کی نصرت اور ان کے دشمنوں کی ناکامی اور ان پر خدا کی مار اور پھٹکار کا ذکر موجود ہوگا۔ پس قاعدہ نظم و ارتباط قرآن حکیم اس کو مجبور کر دے گا کہ وہ تسلیم کر لے کہ اس جگہ سنت اللہ سے مراد پیغمبروں کی نصرت اور ان کے دشمنوں کی تعذیب و خذلان ہے۔ چنانچہ ہم وہ سب مواقع علی الترتیب مع ان کے ماقبل کے نقل کر کے فیصلہ ناظرین کے فہم رسا پر چھوڑتے ہیں۔

[1] اکمل صاحب فرماتے ہیں: ’’سنت اللہ کے معنی عذاب الٰہی کسی لغت سے دکھائے ہوتے۔‘‘ (ص۶) خدا جانے اکمل صاحب نے کس کمال کی بناء پر اپنا نام اکمل تجویز کیا۔ جناب والا! سنت کے معنی ہیں عادت و سیرت۔ چنانچہ صراح میں ہے: ’’سنۃ بالضم روش‘‘ اور قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہمیشہ گزشتہ امتوں میں یہ کرتا آیا ہوں کہ منکرین انبیاء کو عذاب کروں تو اب بھی ایسا ہی کروں گا اور یہ میری سنت ہے۔ مصنّفین کتب لغت پر یہ واجب نہیں کہ لفظ سنت کی ذیل میں سب قسم کی عادتوں کو لکھ دیں۔ یہ تو متکلم کے کلام سے معلوم ہوگا۔ گو آپ کا سوال بالکل جاہلانہ ہے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ اس نے اپنے ایک بندے سے آپ کا مطالبہ بھی پورا کرا دیا۔ دیکھئے قاموس میں ’’سُنَّةُ الْاَوَّلِیْن‘‘ کی نسبت لکھا ہے ’’اَیْ مُعَاَیِنَةُ الْعَذَابِ‘‘ اسی طرح لسان العرب میں بھی ہے جو ان شاء اللہ آگے مذکور ہوگا۔ (سعادت)

[2] اکمل صاحب لکھتے ہیں (ص۶) ’’لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ‘‘ میں لانفی جنس کو دیکھو۔ ہر بدلانے والے کی نفی ہے۔ جواب: کیا آپ کا یہ مدعا ہے کہ پھر خدا بھی نہیں بدل سکتا۔ جناب یہ بات آپ نے بے علمی کی وجہ سے لکھی، کلمات کی اضافت جب خدا کی طرف کی گئی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے سوائے خدا کے کلمات کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ دیکھئے تفسیر ابوالسعود میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے ’’لَا قَادِرُ عَلٰی تَبْدِیْلِهٖ وَتَغْیِیْرِهٖ‘‘ غیرہ یعنی خدا کے سوا کوئی دوسرا اس کی تبدیل و تغییر پر قدرت نہیں رکھتا۔

اوّل: سورہ(بنی اسرائیل:۷۶،۷۷)''وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا. سُنَّۃَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلاً''اور تحقیق یہ لوگ نزدیک ہیں کہ تجھ کو دل برداشتہ کر کے اس سرزمین (مکہ) سے نکال دیں۔ پھر یہ بھی اس میں تیرے پیچھے تھوڑی ہی مدت بسیں گے۔ یہ سنت ہے، ان پیغمبروں کی جن کو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو ہماری سنت کے لئے تحویل (ٹال دینا) نہ پاوے گا۔

اس موقع پر صاف مذکور ہے کہ کفار مکہ پیغمبرﷺ کو مکہ شریف سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ حق تعالیٰ نے آپﷺ کو تسلی فرمائی کہ اگر آپ کو نکال دیں گے تو خود بھی نہ رہیں گے۔ کیونکہ انتقام انبیاء از اعداء ہماری سنت قدیمہ ہے اور یہ کبھی محوّل نہ ہوگی۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر کبیر میں کہا ہے۔ یعنی''اِنَّ کُلَّ قَوْمٍ اَخْرَجُوْا نَبِیَّھُمْ سُنَّۃَ اللّٰہِ اَنْ یُّھْلِکَھُم''یعنی خدائے تعالیٰ کی اس سے یہ مراد ہے کہ جس کسی قوم نے اپنے نبی کو نکالا۔ ان کے متعلق خدا کی سنت یہی ہے کہ ان کو بس ہلاک ہی کر دے۔

اور آیت:''لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلاً''پر کہا ہے:''وَالْمَعْنٰی اِنَّ مَا اَجْرَی اللّٰہُ تَعَالٰی بِہِ الْعَادَۃَ لَمْ تَتَھَیَّا لِاَحَدٍ اَنْ یُّقَلِّبَ تِلْکَ الْعَادَۃ''یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ جس امر کو خدا اپنی عادت ٹھہرا لے تو کسی سے بھی نہیں ہوسکتا کہ اس عادت کو بدل ڈالے۔ اسی طرح تفسیر ابوالسعود میں بھی لکھا ہے کہ خدا کی یہی سنت ہے کہ جو امت اپنے رسول کو اپنے علاقہ سے نکال ڈالے، خدا تعالیٰ اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اسی سورۃ بنی اسرائیل میں فرعون کی نسبت فرمایا:''فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّھُمْ مِنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنَاہُ وَمَنْ مَّعَہٗ جَمِیْعًا وَّقُلْنَا مِنْ بَعْدِہٖ لِبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اسْکُنُوا الْاَرْضَ (بنی اسرائیل:۱۰۳،۱۰۴)''پس ارادہ کیا (فرعون نے) کہ دل برداشتہ کرے ان کو اس سرزمین (مصر) سے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے۔ سب کو ڈبو دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو کہا کہ اب تم اس زمین (مصر) میں (بااختیار ہوکر) سکونت اختیار کرو۔

گویا:''سُنَّۃَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَاقَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا''کی ایک مثال بھی ذکر فرما دی۔

(۲) موقع ثانی: (احزاب:۶۰تا۶۲)''لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ ثُمَّ لَا

یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْهَا اِلَّا قَلِیْلاً. مَلْعُوْنِیْنَ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلاً. سُنَّةَ اللّٰهِ فِیْ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً'' اگر منافق اور وہ جن کے دل میں مرض (شک) ہے اور وہ جو شہر میں بری خبریں اڑاتے پھرتے ہیں۔ باز نہ آئیں گے تو ہم تجھ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ پھر وہ اس شہر مدینہ میں تیرے نزدیک تھوڑے ہی دن رہیں گے۔ لعنت مارے ہوئے ہو کر جہاں پائے جائیں گے، پکڑے جائے گے اور ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں گے۔ جو لوگ پہلے گزرے ہیں، ان میں (بھی) خدا کا (یہی) دستور رہا ہے اور اے پیغمبر! تم خدا کے دستور میں ہرگز (کسی طرح کا) ردّ و بدل نہ پاؤ گے۔

اس میں بھی عذاب الٰہی کا صاف ذکر ہے۔ چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں لکھا ہے: ''سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِکَ فِی الْاُمَمِ الْمَاضِیَةِ سُنَّةً وَّهِیَ اَنْ یَّقْتُلَ الَّذِیْنَ نَافَقُوا الْاَنْبِیَاءَ عَلَیْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَسَعَوْا فِیْ تَوْهِیْنَ اَمْرِهِمْ بَالْاِرْجَافِ وَنَحْوِهٖ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا'' یعنی گزشتہ امتوں میں خدا کی سنت یہی رہی ہے کہ ان لوگوں کو جو انبیاء علیہم السلام سے منافقت کریں اور ان کے امر (دین) کے ضعیف کرنے میں ارجاف (غلط پروپیگنڈا) کرنے یا اس کی مثل اور (شرارتوں) سے سعی کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیتا رہا ہے۔

اسی طرح تفسیر کبیر میں بھی یہی مضمون ہے۔ اسی طرح لسان العرب میں ہے: ''سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِکَ فِی الَّذِیْنَ نَافَقُوا الْاَنْبِیَاءَ وَاَرْجَفُوْا بِهِمْ اَنْ یُّقْتَلُوْا اَیْنَ ثُقِفُوْا اَیْ وُجِدُوْا'' اس کے بعد ''سُنَّةَ الْاَوَّلِیْنَ'' (سورہ کہف) کی نسبت کہا ہے: ''قَالَ الزُّجَاجَ سُنَّةَ الْاَوَّلِیْنَ اَنَّهُمْ عَایَنُوا الْعَذَابَ[۱]''

(۳) موقع ثالث: (فاطر:۴۳) ''وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیءُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِیْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلاً'' اور بری تدبیر (کا وبال) صرف اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے تو یہ لوگ سوائے پہلوں کی سنت کے اور کچھ نہیں انتظار کرتے۔ پس تو ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پائے گا اور نہ خدا کی سنت میں تحویل (ٹالنا) پائے گا۔

چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں کہا ہے: ''اَیْ سُنَّةُ اللّٰهِ فِیْهِمْ بِتَعْذِیْبِ مُکَذِّبِهِمْ''

[۱] لیجئے! اکمل صاحب لغت کی کتاب سے بھی سنت اللہ سے مراد عذاب اللہ ثابت ہوگیا۔ اب تو قادیانی مسیح کو چھوڑیئے۔

یعنی ایسے لوگوں کے بارے میں خدا کی سنت یہ ہے کہ مکذبین کو عذاب کرے۔

اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے: ’’لَیْسَ لَھُمْ بَعْدَ ھٰذَا اِلَّا انْتِظَارُ الْاِھْلَاکِ وَھُوَ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ‘‘ یعنی ان بداندیشوں کے لئے اس کے بعد سوائے ان کی ہلاکت کے کسی چیز کا انتظار نہیں ہے اور یہی پہلے لوگوں میں خدا کی سنت ہے۔

(۴) موقع رابع: (سورہ فتح:۲۲) ’’وَلَوْ قَاتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا‘‘ اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر جائیں گے۔ پھر ان کو کوئی بھی حامی و مددگار نہ ملے گا (یہ) خدا کی سنت ہے۔ جو پہلے گزر چکی اور تو ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پائے گا۔

چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے: ’’سُنَّۃُ اللّٰہِ نُصْرَۃُ رَسُوْلِہٖ وَاِھْلَاکُ عَدُوِّہٖ‘‘ یعنی خدا کی سنت یہ ہے کہ اپنے رسول کی مدد کرے اور اس کے دشمن کو ہلاک کرے۔ اسی مضمون، عدم تبدیل عذاب الٰہی کو مواقع کثیرہ میں بالفاظ دیگر بیان کیا گیا ہے۔ گویا وہ آیات تفسیر ہیں ’’سُنَّۃُ اللّٰہِ‘‘ کی۔

چنانچہ فرمایا سورۂ انعام میں: ’’وَلَا یُرَدُّ بَاْسُہٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ (انعام:۱۴۷)‘‘ اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

نیز سورہ یوسف میں فرمایا: ’’وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ (یوسف:۱۱۰)‘‘ اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

اور سورہ مؤمن کے اخیر میں فرمایا: ’’فَلَمْ یَکُ یَنْفَعُھُمْ اِیْمَانُھُمْ لَمَّا رَاَوْ بَاْسَنَا سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِہٖ وَخَسِرَ ھُنَالِکَ الْکَافِرُوْنَ (المومن:۸۵)[۱]‘‘ پس جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا تو ان کو ان کے ایمان نے کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ (یہ) خدا کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکی اور اس وقت کفار خسارے میں ہوئے۔

[۱] اکمل صاحب نے ان آیتوں میں سنۃ اللہ سے عذاب الٰہی مراد ہونے میں بہت بے سود کوشش کی ہے۔ اس کا صحیح و درست جواب یہ ہوسکتا تھا کہ آپ قرآن شریف میں سے کوئی پانچویں جگہ نکال دیتے جہاں سنۃ اللہ کو غیر مبدل کہا ہو اور سابقاً یا لاحقاً عذاب و نکال کا ذکر و قرینہ نہ ہو۔ کیونکہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزیہ ہوتی ہے۔ مگر آپ کو یہ باتیں بتائے کون؟ مسیح قادیانی تو خود ان علوم سے ناواقف تھا۔ مرید کیا جانیں گے؟ اور ’’کَلِمٰتُ اللّٰہِ‘‘ کے متعلق ایک بات آپ کو بتادوں کہ یہاں پر مراد خدا کے وعدے ہیں جو قادیانی سے کبھی بھی پورے نہیں ہوئے۔ سمجھ میں نہ آئے تو محمدی بیگم کا نکاح، ڈاکٹر عبدالحکیم اور عبداللہ آتھم کی موت، مولوی ثناء اللہ سے آخری فیصلہ کے مواعید سمجھ لیں۔

اس بیان وتفصیل سے طالب ذکی پر واضح ہوگیا کہ متعلقین کا انکار خرق عادت کے لئے آیت: ''وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً'' سے تمسک کرنا مراد الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔ ''تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ''

مقدّمہ ثالثہ

دربیان خصائص حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قادر قیّوم کا طریق تعلیم اسی نہج پر چلا آیا ہے کہ جب لوگ مسبب حقیقی سے غافل ہو کر اسباب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں وہ ''عزیز حکیم'' ان کے مزعومات کو باطل کرنے کے لئے اپنی قدرت کے کرشمے ظاہر کیا کرتا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے وقت طب اور فلسفہ کا بڑا چرچا تھا (اور ظاہر ہے کہ ان علوم کا مدار اسباب ہی پر ہے) شب وروز کے توغّل نے ان کے اذہان قاصرہ میں یہی کچھ مزیّن کردیا تھا کہ کوئی چیز بغیر سبب[1] وعلاج اور بدون ترکیب ومزاج کے پیدا نہیں ہوسکتی:

اے گرفتار سبب از مسبب غافلی سوئے ایں روتاب زاں سو مائلی

سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے اس واہی خیال کے ابطال کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کو خلاف عادت بے باپ پیدا کیا اور آپ کو طفلی میں خلاف عادت نطق فصیح کی طاقت دی[2] اور ایسے مریضوں کو جن کے علاج سے اطبّاء عاجز ہوں۔ بغیر اسباب معتادہ کے ان کے ہاتھ پر شفا دی اور معجزۂ احیائے موتی جو طاقت بشری سے باہر ہے، ان کے ہاتھ پر ظاہر کیا اور مٹی کی مورت میں آپ کی پھونک سے زندگی کی روح پھونک دی جو اس سے بھی عجیب تر ہے اور ''صعود الی السمآء'' جسے فلاسفر محالات میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر چڑھا کر واقعاً محقق کردیا اور فلاسفہ کے اس خیال کو کہ گردش زمانہ کے اثر سے ہر چیز متغیر ومتحیل ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مسئلہ نزول سے باطل کیا۔

چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے: ''قال ابن کثیر من العلمآء بعث اللّٰہ کل نبی من الانبیاء بما یناسب اھل زمانہ. فکان الغالب علیٰ زمان. موسیٰ علیہ السلام

[1] یعنی کوئی وہ سبب جو انسانی علم میں آچکا ہے۔

[2] یہ کلام سورہ (مریم:) کے دوسرے رکوع میں صاف مذکور ہے۔

السحر وتعظيم السحرة فبعثه الله بمعجزة بهرت الابصار وحيرت كل سحار فلما استيقنوا انها من عندالعظيم الجبار انقادوا للاسلام وصاروً من عبادالله الابرار. وامّا عيسٰى علیہ السلام فبعث فى زمن الاطبآء واصحاب علم الطبعية فجاء هم من الأيات بما لا سبيل لاحد اليه الا ان يكون مريداً من الذى شرع الشريعة فمن اين للطبيب قدرة علٰى احياء الجماد او علٰى مذاوة الاكمه والابرص وبعث من هو فى قبره رهين الٰى يوم التناد. وكذلك محمدٌ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فى زمان الفصحاء والبلغاء وتجاريد الشعراء فاتاهم بكتاب من الله عزّوجلّ فلو اجتمعت الانس الجن علٰى ان ياتوا بمثلهٖ او بعشر سور من مثله او بسورة من مثله لم يستطيعوا ابدا. ولو كان بعضهم لبعضٍ ظهيراً. وما ذاك الا ان كلام الرب عزوجل لايشبه كلام الخلق ابداً (تفسير ابن كثير ج۲ ص۲۲۷، ۲۲۸)‘‘

بہت سے علماء امت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس (نشان) کے ساتھ مبعوث کیا جو اس کے زمانہ کے لوگوں کے مناسب تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو اور جادگروں کی تعظیم کا بہت چرچا تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے آپ کو ایسے معجزے (عصا) سے مبعوث کیا، جس نے آنکھوں کو حیران اور ہر جادوگر کر مبہوت کر دیا۔ پس جب انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ معجزہ خدائے بزرگ وجبار کی طرف سے ہے تو اسلام کے مطیع ہوگئے اور خدا کے نیک بندے بن گئے۔

(اسی طرح) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اطبّاء اور علم طبعیات والے لوگوں کے زمانہ میں مبعوث کئے گئے۔ پس وہ ان کے پاس ایسے نشانات لائے جن کی نسبت سوائے اس کے کوئی اور گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ سب اس ہستی کی طرف سے ہیں، جس نے یہ شریعت مقرر کی ہے۔ پس کسی طبیب کو مردوں اور جمادات کے زندہ کرنے پر یا مادرزاد اندھے اور برص کے علاج پر اور اس شخص کے اٹھا کھڑا کرنے پر جو اپنی قبر میں قیامت کے دن تک کے لئے مرہون ہو، کہاں سے قدرت ہے۔

اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے نامی فصحاء وبلغاء وشعراء کے زمانہ میں مبعوث کئے گئے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے ایسی کتاب لائے کہ اگر تمام انسان اور جن اس امر پر

مجتمع ہو جائیں کہ اس کی مثل لائیں تو کبھی بھی نہ لاسکیں گے۔ اگرچہ بعض بعض کے مددگار بھی بن جائیں اور یہ اسی لئے ہے کہ خدا کا کلام مخلوق کے کلام سے ہرگز نہیں ملتا۔

تشریح لفظ آیت: آیت کے معنی ہیں، علامت۔

چنانچہ لسان العرب میں ہے: ’’والاٰیة العلامة ‘‘ قرآن شریف میں اس کا اطلاق کئی امروں پر آیا ہے۔ ایک ان میں سے عجائبات قدرت ہیں۔

چنانچہ فرمایا: ’’اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (کهف:۹) ‘‘ کیا تو نے گمان کیا کہ غار والے اور تختی والے ہمارے نشانات میں سے کوئی انوکھی چیز تھے۔

اسی کے موافق لسان العرب میں کہا ہے: ’’اٰیَاتُ اللّٰهِ عَجَائِبُهٗ‘‘ اسی معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے قرآن شریف میں متعدد مقامات میں آیت کا لفظ وارد ہے۔

چنانچہ فرمایا:

۱...... ’’وَلِنَجْعَلَهٗ اٰیَةً لِّلنَّاسِ (مریم:۲۱) ‘‘ تاکہ ہم اسے (ابن مریم) لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنائیں۔

۲...... ’’وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا اٰیَةً لِّلْعَالَمِیْنَ (انبیاء:۹۱) ‘‘ اور ہم نے اسے (مریم کو) اور اس کے بیٹے (مسیح علیہ السلام) کو جہاں والوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنادیا۔

۳...... ’’وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ اٰیَةً (مؤمنون:۵۰) ‘‘ اور ہم نے ابن مریم علیہ السلام کو اور اس کی ماں کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنایا۔

۴...... ’’وَجَعَلْنٰهُ مَثَلاً لِّبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (زخرف:۵۹) ‘‘ ہم نے اسے (ابن مریم علیہ السلام کو) بنی اسرائیل کے لئے (اپنی قدرت) ایک نمونہ بنایا۔

ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آیت اور مثل یعنی نشان ونمونۂ قدرت فرمایا ہے۔ پس اگر ان کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی ایسی بات وارد ہو۔ جو عام عادت کے خلاف نظر آئے اور لوگوں کو اس سے تعجب پیدا ہو تو قرآن وحدیث پر ایمان رکھنے والوں کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جسے خدائے تعالیٰ نے عام عادت کے خلاف بلا باپ پیدا کیا ہو اور اسے اپنی قدرت کا ایک نشان قرار دیا ہو۔ اس کے حالات عام نظام کے ماتحت نہ ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، ان کا

طفلی میں حکیمانہ تکلم فی المہد، ان کے معجزات[1]، ان کی رفع سماوی اور پھر آسمان سے ان کا نزول سب باتیں۔ اس نظام سے بالکل الگ ہیں جو انسان کے علم میں آیا اور جس پر اس کے معلومات کی چکی گردش کر رہی ہے۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق رفع نزاع واختلاف کے لئے یہ طریق نہایت سادہ اور سلامت روی کا ہے اور ایک مومن کے لئے اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں ہے۔

سوال: آیات مذکورہ بالا میں حضرت مریم کی شان میں بھی لفظ آیت وارد ہے تو حضرت مریم علیہا السلام میں یہ امر کہاں پائے جاتے ہیں؟

جواب: کسی امر کے ثبوت کے لئے قرآن وحدیث میں اس کے اصل کا وجود ضروری ہے۔ پس جس امر میں حضرت مریم علیہا السلام کو آیت کہا گیا ہے۔ بے شک وہ اس میں آیت (نشان قدرت) ہیں اور جو امر ان کے حق میں مذکور ہی نہیں، وہ زیر بحث ونزاع آ ہی نہیں سکتے۔ ان ہی ان کو آیت قرار دینے کے کیا معنی؟ اسی لئے ہم نے اوپر کی عبارت میں نزاع واختلاف کی قید لگائی ہے۔

نکتہ: سورت انبیاء اور سورت مؤمنون کی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام دونوں کی نسبت لفظ آیت بصیغہ وحدت وارد ہے۔ حالانکہ دو کے لئے صیغہ تثنیہ کا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس امر میں یعنی ولادت بلا پدر میں دونوں کا حال مجموع ایک آیت (نشان) ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں زیر لفظ آیت، آیت: ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً (مؤمنون: ۵۰)'' کو ذکر کر کے کہا ہے: ''وَقَالَ اَبُوْ مَنْصُوْرٍ لِاَنَّ الْاٰيَةَ

[1] قاضی اکمل صاحب معجزات مسیحیہ پر اعتراض لکھتے ہیں: ''اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے معجزے کے پرند اڑائے یا بقول آپ کے خلق حیات کیا تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ نہیں بن گیا تھا۔'' (ص۴) جواب: ہاں جناب! بن گیا تھا۔ لیکن اس سے آپ کو فائدہ کیا؟ اور ہمیں نقصان کیا؟ اس میں بھی تو ہماری ہی تائید ہے اور یہ جو آپ نے کہا: ''بقول آپ کے خلق حیات کیا۔'' جناب! یہ مجھ پر افتراء ہے۔ آپ تو لکھتے ہیں، شہادت القرآن حصہ اوّل اس وقت میرے سامنے ہے۔ (ص۲) بھلا اس میں کہیں دکھایئے تو کہ اس میں کہاں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خلق حیات کیا۔ جناب اس میں تو صاف لکھا ہے: ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خلق حیات حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر اپنی قدرت کاملہ سے کر دکھایا۔'' اسی طرح اعادہ...... حیات کو بھی خدا ہی کی طرف منسوب کیا۔ و دیکھو (ص۱۲ طبع ثانی)

فِیْهِمَا مَعًا اٰیَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّهِیَ الْوِلَادَةُ دُوْنَ الْفَحْل (ج ۱۸ ص ۲۶) ’’ابومنصور نے کہا یہ اس لئے ہے کہ دونوں میں معاً ایک ہی نشان ہے اور وہ ولادت ہے بغیر مرد کے۔

خاکسار کہتا ہے کہ اس کی نظیر آیت: ’’هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ (آل عمران:۷)‘‘ ہے کہ ھــــنّ جمع کی خبر امّ واحد ہے۔ کیونکہ مجموع آیات محکمات ایک شے ہے اور مجموع آیات متشابہات ایک شئے۔ (مستفاد از تفسیر کبیر)

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام میں ایک امر مشترک ہے اور دیگر امر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ثابت ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کی نسبت نہیں۔

’’اَمَّا الْاِشْتِرَاکُ فَفِیْ اَنَّهَا وَلَدَتْهُ مِنْ غَیْرِ بَعْلٍ بِمَحْضِ قُدْرَةِ اللّٰهِ وَاَمَّا الْاِفْتِرَاقُ فَفِی التَّکَلُّمِ فِی الْمَهْدِ وَالْمُعْجِزَاتِ الدَّالَّةِ عَلٰی صِدْقِ النُّبُوَّةِ وَالرَّفْعِ اِلَی السَّمَآءِ حَیًّا وَالنُّزُوْلِ مِنْهَا فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ (میر سیالکوٹی)‘‘ اشتراک اس امر میں ہے کہ حضرت مریم علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف خدا کی قدرت سے بغیر خاوند کے جنا اور ان میں فرق ان امور میں ہے۔ (۱) ماں کی گود میں خلاف عادت باتیں کرنا (۲) اور معجزات جو صدق نبوت پر دلالت کرتے ہیں (۳) اور آسمان پر زندہ اٹھایا جانا اور آخری زمانہ میں وہاں سے نازل ہونا۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن میں آیۃ[1] کہا گیا اور امور خمسہ مذکورہ بالا ان کی نسبت قرآن وحدیث میں بطور خرق عادت ذکر کئے گئے۔ پس آپ ان سب میں آیت اللہ ہیں۔ ایسا نہیں کہ چونکہ آپ کو آیت کہا گیا ہے۔ اس لئے پانچوں امور مذکورہ بالا ان میں بغیر قرآن وحدیث میں وارد ہونے کے بطور خرق عادت مانے جائیں۔ کیونکہ یہ نتیجہ عیب واقعہ وذکر ہے۔ نہ بحسب علاقہ ولزوم۔ اسی لئے ہم اسے بطور قضیہ اتفاقیہ[2] کے قرار دیتے

[1] قاضی اکمل صاحب اس لفظ آیت پر لکھتے ہیں: ’’دوسرے امور کے لئے آیت ٹھہرانا ضروری ہو تو کیا وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوا۔

جواب: جناب یہ تو اللہ تعالیٰ سے پوچھئے کہ اس نے کیوں نہیں کہا۔ ہم نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ قرآن میں مذکور ہونے کے سبب نشان کی صورت مقرر کی ہے اور ولادت بلا پدر اس کی مؤید ہے۔ لیکن آپ سے سمجھے نہیں۔

[2] ملا مبین نے شرح سلّم میں بحث شرطیات میں لفظ اتفاقاً پر لکھا ہے: ’’بحیث یکون کلا النسبتین واقعتین فی نفس الامر من غیر علاقة بینهما ‘‘یعنی دونوں نسبتیں نفس الامر میں واقع ہوں اور ان میں علاقہ لزوم...... نہ ہو۔

ہیں، نہ بطور قضیہ لزوم کے۔

تذییل: اسی طرح فرعون کی نسبت وارد ہے: ’’لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ (یونس:۹۲)‘‘ اور وہ صرف اس کے دریا میں ہلاک ہونے اور پھر ذلت کے ساتھ ساحل پر پڑے رہنے میں ہے۔ جیسا کہ سباق آیت اس پر شاہد ہے۔

نیز اسی کے حق میں فرمایا: ’’فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى (نازعات:۲۶،۲۵)‘‘ اس (خدا) نے اس (فرعون) کو دنیا اور آخرت (ہر دو جہان) کے عبرتناک عذاب میں پکڑا بے شک اس امر میں (خدا سے) ڈرنے والے کے (بڑی بھاری) عبرت ہے۔

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام[1] کی شان میں فرمایا: ’’وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ (بقرہ:۲۵۹)‘‘ یعنی تاکہ ہم تجھ کو لوگوں کے لئے ایک نشان (قدرت) بنائیں۔ سو یہ بھی صرف اس امر میں ہے کہ مردوں کو پھر زندگی بخش دینا خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ’’اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ[2] (بقرة:۲۵۹)‘‘ اور اس کے بعد فرمایا: ’’فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[3] (بقرة:۲۵۹)‘‘ سے ظاہر ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ چونکہ خصوصیات مسیحیہ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت[4] عزیر علیہ السلام

[1] قرآن مجید میں اس موقع پر حضرت عزیر علیہ السلام کا نام مذکور نہیں۔ مفسرین کی ایک بھاری جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ قصہ حضرت عزیر علیہ السلام کا ہے۔ سو بنا بر مشہور لکھا گیا: ’’واللہ اعلم بحقیقۃ الحال‘‘

[2] یعنی خدا اس بستی کے مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ پس خدا نے اسے سو سال تک مارے رکھا، پھر زندہ کیا۔ (البقرہ:۲۵۹)(سعادت)

[3] یعنی جب سب کچھ اس کے سامنے ظاہر ہو گیا تو کہنے لگا میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا ہر شئے پر قادر ہے۔ (البقرہ:۲۵۹)(سعادت)

[4] قاضی اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں: ’’یہی لفظ (آیۃ) حضرت مریم علیہا السلام (مطابق اصل) کے حق میں بھی وارد ہوا ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کے حق میں بھی اور پھر فرعون کے بارے میں بھی آیا ہے۔ (ص۳)

جواب: ہاں جناب! آیا ہے۔ لیکن اس اعتراض میں آپ کا کیا کمال ہے۔ یہ سوال تو میں نے خود ذکر کر کے اس کا جواب کافی ووافی دے دیا ہے۔ جسے آپ سمجھ نہیں سکے۔ اگر اعتراض کرنا تھا تو اس جواب پر کرتے۔

میں اور فرعون کے حق میں وارد نہیں ہوئیں۔ اس لئے ہم نہ تو ان کو ان امور میں آیت اللہ کہہ سکتے ہیں اور نہ ان کے متعلق یہ سوال اٹھ سکتا ہے۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَاصِرِيْنَ!

تنبیہ (درباره طریق بیان)

اثبات مدعا کے لئے صرف قرآن شریف سے تمسک کیا گیا ہے اور رفع تنازع کے لئے کوئی امر ایسا نہیں لکھا، جس کی تائید کتاب اللہ یا حدیث رسول اللہ ﷺ یا زبان عرب سے نہ ہوتی ہو۔ خواہ اسے کسی تفسیر سے لکھا ہے۔ خواہ استعداد خداداد سے سمجھا ہے۔ غرض جو کچھ لکھا ہے۔ مراد کتاب اللہ کے موافق لکھا ہے، خلاف نہیں لکھا۔ مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال[1] صرف اس لئے ذکر کئے ہیں کہ اس زمانہ جہالت میں کفران نعمت کی صفت مذموم بڑھتی جاتی ہے۔ بنابرآں بعض مصنف تو تحقیقات کو اپنی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں اور اپنے ماخذ کا پتا نہیں بتاتے اور بعض ائمہ مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کو نظر عزت سے نہیں دیکھتے۔ لیکن خاکساران دونوں امروں میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں۔ جس امر کو کسی کتاب سے لیا ہے۔ اس کا نام لکھ دیا ہے اور مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے جس قول کو اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید قرآن وحدیث یا لغت عرب یا قواعد علمیّہ سے کر دی ہے۔ پس جب قدر ناشناس لوگ سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کو قرآن وحدیث اور لغت عرب اور قواعد علمیہ سے مؤیّد پائیں گے تو ان شاء اللہ بدظنی دور ہو جائے گی۔

دوسرے اس غرض کے لئے کہ اپنے موافقین کو زیادت اطمینان حاصل ہو اور اپنے پر سے ظن تفسیر بالرائے دور ہو جائے۔

تیسرے اس لئے کہ نازک خیالی کے مدعی جو حقیقت میں تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ جان لیں کہ وہ سلف صالحین اور متقدمین اسلام کے فہم وادراک کو نہیں پہنچ سکتے۔ اللّٰھم انت عضدی ونصیری بک اعتصم عما یصم وانا عبدک الناسوتی محمد ابراھیم میر السیالکوتی

[1] قاضی ظہورالدین صاحب اکمل قادیانی نے اپنی کتاب ''شہادت الفرقان'' کے شروع میں خاکسار کی اس کی شہادت القرآن کے نام کے متعلق لکھا ہے ''نام تو شہادت القرآن ہے۔ مگر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے شہادت تفاسیر ہے۔'' (ص۳)

جواب: خدا جانے قادیانیوں کی سمجھ کو کیا ہو گیا؟ تفاسیر کے حوالہ جات جس غرض کے لئے دیئے گئے ہیں۔ وہ صاف صاف بیان کر دی گئی ہے۔ پھر بھی کہتے ہیں، شہادت تفاسیر ہے۔ فافھم!

فصل اوّل

دربیان عدم مصلوبیّت حضرت عیسیٰ علیہ السلام

چونکہ مرزا قادیانی نے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات قبل النزول کا افتتاح مسئلہ صلیب سے کیا ہے اور یہ مسئلہ ان کے نزدیک بمنزلہ بناکے ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی پہلے اسی کی تحقیق کریں کہ آیا یہ واقعہ صلیبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت درست ہے یا نہیں؟ سو اس کے لئے بیان ذیل ملاحظہ فرمائیں:

اس بات کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اب سے قریباً دو ہزار سال قبل کے واقعہ کی صحت وصداقت کے لئے کسی زبردست قابل اعتبار شہادت وسند کی ضرورت ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال سے اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن مجید یا حدیث صحیح مرفوع میں اس کی تصریح ہو۔ دوم یہ کہ نزول قرآن سے قبل کی کتابوں یا روایتوں میں اس کا ذکر ہو۔ بشرطیکہ وہ قرآن ونبی کی تصریح کے خلاف نہ ہوں اور زمانہ کے دست برد، لوگوں کے جعل وتصرف اور ان کے ردّوبدل اور تحریف وتبدیل سے محفوظ چلی آئی ہوں اور ان کے مصنفین تک ان کا سلسلہ روایت صحت سند سے پہنچتا ہو اور پھر ان مصنفین نے اسے معتبر ذرائع وقابل وثوق وسائل سے معلوم کر کے درج کیا ہو۔ سو قرآن شریف میں تو صاف طور پر ''ما صلبوہ (نساء)'' مذکور ہے۔ جس کے خلاف ایک مسلمان کسی بھی دیگر شہادت کو ہرگز نہیں مان سکتا اور نہ اس کے بعد تحقیقات کی کوئی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ہاں بے شک مسیحی اسفار میں صلیب کا واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت اثبات میں مذکور ہے اور ان ہی کی بناء پر سرسید احمد صاحب علی گڑھی نے صلیب ووفات مسیح علیہ السلام کا واقعہ لکھا۔ دیکھو (تفسیر القرآن مصنفہ سرسید سورہ آل عمران) جن کی پیروی مرزا قادیانی بھی باضافہ دعویٰ مسیحیت صلیب ووفات مسیح علیہ السلام کے قائل ہوئے۔ ان مسیحی کتابوں کے سوا دونوں صاحبوں کے ہاتھ میں اسلامی کتب میں سے کچھ بھی نہیں اور یہ محقق ہوچکا ہے کہ یہ کتابیں محض جعلی ہیں اور ان کے بیانات ہرگز قابل وثوق نہیں ہیں۔[1]

چونکہ ہم نے اس کتاب میں التزام کیا ہے کہ اپنے دعویٰ اور دلیل کی بنا قرآن کریم پر رکھیں۔ اس لئے ہم قرآن شریف کی چند آیات سے ثابت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

[1] مسیحی کتب کی رو سے اس واقعہ کی تحقیق الگ رسالہ میں کی جائے گی۔ ان شاءاللہ!

کی نسبت واقعہ صلیبی محض دروغ ہے۔

پہلی آیت: ''(قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی) مَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (آل عمران:۵۴) ''یعنی یہود نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کی) تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی ایک تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت مندرجہ عنوان کے ذیل میں لفظ مکر کی تحقیق میں فرمایا ہے: ''لِاَنَّہٗ عِبَارَۃٌ عَنِ التَّدْبِیْرِ الْمُحْکَمِ الْکَامِلِ ثُمَّ اخْتُصَّ فِی الْعُرْفِ بِالتَّدْبِیْرِ فِیْ اِیْصَالِ الشَّرِّ اِلَی الْغَیْرِ (تفسیر کبیر ج۲)'' مکر سے تدبیر محکم اور کامل مراد ہے۔ پھر عرف عام میں یہ لفظ ایسی تدبیر میں خاص ہوگیا جو کسی دوسرے کو ضرر پہنچانے کے لئے کی جائے۔ امام رازی کا یہ قول بالکل صحیح ہے اور کتاب اللہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

چنانچہ فرمایا: ''وَالَّذِیْنَ یَمْکُرُوْنَ السَّیِّئَاتِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَکْرُ اُوْلٰئِکَ ھُوَ یَبُوْرُ (فاطر:۱۰) (وَقَالَ) فَلَمَّا جَاءَ ھُمْ نَذِیْرٌ مَّا زَادَھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا اِسْتِکْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَمَکْرَالسَّیِّ ءِ وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّ ءُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ (فاطر:۴۲،۴۳) ''اور جو لوگ بداندیشیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان کو سخت عذاب ہوگا اور ان کا مکر ہی تباہ ہوگا۔ نیز فرمایا پس جب ان کے پاس ڈرانے والا (نبی ﷺ) آ گیا تو ان کو سوائے نفرت و بھاگنے کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ بوجہ زمین میں بڑائی چاہنے کے اور بداندیشی کرنے کے اور بداندیشی کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑتا ہے۔

پہلی آیت میں تو ''سیّئات'' کو فعل ''یمکرون'' کا مفعول گردانا اور دوسری میں دودفعہ مکر کو سییّ سے موصوف کیا، جس سے صاف ثابت ہے کہ اصل لغت میں مکر کے معنی صرف تدبیر کرنے کے ہیں۔ نیز اس آیت زیر بحث یعنی ''وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہ'' کو ''وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ'' پر ختم کرنا بھی اس امر کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ تدبیر الٰہی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں خیر ثابت ہوئی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شر اعدائے سے بالکل محفوظ رکھا اور آسمان پر اٹھا لیا اور یہود کے حق میں شرّ ہوئی کہ ان کو مکر میں ناکام رکھا اور ان میں سے ایک شخص پر عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی۔ جس کو انہوں نے پکڑ کر صلیب پر چڑھایا اور قتل

کیا۔ جیسا کہ مفصل مذکور ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جملہ ’’مکر اللہ‘‘ میں مکر کو خدائے تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی بھی قباحت واعتراض نہیں۔

سوال: ’’مکروا‘‘ میں ضمیر فاعلی کس کی طرف راجع ہے؟

جواب: کفار بنی اسرائیل کی طرف۔ جن سے عیسیٰ علیہ السلام نے احساس کفر کیا تھا۔ چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے: ’’الواو لِکُفَّارِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ الَّذِیْنَ اَحَسَّ مِنْھُمُ الْکُفْرَ (کشاف ج اوّل)‘‘ ایسا ہی دیگر تفاسیر مثل سراج منیر، بیضاوی، خازن، مدارک، جلالین، معالم، جامع البیان، ابن کثیر، ابی السعود، عباسی اور تفسیر فیضی میں ہے۔

مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کا یہ قول بالکل راست اور مطابق قرآن مجید ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ہے: ’’وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ (مائدہ:۱۱۰)‘‘ اے عیسیٰ! جب ہٹائے رکھا میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو۔[1]

سوال: یہود کا یہ مکر کسی امر کے لئے تھا؟

جواب: اس امر کے لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالیں۔[2] چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے: ’’وَمَکْرُھُمْ اَنَّھُمْ وَکَّلُوْا بِہٖ مَنْ یَّقْتُلُہٗ غِیْلَۃً‘‘ یعنی یہود بے بہبود کا مکر یہ تھا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایک ایسا شخص مقرر کیا جوان کو فریب سے قتل کر ڈالے اور ’’غیلۃ بالکسر‘‘ کی تعریف سراج منیر میں یہ لکھی ہے کہ کوئی کسی کو دھوکے سے کہیں لے جائے۔

[1] اس آیت کی پوری تفسیر آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ!

[2] اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں ’’آپ خود ہی تسلیم کر لیا کہ یہ مکر عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے تھا۔ بس جناب اس پر صلیب کے حاشیے نہ چڑھائیے۔ (ص۶) جواب: قتل ایک ایسا فعل ہے جس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک ان میں سے صلب بھی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مکّے سے جو قبطی مرا تھا۔ اس پر بھی قتل کا لفظ آیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ’’ما قتلوہ‘‘ کے بعد ’’ما صلبوہ‘‘ اس لئے فرمایا کہ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی صورت صلب تھی اور اسے مرزا قادیانی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر خدا جانے اکمل صاحب کیوں انکار کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ آگے چل کر خود بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھو (ص۱۲،۱۳۔ ان کی کتاب کا) کہ کتنی جگہ صلب کو قتل کے ساتھ ضم کیا ہے۔ جناب والا! جب آپ کے نزدیک صلب کے معنی صلیب پر قتل کرنے کے ہیں تو ساتھ قتل کیوں لکھتے جاتے ہیں۔ (سعادت)

جب وہاں پہنچے تو اسے قتل کر ڈالے ’’وَهِيَ بِالْكَسْرِ اَنْ يَّخْدَعَ غَيْرَهٗ فَيَذْهَبَ بِهٖ اِلٰى مَوْضِعٍ فَاِذَا صَارَ اِلَيْهِ قَتَلَهٗ (تفسیر السراج المنیر جلد اوّل)‘‘ اسی طرح دیگر تفاسیر مثل رحمانی، سواطع، جلالین، جامع البیان، معالم، تفسیر حافظ ابن کثیر، سراج منیر، تفسیر علامه ابی السعود، لباب التاویل، مدارک، کبیر، انوار التنزیل، عباسی۔ ان سب تفاسیر میں بالاتفاق یہی لکھا ہے کہ یہود کا مکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالیں۔ بلکہ ابن کثیر اور مدارک میں قتل کے ساتھ صلب کو بھی ضم کر لیا ہے۔

چنانچہ تفسیر مدارک میں ہے: ’’حِيْنَ اَرَادُوْا قَتْلَهٗ وَصَلْبَهٗ‘‘ یعنی جب انہوں نے آپ کو قتل کرنے اور سولی دینے کا ارادہ کیا۔

سوال: یہ مکر اور تدبیر قتل وصلب کس کے حق میں کی گئی؟

جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں۔

چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے: ’’ای کفار بنی اسرائیل بعیسیٰ‘‘ اسی طرح دیگر تفاسیر مثل ابن کثیر، مفاتیح الغیب، ارشاد العقل السلیم لباب التاویل، مدارک، کشاف الحقائق، عباسی، تبصیر الرحمن، سواطع الالهام، جامع البیان، معالم، فتح البیان، السراج المنیر، انوار التنزیل۔ ان سب تفاسیر میں بالاتفاق یہی لکھا ہے۔ کسی میں اسم ظاہر ہے اور کسی میں صرف ضمیر پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کا یہ قول بالکل حق اور مطابق کتاب اللہ ہے جیسے سورۂ مائدہ میں وارد ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمائے گا: ’’وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ:۱۱۰)‘‘ (اے عیسیٰ! وہ وقت یاد کرو) جب میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو دور ہٹائے رکھا۔ جب تو ان کے پاس روشن دلائل لایا تو ان میں سے منکروں نے کہا یہ تو (سراسر) صریح جادو کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سوال: یہود نے یہ مکر اور تدبیر قتل آپ کے حق میں کیوں کی؟

جواب: یہود نے آپ کے معجزات کو جادو قرار دے کر آپ کو جادوگر ٹھہرایا اور پھر قتل کا حکم لگایا اور اس کی صورت صلیب پر کھینچنا تجویز کی۔ چنانچہ اوپر کی آیت میں معجزات کو جادو قرار دینا صاف مذکور ہے اور آیت مندرجہ عنوان کے قبل بھی ذکر معجزات اس امر پر

دلالت کررہا ہے اور ’’فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْکُفْرَ‘‘ کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کفار یہود سے مکر قتل کا احساس کیا۔ اس جگہ بمعنی قتل ’’من باب تسمیة الشئ باسم سببه‘‘ ہے۔ یعنی کسی شئے کے لئے وہ نام بولنا جو اس کے سبب کا نام ہے۔

چنانچہ مطوّل میں لکھا ہے: ’’رَعِیْنَا الْغَیْثَ اَیْ النَّبَاتَ الَّذِیْ سَبَبُهُ الْغَیْثُ (مطول)‘‘ چرائی ہم نے بارش یعنی نباتات جس کے اگنے کا سبب بارش ہے۔

اسی طرح آیت: ’’وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ (جاثیه:۵)‘‘ میں رزق بمعنی مطر یعنی بارش ہے۔ کیونکہ بارش سبب ہے رزق کے پیدا ہونے کا۔ پس رزق مسبب ہے۔ اسی طرح اس کے نظائر قرآن شریف میں بکثرت ہیں اور کتب بلاغت میں اس قاعدے کی تصریح موجود ہے۔ دیگر یہ کہ کفر کا احساس کے ساتھ ذکر کرنا بھی اس امر کا مؤیّد ہے کہ اس جگہ کفر سے مراد قتل ہے۔ کیونکہ احساس ایسے مواقع میں اس جگہ مستعمل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی خوفناک امر ہو۔ جیسے آیت: ’’فَلَمَّا اَحَسُّوْا بَأْسَنَا (انبیاء:۱۲)‘‘

اور نیز آیت: ’’اِذْ تُحُسُّوْنَهُمْ (آل عمران:۱۵۲)‘‘

’’اَیْ تَقْتُلُوْنَهُمْ ذَرِیْعًا مِنْ اَحَسَّهُ اَذَا عَدَمَ حِسَّهُ اِهْلَاکًا‘‘

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ: ’’فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْکُفْرَ‘‘ میں کفر بمعنی قتل ہے۔ پس مکر یہود کی صورت ارادہ قتل وصلب عیسیٰ علیہ السلام متعین ہوگئی۔

<u>سوال:</u> کیا مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے اس قول کی تائید قرآن شریف سے ہوسکتی ہے کہ مکر سے مراد قتل ہے؟

<u>جواب:</u> کیوں نہیں؟ بے شک مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے بیان کی تائید میں کئی آیات ہیں: مِنْهَا قَوْلُهٗ تَعَالٰی حَاکِیًا عَنْ اِخْوَةِ یُوْسُفَ ’’اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِاطْرَحُوْهُ اَرْضًا (یوسف:۹)‘‘ یوسف کو قتل کرڈالو یا اسے کسی زمین میں پھینک دو۔

اور اس تدبیر قتل کا نام مکر رکھا۔ چنانچہ اسی سورہ یوسف ہی میں ’’وَهُمْ یَمْکُرُوْنَ (یوسف:۱۰۲)‘‘ فرمایا۔

اور نیز سورہ نمل میں صالح علیہ السلام کے بیان میں فرمایا: ’’وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِکَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ

(النمل:۴۸،۴۹) ’’اور اس شہر میں نو شخص تھے۔ جو زمین میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ خدا کی قسم کھاؤ کہ اس (صالح) کو اور اس کے اہل کو راتوں رات قتل کر ڈالیں گے۔ پھر اس کے ولی کو کہیں گے کہ ہم تو اس کے قتل کے موقع و وقت پر حاضر نہ تھے اور ہم ضرور سچے ہیں۔

یعنی نو (۹) مفسدوں نے آپس میں یہ منصوبہ باندھا اور اس پر قسمیں کھانے کو کہا، کہ صالح علیہ السلام کو آپ کے اہل کو راتوں رات قتل کر ڈالیں۔ ان کی اس تدبیر شرّ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اس سے آگے فرمایا ’’وَمَکَرُوْا مَکْرًا (نوح:۲۲)‘‘ یعنی انہوں نے بڑا بھاری مکر کیا۔ یعنی پوشیدہ طور پر نبی اللہ صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی تدبیر کی۔

اسی طرح حضرت سید المرسلین خاتم النّبیین ﷺ کی نسبت کفار نے جو مشاورت کی اس کی نسبت فرمایا: ’’وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُاللّٰہَ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (الانفال:۳۰)‘‘ اور جب کفار تدبیر کرتے تھے کہ تجھے قید کرلیں یا جلاوطن کردیں یا قتل کر ڈالیں وہ بھی تدبیر کرتے تھے اور خدا بھی تدبیر کرتا تھا اور خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسبت کفار نے جو مشورہ کیا اس کی نسبت فرمایا: ’’فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖ اِلَّا اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْہُ اَوْ حَرِّقُوْہُ (عنکبوت:۲۴)‘‘ اور اس کی قوم سے کوئی جواب نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا۔ اسے قتل کر ڈالو یا آگ میں جلاڈالو۔

اور ان کے منصوبہ کا نام کید رکھا۔ چنانچہ سورہ انبیاء میں فرمایا: ’’وَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَخْسَرِیْنَ‘‘ انہوں نے اس کی نسبت خفیہ تدبیر کی۔ پس ہم نے انہی کو نہایت زیاں کار کردیا۔ (انبیاء:۷۰)

اور مکر اور کید مترادف ہیں۔ چنانچہ مصباح میں ہے کادہٗ، مکر بہ۔

<u>سوال:</u> کفار ماکرین کے ساتھ سنت الٰہیہ کیا ہے اور ان کے مکر کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

<u>جواب:</u> ماکرین کو ہلاک کرنا اور ان کے مکر کا وبال انہی پر نازل کرنا اور اپنے عباد مرسلین کو ان کے مکر سے بچالینا۔

دلیل: اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاطروغیرہ میں فرمایا: ’’وَالَّذِیْنَ یَمْکُرُوْنَ السَّیِّئَاتِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَکْرُ اُوْلٰئِکَ ھُوَ یَبُوْرُ (فاطر:۱۰) (وَقَالَ) وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیءُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ (فاطر:۴۳) (وَقَالَ) وَھَمَّتْ کُلُّ اُمَّۃٍ بِرَسُوْلِھِمْ لِیَأْخُذُوْہُ (اِلٰی) فَاَخَذْتُھُمْ فَکَیْفَ کَانَ عِقَابِ (المؤمن:۵) (وَقَالَ) وَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَخْسَرِیْنَ (انبیاء:۷۰) (وَقَالَ) فَاَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَسْفَلِیْنَ (صافات:۹۸) (وَقَالَ) قَدْ مَکَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَاَتَی اللّٰہُ بُنْیَانَھُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْھِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِھِمْ وَاَتٰھُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (النحل:۲۶) (وَقَالَ) قَدْ مَکَرُوْا مَکْرَھُمْ وَعِنْدَ اللّٰہِ مَکْرُھُمْ وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْہُ الْجِبَالَ. فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ مُخْلِفَ وَعْدِہٖ رُسُلَہٗ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ ذُوْانْتِقَامٍ (ابراھیم:۴۶،۴۷) (وَقَالَ فِیْ ھٰذَا الْوَعْدِ بِرُسُلِہٖ) وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ اِنَّھُمْ لَھُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (صافات:۱۷۱، ۱۷۲) (وَقَالَ اَیْضًا) کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (مجادلہ:۲۱) (وَقَالَ) وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَۃِ تِسْعَۃُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰہِ لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَاَھْلَہٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّہٖ مَا شَھِدْنَا مَھْلَکَ اَھْلِہٖ وَاِنَّا لَصَادِقُوْنَ وَمَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ. فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ مَکْرِھِمْ اَنَّا دَمَّرْنَاھُمْ وَقَوْمَھُمْ اَجْمَعِیْنَ. فَتِلْکَ بُیُوْتُھُمْ خَاوِیَۃً بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ (النمل:۴۸-۵۳)‘‘

ترجمہ: یعنی جولوگ بری تدبیریں اور منصوبے باندھتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اوران کا مکر ہی ہلاک ہوگا اور نیز فرمایا(۲) اسی سورت میں کہ بری تدبیر کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے اور نیز (۳) سورہ مؤمن میں فرمایا کہ ہر امت نے اپنے رسول کو ماخوذ کرنے پر کمر باندھی۔ پس میں نے انہی کو عذاب میں گرفتار کیا۔ پس میرا عذاب ان پر کیسا سخت ہوا۔ (۴) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے حق میں جو مکر اور کید ان کی قوم نے کیا تھا۔ اس کی بابت فرمایا کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک بھاری مکر کرنا چاہا۔ پس ہم نے انہیں کو سخت زیاں کار اور سخت پست اور ذلیل کر دیا اور نیز (۵) سورہ نحل میں فرمایا کہ کفار مکہ کے پیشتر بہت لوگوں

نے مکراور تدابیر کیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارات کو بنیادوں سے گرادیا اوران پر چھت ان کے اوپر سے گر پڑے اوران کو ایسی جگہ سے عذاب آیا جہاں سے ان کو شعور بھی نہ تھا۔

اور نیز سورۂ ابراہیم میں بڑے زور اور تاکید سے فرمایا کہ کفار مکہ نے جہاں تک ان سے ہوسکا، بہت سی تدبیریں کیں اور اللہ تعالیٰ کو ان کی سب تدبیریں معلوم ہیں۔ اگرچہ ان کی تدابیر اور مکر ایسے زبردست اور محکم ہوں کہ ان سے زوال جبال یعنی پہاڑوں کا گر جانا ممکن ہوسکے تو بھی ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس وعدے کا خلاف کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں سے کیا ہوا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب ہے اور اعداء سے بدلہ لینے والا ہے اور اس وعدے کی نسبت سورہ صافات میں فرمایا کہ بے شک ہمارا اپنے عباد مرسلین سے پہلے ہی سے وعدہ ہو چکا ہوا ہے کہ وہ ضرور ضرور منصور ہوں گے اور نیز سورہ مجادلہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ امر مقرر کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور ضرور غالب رہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور بڑا غالب ہے اور سورہ نمل میں حضرت صالح علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا کہ اس شہر میں نوشخص مفسد اور غیر مصلح تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ صالح علیہ السلام اور آپ کے اہل بیت کو راتوں رات قتل کرنے پر قسمیں کھاؤ اور اس پر بھی کہ پھر اس کے والی یعنی حامی ووارث کو کہیں گے کہ ہم تو اس کے اہل بیت کے مرنے کے موقع اور وقت پر حاضر ہی نہ تھے اور ہم ضرور سچے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ انہوں نے بڑا بھاری مکر کیا تھا اور ہم نے بھی مکر (تدبیر محکم) کیا اور وہ ہماری تدبیر کا شعور نہ رکھتے تھے۔ پس دیکھ ان کے مکر کا انجام کیا ہوا کہ ہم نے ان نو مفسدوں اور ان کے باقی حامی کاروں سب کو بالکل ہلاک کر دیا۔ پس یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب اجڑے پڑے ہیں۔ بے شک اس معاملہ میں علم والے یعنی سمجھ والے لوگوں کے لئے (رسولوں کی نصرت اوران کے دشمنوں کی ذلت کا) بڑا بھاری نشان ہے اور ہم نے مومنین اور متقین یعنی اتباع صالح علیہ السلام کو بچالیا۔ انتہی!

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں رسل اللہ کے برخلاف کفار کے مکر کا ذکر ہے۔ اس جگہ یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو ان کے مکر اور شر سے محفوظ رکھتا ہے اور الٹا ماکرین ہی پر وبال وعذاب نازل کیا کرتا ہے۔ سو! اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں بھی اسی طرح کی آیت آئی ہے۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت سید المرسلین ﷺ کے حق میں

وارد ہے۔ یہ کس قدر غلط اور لغو بات ہے کہ جو الفاظ دیگر رسولوں کے محفوظ رہنے پر دلالت کریں۔ انہی الفاظ کے ہوتے حضرت کلمۃ اللہ وروح اللہ علیہ السلام اس قدر ذلت اور خواری سے صلیب پر کھینچے جائیں کہ آپ کی مبارک رانوں پر میخیں لگائی جائیں اور آپ کے پاک ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکی جائیں اور آپ کے مقدس سر پر کانٹوں کی ٹوپی پہنائی جاوے اور آپ کے خزانہ حکمت کی پسلی میں تیر مارا جائے۔ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ جس امر کی تاکید کے لئے اللہ تعالیٰ اس قدر تاکید فرمائے اور بانظام بیان کرے۔ اسی امر کو برخلاف مراد الٰہی اپنا عقیدہ بنایا جائے۔

سوال: ''ومکر اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی۔ یہ تدبیر الٰہی کیا تھی؟

جواب: یہود کے خلاف اللہ تعالیٰ کا مکر یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور انہی میں سے کسی کو آپ کا ہم شکل بنا دیا جس کو یہود نے صلیب پر چڑھا کر قتل کیا۔[1] چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے: ''ومکر اللہ ان رفع عیسٰی الی السمآء والقی شبہہ علٰی من اراد اغتیالہ حتی قتل'' یعنی اللہ کا مکر اور اس کی تدبیر یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور آپ کی شکل اور شباہت اس شخص پر ڈال دی۔ جس نے آپ کو دھوکے سے قتل کرانا چاہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ قتل کیا گیا۔ اسی طرح تفسیر جلالین میں بھی ہے: ''ومکر اللہ بھم بان القٰی شبہ عیسٰی علٰی من قصد قتلہ فقتلوہ ورفع عیسٰی. انتھٰی'' اور خدا کا مکر ان سے یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت اس پر ڈال دی۔ جس نے آپ کے قتل کا قصد کیا تھا، سو انہوں نے اسے قتل کیا اور خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر اٹھا لیا۔

[1] اکمل صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں: ''ان میں سے کسی کا قتل ہونا بھی ضروری تھا تو ثابت کرتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جگہ بھی کوئی آگ میں ڈالا گیا اور ہماری سرکار ﷺ کے غار میں رہنے کے عوض کوئی اور غار میں رہا۔'' (ص۸) جب کہ (۲) ایک رسول کی شکل ایک کافر پر ڈالی گئی اور حکم ہمیشہ ظاہر پر کیا جاتا ہے (ص۸ ملخصا) ان دونوں کا جواب بصراحت سوال کر کے دے دیا گیا تھا۔ لیکن اکمل صاحب نے عشوہ نمائی کی جناب! عالم امکان میں ممکنات کی صورتیں بہت ہوتی ہیں۔ ہر ممکن درجہ وجوب میں آنے سے پہلے ہر صورت کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن جب واقع ہو جائے تو بس اسی میں ماننا پڑتا ہے۔ پھر اس میں اتباع دلیل وخبر کی ہوتی ہے۔ جب واجب ہو گیا تو باقی سب احتمالات اور امکانی صورتیں جاتی رہیں اور ظاہر پر حکم مرتب ہوتا ہے جب حقیقت معلوم نہ ہو۔ جب حقیقت ''مَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ'' سے معلوم ہو چکی تو ظاہر باطل ہو گیا۔ فافھم! (سعادت)

اوراسی طرح تفسیر علامہ ابی السعود میں بھی ہے:’’بان رفع عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام والقٰی شبھہ علٰی من قصد اغتیالہ حتی قتل‘‘ کہ خدا نے عیسٰی علیہ السلام کو اوپر اٹھالیا اوران کی شباہت اس پر ڈال دی، جس نے آپ سے فریب کا قصد کیا تھا۔ چنانچہ وہ قتل کیا گیا۔

اوراسی طرح تفسیر مدارک میں ہے:’’بان رفع عیسٰی الی السمآء والقٰی شبھہ علٰی من اراد اغتیالہ حتی قتل (مدارک)‘‘ کہ خدا نے عیسٰی علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور آپ کی شباہت اس پر ڈال دی۔ جس نے آپ سے فریب کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ قتل کیا گیا۔

اوراسی طرح ابن کثیر میں بھی ہے:’’فلمّا احاطوا بمنزلۃ وظنّوا انھم ظفروا بہ نجّاہ اللہ تعالٰی من بینھم ورفع من روزنۃ ذلک البیت الی السمآء والقی شبھہ علٰی رجل ممن کان عندہ فی المنزل فلما دخل اولئک اعتقدوہ فی ظلمۃ اللیل عیسٰی علیہ السلام فاخذوہ وصلبوہ ووضعوا علٰی راسہ الشوک وکان ھذا مکر اللہ بھم فانہ نجّی نبیّہ ورفعہ من بین اظھرھم وترکھم فی ضلالھم یعمھون (ابن کثیر ج۳)‘‘ جب یہود نے آپ کے مکان کو گھیرلیا اورگمان کیا کہ آپ پر غالب ہوگئے ہیں تو خدا نے ان کے درمیان سے آپ کو نکال لیا اوراس مکان کی کھڑکی سے آسمان پر اٹھالیا اورآپ کی شباہت اس پر ڈال دی جو مکان میں آپ کے پاس تھا۔ سو جب وہ اندر گئے تو اس کو رات کے اندھیرے میں عیسٰی خیال کیا۔ پس اسے پکڑا اور سولی دیا اورسر پر کانٹے رکھے اوران کے ساتھ خدا کا مکر یہی تھا کہ اپنے نبی کو بچالیا اعداء سے ان کے درمیان سے اوپر اٹھالیا اوران کو ان کی گمراہی میں حیران چھوڑ دیا۔

اوراسی طرح تفسیر بیضاوی میں بھی ہے:’’حین رفع عیسٰی علیہ السلام والقٰی شبھہ علٰی من قصد اغتیالہ حتی قتل (بیضاوی)‘‘ جب عیسٰی علیہ السلام کو اوپر اٹھالیا اورآپ کی شباہت اس پر ڈال دی جس نے آپ کو فریب سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا، حتیٰ کہ وہی قتل کیا گیا۔

اسی طرح دیگر تفاسیر مثل (۷) رحمانی، (۸) فتح البیان، (۹) معالم، (۱۰) سراج منیر، (۱۱) فیضی، (۱۲) عباسی، (۱۳) کبیر، (۱۴) جامع البیان میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ تفسیر کبیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ وجہیں ذکر کی ہیں۔ پہلی تین میں بالتصریح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اورکسی پر آپ کی شبہات ڈالے جانے کا ذکر کیا اور

چوتھی میں کسی ظالم بادشاہ کا بنی اسرائیل پر مسلط کر دینا، مکر الٰہی ٹھہرایا۔ ناقد بصیر پر ظاہر ہے کہ یہ وجہ منافی وجوہ سابقہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ ضم کی جاسکتی ہے۔

پانچویں وجہ علیٰ سبیل الاحتمال یہ فرمائی: ''**یحتمل ان یکون المراد انہم مکروا فی اخفاء امرہ وابطال دینہ ومکر اللّٰہ بہم حیث اعلیٰ دینہ واظہر شریعتہ وقہرہ بالذل والدناء ۃ اعدائہ وہم الیہود** (تفسیر کبیر ج۳)'' احتمال ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امر کے مخفی رکھنے اور آپ کے دین کے ابطال میں تدبیر کی اور خدا نے ان سے یہ تدبیر کی کہ آپ کے دین کو بلند کیا اور شریعت کو غالب کیا اور نہایت ذلّت اور پستی سے آپ کے دشمنوں کو مغلوب کیا اور وہ یہودی ہیں۔

اوّل تو اس وجہ کی تضعیف خود امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کلمہ احتمال سے کر دی ہے۔ دیگر یہ کہ اس وجہ اور قول جمہور مفسرین میں منافاۃ نہیں۔ کیونکہ ان میں نسبت سبب اور نتیجہ کی ہے۔ کیونکہ نبی برحق کا آسمان پر اٹھایا جانا اس نبی کی فضیلت کا مستلزم ہے اور دشمنوں کی ذلت ونا کامی کا، مؤجب ہے۔ ''**فلا منافاۃ بینہما اصلاً**'' (پس ان دونوں میں ہرگز کوئی منافات نہیں)

سوال: مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر یہ تھی کہ ایک اور شخص کو جس نے عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑوانا چاہا تھا، صلیب پر چڑھوا کر قتل کرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ کیا ان ہر دو امر کی تائید قرآن شریف سے ہو سکتی ہے؟

جواب: بے شک مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے یہ سب کچھ قرآن شریف ہی سے لکھا ہے۔ امر اوّل کا بیان ''**ولکن شبہ لہم**'' میں مصرح ہے اور ''**فقاتلوا ائمۃ الکفر**'' اس کا مؤید ہے اور امر ثانی کی تصریح میں ''**انی متوفیک ورافعک الیّ**'' اور ''**بل رفعہ اللّٰہ**'' موجود ہیں۔ ان کی تفصیل موقع پر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

سوال: ''**واللّٰہ خیر الماکرین**'' میں بجائے اسم مضمر کے اسم ظاہر کیوں اختیار کیا گیا ہے؟ ''**وہو خیر الماکرین**'' کیوں نہیں کہا گیا؟

جواب: قرآن شریف میں اللہ جل جلالہ کے اسماء حسنیٰ بکثرت ہیں اور وجہ اس کثرت کی یہ ہے کہ چونکہ قرآن شریف کی آیات مثل دعاوی مع بیّنات کے ہیں۔ اس لئے ذکر ہر اسم کا حسب اقتضائے مقام ہوتا ہے اور وہ اسم بمنزلہ دلیل وعلّت کے ہوتا ہے۔ چونکہ آیت: ''**مانحن فیہا**'' موقع نصرت، حضرت روح اللہ رسول برحق اور ذلت اعداء میں

وارد ہے۔اس لئے اسم جلالت (ای اللہ) کو بوجہ مہابت واثبات رسالت وحفاظت رسول کمال مناسبت ہے۔جیسا کہ سورہ مجادلہ میں ہے:''کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (مجادلہ: ۲۱)''اللہ تعالیٰ نے یہ امر مقرر کردیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور ضرور غالب رہیں گے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا قوی اور غالب ہے۔

چونکہ یہ آیت سورہ مجادلہ بھی کفار پر رسول کو غالب کرنے کی بابت وارد ہے۔اس لئے ذکر اسم جلالۃ (ای اللہ) کا کیا اور آخر میں اسم جلالۃ کے ساتھ قوت اور غلبہ کا بھی ذکر کیا جو بمنزلہ علت کے ہے۔

''ولا یخفی امثال ذالک علی المتأمل ومن لم یعط حظا من ذلک فلا یلومن الا نفسه وهمته''اور ایسی باتیں اس پر مخفی نہیں جو تامل کرنے والا ہو اور جس کو اس ملکہ میں سے حصہ نہ ملا ہو۔وہ سوائے اپنے نفس کے کسی کو ملامت نہ کرے۔

چنانچہ تفسیر''ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم''میں علامہ ابوالسعود اسعده اللہ بالفوز بجنّت النعیم اسی آیت میں فرماتے ہیں: ''واظهار الجلالة فی موضع الاضمار لتربیة لمهابة والجملة تذیيل مقرر لمضمون ما قبله (ابوالسعود)''موضع اضمار میں اسم جلالۃ کو ظاہر لانا ترتیب مہابت کے لئے ہے اور یہ جملہ تذییل ہے جو مضمون ہے ماقبل کی تقریر اور اثبات کرتا ہے۔

<u>سوال</u>:''واللہ خیر الماکرین''کی تفسیر کس طرح پر ہے؟

<u>جواب</u>: اس آیت سے مقصود اس امر کا اظہار ہے کہ اللہ قدیر کی تدبیر کے مقابلہ میں مخلوق عاجز کی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی اور اس کی تدبیر اپنے رسولوں کے حق میں خیر ہوتی ہے۔اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی تدبیر خیر کی کہ ان کو آسمان پر اٹھالیا۔[1]

<u>سوال</u>: بے شک ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ ماکرین مکر میں ناکام رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ الٹا ان ہی پر عذاب نازل کرتا ہے۔مگر قرآن شریف میں یہود کے بعض انبیاء کے قتل کرنے کا جو ذکر آیا ہے۔اس کا کیا جواب ہے؟

[1] اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں:''رسولوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر بیشک خیر ہی ہوتی ہے۔مگر تدبیر خیر سے خواہ مخواہ آسمان پر اٹھالینا ہٹ دھرمی ہے۔(ص۷۹ حاشیہ نمبر۱) جواب: خواہ مخواہ مراد نہیں لی۔بلکہ بیان قرآنی سے لی ہے۔اسے آپ ہٹ دھرمی کہتے ہیں تو پڑے کہیں اور یاد رکھئے،لزوم واقعہ اور وقوع واقعہ میں فرق ہوتا ہے۔فافهم!(سعادت)

جواب: قرآن کریم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں شرک پھیلنے کے بعد رسل اللہ تین پر طرح بھیجے گئے ہیں۔ اوّل وہ رسول جو اصحاب شرائع ہیں اور وہ پانچ ہیں۔ (۱) نوح نبی اللہ، (۲) ابراہیم خلیل اللہ، (۳) موسیٰ کلیم اللہ، (۴) عیسیٰ روح اللہ، (۵) محمد رسول اللہ علیہم السلام۔

جیسا کہ فرمایا: ''شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖ اِبْرَاھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی (شوریٰ:۱۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَھُمْ وَمِنْکَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرَاھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ (الاحزاب:۷) '' خدا نے تمہارے لئے وہ دین مقرر کیا ہے جس کی تاکید نوح علیہ السلام کو کی تھی اور جو (اے پیغمبر) ہم نے تیری طرف وحی کیا اور جس کی تاکید ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو کی تھی نیز فرمایا اور جب ہم نے سب نبیوں سے اور (اے پیغمبر) تجھ سے بھی اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے بھی اقرار لیا۔

آیت احزاب میں تخصیص بعد تعمیم کا فائدہ مزید کرامت اور زیادت شرافت ہے اور وہ ان کا اصحاب شرائع ہونا ہے جیسا کہ آیت شوریٰ میں مصرح ہے۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو اپنی اپنی قوم کی طرف بالاستقلال رسول کئے گئے۔ اگرچہ صاحب شریعت نہ تھے۔ ہاں! ان کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوئے اور ان کی قوم بہ سبب تکذیب کے معذّب ہوئی۔ مثل صالح اور ہود اور لوط اور شعیب علیہم السلام۔ تیسری وہ جماعت جو حکمت اور نبوت دیئے گئے۔ لیکن اتباع تورات کے مامور تھے اور...... وہ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے۔

چنانچہ فرمایا: ''اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰتَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ. یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا (مائدہ:۴۴) '' ہم نے ہی توریت کو نازل کیا تھا، اس میں ہدایت اور نور تھا۔ اس کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاء قوم یہود کے لئے فیصلہ کرتے تھے۔

مثل یحییٰ اور زکریا علیہ السلام کی۔ پس محاورہ قرآنی میں نبی اور رسول (مصداق میں) مترادف اور متسارق ہیں۔ ہر نبی رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے۔ صاحب شریعت ہو یا نہو جیسے کہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی شان میں ''رسولاً نبیا'' فرمایا اور اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی شان بھی ''رسولاً نبیا'' فرمایا اور معلوم ہے کہ حضرت کلیم اللہ صاحب شریعت تھے اور حضرت ذبیح اللہ صاحب شریعت نہ تھے۔ پس بعض علماء کا یہ قول کہ رسول وہ ہے جس پر کتاب

اترے اور ہر رسول نبی ہے۔ لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حسب التزام قرآن کریم ہے بلکہ یہ ان کی اصطلاح ہے[1]۔

’’وَلَا مُشَاحَةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ‘‘(اور اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا)

چنانچہ بعض علماء نے ہماری طرح تحقیق کیا ہے۔ (حاشیہ شرح ملا ص۴)

نتیجہ اس تمہید کا یہ ہے کہ قسم اوّل ودوم کے رسولوں کے مقابلہ میں ماکرین مکر میں ناکام رہتے ہیں، کیونکہ ان کا قتل شریعت اور رسالت میں شبہ ڈالتا ہے۔ بخلاف جماعہ ثالثہ کے کہ ان کا قتل کتاب اور شریعت میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ اسی لئے جریمۂ قتل انبیاء سوائے قوم یہود کے کسی امت سے سرزد نہیں ہوا۔ اگرچہ ہر امت نے اپنے رسول کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ مفسرین رحمہم اللہ آیت:’’یقتلون النبیین‘‘ وامثالہا میں حضرت یحییٰ اور زکریا علیہما السلام کو بالاتفاق مثال میں لکھتے ہیں۔

چنانچہ تفسیر جلالین میں کئی مواضع پر اور نیز تفسیر کبیر میں زکریا ویحییٰ علیہما السلام لکھا ہے اور تفسیر کشاف، معالم، مدارک، جامع البیان، خازن، سراج منیر، بیضاوی، فتح البیان، رحمانی، ابی السعود ان سب تفاسیر میں شعیا اور زکریا اور یحییٰ علیہم السلام لکھے ہیں۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاحب شرح ومعجزات رسول ہیں۔ اس لئے یہود آپ کو صلیب پر نہیں کھینچ سکتے تھے۔

کسر صلیب کی دوسری آیت

’’وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسٰى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (نساء:۱۵۷)‘‘اور ان کے اس قول کے سبب بھی کہ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم نے

[1] اکمل صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں:’’کیا آپ کے علماء قرآن شریف کے برخلاف اصطلاحات کے گھڑ لینے کے مجاز ہیں؟(ص۱۹) جواب: جناب قرآن شریف کے خلاف تو کوئی بھی مجاز نہیں۔ لیکن آپ کو سمجھ نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ قرآن نے جس امر کا التزام نہیں کیا، کیا اسے کوئی گروہ اپنی اصطلاح میں کسی خاص معنی میں مقید کرلے تو اسے خلاف قرآن نہیں کہتے۔ دیگر یہ کہ میں نے تو اس اصطلاح کی پابندی بھی توڑ دی اور حاشیہ شرح ملا کا حوالہ بھی دے دیا۔ آپ نے نظرانداز کیوں کردیا؟ دیکھئے وہاں لکھا ہے:’’وَالرَّسُوْلُ اِمَّا مُرَادِفٌ لِلنَّبِيِّ...... وَاِلَيْهِ ذَهَبَ جَمَاعَةٌ (ص۱)‘‘نمبر۴:اسی طرح مرزاقادیانی بھی اپنے آپ کو رسول بھی کہتے ہیں اور نبی بھی اور پھر غیرتشریعی بھی کہتے ہیں۔ فافہم!(سعادت)

مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا ہے اور انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔
یہ آیت نفی صلیب کے لئے نص صریح اور دلیل قطعی ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ یہ آیت دو وجہ سے نفی صلیب پر دلالت کرتی ہے۔ الوجہ الاوّل قولہ تعالیٰ بالتصریح ’’وما قتلوہ وما صلبوہ‘‘ یعنی یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا اور نہ انہوں نے آپ کو صلیب پر چڑھایا۔
محرر سطور نے ایک مطبوع اشتہار مرزا قادیانی کو بھیجا تھا، جس کی نقل حسب ذیل ہے:

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ!

جناب مرزا قادیانی! بندہ جمیع اہل السنۃ والجماعۃ سلف وخلف کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر نہیں چڑھائے گئے اور اب تک فوت بھی نہیں ہوئے۔ آپ اگر قرآن کریم میں مسیح علیہ السلام کا صلیب پر چڑھایا جانا ثابت کر دیں اور اگر صلیب پر چڑھایا جانا ثابت نہ کرسکیں تو بعد از اقرار عدم مصلوبیت قرآن شریف میں سے بدلائل قطعیہ ان کی وفات ثابت کر دیں تو بندہ اس بات کا حلفی اقرار کرتا ہے کہ آپ کی تحقیق کا بہت ہی ممنون ومشکور ہو کر مسیح علیہ السلام کی وفات کو تسلیم کر لے گا۔ اس امر کے فیصلے کے لئے خواہ آپ مجھے کادیان میں حاضر ہونے کے لئے فرماویں اور کسی عام مجلس میں اس مرحلہ کو طے کریں۔ خواہ کسی اور جگہ پر تشریف لا کر مجھے اطلاع بخشیں۔ خواہ آپ سیالکوٹ میں قدم رنجہ فرما کر بندے کو ممنون فرماویں۔ بندہ ہر طرح حاضر ہے۔ آپ کے سیالکوٹ آنے کی صورت میں آپ کے ذاتی اخراجات کا متحمل بندہ ہوگا۔ اگر آپ بندے کو کادیان میں طلب نہ فرمائیں اور کسی اور جگہ بھی بہ سبب کسی خفی وجہ کے خود تشریف نہ لاسکیں تو وہاں کادیان ہی میں بیٹھے بیٹھے اس بار کو برداشت کریں۔ بندہ اس پر سر تسلیم نہیں پھیرے گا۔ اس عریضہ کے جواب میں آپ کا یہ فرما دینا کہ ہم نے یہ مسئلہ ازالہ اوہام میں بہ بسط لکھا ہوا ہے۔ بندہ کے لئے جواب باصواب نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دلائل جو آپ نے ازالہ اوہام میں بیان کئے ہیں بندہ کے نزدیک قطعیت چھوڑ مفید ظنیت بھی نہیں ہوسکتے۔ اس عریضہ کی قبولیت وعدم قبولیت سے بندہ کو ایک ہفتے کے اندر اندر بدستخط خاص قلمی یا بذریعہ اشتہار طبع شدہ اطلاع بخشیں اور اس کی تعمیل کی میعاد ایک ماہ سے زائد نہیں ہونی چاہئے۔ ۸؍جون ۱۹۰۲ء

یہ اشتہار رجسٹری کرا کر مرزا قادیانی کی خدمت میں ارسال کیا گیا، جس کی رسید بھی آ گئی تھی۔ مگر جواب ندارد۔ ہاں! ان کے ایک مرید بلکہ استاد زادے مولوی مبارک علی

صاحب سیالکوٹی نے اس کا جواب لکھ کر اپنی لیاقت کا اظہار کیا۔ سو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً اس کی بھی تردید ہو جائے۔

یہ رسالہ نام کا ''جواب باصواب'' ہے اور اس میں مولوی مبارک علی صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب پر چڑھائے جانے کے ثبوت پر زور مارا ہے اور آپ کو دلائل مزبورہ پر بڑا ناز ہے۔ چنانچہ لوح کے اندرونی صفحہ میں فخر سے فرماتے ہیں ''سوال اور اس کے جواب میں غور فرما کر حسن کلام اور خوبی جواب اور طرز استدلال کی داد دیں۔'' انتہیٰ! اور نیز نظم دلچسپ میں یوں رقم طراز ہیں:

گو دیکھنے میں چھوٹی سی یہ اک کتاب ہے — اس کا ہر ایک نکتہ مگر لا جواب ہے

اس کتاب میں مصنف صاحب نے اپنی تحقیقات کی داد ان دو امروں کی صحت پر مانگی ہے۔

امر اوّل: صلیب کے معنی، صلیب پر مارنا ہیں۔ لہٰذا ''ما صلبوہ'' کے معنی ''یہود نے حضرت مسیح کو صلیب پر نہیں مارا'' ہوئے۔

چنانچہ (ص۱۴ حاشیہ) میں لکھتے ہیں: ''واضح رہے کہ اصل لغت میں مصلوب ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی موت صلیب پر واقع ہو جائے۔ دیکھو قاموس اور اقرب الموارد وغیرہ اور جس شخص کی موت صلیب پر واقع نہ ہو۔ اس کو لغت کے رو سے مصلوب کہنا ناجائز ہے۔'' انتہیٰ اور نیز (ص۲۴) میں یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ ''کیونکہ عرف لغوی میں مصلوب اسے کہتے ہیں جس کی موت صلیب پر واقعہ ہو جائے اور جس کی موت واقع نہ ہو۔ اسے مصلوب نہیں کہتے۔''

امر دوم: کلمہ ''لکن'' اس وہم کے دفعیہ کے لئے آیا ہے جو کلام سابق سے پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ''ولکن شبہ لہم'' اس لئے فرمایا کہ ''ما صلبوہ'' کی نفی سے مطلق سولی چڑھانے کی نفی بھی سمجھی[1] جاتی تھی۔

مگر چونکہ فعل سولی پر چڑھانا درست تھا اور سولی پر مر جانا غلط۔ اس لئے ''ولکن شبہ لہم'' سے اس وہم کو دور کیا اور ظاہر کر دیا کہ نفی صلب سے مراد نفی نتیجہ صلب (موت) ہے۔ یعنی سولی پر مرے نہیں۔ چنانچہ (ص۱۶) میں یوں تحریر فرماتے ہیں: پس اس قاعدے کے رو سے ثابت ہوا کہ آیہ زیر بحث کے جملہ اولیٰ منفیہ میں ایک وہم ہے جو جملہ ثانیہ مثبتہ

[1] حق برزبان جاری۔

سے بواسطہ حرف استدراک متضمن معنی استثناء رفع کیا گیا ہے اور وہ وہم یہ ہے کہ نفی قتل بعلت صلب سے نفی وقوع صورت صلب موہوم ہوتی ہے۔ جو مناقض اور مغائر نتیجہ صلب (موت) کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کو حرف استدراک متضمن معنی استثنیٰ سے یوں ظاہر کیا کہ قتل اور صلب کا نتیجہ واقع نہیں ہوا اور صورت صلب پیش آ گئی۔ پس جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ آیت: ''شبہ لهم'' میں مشبہ حضرت مسیح علیہ السلام ہے اور مشبہ بہ یہود کا زعمی مصلوب یا وہ مقتول ومصلوب جو بعلت تصلیب معہود فی الذہن ہوتا ہے۔ انتہیٰ!

اقول: یہ دونوں امر بالکل غلط اور ناشی از جہالت ہیں اور ان کا قائل جاہل مطلق اور لیاقت علمیہ سے بے بہرہ اور علوم رسمیہ سے بالکل نابلد ہے۔

امر اوّل: یعنی صلب کے معنی سولی پر چڑھا کر مارنا تین وجوہ سے باطل ہے۔

وجہ اوّل: لغت میں صلب کے معنی صرف سولی پر چڑھانا ہیں، اسے موت لازم نہیں۔ غیاث اللغات اور صراح میں ہے۔ صلب بردار کردن بلکہ غیاث اللغات میں لفظ صلیب کے ذیل میں کہا ہے ''بمعنی بردار کردہ شدہ وجہش آنکہ چوں عیسیٰ علیہ السلام را بر آسمان بردند۔ طرطوس نام شخصے را کہ ہم شکل عیسیٰ علیہ السلام بود، بردار کشیدند و بعد ازاں واقعہ ترسایاں آنرا عیسیٰ علیہ السلام پنداشتہ شکل دار با عیسیٰ علیہ السلام از چوب تراشیدہ در گلو آویختند و تعظیمش کردند'' اور سب تراجم اردو فارسی میں صلب کے معنی سولی پر چڑھانا ہی لکھے ہیں۔

ترجمہ شاہ ولی اللہ مرحوم محدث دہلوی جو مسلّم بین العلماء والفضلاء ہے ''ونہ کشتند اورا و بردار نکردند اورا۔''

ترجمہ شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ ''اور نہیں مارا اس کو اور نہ سولی دی اس کو۔''

ترجمہ شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ ''اور نہ اس کو مارا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا۔''

ترجمہ حافظ نذیر احمد ''نہ تو انہوں نے ان کو سولی چڑھایا۔''

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ صلب کے معنی لغت اور تراجم میں سولی پر چڑھانا لکھے ہیں اور موت اس کے لئے لازم نہیں۔ اگر صلب کے معنی کسی لغت کی کتاب میں یا کسی محاورے میں یا کسی شعر میں سولی پر چڑھا کر مارنا آئے ہیں تو مصنف صاحب پر واجب تھا کہ اس کتاب کی عبارت نقل کر دیتے۔ صرف آپ کا اتنا کہہ دینا کہ عرف لغوی میں فلاں لفظ کے معنی یہ ہیں، سند نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ کہیں کہ (ص۱۴) کے حاشیہ میں قاموس اور اقرب الموارد کا نام لکھ دیا ہے۔ بلکہ اس پر وغیرہ کا بھی پشتہ چڑھا دیا ہے تو اس عذر سے شرم چاہئے۔ مولوی صاحب! جہاں قاموس وغیرہ میں آپ کی تائید کی تصریح کی گئی ہے۔ مہربانی کر کے وہ عبارت ہی نقل کر دی ہوتی تا کہ آپ پر دھوکے کا الزام عائد نہ ہوتا[۱]۔ مولوی صاحب! یاد رکھئے لغت کی کسی کتاب میں آپ کی تائید نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے۔ یہ صرف آپ ہی کا اختراع ہے اور مصنّفین گزشتہ پر افتراء۔

اچھا اگر عربی زبان میں صلب کے معنی سولی پر چڑھا کر مارنا اور مصلوب کے معنی سولی پر چڑھایا جا کر مارا ہوا ہے ہیں تو صرف سولی پر چڑھانے اور سولی چڑھائے ہوئے کے لئے کیا لفظ ہیں؟ جب آپ نے یہ لکھا تھا کہ جس شخص کی موت صلیب پر واقع نہ ہو، اس کو لغت کے رو سے مصلوب کہنا ناجائز ہے تو کیا اس وقت ایسے شخص کے لئے جو لفظ اس پاک زبان میں موضوع ہے، لکھنا ہی یاد نہ رہا تھا یا خود بدولت کو یاد ہی نہ تھا؟ یا زبان ہی میں کوئی لفظ نہیں؟ مہربانی کر کے وہ لفظ تو لکھ دیا ہوتا تا کہ آپ کی تحریر کچھ تو مفید پڑتی۔ پہلی دو صورتوں میں آپ کا قصور ہے اور تیسری صورت میں زبان کا نقص۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے پر الزام سہ جائیں گے اور زبان عرب میں نقص کے قائل نہ بنیں گے۔

<u>وجہ دوم:</u> جو الفاظ افعال کے لئے موضوع ہیں، وہ صرف ان کی ابتدائی صورت

[۱] اکمل صاحب نے بہت محنت سے ''لسان العرب'' میں سے یہ عبارت تلاش کر کے نکالی ''والصاب هذه القتلة المعروفة...... الخ'' اور کہا ہے کہ لسان العرب میں صلب کے معنی قتل کے لکھے ہیں۔ (ص۱۱)

جواب: ہم قادیانی علمیت پر ہنسیں یا کیا کریں۔ دعویٰ اکملیت کا اور ''قتلة'' کے معنی کرتے ہیں ''قتل'' جناب من! علم صرف کے قواعد جانے آپ کی بلا، ''فعلة'' بالکسر کا وزن عربی زبان میں نوعیت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ شافیہ میں ہے: ''وبکسر الفاء للنوع نحو ضربة وقتلة'' پس صلب کے ضمن میں لسان العرب میں جو ''القتلة المعروفة'' کے لکھا ہے سو اس کے معنی یہ ہیں کہ صلیب بھی قتل کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ قتل عام ہے چاہے کس طرح مارا جائے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک ان میں سے صلیب بھی ہے۔ اسی لئے قرآن میں ''ما قتلوه'' کے بعد ''ما صلبوه'' کی تصریح کی ضرورت پڑی کہ یہود قتل مسیح کی صورت صلیب پر چڑھا کر مارنا کہتے تھے۔ پس خدا تعالیٰ نے ماقتلوه سے تو قتل کی نفی کر دی اور ماصلبوه سے صلیب پر چڑھانے کو رد کر دیا۔ پس ماصلبوه میں فعل صلب جو منفی ہے وہ صلیب پر چڑھانے کے معنوں میں ہو نہ کہ صلیب پر مارنے کے معنی میں۔ کیونکہ مارنے کی نفی تو ماقتلوه میں ہو چکی ہے۔ باقی رہا صلیب پر چڑھانا سو ماصلبوه سے مردود ہو گیا۔ (سعادت الاقران)

کے لئے ہیں۔ نتیجہ ان میں داخل نہیں ہوتا۔ نتیجہ پر دلالت ترکیب سے ہوتی ہے یا زیادت سے۔ آپ قواعد فقہ یا علم بیان کی کوئی کتاب پڑھیں۔ پھر معلوم ہو جائے گا اور اس سے پہلے ایسی تحقیق کو چھوڑ دیں اور استاد کے اس شعر کو ورد زبان بنائے رکھیں:

بجائے بزرگاں دلیری مکن چو سرپنجات نیست شیری مکن

وجہ سوم: مثل مشہور ہے: ’’دروغ گورا حافظہ نباشد‘‘ رسالہ جواب باصواب کے مصنف صاحب نے صلب کے معنی سولی پر چڑھا کر مارنا کرنے میں اپنی مطلب برآری کے لئے بہت زور مار کر تصرّف فی اللغۃ کیا ہے اور بموجب مثل مندرجہ عنوان ان کی اپنی بہت سی عبارات اسی رسالے میں موجود ہیں۔ جن میں صلب بمعنی مطلق صلیب پر چڑھانا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ مواضع حسب ذیل ہیں:

(۱) حاشیہ (ص۱۴) ’’مَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا اَیْ مَا وَقَعَ مَوْتُہٗ بِقَتْلِہٖ صَلْبًا ‘‘نفی قتل بعلت صلب سے نفی وقوع صورت صلب موہوم ہوتی ہے۔‘‘

(۲) (ص۱۶) ’’جو مناقض اور مغائر نتیجہ صلب (موت) کی ہے۔‘‘

(۴) (ص۱۷) ’’اب اس میں صورت میں یہ معنی ہوئے کہ مسیح علیہ السلام کے صلب کا نتیجہ تو واقع نہیں ہوا۔‘‘

(۵) (ص۱۷) ’’اور دونوں جملوں کے ملانے سے عدم وقوع نتیجہ صلیب کا اثبات۔‘‘

(۶) (ص۱۸) پس ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوگیا کہ آیت ’’وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (النساء:۱۵۷) ‘‘میں مطلق نفی مقصود نہیں۔ بلکہ نتیجہ صلب وقتل کی نفی مقصود ہے اور وقوع صورت صلب کا اثبات مطلوب ہے۔‘‘

ہم ان عبارات پر کچھ زیادہ توضیح نہیں کرتے۔ صرف ناظرین کے فہم رسا اور انصاف پر چھوڑتے ہیں اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ ان عبارات میں صلب بمعنی سولی پر چڑھانا مستعمل ہوا ہے یا نہیں۔ ’’والانصاف اولی الاوصاف‘‘ (انصاف کرنا سب سے بہتر وصف ہے) اگر مصنف صاحب اس اشارے سے اپنی بے علمی کا اعتراف نہ کریں تو نتیجہ اور سبب کی مغائرت سے سمجھ لیں[1]۔

[1] افسوس اب تو وہ فوت ہو چکے ہیں۔ (سعادت الاقران)

’’الفقیہ تکفیہ الاشارۃ والسفیہ لا تفیدہ العبارۃ‘‘ دانا کو بس ایک اشارہ ہی کافی ہے اور نادان کو (لمبی) عبارت بھی مفید نہیں۔

امر دوم: یعنی بحث کلمہ لیکن کی نسبت یہ عرض ہے کہ مولوی صاحب خود اس سے وہم میں پڑے ہیں اور عوام کو اوہام میں ڈالتے ہیں۔ ’’فضلّ واضلّ‘‘ مولوی صاحب نے ’’لکنّ‘‘ (مثقلۃ النون) کے قاعدہ میں دو عبارتیں نقل کی ہیں اور ان عبارات سے مولوی صاحب کو کچھ فائدہ نہیں۔ ہاں! اتنا فائدہ ضرور ہے کہ مرزائی پارٹی یہ جانے گی کہ مولوی صاحب علم نحو سے واقف ہیں۔ مگر علم نحو کے ماہرین کے نزدیک یہ امر شاہد ناطق ہے کہ مولوی صاحب علم نحو سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ نے کتب نحو کی عبارات تو نقل کر دی کہ ’’لکن‘‘ ازالہ وہم کے لئے آتا ہے۔ مگر تعیین وہم کی سند میں کسی تفسیر کی عبارت کیوں نقل نہ کی۔ مخالف پر کسی کتاب کا حوالہ دے کر وہ امر آشکارا کیا جاتا ہے۔ جس میں اس کو خلاف ہو۔ کلمہ لکن کا ازالہ وہم کے لئے موضوع ہونا تو فریقین کے نزدیک مسلّم ہے۔ اختلاف تو تعیین وہم میں ہے جو ہم آپ کو ہوا ہے۔ اس کی صحت کے لئے کسی کتاب کی عبارت لکھنی چاہئے تھی یا اسے مدلّل طور پر پرزور عبارت میں ثابت کرنا تھا۔ مگر افسوس مولوی صاحب نے غیرضروری امر ہی پر اپنا سارا زور بل لگا دیا اور جس امر کو دلیل سے ثابت کرنا تھا۔ وہاں پہنچ کر بیدم ہوگئے۔ مولوی صاحب! معاملہ ایسا نہیں جیسا کہ آپ کو وہم ہوا ہے۔ سنئے ’’وما قتلوہ وما صلبوہ‘‘ کے معنی تین طریق سے ہو سکتے ہیں۔

اوّل: اگر نفی قتل کو مفعول پر مقصور رکھیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے ’’اور یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا‘‘ ’’وھذالوجہ ھو الحق‘‘ (اور یہی وجہ درست ہے)‘‘

دوم: اگر نفی قتل کو فاعل پر مقصور رکھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ مسیح علیہ السلام کو یہود نے قتل نہیں کیا اور نہ اس کو سولی پر چڑھایا۔ اس کے خلاف یہ ہوگا کہ یہود کے سوا کسی اور نے مارا اور یہ وجہ باطل ہے۔ اس کی تفصیل ان شاءاللہ آگے آئے گی۔

سوم: اگر نفی کو افعال مذکورہ پر مقصور کریں تو معنی یہ ہوں گے مسیح علیہ السلام کو یہود نے قتل نہیں کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا ہے۔ اس کے خلاف یہ ہوگا کہ کسی اور طرح سے مر گیا اور یہ وجہ بھی باطل ہے۔

ناظرین! انصاف سے دیکھیں کہ ان ہر سہ وجوہ میں سے ’’ولکن شبہ لھم ‘‘ کو کس وجہ سے تعلق ہے۔ اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ’’ولکن شبہ لھم ‘‘ کو ان وجوہ میں سے صرف پہلی ہی صورت سے مناسبت ہے اور جمیع مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے بالاتفاق یہی معنی کئے ہیں۔

صورت دوم: اس لئے درست نہیں کہ اس صورت میں فعل کی اسناد اس کے فاعل کی طرف نہیں کی گئی اور نیز اس لئے کہ اس صورت میں یہود کا ذکر باسم ظاہر چاہئے تھا یا ضمیر مرفوع منفصل لانی چاہئے تھی۔

صورت سوم: اس لئے باطل ہے کہ جب اس صورت کے خلاف یہ تھا کہ وہ کسی اور طرح مر گیا تو پھر فعل کی نفی یہود کی طرف اشارہ کر کے نہ کی جاتی بلکہ عام طور پر کہا جاتا کہ اس کو کسی نے نہیں مارا اور وہ تو اپنی موت سے بستر پر مرا۔ کیونکہ اس صورت میں لفظ احد (بمعنی کوئی) یہ سبب معین نہ ہونے کے نکرہ اور عام ہے اور یہود اس کی نسبت خاص اور خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہو سکتی۔ باقی رہی صورت اوّل سو اس جملہ ’’ولکن شبّہ لھم ‘‘ سے پورا پورا تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ انہوں نے اسے صلیب پر چڑھایا۔ لیکن کسی ایسے شخص کو صلیب پر چڑھایا جو ان کے لئے از روئے مکر کے مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ’’ماقتلوہ وما صلبوہ ‘‘ سے مسیح علیہ السلام سے مصلوبیت ومقتولیت کی نفی کر دی تو وہم ہو سکتا تھا اور وہ وہم معقول تھا کہ قتل اور صلب حسّی امر ہیں۔ وہمی اور خیالی نہیں۔ اس لئے کوئی نہ کوئی تو ضرور مصلوب ومقتول ہوا تھا۔ اگر وہ مقتول مسیح علیہ السلام نہیں تھا تو اور کون تھا؟ سو ضرور تھا کہ اس کا جواب دے کر ازالہ وہم کیا جاتا۔ پس ’’ولکن شبّہ لھم ‘‘ سے اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دفع کیا اور حقیقت امر کھول دی کہ وہ کوئی اور شخص تھا جو کہ یہود کے لئے ’’مکراً بھم ‘‘ مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا۔

اس میں شاید کوئی کوتاہ نظری سے یہ سوال کرے کہ فعل ’’شبّہ ‘‘ کی اسناد کس کی طرف ہے۔ کیونکہ اسے مسیح علیہ السلام کی طرف مسند کیا جائے تو مسلمانوں کے اعتقاد میں مسیح علیہ السلام مشبہ بہ ہیں اور یہاں ذکر مشبہ کا ہے اور اگر کسی اور مقتول ومصلوب کی طرف اسناد کی جائے تو اس کا اوپر ذکر نہیں۔ ’’لہٰذا تقریر السوال ‘‘

اس کا ایک جواب باتفاق جمہور مفسرین یہ ہے، جو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے:
’’اَنْ یُّسْنَدَ اِلَی ضَمِیْرِ الْمَقْتُوْلِ لِاَنَّہٗ قَوْلُہٗ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَقَعَ الْقَتْلُ عَلٰی غَیْرِہٖ فَصَارَ ذٰلِکَ الْغَیْرُ مَذْکُوْرًا بِھٰذَاالطَّرِیْقِ فَحَسُنَ اِسْنَادُ شُبِّہَ اِلَیْہِ‘‘ کہ یہ فعل مسند ہے طرف ضمیر کی۔ جو مقتول کی طرف پھرتی ہے۔ کیونکہ قول ’’وما قتلوہ وما صلبوہ‘‘ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی اور شخص پر قتل واقع ہوا۔ پس اس طریق سے وہ مقتول مذکور ہوا اور شبہ کی اسناد اس کی طرف ٹھیک ہوئی۔

اور نیز ’’انّا قتلنا المسیح‘‘ سے بھی اس مقتول کا ذکر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جیسا قاضی بیضاوی نے فرمایا: ’’اَوْ اِلٰی ضَمِیْرِ الْمَقْتُوْلِ لِدَلَالَۃِ اِنَّا قَتَلْنَا عَلٰی اِنَّ ثَمَّ قَتِیْلًا‘‘ یا اس فعل کی اسناد ضمیر مقتول کی طرف ہے۔ کیونکہ ’’انا قتلنا المسیح‘‘ اس امر پر دلاللت کرتا ہے کہ وہاں کوئی تو ضرور مقتول تھا۔

مولوی صاحب نے شبہ کی توجیہ میں تفسیر بیضاوی کی عبارت نقل کر کے عوام کو یہ دھوکا دینا چاہا ہے کہ گویا اس توجیہ میں پہلے مفسر بھی ان سے متفق ہیں۔ اچھا مولوی صاحب! اگر قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت آپ کے مفید ہے تو قاضی بیضاوی ہی سے پوچھ لیجئے کہ مسیح علیہ السلام کے رفع کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب! تفسیر بیضاوی درسی کتاب ہے اور آپ نے نہیں پڑھی[1]۔ تفسیر بیضاوی آپ جیسے ماہروں سے حل نہیں ہوسکتی۔ بندہ آپ کو پھر وہی نصیحت کرتا ہے:

بجائے بزرگاں دلیری مکن   چو سر پنجہ ات نیست شیری مکن

تفسیر بیضاوی کا حل انہی لوگوں کے سپرد کریں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے حل کرنے کے پیدا کیا ہے: ’’ہر کسے را بہر کارے ساختند‘‘

خَلَقَ اللّٰہُ لِلْحُرُوْبِ رِجَالاً   وَرِجَالاً لِقَصْعَۃٍ وَّثَرِیْدٖ

[1] مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی جناب مرزا قادیانی کے استاد مولوی فضل احمد صاحب مرحوم کے بیٹے تھے۔ فقہ وغیرہ کی چند ابتدائی کتابیں حافظ محمد سلطان سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ حدیث کی کچھ کتابیں استاد پنجاب حافظ عبدالمنان صاحب محدث وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ کسی ناگفتہ بہ شرارت پر جناب حافظ صاحب نے سخت سزا دی۔ وہاں سے بھاگ آئے۔ پھر قادیانی ہوگئے۔ مولوی نورالدین صاحب کے بعد لاہوری جماعت میں شامل ہوئے۔ آخر گوجرانوالہ میں طاعون سے فوت ہوئے۔

یعنی خدا تعالیٰ نے بعض آدمیوں کو تو جنگ کے لئے پیدا کیا اور بعض کو صرف پیالے اور ثرید یعنی پیٹ پالنے کے لئے بنایا۔

مولوی صاحب! آپ مفسرین کے مختلف اقوال سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے۔ مفسرین کے آیت کے ذیل میں کئی اقوال نقل کرنے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ اقوال آپس میں متضاد ہیں اور ان سے نتیجہ ایک نہیں نکلتا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہر صورت میں نتیجہ ایک ہی ہے۔ اس کے اثبات کی کئی صورتیں ہیں اور جس قول سے نتیجہ الٹ نکلتا ہو۔ اس کی تضعیف کر دیتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں کہ اگر شبّہ کی اسناد جار مجرور کی طرف کرنے یا ضمیر مقتول کی طرف کرنے سے نتیجہ ایک نہیں نکلتا تو معاذ اللہ! مفسرین رحمۃ اللہ علیہم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ وہ قول راجح اور مرجوح اور ضعیف اور قوی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ صرف مختلف اقوال کا نقل کر دینا جانتے تھے اور ان میں قوت فیصلہ نہ تھی یا یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاذ اللہ! قرآن شریف ایسی کتاب ہے کہ اس کے مضامین کے بیان میں اتفاق رائے نہیں۔ اگر ان اختلافات کو اس طریق پر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، سمجھا جائے تو مفسرین کی بھی علوّ شان ثابت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی بھی۔ مفسرین کی اس طرح کہ گویا وہ ایسے وسیع النظر اور ماہر ہیں کہ ایک امر کو کئی وجوہ سے ثابت کر سکتے ہیں اور قرآن کریم کی اس طرح کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے مضامین کے اثبات کے لئے اپنے اندر ہی کئی دلائل رکھتی ہے۔ **فافهم!**

اب ہم بفضلہ تعالیٰ شبہ کی اسناد کی نسبت مفسرین کے اقوال نقل کر کے مولوی صاحب کے فہم سے وہم کو دور کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ہر صورت نتیجہ یہی ہے کہ کوئی اور شخص مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا اور وہی صلیب پر کھینچا جا کر مارا گیا تھا۔

چنانچہ تفسیر بیضاوی میں ہے: ’’**وَشُبِّهَ مُسْنَدٌ اِلَی الْجَارِ وَالْمَجْرُوْرِ کَاَنَّهٗ قِیْلَ وَلٰکِنْ وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِیْهُ بَیْنَ عِیْسٰی وَالْمَقْتُوْلِ**‘‘ شبہ جار مجرور یعنی لھم کی طرف مسند ہے گویا یہ کہا گیا: ’’لیکن ان کو عیسیٰ علیہ السلام اور اس مقتول میں مشابہت نظر آئی۔‘‘

مولوی صاحب اس توجیہ کی طرف (ص۱۵) کے حاشیہ میں یوں اشارہ کرتے ہیں: ’’بعض مفسرین نے شبہ کا اسناد جار مجرور کی طرف بھی مانا ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے ’’**وَلٰکِنْ وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِیْهُ اَیْ شُبِّهَ عَلَیْهِمُ الْاَمْرُ اَوْ جُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِهًا لَهُمْ**‘‘ مولوی صاحب نے اس ایک سطر عبارت کے نقل کرنے میں جو خیانت کی ہے، وہ ناظرین پر ظاہر ہوگئی

ہوگی۔ اگر جار مجرور کی طرف اسناد کرنے سے معنی آپ کے مطلب کے موافق تھے تو آپ نے اگلی عبارت پوری نقل کیوں نہ کی اور ’’بین عیسٰی و المقتول‘‘ کی خیانت کیوں کی اور اپنی طرف سے اس کے معنی ’’شُبِّہَ عَلَیْہِمُ الْاَمْرُ اَوْجُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِھًا لَھُمْ‘‘ عربی عبارت وعربی خط میں لکھ کر کیوں عبارت لمبی کی گئی اور کیوں لوگوں کو دھوکا دیا گیا؟

ایمان داری تو یہ تھی کہ آپ کتاب کی عبارت پوری نقل کردیتے۔ پھر سمجھنے والے خود سمجھ لیتے کہ یہ عبارت آپ کے موافق ہے یا مخالف۔ مولوی صاحب نے ’’وقع لھم التشبیہ‘‘ کے معنی ’’شُبِّہَ عَلَیْہِمُ الْاَمْرُ اَوْجُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِھًا لَھُمْ‘‘ کر کے اپنی لیاقت علمی کا ایک اور نمونہ دکھایا ہے۔ سبحان اللہ! کہاں کی کہاں لگادی۔ آپ پر تشبیہ اور اشتباہ مشتبہ ہوگئے اور صلہ علیٰ سے نظر ہی عالی پرواز ہوگئی اور صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ یہ فرمایا: ’’پس بجائے صلہ علیٰ کے صلہ لام کا اختیار کرنا یہ ایک دقیق بلاغت کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے کہ لام عربی میں انتفاع کے لئے آتا ہے۔‘‘ مولوی صاحب! آپ کیوں ایسے امور میں دخل انداز ہوتے ہیں جن کے آپ اہل نہیں۔ آپ ناحق لغت اور نحو کا مسئلہ چھیڑتے ہیں۔ آپ لغت اور نحو نہیں جانتے۔ آپ کو کسی استاد کے اس مصرعہ سے نصیحت کی جاتی ہے: ’’نکتہ داں نشود کرم گر کتاب خورد‘‘ اس عبارت کو بغور پڑھیں[1]۔ اشتباہ اور تشابہ وغیرہ کا صلہ جب علیٰ آئے۔ تب ان کے معنی التباس کے ہوتے ہیں۔ جیسے سورہ (بقرہ:۷۰) میں ہے: ’’اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا‘‘ بے شک موصوفہ گائے مشتبہ ہوگئی ہم پر۔‘‘

اورسورہ (رعد:۱۶) میں ہے: ’’فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْہِمْ‘‘ پیدائش مشتبہ ہوگئی اوپر ان کے۔

اورسورہ (انعام:۹) میں ہے: ’’وَلَلَبَسْنَا عَلَیْہِمْ‘‘ اور البتہ مشتبہ کرتے ہم اوپر ان کے۔

اور قاموس میں ہے: ’’شُبِّہَ عَلَیْہِ الْاَمْرُ تَشْبِیْھًا لُبِسَ عَلَیْہِ‘‘ (معاملہ اس پر مشتبہ ہوگیا)

آپ نے ناحق ’’شُبِّہَ عَلَیْہِمُ الْاَمْرُ‘‘ اور ’’وَقَعَ لَھُمُ التَّشْبِیْہُ‘‘ کو ایک بنا کر اپنی بے بضاعتی پر ہنسایا۔

پھر مولوی صاحب نے مطوّلات کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو ضرور جانتے کہ عربی میں لام کئی معنوں کے لئے آتا ہے۔ ایک ان میں سے ضرار ہے۔

[1] اب تو وہ فوت ہوچکے ہیں۔ اب کیا پڑھیں گے۔

جیسے اس آیت میں ہے: ’’فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا (یوسف: ۵) ‘‘یعنی پس وہ تیرے ضرر کی تدبیر کریں گے۔

ایسے ہی ’’وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ‘‘ میں بھی ضرار کے لئے ہم۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰهُ‘‘ پس یہود کا مکر یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کر کے قتل کر ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ کا مکر ان کے مقابلے میں یہ ہوا کہ انہی میں سے ایک شخص کو مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنا کر ان کے ہاتھ سے مصلوب کرا کے مقتول کرایا۔ جن کا ضرر انہی پر پڑا، بحکم آیت: ’’وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر:۴۳) ‘‘بداندیشی کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے۔

دیکھو دونوں آیتوں میں مکر اور کید کے لفظ ہیں جو آپس میں مترادف ہیں۔ دیگر یہ کہ جار مجرور کی طرف اسناد کرنے سے الامر کہاں سے نکال لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب بے چارے مفسرین کے اقوال سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے۔

تفسیر بیضاوی میں عبارت مذکورۃ الصدر کے آگے لکھا ہے: ’’اَوْ فِی الْاَمْرِ عَلٰی قَوْلِ مَنْ قَالَ لَمْ یُقْتَلْ اَحَدٌ وَلٰکِنْ اُرْجِفَ بِقَتْلِهٖ فَشَاعَ بَیْنَ النَّاسِ‘‘ یا اس معاملہ میں ان کے لئے تشبیہ واقع ہوئی۔ اس قائل کے قول پر کہ مقتول کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی جھوٹی افواہ اڑ گئی اور لوگوں میں شائع ہوگئی۔

اس عبارت میں سے فی الامر کو دیکھ کر پہلی توجیہ سے ملا لیا اور ایک الگ عبارت بنا کر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے ذمے لگانی چاہی۔

<u>فائدہ:</u> واضح ہو کہ مولوی صاحب نے یہ عبارت بھی (ص ۱۷) میں نقل کی ہے اور اس میں یہ خیانت کی ہے کہ ’’فی الامر‘‘ کی جگہ ’’الی الامر‘‘ لکھ کر اپنے مطلب کے موافق معنی گھڑ لئے ہیں۔ زیادہ اطمینان کے لئے تفسیر ’’ارشاد العقل التسلیم‘‘ کا مطالعہ کریں تاکہ آپ کو سمجھ آجائے کہ صحیح عبارت ’’فی الامر‘‘ ہے نہ ’’الی الامر‘‘ فافهم!

مطلب اس عبارت کا پہلی عبارت کو ملا کر یہ ہے کہ یہود کے لئے مسیح علیہ السلام اور مقتول میں تشبیہ واقع ہوگئی۔ یعنی ان کی نظر میں وہ مقتول مسیح علیہ السلام نظر آیا[1]۔ یا اس معاملے میں

[1] حاصل مطلب یہ ہے کہ یہود نے جس شخص کو صلیب پر چڑھا کر قتل کیا۔ انہوں نے اس کی نسبت یہ گمان کیا کہ وہ حضرت مسیح ہے۔ حالانکہ وہ کوئی اور تھا۔ (سعادت الاقران)

ان کے لئے تشبیہ واقع ہوئی۔’’او فی الامر ‘‘ کا عطف عبارت متقدمہ’’بین عیسٰی والمقتول ‘‘پر ہے۔گویا عبارت یوں ہے:’’او وقع لهم التشبيه في الامر الخ!‘‘ اور یہ عبارت بعطف تر دیدی کوئی نئی ترکیب نہیں جیسا کہ مولوی صاحب نے خوش فہمی سے سمجھا ہے بلکہ شبہ کی جار مجرور کی طرف اسناد کرنے میں جو دوسرے معنی ہو سکتے تھے وہ ذکر کئے ہیں اوران معنوں کے ضعف کی طرف بھی’’علٰی قول من قال‘‘ سے اشارہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو تفاسیر کے مطالعہ اور تدریس کی توفیق بخشی ہے وہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ قول شاذ ہے اور پھر بھی اس میں مسیح علیہ السلام کی عدم مصلوبیّت کی تصریح ہے اور رفع جسمی کی نفی نہیں۔

مفسرین کا دوسرا قول شبہ کی اسناد کی نسبت وہ ہے جو پہلے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفاسیر سے گزر چکا ہے۔

ناظرین! ان دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر انصاف سے نظر کریں کہ دونوں ترکیبوں سے نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یا الگ الگ؟ اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے سواء کوئی اور شخص مصلوب ہوکر مقتول ہوا۔ یہ سارا بیان مولوی صاحب کی وجہ پر ردّ ہے جو ضمناً کیا گیا۔

مفسرین کی یہ ترکیب کہ شبہ کی اسناد ضمیر مقتول کی طرف ہے نہایت ٹھیک اور قواعد لسان کے بالکل مطابق ہے:’’لِمَا قَالَ ابْنُ هِشَامٍ مُعْزِيًا اِلَى ابْنِ مَالِكٍ اِنَّهُ لٰكِنْ غَيْرُ عَاطِفَةٍ وَالْوَاوُ عَاطِفَةٌ بِجُمْلَةٍ حُذِفَ بَعْضُهَا عَلٰى جُمْلَةٍ صُرِحَ بِجَمِيْعِهَا قَالَ فَالتَّقْدِيْرُ فِىْ نَحْوِمَا قَامَ زَيْدٌ وَّلٰكِنْ عَمْرٌ وَّلٰكِنْ قَامَ عَمْرٌ وَّفِىْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كَانَ رَسُوْلَ ا للّٰهِ (مغنی ج دوم ص)‘‘ چنانچہ امام ابن ہشام نحوی نے ابن مالک نحوی کی طرف نسبت کر کے کہا کہ’’ولكن‘‘میں’’لكن‘‘غیر عاطفہ ہوتا ہے اور واؤ ایسے جملہ کو جس میں سے کچھ حذف ہوا ایسے جملہ پر جو پورا مصرح ہے۔ عطف کرتی ہے۔ پس مثال’’ماقام زيد الخ!‘‘میں تقدیر یہ ہے’’وَلٰكِنْ قَامَ عَمْرٌو‘‘اور آیت: ’’وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ‘‘میں تقدیر عبارت یوں ہے۔’’وَلٰكِنْ كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ‘‘

مولوی صاحب بے چارے علم نحو میں ایسے کم فہم ہیں کہ کسی کتاب کی عبارت نقل کرتے وقت امر مقصود اور غیر مقصود میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔’’لٰكِنَّ مُشَدَّدَةُ النُّوْنِ‘‘ کا قاعدہ لکھا اور چونکہ’’ولٰكِنْ شُبِّهَ لَهُم‘‘میں’’لٰكِنْ مُخَفَّفَةُ النُّوْنِ مَعَ الْوَاو‘‘تھا۔ اس لئے اعتراض سے بچنے کے لئے ایک عبارت کے پیچھے اتنا دنبالہ اور لگا دیا۔’’يجوز معها

ای لکن مشددة او مخففة الواو وهی اما العطف جملة علٰی جملة وامّا اعتراضية (شرح جامی وسعادت) ''اوراس دنبالہ نے آپ کی سخت تفضیح کی۔ کیونکہ لکن پرواؤ کے داخل ہونے میں تو کوئی خلاف ونزاع نہیں۔ نزاع تو اس میں ہے کہ جس ''لکن مخففة النون '' پرواؤ داخل ہو اس کا حکم کیا ہے؟ آپ اتنا تو سوچ لیتے کہ جب آیت میں ''لکن مخففة النون مع واو '' کے ہے تو اس کا بھی کسی کتاب سے قاعدہ دیکھ لیں۔ مبادا اس میں خصم کے مذہب کی کوئی تائید ہو اور پھر ندامت اٹھانی پڑھے۔

اور مزید برآں نہایت جرأت سے مولوی صاحب نے آیت سورۂ احزاب ''ولکن رسول الله '' کی ترکیب لکھ دی اور خیال نہ فرمایا کہ ائمہ نحو نے اس کی ترکیب کس طرح کی ہے؟ شاید وہ ترکیب خصم کے مذہب کی مؤید ہو۔ مولوی صاحب! اب تو خوب دیکھ لیا یا نہیں؟ کہ جس طرح ''ما قام زید ولکن عمرو ''میں قام محذوف ہے۔ اور آیت: ''وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ''میں کان محذوف ہے۔ اور''کان اور قامٗ'وہی افعال ہیں جو پہلے جملوں میں نفیاً مذکور ہیں۔ اسی طرح ''مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُم ''میں تقدیر یوں ہے۔''وَلٰکِنْ قَتَلُوْا وَصَلَبُوْا مَنْ شُبِّهَ لَهُم ''لیکن انہوں نے اس شخص کو قتل کیا اور صلیب پر چڑھایا جو ان کے لئے مسیح کے مشابہ بنایا گیا تھا۔

تفسیر کشّاف جو قرآن شریف کی عربیت اور فصاحت وبلاغت کے ذکر کرنے میں سب تفسیروں کی استاد ہے۔ اس میں یوں لکھا ہے:''وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ مَنْ قَتَلُوْهُ''لیکن شبیہ بنایا گیا واسطے ان کے جس کو قتل کیا، انہوں نے اور یہی الفاظ بعینہٖ تفسیر مدارک میں بھی ہیں اور تفسیر رحمانی جو نکات ومعارف قرآنیہ میں لاثانی ہے۔ اس میں لکھا ہے:''وَلٰکِنْ قَتَلُوْا وَصَلَبُوْا مَنْ اُلْقِیَ عَلَیْهِ شِبْهُه''پس انہوں نے اس کو قتل کیا اور صلیب دی جس پر مسیح علیہ السلام کی شباہت ڈالی گئی تھی۔

اس قاعدے کی دوسری مثال

''مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ (آل عمران:۷۹)'' کسی بشر کو جسے خدا کتاب اور فہم شریعت اور نبوت عطا کرے لائق نہیں کہ وہ لوگوں سے یہ کہے

کہ خدا کے سوائے میرے بندے بن جاؤ۔لیکن (یہ کہتا ہے) کہ رب کے بندے بنو۔

اس میں تقدیر عبارت یوں ہے ''وَلٰكِنْ يَقُوْلُ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ '' اسی طرح اس قاعدے کی مثالیں قرآن وحدیث وکتب ادب میں بکثرت ہیں۔دیکھو(۱) تفسیر جلالین، (۲) جامع البیان، (۳) بیضاوی، (۴) مدارک، (۵) خازن، (۶) سراج منیر، (۷) کبیر (۸) ابوالسعود، (۹) رحمانی، (۱۰) کشاف، (۱۱) فتح البیان، (۱۲) ابن کثیر۔[1]

اب آپ برائے خدا اپنی ہی پیش کردہ آیت سورۂ احزاب کی مثال سے اس آیت کو سمجھیں اور امام ابن مالک اور ابن ہشام اور علامہ نسفی اور علامہ علی مہائمی اور فارس میدان فصاحت علامہ جار اللہ زمخشری کی ترکیب کو تسلیم کر کے حزب اللہ میں داخل ہو جائیں اور قادیانی کے عقائد سے جلد توبہ کر کے اس کے مکائد سے بچ جائیں۔کیونکہ آیت سورہ احزاب ختم نبوت ورسالت نص قطعی ہے اور کادیانی مدعی رسالت ہے اور آپ اس کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔چنانچہ آپ کی نظم دلچسپ میں سے ایک شعر پیش کیا جاتا ہے:

ہے مقتداء امام ورسول خدا ہے وہ   صادق ہے اور امین ہے عالی خطاب ہے[2]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ''جواب باصواب'' کے باقی بعض قابل اعتراض مقامات پر بھی بنظر تحقیق نقض کیا جائے اور مجیب صاحب کو جتلا دیا جائے کہ ان کا فخریہ مصرعہ ''اس کا ہر ایک نکتہ مگر لاجواب ہے'' کہاں تک درست اور بجا ہے۔

قولہ (۱۹): ''ان کے اپنے اقرار سے ثابت ہوگیا کہ صلیب پر ضرور کوئی ایسا شخص چڑھایا گیا ہے جس کے ناک، کان، آنکھ وغیرہ تمام اعضاء مسیح علیہ السلام کے اعضاء کے مشابہ تھے۔گویا ہو بہو وہی تھا۔'' انتہیٰ!

[1] مولوی محمد علی ایم.اے لاہوری نے اس قاعدہ کا انکار کیا ہے۔چونکہ وہ عربی زبان سے ناواقف ہیں اس لئے ان کا معتبر نہیں۔

[2] حیرانی ہے کہ مولوی مبارک علی صاحب نے یہ شعر مرزا قادیانی کی زندگی میں لکھا اور ان کی زندگی بھر اس پر قائم رہے۔پھر مولوی نورالدین صاحب کی خلافت کے زمانہ میں بھی اس پر قائم رہے۔لیکن لاہوری پارٹی قادیان دارالامان سے بدر کی گئی اور انہوں نے لاہور میں اپنا الگ شاخسانہ بنالیا اور مولوی مبارک علی صاحب ان کے ہاں مدرسہ میں ملازم ہوگئے تو محمد علی صاحب ایم.اے کی موافقت میں جو عربی زبان سے ناواقف ہیں۔قادیانی رسالت سے تائب ہوگئے اور اپنا شعر بھی بھول گئے اور اسی حالت میں طاعون سے مر گئے۔

اقول: اس نامعقول قول سے روز روشن کی طرح ظاہر ہوگیا کہ مجیب صاحب کا دماغ سمجھ سے خالی ہے۔ کیونکہ مشابہت صورتی سے اتحاد ذوات لازم نہیں آتا جیسے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بصورت بشری آنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ’’فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم:۱۷)‘‘ یعنی پس وہ (جبرئیل) اس (مریم) کے پاس پورے (توانا) بشر کی شکل میں آیا۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کا جواب ذکر کیا۔ ’’اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکَ‘‘ یعنی میں تو تیرے رب کا فرشتہ ہوں۔

اس سے ظاہر ہوگیا کہ باوجود بشری صورت میں ہونے کے حقیقت ملکیت ان سے منتزع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ فرشتے کے فرشتے ہی تھے۔ اسی طرح جو شخص حضرت مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا۔ اس کی ذات اور حقیقت وہی رہی تھی۔ جو مشابہت پڑنے سے پیشتر تھی۔ گو حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت اس پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے نظائر وامثال کتب حدیث وواقعات اولیائے عظام میں بکثرت ہیں اور اصطلاح صوفیائے کرام میں اسے خلع کہتے ہیں۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بارہا بصورت بشری[1] آنا صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن نسائی وغیرہ کتب حدیث میں مصرح ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس جو فرشتے بصورت بشری آئے تھے۔ ان کا ذکر بھی قرآن شریف میں متعدد مقامات میں مذکور ہے۔ چنانچہ سورہ ہود میں ان سے حکایت کیا کہ انہوں نے کہا: ’’یَا لُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ‘‘ اے لوط! ہم تیرے رب کے فرشتے ہیں۔

اس بیان وتفصیل سے صاف معلوم ہوگیا کہ القائے شبہ سے ذات ملقٰی علیہ متغیر نہیں ہوجاتی۔ بلکہ حقیقت برحال قائم رہتی ہے۔ کیونکہ حلیہ اور شکل مثل لباس کے عوارض میں سے ہے، داخل حقیقت نہیں۔ فَافْهَمْ وَلَاتَكُنْ مِّنَ الْقَاصِرِيْنَ!

قولہ: ’’دنیا کی دو کثیر التعداد قومیں یہود ونصاریٰ تواتر قومی کے طور اس پر اتفاق رکھتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو صلیب پر ضرور لٹکایا گیا۔‘‘

اقول: جناب! یہود کے قول کو تو اللہ عزیز ذوانتقام نے ’’وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ‘‘ سے باطل کر دیا اور انہیں اس قول زور کے سبب ملعون قرار دیا اور آپ ابھی تک ان کے تواتر پر اترا رہے ہیں اور نصاریٰ کے مذہبی اختلافات کی بابت آپ کو کیا معلوم ہے۔

[1] خصوصاً آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آنا۔

یہ کس جاہل سے سیکھا تھا کہ نصاریٰ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر اتفاق رکھتے ہیں۔ آپ ان کی کتب خلافیات کا مطالعہ کریں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نصاریٰ کے قدیم فرقے یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک اور شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل ڈالی گئی تھی۔[1] چنانچہ جارج سیل صاحب قرآن شریف کے ترجمہ انگریزی میں بذیل آیت: ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران:۵۴)'' جو لکھتے ہیں۔ وہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ناظرین انصاف سے غور کریں اور رائے دیں کہ کیا حضرت روح اللہ علیہ السلام کا مصلوب ہونا عیسائیوں کا اتفاقی اعتقاد ہے؟

خلاصہ مطلب عبارات انگریزی جارج سیل صاحب

یہود کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ مکر تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور آپ کی شباہت ایک اور شخص پر ڈال دی۔ جو آپ کی بجائے گرفتار کر کے صلیب دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا متواتر مسئلہ ہے۔ بعض (عیسائی) لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قصہ القاء شباہت کا (معاذ اللہ) محمد رسول اللہ ﷺ کی اپنی اختراع ہے۔ مگر وہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ پیغمبر صاحب کے زمانے سے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے فرقوں کا یہی اعتقاد تھا۔

چنانچہ فرقہ ''بے سی لی ڈین'' جو عیسائیت کے نہایت شروع میں تھا۔ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے سے انکار کرتا تھا اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ سائمن آپ کی جگہ صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ ایسے ہی فرقہ ''سیرنتھین'' جو ان سے بھی پیشتر تھا اور کارپاکریستن جو مسیح علیہ السلام کو صرف انسان ہی مانتے ہیں۔ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص کو جو آپ کا ہم شکل تھا، صلیب دیا گیا۔

مصنف فوتین کہتا ہے کہ: ''میں نے ایک کتاب ''رسولوں کے سفرنامے'' پڑھی، جس میں پطرس، یوحنا، اندریاس، طامس اور پولوس کے اعمال مندرج تھے اور منجملہ دیگر امور کے ایک امر یہ بھی تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ کی بجائے کوئی اور شخص صلیب دیا گیا تھا اور اس لئے حضرت مسیح ان لوگوں پر ہنسے، جنہوں نے اپنے زعم میں آپ کو صلیب پر چڑھایا تھا۔''

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا تو پولوس نے گھڑا۔ جس نے منافقت سے آپ کا دین بگاڑا۔ دیکھو اس کے خطوط رومیوں، قرنتیوں وغیرہ کے نام۔ پھر اس پر کفارہ کی بنیاد ڈالی۔ (سعادت)

اس کے بعد سیل صاحب نے انجیل برنباس کی عبارت نقل کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ: ’’جب یہود بے بہبود حضرت مسیح علیہ السلام کو پڑنے کے لئے جارہے تھے۔ آپ بوساطت چار فرشتگان حضرت جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور یوریل تیسرے آسمان پر اٹھا لئے گئے کہ آپ آخر دنیا تک نہ مریں گے اور آپ کی بجائے یہودہ اسکریوطی صلیب دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مکار کو یہود کی نظروں میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایسا ہم شکل کر دیا کہ یہود اس کو پکڑ کر پلاطوس کے پاس لے گئے۔ یہ مشابہت صوری ایسی عجیب تھی کہ اس سے حضرت مریم علیہا السلام اور حواری بھی بھول گئے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کر ان کو تسلی دینے کے لئے پھر نازل ہوئے۔ اس پر برنباس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری تھا۔ اس نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ہم کو اور اپنی والدہ ماجدہ کو کیوں غم اور تکلیف میں رکھا کہ آپ ایسی بری موت سے مرے۔ گو یہ تھوڑی دیر کے لئے تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس پر یہ جواب دیا کہ اے برنباس! سچ جانیو کہ گناہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت سزا کے لائق ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ گناہ سے ناراض ہے۔ میری والدہ ماجدہ اور مؤمن حواریوں نے مجھے نفسانی پیار کی آمیزش سے محبت کی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موجودہ غم سے سزا دی تاکہ ان کو پھر دوزخ کی سزا نہ ہو اور میری تو یہ بات ہے کہ اگرچہ میں دنیا میں بے عیب رہا ہوں۔ مگر چونکہ اور لوگوں نے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہ میں قیامت کے دن شیطانوں سے مضحکہ نہ کیا جاؤں، یہودہ اسکریوطی کی موت سے مجھ پر یہ مضحکہ کرا دیا کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر مارا گیا اور دیکھ یہ مضحکہ محمد رسول اللہ ﷺ کے آنے تک رہے گا۔ وہ دنیا میں آکر ہر اس شخص کو اس غلطی سے نکالیں گے جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کی متبع ہوگا۔‘‘ انتہیٰ!

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام کی عدم مصلوبیت کا اعتقاد نصاریٰ کے قدیم فرقوں میں مسلّم تھا اور ان کی قدیم تصانیف بھی اس امر کی شہادت دیتی ہیں۔ اگرچہ وہ کسی غرض سے ان کو مخفی رکھیں۔ مگر بحکم شعر:

حدو شود سبب خیر گر خدا خواہد   خمیر مایہ وکان شیشہ گر منگیست

اور بفحوائے حدیث صحیح مسلم ’’اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ ہٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ‘‘ خدا اس دین کی مدد وفاجر آدمی سے بھی کرا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اعداء اسلام سے بھی اسلام کی تائید کرائی۔ جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرعون کے گھر میں کرائی۔

انجیل برنباس کے متعلق ایک اور نکتہ ہے کہ مرزا قادیانی دعویٰ مسیحیت سے پیشتر عیسائیوں کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے ثابت کرنے میں اسی انجیل برنباس سے انہیں ملزم کیا کرتے تھے۔ اب ان کے اپنے ہی الزام سے ہم ان کو ملزم کرتے ہیں کہ یہ عبارت جو وہ عیسائیوں کو سناتے تھے۔ خود پڑھیں ''ولعنم ما قال الشیرازی'''' بہ بندہ طمع دیدۂ ہوشمند'' مرزا قادیانی نے اپنی مسیحیت کے لئے رسول اللہ ﷺ کے اثبات نبوت کو بھی جھٹلادیا۔ ''قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ'' خدا ان کو غارت کرے کدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔''

قولہ: ''بحکم احالة العادة تواطئهم علی الکذاب'' عادۃً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو۔''

اقول: جناب مولوی صاحب! آپ کتب درسیہ کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ لہٰذا نقل عبارات سے اپنی تفضیح نہ کرایا کریں۔ شرح نخبہ میں سے یہ عبارت تو دیکھ لی۔ مگر تواتر کے افادۂ یقین کی شروط کے لئے اگلے صفحہ کو الٹ کر نہ دیکھا۔ اگر تواتر کا مدار صرف کثرت پر ہے تو افواہ اور اخبار بے سروپا کس کا نام ہے؟ پھر تو آپ کے نزدیک عوام ہندوؤں کا یہ قول کہ راون کے دس سر تھے اور ہنومان نے پہاڑ اٹھا لیا اور ایسے ایسے خزعبلات جو ان میں ذائع وشائع ہیں۔ سب متواترات میں سے ہوں گے۔ کیونکہ ان امور کو ہزاروں لوگ روایت کرتے چلے آئے ہیں۔ جناب من! تواتر کے افادہ یقین کے لئے ایک یہ شرط ہے کہ منتہیٰ، اس کا احس ہو۔

دیکھئے شرح نخبہ کے اگلے صفحہ پر ہے: ''فَاِذَا جَمَعَ هٰذِهِ الشُّرُوْطَ الْاَرْبَعَةَ وَهِيَ عَدَدٌ كَثِيْرٌ اَحَالَتِ الْعَادَةُ تَوَاطُئَهُمْ وَتَوَافُقَهُمْ عَلَى الْكِذْبِ وَرَوَوْا ذٰلِكَ عَنْ مِثْلِهِمْ مِنَ الْاِبْتِدَاءِ اِلَى الْاِنْتِهَاءِ وَكَانَ مُسْتَنَدُ اِنْتِهَائِهِمُ الْحِسَّ وَانْضَافَ اِلٰى ذٰلِكَ اَنْ يَّصْحَبَ خَبَرُهُمْ اِفَادَةَ الْعِلْمِ لِسَامِعِهٖ فَهٰذَا هُوَالْمُتَوَاتِرُ (ص۸ مطبوعہ دھلی ۱۹۱۴ء) ''پس جب یہ چاروں شرطیں پوری ہو جائیں۔ (۱) یہ کہ اتنی بڑی جماعت روایت کرے کہ عادت کی رو سے ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔ (۲) یہ کہ ابتداء سے انتہاء تک سارا سلسلہ عادل ضابطہ

راویوں کا ہو۔ (۳) یہ کہ ان کے انتہاء کی استناد امر حسّی پر ہو۔ (۴) یہ کہ ان کا خبر دینا سامع کو یقین کا فائدہ دیوے تو اسے متواتر کہتے ہیں۔

اور اسی طرح علامہ سخاوی نے ''فتح المغیث'' میں بعد ذکر دیگر شروط کے فرمایا: ''هٰذَا كُلُّهُ مَعَ كَوْنِ مُسْتَنَدِ اِنْتِهَائِهِ الْحِسَّ مِنْ مُشَاهَدَةٍ اَوْ سَمَاعٍ لِاَنَّ مَا لَا يَكُوْنُ كَذَالِكَ يَحْتَمِلُ دُخُوْلُ الْغَلَطِ فِيْهِ'' یہ سب باتیں تب معتبر ہیں کہ اس خبر کا انتہاء حس ہو۔ یعنی اگر مشاہدہ کے متعلق ہے تو مشاہدہ ہو اور اگر سماع کے متعلق ہے تو سماع ہو۔ کیونکہ جو اس طرح پر نہ ہو۔ اس میں غلطی کے داخل ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

پس اگر عقیدہ مردودہ صلیبیہ کے زعمی تواتر کو حسب ہدایت عبارات مذکورہ تحقیق کریں گے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ حضرت روح اللہ کی نسبت یہود ونصاریٰ کا قول صلیب بالکل غلط اور مردود ہے۔ پس اس وقت آپ پر یہ آیت پڑھنی ٹھیک پھبیگی۔ ''فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَائَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق:۲۲)'' پس ہم نے تیرا پردہ کھول دیا ہے۔ پس آج تیری نظر تیز ہوگئی ہے۔

شرح عقائد نسفی میں اس امر کی تصریح ہے کہ مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام کا تواتر ممنوع ہے۔[1]

قولہ: (ص۷) ''مسیح تو کیا مسیح سے بھی عالی درجات انبیاء آنحضرت ﷺ کے خدام کی منزلت نہیں رکھتے۔''

اور نیز کہا کہ: ''مسیح علیہ السلام تو ایک معمولی انسان ہے اور اس قابل بھی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے خدام کی برابری کر سکے۔''

اقول: رسول اللہ ﷺ کے امتی غایت مافی الباب ولائت کے کسی اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتے ہیں، نبی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ آیت: ''وخاتم النّبیین'' مانع ہے اور ولی کو نبی پر فضیلت دینی اہل سنت کے نزدیک کفر وضلالت ہے۔ نبی اللہ متبوع ومطاع ہوتا ہے اور امتی تابع ومطیع، تابع متبوع سے کس طرح بڑھ سکتا ہے؟ اور مطیع مطاع سے کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ مجیب

[1] کیونکہ صدر اوّل میں اس کی بابت چشم دید شہادت دینے والا ایک شخص بھی نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے وقت آپ کے سب حواری بھاگ گئے تھے۔ ملاحظہ ہو (انجیل متی ۵۶:۲۶ اور انجیل مرقس ۴۹:۱۴) پس عہد واقعہ میں واقعہ کا گواہ ہی کوئی نہیں تو زمانہ مابعد کی کثرت کسی کام کی نہ رہی۔ (سعادت)

صاحب علم اسلامی سے ایسے بے خبر ہیں کہ اہل سنت کے مشہور عقائد بھی آپ کو معلوم نہیں۔ قصیدہ امالی میں ہے:

وَلَمْ یَفْضُلْ وَلِیٌّ قَطُّ دَهْرًا نَبِیًّا اَوْ رَسُوْلاً فِیْ انْتِحَالِی

یعنی ولی کبھی بھی نبی یا رسول سے افضل نہیں ہوسکتا۔

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ’’وَذٰلِکَ لِاَنَّ الْوَلِیَّ تَابِعٌ لِلنَّبِیِّ وَلَا یَکُوْنُ التَّابِعُ بِاَعْلٰی مَرْتَبَةٍ مِّنَ الْمَتْبُوْعِ وَلِاَنَّ النَّبِیَّ مَعْصُوْمٌ مَّامُوْنُ الْعَاقِبَةِ وَالْوَلِیُّ یَجِبُ اَنْ یَّکُوْنَ خَائِفًا عَنِ الْخَاتِمَةِ وَلِاَنَّ النَّبِیَّ مُکَرَّمٌ بِالْوَحْیِ وَمُشَاهَدَةِ الْمَلَائِکَةِ الْکِرَامِ وَالرَّسُوْلُ مَامُوْرٌ بِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ وَاِرْشَادِ الْاِمَامِ بَعْدَ اِتِّصَافِهٖ بِکَمَالَاتِ الْوَلِیِّ فِی الْمَقَامَاتِ الْفِخَامِ فَمَا نُقِلَ عَنْ بَعْضِ الْاِکْرَامِیَّةِ مِنْ جَوَازِ کَوْنِ الْوَلِیِّ اَفْضَلُ مِنَ النَّبِیِّ کُفْرٌ وَّضَلَالَةٌ وَّعِبَارَةُ النَّسَفِیْ فِیْ عَقَائِدِهٖ وَلَا یَبْلُغُ وَلِیٌّ دَرَجَةَ الْاَنْبِیَاءِ اَوْلٰی مِنْ عِبَارَةِ النَّاظِمِ لِاِفَادَتِهَا نَفْیَ الْمُسَاوَاتِ اَیْضًا. انتهٰی‘‘

اس کا سبب یہ ہے کہ ولی نبی کے تابع ہوتا ہے اور کوئی پیرو اپنے پیشوا سے افضل رتبہ پر نہیں ہوسکتا۔ نیز اس لئے کہ نبی معصوم ہے اور خاتمہ سے امن میں ہے اور ولی کے لئے ضروری ہے کہ خاتمہ سے ڈرتا رہے۔ نیز اس لئے کہ نبی وحی سے اور ملائکہ مقربین کے مشاہدے سے مشرف ہوتا ہے اور رسول احکام الٰہی کی تبلیغ اور خلقت کے ارشاد کا مامور ہوتا ہے۔ بعدازاں کہ ولی کے کمالات سے بھی نہایت عالی مقامات پر موصوف ہو۔ پس بعض کرامیہ سے جو نقل کیا گیا ہے کہ جائز ہے کہ کوئی ولی کسی نبی سے افضل ہو، سو کفر اور ضلالت ہے اور امام نسفی کی یہ عبارت کہ: ’’کوئی ولی انبیاء کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا‘‘ اس ناظم کی عبارت سے اولیٰ ہے۔ کیونکہ اس میں مساوات کی بھی نبی کا فائدہ ہے۔

اسی طرح تمہید ابی الشکور سالمی میں ہے: ’’قَالَ اَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ اِنَّ النَّبِیَّ اَفْضَلُ مِنْ وَلِیٍّ وَاِنْ کَانَتْ دَرَجَتُهٗ اَدْوَنَ مِنْ دَرَجَاتِ النُّبُوَّةِ وَقَالَ الْمُنْقَشِّفَةُ مِنَ الْکَرَامِیَّةِ اِنَّهٗ یَجُوْزُ اَنْ یَّکُوْنَ الْوَلِیُّ اَفْضَلَ مِنَ النَّبِیِّ وَهٰذَا کُفْرٌ. انتهٰی‘‘ اہل سنت والجماعت کا قول یہ ہے کہ ہر نبی ہر ولی سے افضل ہوتا ہے۔ خواہ وہ

نبی درجات نبوت کے کسی ادنیٰ درجے پر ہو اور کرامیہ میں سے منقشفہ کہتے ہیں کہ ولی کا نبی سے افضل ہونا جائز ہے اور یہ کفر ہے۔

اسی طرح دیگر کتب عقائد میں بھی مذکور ہے۔ پس مولوی صاحب کا اس کے خلاف لکھنا ان کی جہالت اور ضعف ایمان پر دلیل بیّن ہے۔

قولہ: (ص۸) ''اگر وہ بقول مشتہر صاحب صلیب پر چڑھا ہی نہیں سکے تو پھر مکر کون سا ہوا۔ جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بلاوقوع کس امر کے اس کا وقوع ان کی طرف منسوب کر دیا ہے؟''

اقول: ''سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست'' یہ امر بھی مجیب صاحب کی بے لیاقتی ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ مکر کہتے ہیں تدبیر محکم کو۔ جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے۔ یہود نے حضرت روح اللہ کو صلیب پر چڑھانے کی صرف تدبیر ہی کی تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس ارادۂ بد کو ان کی طرف منسوب کیا اور جس شخص کو علوم درسیہ میں ادنیٰ سی ممارست بھی ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ ارادۂ انسانی کو وقوع فعل لازم نہیں۔ پس یہ ضرور نہیں کہ جب تک فعل صلب کا وقوع نہ ہو تب تک یہود کی طرف ارادہ وتدبیر ایصال شر منسوب نہ کر سکیں۔ فافھم!

مجیب صاحب اگر اپنی ہی عبارات کو محفوظ رکھتے تو ایسی فاش خطا اور ڈبل غلطی نہ کرتے۔ چنانچہ آپ اسی صفحہ کی سطر دوم میں فرماتے ہیں کہ یہود نے ایک منصوبہ بنایا اور تیسری سطر میں ''چاہا'' لکھتے ہیں اور سطر ششم میں پھر منصوبہ تحریر کرتے ہیں۔ آپ غور کریں اور انصاف سے کہیں کہ کیا منصوبہ بنانے اور چاہنے کے یہی معنی ہوا کرتے ہیں کہ وہ امر بالضرور بالضرور واقع بھی ہو جائے۔ جناب من! ارادہ امر دیگر اور صدور فعل امر دیگر۔

قولہ: (ص۱۱) ''لیکن دعویٰ کی تکذیب نہیں کی۔''

اقول: حضرت! اس آیت: ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (محمد:۲۴) '' تو کیا یہ لوگ قرآن کو تدبر سے نہیں پڑھتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔ کے مصداق بھی تو پائے جانے چاہئیں۔ اگر آپ کو یہود کے دعویٰ قتل مسیح علیہ السلام کی تردید وتکذیب معلوم نہیں ہوئی تو اس میں قصور کس کا ہے:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اللہ تعالیٰ نے یہود کی لاف قتل مسیح علیہ السلام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ’’اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ (نساء:۱۵۷)‘‘ ہم نے ضرور عیسیٰ مسیح ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا۔

اس میں دو امر ملحوظ ہیں۔ اوّل دعویٰ قتل مسیح علیہ السلام کو بطور مفاخرت ذکر کرنا۔ کیونکہ نفس قتل امر فخر نہیں تھا۔ بلکہ ان کے زعم میں قتل محل خاص میں واقع ہوا۔ اس لئے مفعول یعنی المسیح کو موصوف ذکر کیا اور یہی مفاخرت یہود اس امر کی مؤید ہے کہ: ’’مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ‘‘ میں نفی قتل وصلب کو مقصور علی المفعول کیا جائے۔ دوم لفظ ’’انّا‘‘ سے اس زعم پر یہود کا جزم۔ سو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امر اوّل کی تکذیب وتردید ’’مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ‘‘ سے کردی اور ان کے فخر کو خاک میں ملا دیا اور امر دوم یعنی ان کے جزم کا ابطال ’’وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا‘‘ سے فرمادیا اور حقیقت امر کو ’’وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ‘‘ اور ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ سے کھول دیا کہ کوئی اور شخص مصلوب ہوکر مارا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا اَحْکَمَ کَلَامَہٗ!

دوسری وجہ جس سے آیت ’’وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسٰی بْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ (نساء:۱۵۷)‘‘ یعنی اور ان کے اس قول کے سبب بھی (ہم نے ان پر لعنت کی) کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے ضرور مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا۔ عقیدہ ملعونہ صلیبیہ کی تردید کرتی ہے۔ یہ ہے کہ جن جرائم کے سبب اللہ تعالیٰ جبار قہار نے یہود پر لعنت کی، منجملہ ان کے ان کا قول بہ قتل وصلب[1] مسیح علیہ السلام ہے۔ ان جرائم میں سے بعض تو محض اقوال ہیں اور بعض افعال جیسا کہ ’’فَبِمَا نَقْضِھِمْ مِیْثَاقَھُمْ‘‘ سے ’’وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا‘‘ تک غور کرنے سے واضح ہوتا ہے۔

افعال یہ ہیں:

اوّل: نقض میثاق کیونکہ خلاف میثاق فعل سے صادر ہوتا ہے۔

[1] اکمل صاحب اس پر کہتے ہیں: یہ صلب آپ نے کہا سے ملالیا۔ جواب: ماقتلوہ کے بعد ماصلبوہ سے یعنی قتل کی نفی کے بعد صلب کی نفی کرنے سے معلوم ہوا کہ یہود اس امر کے مدعی تھے کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر ماردیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی الگ الگ نفی کردی۔ فافھم!

دوم: کفر بآیات اللہ کیونکہ یہ فعل تحریف کلمات اللہ وقتل انبیاء واخذ رشوت وسود جیسے افعال قبیحہ کی طرف کھینچنے والا ہوا۔

سوم: قتل انبیاء یہ اگرچہ کفر ہی کا نتیجہ ہے۔ مگر چونکہ باصلہٖ مستقل ایک کفر ہے اس لئے علیحدہ ذکر کیا گیا۔

اور اقوال یہ ہیں:

اوّل: ان کا ''قُلُوْبُنَا غُلْف'' کہنا۔

دوم: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے پدر پیدا ہونے پر قدرت قادر عزیز سے انکار کرنا اور چونکہ ان کا کفر دو زمانوں میں ہوا۔ اوّل قبل مبعث عیسیٰ علیہ السلام پھر بعد آپ کی ولادت اور بعثت کے۔ اس لئے کفر کو مکرر ذکر کیا اور اسی نکتہ کے لئے اعادہ جار بھی کیا۔

سوم: مریم صفیۃ اللہ علیہا السلام پر بہتان لگانا۔

چہارم: ان کا یہ کہنا کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مار ڈالا ہے۔

ناظرین! قرآن کریم کی فصاحت اور حسن بیان پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اقوال وافعال میں کس طرح فرق کیا ہے۔ جملہ افعال کو نسبت صدوری وقوعی سے ذکر کیا ہے کہ بے شک ان سے یہ افعال قبیحہ سرزد ہوئے۔ ''کَمَا یَشْھَدُ بِذٰلِکَ طَرِیْقُ الْبَیَانِ'' جیسا کہ طریق بیان اس کی شہادت دیتا ہے اور جملہ اقوال کو مردود و مکذوب فرمایا۔ چنانچہ ''قَوْلِھِمْ قُلُوْبُنَا غُلْف'' کو ''بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ'' سے رد کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے بارے میں جو اقوال مردودہ آپ پر اور حضرت صفیۃ اللہ پر کہے تھے۔ ان کو لفظ بہتان سے اور نیز ''اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ'' (بے شک عیسیٰ کا معاملہ خدا کے نزدیک آدم کی طرح ہے) سے اور نیز ''قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ (مریم:۳۰)'' (کہا میں خدا کا کامل بندہ ہوں) سے اور نیز ''وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا (انبیاء:۹۱)'' سے رد فرمایا اور دعویٰ قتل کو ''وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ'' (اور نہیں قتل کیا انہوں نے اس کو اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا) سے مکذوب کیا۔

اس بیان وتفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر فعل صلب صورت فعلیہ میں صادر ہوا ہوتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ فعل کو سبب لعنت قرار دیتا نہ مجرد قول کو اور پھر عبارت ''وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ'' کی بجائے ''وَبِصَلْبِھِمُ الْمَسِیْحَ'' ہوتی۔ کیونکہ صلیب پر چڑھانا اور

معاذ اللہ! رسول برحق کے پاک ہاتھوں میں میخیں لگانا وغیرہ وغیرہ! زیادہ سخت جرم ہے۔ مجرد افتراء و بہتان سے۔ اس قول بقتل المسیح کے سبب یہود کو ملعون و مردود گردانے سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت یہ قول سخت ناپسند ہے۔ کیونکہ جس حکمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر مرفوع کیا اور اس وقت تک زندہ رکھا اور پھر آخری زمانے میں دنیا میں نازل کرے گا۔ اس قول مردود سے اس حکمت کا ابطال وبطلان لازم آتا ہے۔ پس اگر اب بھی کوئی شخص حضرت مسیح علیہ السلام کے صلیب پر چڑھائے جانے اور ان کی موت قبل النزول کا قائل ہو تو چونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کو باطل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا حکم بھی یہود بے بہبود کا حکم ہے۔

اس آیت مبارکہ طیبہ میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ چونکہ اس ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کے بعض انبیاء کو قتل کرنے کا ذکر کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت بھی یہود و بعض فرق نصاریٰ کا یہی قول تھا کہ وہ مصلوب ہو کر مقتول ہوئے اور حقیقت الامر اس کے خلاف تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل وصلب کی نفی علیحدہ طور پر کر دی تاکہ کوئی حقیقت ناشناس آپ کو بھی ان انبیاء کے زمرہ میں شمار نہ کرلے۔ جو یہود کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور اس طرز بیان کو ''التخصیص بعد التعمیم لاخراج الخاص عن حکم العام'' کہتے ہیں۔ پس اس آیت سے ملحدین کی صلیب بالکل منہزم ومنکسر ہوگئی۔ **والحمد للہ علیٰ ذلک!**

کسر صلیب کی تیسری آیت

''**وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ** (مائدہ:۱۱۰)'' یعنی (اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمائے گا کہ میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ) جب تم بنی اسرائیل کے پاس معجزات لائے اور انہوں نے ان معجزات کو جادو کہا (اور تم پر دست درازی کرنی چاہی) تو ہم نے ان کا ہاتھ تم سے (دور) روکے رکھا۔ یعنی تمہارے پاس تک نہ آنے دیا۔ یہ آیت بالصراحت صلیب ملحدین کو توڑ رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہود کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے روکنے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نعمت فرماتا ہے اور آپ کو امتناناً یاد کراتا ہے۔ معاذ اللہ! اگر حضرت مسیح علیہ السلام یہود کے ہاتھ سے صلیب پر چڑھائے جائیں تو اس صورت میں

امتنان سے کذب باری سبحانہٗ لازم آتا ہے۔ایسا اعتقاد کفر ہے۔اعاذنا اللہ من ذلک!

اسی سورت مائدہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی ایسے ہی کلمات طیبات سے نعمت یاد کرائی ہے۔چنانچہ فرمایا:''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ (مائدہ:۱۱)''یعنی اے مسلمانو!تم اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی۔جب قوم کفار نے تم پر دست درازی کرنی چاہی تو ہم نے ان کے ہاتھ تم سے روکے رکھے۔

جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں کفار یہود نے مکر ایصال شر کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو آپ تک نہ پہنچنے دیا۔اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ حبیب خدا، اشرف انبیاء علیہ السلام کے حق میں بھی طائفہ یہود بنی نضیر نے ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے شر سے بالکل محفوظ رکھا۔(ابن کثیر سورۃ مائدہ) اور الٹا ان ہی پر وبال جلاوطنی نازل کیا۔(ابن کثیر سورۃ حشر) یہ آیت اس نعمت عظمیٰ کی تذکیر و یاددہانی کے لئے ہے۔

سبحان اللہ!جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو خطاب''یٰعِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ''فرمایا اسی طرح اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ''سے خطاب کیا اور جس طرح حضرت عیسیٰ کو''وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ''سے نعمت یاد دلائی۔اسی طرح اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو''اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ فَکَفَّ اَیْدِیَھُمْ عَنْکُمْ (المائدہ:۱۱)''سے انعام یاد کرایا۔پس جس طرح سے اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند اور آسیب نہیں پہنچا۔اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی ہرگز صلیب کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ کفّ کے متعلق ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ''یعنی اور جب ہٹا رکھا میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو اور یہ نہیں فرمایا:''وَاِذْ نَجَّیْتُکَ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ''یعنی جب بچایا تجھ کو الخ! جیسے کہ دوسرے مقام پر بنی اسرائیل کو اپنی نعمت یاد کرائی۔''وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ (بقرہ:۴۹)''اور جب بچایا ہم نے تم کو آل فرعون سے، پہنچاتے تھے تم کو بہت برا عذاب۔

کیونکہ اس صورت میں وہم پڑسکتا ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرلیا ہوگا اور آپ کو کچھ اذیت بھی پہنچائی ہوگی۔ مگر آخرکار اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ہاتھ سے بچالیا ہوگا۔ جیسا کہ عقیدہ ملعونہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ بنی اسرائیل فرعون کے ملک میں غلام تھے اور وہ ان کو ہر طرح کی تکلیف پہنچاتا تھا۔ مگر آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے ظلم سے نجات دی۔ لیکن پہلی صورت میں یعنی قرآن شریف کے الفاظ میں اس وہم کی سراسر تردید ہے۔ یعنی اوّل تو لفظ نجات (بچانا) کی بجائے لفظ کف (ہٹا رکھنا) استعمال کیا۔ دوم یہ کہ کف کا مفعول ''بَنِیْ اِسْرَائِیْل'' کو کیا نہ ''ک'' ضمیر مخاطب کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا: ''کَفَفْتُکَ عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْل'' (ہٹا رکھا تجھ کو بنی اسرائیل سے) کیونکہ ارادہ ضرر پہنچانے کا یہودیوں کا تھا۔ پس انہی کو ہٹا رکھنے کا ذکر مناسب ہے۔ سوم یہ کہ کف کا صلہ عن ذکر کیا جو بُعد (دوری) کے لئے آتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق سے دشمنوں کو بالکل دور ہٹائے رکھا اور آپ کے پاس تک بھی پھٹکنے نہ دیا تو پھر وہ کس طرح آپ کو کوئی اذیت پہنچا سکتے ہیں اور کیسے صلیب پر کھینچ سکتے ہیں[1]۔

یہی آیت یعنی ''وَاِذْ کَفَفْتُ'' دوسری آیت: ''وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (کافروں سے تجھے پاک رکھنے والا ہوں) کی صحیح تفسیر ہے کہ اس میں بھی تطہیر سے مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے ہاتھ سے پاک رہیں گے۔ جملہ معتبر تفاسیر میں اس آیت ''وَاِذْ کَفَفْتُ'' کے ذیل میں ایسا ہی مذکور ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک رسول حضرت روح اللہ علیہ السلام کو یہود کے ہاتھ میں گرفتار نہیں ہونے دیا اور کوئی گزند پہنچنے نہیں دیا۔ بلکہ مبسوط تفاسیر میں ''رُفِعَ اِلَی السَّمَآءِ'' کی بھی تصریح ہے۔

[1] اکمل صاحب فرماتے ہیں باوجود وعدہ ''وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ:۶۷)'' کے حضرت رسول کریم ﷺ کا دانت مبارک شہید ہوا...... کففت کا لفظ یعصمک سے زیادہ نہیں۔ جواب: اوّلاً تو یہ ہے کہ: ''وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ'' دانت مبارک شہید ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ ثانیاً یہ کہ عصمت کا لفظ اس موقع پر بولا جاتا ہے۔ جب کوئی گرفتار مصیبت ہو اور پھر اس سے بچالیا جائے۔ دیکھو سورہ ہود میں ہے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے طوفان میں مبتلا ہونے کے وقت کہا: ''سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ'' اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا: ''لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ'' پس کف کا لفظ عصمت کی نسبت زیادہ ہوا۔

چنانچہ فتح البیان میں ہے: ’’وَلَمَّا اَتٰی عِیسٰی بِھٰذِہِ الْاٰیَاتِ الْبَیِّنَاتِ قَصَدَ الْیَھُوْدُ بِقَتْلِہٖ فَخَلَّصَہُ اللّٰہُ مِنْھُمْ وَرَفَعَہٗ اِلَی السَّمَآءِ (فتح البیان ج۲)‘‘ اور جب عیسٰی علیہ السلام نے یہ روشن نشانات (معجزات) دکھلائے تو یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ سو خدا تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے صاف نکال لیا اور آسمان کی طرف اٹھالیا۔

اور اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں یہ لکھا ہے: ’’اَیْ وَاذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ فِیْ کَفِّیْ اِیَّاھُمْ عَنْکَ حِیْنَ جِئْتَھُمْ بِالْبُرَاھِیْنِ وَالْحُجَجِ الْقَاطِعَۃِ عَلٰی نُبُوَّتِکَ وَرِسَالَتِکَ مِنَ اللّٰہِ اِلَیْھِمْ فَکَذَّبُوْکَ وَاتَّھَمُوْکَ بِاَنَّکَ سَاحِرٌ وَسَعَوْا فِیْ قَتْلِکَ وَصَلْبِکَ فَنَجَّیْتُکَ مِنْھُمْ وَرَفَعْتُکَ اِلَیَّ وَطَھَّرْتُکَ مِنْ دَنَسِھِمْ وَکَفَّیْتُکَ شَرَّھُمْ. انتھی! (ابن کثیر زیر آیت ھذا)‘‘ یعنی اے مسیح علیہ السلام تو وہ نعمت یاد کر جو ان یہود کو تجھ سے دور ہٹا رکھنے کے بارے میں کی۔ جب تو ان کے پاس یقینی دلائل اور قطعی ثبوت اپنی نبوت اور رسالت کے لایا تو انہوں نے تیری تکذیب کی اور تجھے تہمت لگائی کہ تو جادوگر ہے اور تیرے قتل وعذاب میں سعی کرنے لگے تو ہم نے تجھ کو ان میں سے نکال لیا اور اپنی طرف اٹھالیا اور تجھے ان کی میل سے پاک رکھا اور ان کی شرارت سے بچالیا۔

اور اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے: ’’رُوِیَ اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ لَمَّا اَظْھَرَ ھٰذِہِ الْمُعْجِزَاتِ الْعَجِیْبَۃِ قَصَدَ الْیَھُوْدُ قَتْلَہٗ فَخَلَّصَہُ اللّٰہُ مِنْھُمْ حَیْثُ رَفَعَہٗ اِلَی السَّمَآءِ. انتھٰی!‘‘ مروی ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام نے یہ معجزات مذکورہ دکھلائے تو یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ سو خدا تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے اس طرح صاف نکال لیا کہ انہیں آسمان پر اٹھالیا۔

اور اسی طرح تفسیر خازن میں ہے: ’’وَذٰلِکَ اَنَّ عِیْسٰی علیہ السلام لَمَّا اَتٰی بِھٰذِہِ الْمُعْجِزَاتِ الْعَجِیْبَۃِ الْبَاھِرَۃِ قَصَدَ الْیَھُوْدُ قَتْلَہٗ فَخَلَّصَہُ اللّٰہُ مِنْھُمْ وَرَفَعَہٗ اِلَی السَّمَآءِ‘‘ اور اس کا سبب یہ تھا کہ جب عیسٰی علیہ السلام ایسے عجیب اور روشن معجزات لے کر آئے تو

۱؎ تفاسیر میں اس موقع پر جو خَلَّصَہُ اللّٰہُ وغیرہ الفاظ نقل کئے گئے تو ہمارے اکمل صاحب نہایت بھولے پن سے کہتے ہیں کہ بس ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ کففت اور نجیت مترادف ہیں (ص۱۸،۱۹) جواب: آپ نے ان تفسیروں میں نجّیتک وغیرہ دیکھ لیا اور تصریح ’’رَفَعَ اِلَی السَّمَآءِ‘‘ نہ دیکھی۔ حَفِظْتَ شَیْئًا وَغَابَتْ عَنْکَ اَشْیَاءُ!

یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے صاف ہی نکال لیا اور آسمان پر اٹھالیا۔

مرزا قادیانی نے اپنے رسالہ ازالہ اوہام میں ان آیات تذکیر انعامات میں کہا ہے کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے ہیں تو ایسا بھاری انعام ان نعمتوں میں کیوں معدود نہیں ہوا۔ جواباً عرض ہے کہ اگر چشم حق بین سے دیکھیں تو ’’وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ‘‘ اسی نعمت جلیلہ کی تذکیر کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ جب بیان قرآنی کی رہنمائی سے مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے صورت واقع کو ملحوظ رکھ کر اس آیت سے سمجھ لیا تو جس شخص پر یہ انعام وارد ہوا۔ ہو کیوں نہ سمجھے گا۔ ’’فَتَدَبَّرْ لَعَلَّکَ تَرْشُدْ‘‘

سوال: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کفار نے آگ میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس آگ سے بچالیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہود نے حضرت روح اللہ کو صلیب پر چڑھا دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ رکھا اور ان کے ہاتھ سے مرنے نہ دیا تو اس میں کیا حرج ہے؟

جواب: مصنف رسالہ ’’جواب باصواب‘‘ کو بھی (ص۱۰) میں یہی خبط ہوا ہے۔ جناب! وقائع اور امور تاریخیہ میں قیاس کو بالکل دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا مدار صرف روایت وشہادت ہی پر ہوتا ہے۔ وقائع میں قیاسیات کے مفید نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وقوع حوادث کی صورت واحد دون آخر نہیں ہوتی۔ پس حضرت روح اللہ کے واقعہ کو قیاس محض سے واقعہ حضرت خلیل اللہ کا ہمرنگ بنانا جہالت وسفاہت ہے۔ کیونکہ صورت نجات اسی ایک طریق میں منحصر نہیں ہے۔ ’’کَمَا لَا یَخْفٰی عَلٰی مَنْ لَہٗ اَدْنٰی تَاَمُّلٌ‘‘ دیگر یہ کہ ہمارا دین سماعی ہے، قیاسی نہیں۔ یعنی جو امر جس طرح قرآن وحدیث میں وارد ہے۔ اسے اسی طرح تسلیم کرتے ہیں اور اپنے قیاسیات سخیفہ اور خیالات ضعیفہ پر مدار نہیں رکھتے۔ چونکہ قرآن مجید میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا آگ میں پڑنا اور پھر سلامت رہنا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس واقع کو اسی طرح مانتے ہیں اور چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام کا صلیب پر نہ چڑھایا جانا اور یہود کا آپ کو مس تک بھی نہ کرسکنا مذکور ہے۔ اسی لئے اسی طرح یقین رکھتے ہیں۔ اپنے خیال وقیاس سے کچھ نہیں کہتے۔

حضرت خلیل اللہ کے واقعہ نار کی بابت سورہ انبیاء میں فرمایا: ’’قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاہِیْمَ وَاَرَادُوْ بِہٖ کَیْدًا فَجَعَلْنٰھُمُ الْاَخْسَرِیْنَ

(انبیاء: ۶۹، ۷۰) ’’ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا اور انہوں نے ابراہیم سے داؤ کرنا چاہا تھا۔ پس ہم نے انہی کو نہایت زیاں کار کر دیا۔

اور سورت صافات میں ’’الاسفلین‘‘ (نہایت پست) فرمایا۔ سوان آیات میں امر ’’یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ‘‘ مشعر اس امر کا ہے کہ آپ آگ میں ڈالے گئے تھے۔ کیونکہ امر ’’یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا‘‘ نہیں ہوسکتا، جب تک آگ موجود نہ ہو[1] اور ’’علٰی ابراھیم‘‘ صادق نہیں ہوسکتا، جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں واقع نہ ہوں۔

علاوہ اس کے حدیث میں رفعاً وارد ہوا۔ ’’عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا اُلْقِیَ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ فِی النَّارِ قَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ وَاحِدٌ فِی السَّمَآءِ وَاَنَا فِی الْاَرْضِ وَاحِدٌ اَعْبُدُکَ (ابن کثیر ج ۶، ص ۲۸۵)‘‘ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو آپ نے کہا اے خدا! تو آسمان میں واحد (لاشریک) ہے اور (اس وقت) زمین میں صرف میں اکیلا تیری (خالص) عبادت کرتا ہوں الخ!

نیز صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً وارد ہے: ’’عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ اٰخِرُ قَوْلِ اِبْرَاھِیْمَ حِیْنَ اُلْقِیَ فِی النَّارِ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ (کتاب التفسیر سورۂ آل عمران)‘‘ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو آخری بات جو آپ نے کی وہ یہ تھی ’’حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ‘‘ یعنی مجھے صرف اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔ پس اس سے آگ کا واقعہ صاف ثابت ہوگیا۔ نیز یہ کہ کفار کو ’’اخسرین‘‘ اور ’’اسفلین‘‘ نہ فرمایا بلکہ اسم تفضیل میں اسم فاعل پر از روئے معنی زیادتی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ پس کفار ’’الاخسرین‘‘ یعنی سخت زیاں کار اور ’’الاسفلین‘‘ یعنی نہایت پست اور ذلیل تب ہی ہوسکتے ہیں۔ جب اپنا سارا زور بل لگا چکیں اور اپنے اسباب کو استعمال میں لا چکیں اور پھر اپنے ارادے میں ناکام رہیں۔

[1] وجود خارجی بھی ہوتا ہے اور ذہنی بھی خدا کے امر میں دونوں برابر ہیں۔ صورت اس کی یہ ہے کہ اگر خدا کے امر کے وقت مامور خارج میں موجود نہ بلکہ خدا کے علم میں ہو تو خدا تعالیٰ اس صورت علمیہ کو امر کرتا ہے تو لزوماً خارج میں اس کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ’’اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ (یٰس: ۸۲)‘‘

جیسا کہ سورۂ کہف کے اخیر میں فرمایا: ’’قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (کھف:۱۰۳،۱۰۴)‘‘ ترجمہ: (اے پیغمبر! ان سے) کہو کیا ہم تم کو بتائیں کہ اے اعمال میں کون نہایت زیاں کار رہتے ہیں؟ ایسے وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کی سعی اسی زندگی میں اکارت جائے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نیک کام کرتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ’’اخسر‘‘ اس کو کہتے ہیں۔ جس کی سعی اکارت جائے نیز فرمایا: ’’فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ اِلَّا اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (عنکبوت:۲۴)‘‘ یعنی ان کی قوم سے کوئی جواب اس کے سوائے بن نہ آیا کہ وہ کہنے لگا کہ اسے قتل کر ڈالو یا اسے آگ میں جلا دو۔ پس خدا نے اسے اس آگ سے نجات دی۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف آپ کی قوم کی دو تجویزیں ذکر کی گئیں ہیں۔ قتل یا آگ میں جلانا۔ پھر آگ سے بچالینے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ کفار آگ میں ڈالنے کی تجویز کو عمل میں لائے تھے۔ لیکن خدائے قہّار نے آپ کو اس کے گزند سے محفوظ رکھا۔ دیگر یہ لفظ نجات جو اس آیت میں وارد ہے۔ اس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کوئی مبتلائے مصیبت ہو اور پھر اس سے بچ جائے۔ چنانچہ فرمایا ’’قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (انعام:۶۳)‘‘

اور نیز یہی وجوہات مذکورہ اس امر کی مؤیّد ہیں کہ کفار کا کید حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے خلاف صرف تدبیر تک ہی نہ رہا تھا۔ بلکہ صورت فعلیہ میں سرزد ہوا تھا اور پھر وہ اس میں ناکام رہے۔ بخلاف حضرت مسیح علیہ السلام کے کہ کفار یہود کا مکر صورت فعلیہ میں صادر نہیں ہوا۔ جیسا کہ ’’وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا‘‘ اور ’’وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ‘‘ اور ’’وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ عَنْكَ‘‘ سے ظاہر ہے۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ دیگر رسولوں کو انہی اسباب ارضیہ سے۔ اسی زمین میں مکائد کفار سے نجات دیتا رہا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کو ارض مقدسہ کی طرف اور اپنے حبیب ﷺ کو مدینہ طیبہ میں ہجرت کرائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں آسمان پر اٹھالیا۔ کیا زمین پر نہیں بچا سکتا تھا؟

جواب: مصنف رسالہ ''جواب باصواب'' کو بھی یہی خبط ہوا ہے۔ چنانچہ بڑے مبہوت ہوکر (ص۱۰) میں یہی سوال کرتے ہیں اور نیز (ص۱۳) کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''چونکہ آنحضرت ﷺ کی اس محصوریت سے نجات اس عالم میں ارضی اسباب اور قدرتی تائیدات سے ہوگئی تھی...... الخ!'' سو اس کا جواب بالتحقیق والتفصیل ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' کی تفسیر میں ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

کسر صلیب کی چوتھی آیت

''وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران: ۴۵)'' ترجمہ: صاحب وجاہت ہوگا دنیا وآخرت میں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صفت ''وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ'' سے موصوف کیا۔ اس لئے آپ مصلوب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ مصلوبیت اس عالم دنیوی میں لحوق ذلت وخزی کا سبب ہے اور خزی وخذلان منافی وجاہت ہے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ: ۳۳ میں بعد ذکر تصلیب وغیرہ کے فرمایا: ''ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا'' یہ ان کے لئے اس زندگی میں خواری ہے۔ معاذ اللہ! اگر حضرت روح اللہ علیہ السلام صلیب پر لٹکائے جائیں تو وجاہت باقی نہیں رہتی۔ خواہ صلیب سے زندہ اتارے جائیں۔ کیونکہ لحوق خزی کے لئے مجرد صلیب پر لٹکایا جانا کافی ہے۔ موت بالصلیب ضروری نہیں۔ ''وَحَاشَا شَانُ رُوْحِ اللّٰهُ الْوَجِیْهِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ عَنْ ذٰلِکَ[1]'' پس عقیدہ ملعونہ صلیبیہ بالکل مردود ہے۔

سوال: حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں یہود بے بہبود نے کیسے کیسے ناشائستہ کلمات کہے۔ کیا یہ امر منافی وجاہت نہیں؟

جواب: جھوٹے طعن اور بہتان سے شان بری میں کوئی قدح واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ اذی بالقول اور وجاہت میں منافات نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں فرمایا: ''فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَکَانَ عِنْدَاللّٰهِ وَجِیْهًا (احزاب: ۶۹)'' یعنی پس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو اس سے جو انہوں نے کہا تھا، بری کیا اور وہ خدا کے نزدیک صاحب وجاہت تھا۔ پس جس طرح حضرت کلیم اللہ کو مضمون مقولہ یہود سے بری کیا اور آپ کی وجاہت میں کوئی نقص نہ آیا۔ اسی طرح حضرت روح اللہ اور کلمۃ اللہ کو معجزہ تکلم فی المهد سے طعن یہود سے بری کیا۔ پس آپ کی وجاہت میں بھی کوئی فرق نہیں آسکتا۔ **فافهم وتدبّر!**

[1] حضرت روح اللہ جو دنیا اور آخرت میں وجاہت والے ہیں، ان کی شان اس سے پاک ہے۔ (عبدالقیوم میر)

فصل ثانی

در اثبات حیات و رفع عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع الی السمآء بنصوص قطعیہ ثابت ہے۔ چنانچہ پہلی آیت یہ ہے: ''اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران:۵۴)'' جب کہا اللہ تعالیٰ نے اسے عیسیٰ علیہ السلام میں ہوں تیرا بھر لینے والا اور اٹھانے والا تجھ کو اپنی طرف اور پاک رکھنے والا تجھ کو کافروں سے۔

اس آیت معنونہ کا آیت متقدمہ سے ارتباط اس طرح ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے مکر (تدبیر محکم) کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس مکر کے وقت وقوع اور صورت وقوع کا ذکر کیا۔ نیز یہ کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ'' فرمائی تھی۔ اس آیت میں اپنے مکر (تدبیر محکم وکامل) کی ایک مثال ذکر کی جو اسی قصہ کے متعلق تھی۔ چنانچہ تفسیر کشّاف میں ہے: ''وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ظَرْفٌ لِّخَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ اَوْ مَکَرَاللّٰہُ'' اذ قال اللہ ظرف ہے خیر الماکرین کا یا مکر اللہ کا۔

اسی طرح دیگر تفاسیر میں بھی ہے۔ مثلاً بیضاوی، سراج منیر وغیرہ۔ غرض مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت جملہ مکر اللہ کی تفسیر کرتی ہے اور واضح طور پر کیفیت اور صورت مکر یعنی تدبیر الٰہی کو بیان کرتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ''خیر الماکرین'' فرمائی۔ اس لئے لامحالہ اس کی تدبیر رسول برحق کی شان میں خیر ہونی چاہئے اور اعداء الرسول کے حق میں مضر۔ ظاہر ہے کہ کفار ناہنجار کے ناپاک ہاتھوں سے صلیب پر چڑھایا جانا رسول مؤید بالمعجزات کی شان میں خیر نہیں ہے۔ بلکہ ''رَفَعَ اِلَی السَّمَاءِ خَیْرَ الْخَیْرَاتِ وَاَحْسَنَ التَّدْبِیْرَاتِ'' سے ہے۔

وقوع مکر یعنی ''رفع الی السمآء'' سے پیشتر ''یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' کی یہ ضرورت تھی کہ چونکہ کفار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل وصلب میں ازحد کوششیں کیں اور آپس میں منصوبے باندھے اور آپ کے منزل مہبط رحمت الٰہیہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس لئے ایسے نازک وقت میں تسلی کے لئے بشارت تخلیص ازمکر اعداء ضروری تھی کہ اے عیسیٰ! میں ان کافروں کو ان کے مکر میں کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ بلکہ تجھ کو اپنی طرف پورا پورا اٹھالوں گا۔ ایسا کہ ان کے ہاتھ میں تیرا ایک بال بھی نہ آئے۔

چنانچہ تفسیر رحمانی میں ہے: ’’اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِعْلَامًا لَّہٗ بِمَکْرِہٖ بِالْاَعْدَآءِ وَتَخْلِیْصِہٖ عَنْ مَکْرِھِمْ‘‘ جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی اس تدبیر پر واقف کرنے کے لئے کہا جو اس نے آپ کے دشمنوں سے کرنی تھی اور ان کے مکر سے آپ کو سلامت نکال لینے کے متعلق تھی۔

تحقیق لفظ توفی

واضح ہو کہ توفی کی نسبت مرزا قادیانی کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ لفظ صرف موت اور قبض روح کے لئے موضوع ہے اور یہ امر اس کے علوم رسمیہ اور لیاقت علمیہ سے بالکل بے بہرہ اور عاری ہونے پر دلیل بیّن ہے۔ کیونکہ لفظ توفی لفظ وفا سے ماخوذ ہے اور وفا کے معنی ہیں پورا کرنا۔ چنانچہ ’’لسان العرب‘‘ میں ہے: ’’اَلْوَفَآءُ ضِدُّ الْغَدْرِ یُقَالُ وَفٰی بِعَھْدِہٖ وَ اَوْفٰی بِمَعْنٰی (ج۲۰)‘‘ یعنی وفا غدر کی ضد ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے کہ فلاں شخص نے اپنا عہد پورا کیا اور اوفیٰ (باب افعال) اسی کا ہم معنی ہے۔ پس توفّٰی باب تفعل ہے، اسی مادہ وفا سے۔ اس کے معنی ہوئے ’’اَخذُ الشَّیْءِ وَافِیًا‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔

چنانچہ تفسیر کبیر، خازن، جامع البیان، بیضاوی، سراج منیر، ابی السعود اور فتح البیان ان سب تفاسیر میں اس امر کی تصریح موجود ہے اور دیگر ابواب جو مادہ وفا سے آئے ہیں۔ ان سب میں بھی یہی معنی ملحوظ ہیں اور جس طرح سے مادہ کے حروف ہر صیغہ میں باقی رہتے ہیں۔ اسی طرح مادہ کے معنی بھی ہر باب وصیغہ میں باقی رہتے ہیں۔ علم صرف میں ادنیٰ مہارت رکھنے والا بھی اسے بخوبی جانتا ہے۔

چنانچہ ہم ناظرین کی سہولت اور مزید تسلی کے لئے اس مادہ وفٰی سے جو جو باب زبان عرب میں مستعمل ہیں۔ ان سب کا نقشہ مع مثالوں کے لکھتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہو جائے گا کہ ہر باب کے ہر صیغے میں اس کے مادی معنی یعنی ’’پورا کرنا‘‘ ملحوظ ہیں۔

باب	مادہ وفا سے مصدر	معنی صدری	امثال
مجرد ثلاثی	وفآء	پورا کرنا، نبھانا	(۱) ’’اَمَّا ابْنُ طَوْقٍ فَقَدْ اَوْفٰی بِذِمَّتِہٖ کَمَا وَفٰی بِقِلَاصِ النَّجْمِ ھَادِیْھَا‘‘ یعنی ابن طوق نے تو اپنا ذمہ پورا کر دیا الخ۔ لسان العرب اور مصباح میں زیر لفظ وفٰی اس شعر کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ مجرد وفٰی اور مزید فیہ اوفٰی دونوں ہم معنی ہیں۔

ثلاثی مجرد	وفآء	پورا کرنا، نبھانا	(۲) لسان العرب۔ میں یہ بھی ہے۔ ''وَفِی الْحَدِیْثِ فَمَرَرْتُ بِقَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ کُلَّمَا قُرِضَتْ وَفَتْ اَیْ تَمَّتْ وَطَالَتْ'' یعنی حدیث میں آیا ہے کہ میں دوزخیوں کی ایک قوم پر گزرا۔ جن کے ہونٹ کاٹے جاتے تھے جب جب کاٹے جاتے تھے، پھر پورے ہوجاتے تھے۔
افعال مزید فیہ	ایفآء	پورا کرنا، پورا دینا	(۱) ''اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ (البقرہ:۴۰)'' اے بنی اسرائیل تم میرا عہد (جو مجھ سے کیا ہے) پورا کرو۔ میں تمہارا عہد (جو تم سے کیا ہے) پورا کروں گا۔ اس کی مثالیں قرآن کریم میں بکثرت ہیں۔ (۲) ''اَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام:۱۵۲)'' اور پیمانے اور ترازو کو عدل سے ''پورا کرو'' یعنی پورا پورا ماپ کر اور تول کر دو۔ (۳) ''اِذَا غَدَرَتْ حَسْنَآءُ اَوْفَتْ بِعَهْدِهَا وَمِنْ عَهْدِهَا اَنْ لَّا یَدُوْمَ لَهَا عَهْدٌ (متنبی)'' ترجمہ: جب خوبصورت محبوبہ عہد شکنی کرے تو وہ اپنے عہد کو ''پورا'' کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے عہد میں سے یہ بھی ہے کہ اس کا عہد دامی نہ ہو۔
تفعیل	توفیۃ	پورا دینا	(۱) ''فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ (آل عمران:۵۷)'' (اسی آیت: ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' سے تھوڑا آگے) ترجمہ: پس خداتعالیٰ ان کو ان کے اجر پورے دے گا۔ (۲) ''وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (آل عمران:۱۸۵)'' ترجمہ: سوائے اس

			کے نہیں کہ تمہارے اجر ’’پورے پورے‘‘ تم کو قیامت کے دن دیئے جائیں گے۔ (۳) ’’وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (النجم:۳۷)‘‘ اور ابراہیم علیہ السلام کے (صحیفوں میں) جس نے پورا کر دکھایا۔ لسان العرب میں یہ بھی لکھا ہے ’’وَفٰی بِالشَّیْءِ وَ اَوْفٰی وَ وَفّٰی بِمَعْنٰی وَاحِدٌ‘‘ یعنی اس کا مجرّد اور باب افعال اور باب تفعیل (تینوں) ہم معنی ہیں۔
استفعال	استیفاء	پورا پورا لے لینا	(۱) ’’اِذَا كْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (المطففین:۲)‘‘ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ (۲) ’’تَوَفَّيْتُ مِنْهُ دَرَاهِمِیْ‘‘ ترجمہ: میں نے اس سے اپنے درہم پورے وصول پائے۔ یہ محاورہ تفسیر کبیر، خازن، سراج منیر میں زیر آیت ’’انی متوفیک‘‘ لکھا ہے۔
تفعّل	توفّی	موافقت باب استفعال یعنی توفی واستیفاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، کامل اور پورا لے لینا	(۱) ’’اِسْتَوْفَاهُ وَتَوَفَّاهُ اِسْتَكْمَلَهُ (اساس البلاغہ)‘‘ ترجمہ: استوفاہ اور توفّاہ کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسے کامل اور پورا لے لیا۔ (۲) ’’تَوَفَّيْتُ الْمَالَ مِنْهُ وَاسْتَوْفَيْتُهٗ اِذَا اَخَذْتُهٗ كُلَّهٗ (لسان العرب ج۲۰)‘‘ یعنی ’’توفیت المال‘‘ اور ’’استوفیته‘‘ دونوں کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس سے اپنا مال پورا پورا لے لیا۔ (۳) ’’وَتَوَفَّاهُ هُوَ مِنْهُ وَاسْتَوْفَاهُ لَمْ يَدَعْ مِنْهُ شَيْئًا (لسان العرب ج۲۰)‘‘ ’’توفّامنه‘‘ اور استوفاہ دونوں کے یہ معنی ہیں کہ اس نے پورا پورا

			لے لیا اور اس سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ (۴) ’’تَوَفَّیْتُہٗ وَاسْتَوْفَیْتُہٗ بِمَعْنٰی‘‘ یعنی ’’توفیت‘‘ اور استوفیت دونوں ہم معنی ہیں (مصباح المنیر للعلامہ القیومی) (۵) ’’اِسْتِیْفَاۗءٌ تَوَفّٰی‘‘ تمام گرفتن حق یعنی دونوں کے معنی ہیں حق پورا لے لینا۔
	توفّی	پورا پورا گن لینا (مجازاً) سلا دینا بقرینہ لیل (رات) اور منام وکریٰ (نیند) وغیرہ	(۱) ’’تَوَفَّیْتُ عَدَدَ الْقَوْمِ اِذَا عَدَدْتُّھُمْ کُلَّھُمْ (لسان العرب ج ۲۰)‘‘ یعنی میں نے سب قوم کی گنتی پوری لے لی۔ اس کی شہادت کے لئے لسان العرب میں یہ شعر لکھا ہے: (۲) ’’اِنَّ بَنِی الْاَدْرَدِ لَیْسُوْا مِنْ اَحَدْ وَلَا تَوَفَّاھُمْ قُرَیْشٌ فِی الْعَدَدْ‘‘ تحقیق بنی ادرد کسی میں سے نہیں اور قریش نے ان کی گنتی پوری پوری نہیں کی۔ (۱) ’’وَھُوَالَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ (انعام: ۶۰)‘‘ خدا ایسی ذات ہے کہ تم کو رات کے وقت پورا لیتا ہے، یعنی سلا دیتا ہے۔ (۲) ’’اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا (زمر: ۴۲)‘‘ خدا ہی پورا پکڑتا ہے، جانوں کو ان کی موت (جسم اور روح کی مفارقت) کے وقت اور جو (ابھی) نہیں مریں (ان کو پورا پکڑتا ہے) ان کی نیند کے وقت یعنی سلا کر۔ (۳) ’’فَلَمَّا تَوَفَّاہُ رَسُوْلُ الْکَرٰی وَدَبَّتِ الْعَیْنَانِ فِی الْجَفَنْ‘‘

ُ			ترجمہ: جب اسے نیند کے فرشتے نے پکڑ لیا۔ الخ یعنی وہ سو گیا۔ (۴) لسان العرب میں کہا ہے: ’’وَاَمَّا تَوَفِّیْ النَّآئِمِ فَهٰذَا اِسْتِیْفَآءُ وَقْتِ عَقْلِهٖ وَتَمِیْزِهٖ اِلٰی اَنْ نَّامَ‘‘
تفعّل	توفّی	(مجازاً) مار لینا بقرینہ موت وملک الموت وغیرہ	(۱) ’’اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (زمر: ۴۲)‘‘ یعنی خدا ہی جانوں کو قبض کرتا ہے، ان کی موت کے وقت، یعنی مارتا ہے۔ (۲) ’’قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ (الم سجدہ: ۱۱)‘‘ (اے پیغمبران سے) کہو تم کو قبض کرے گا ملک الموت یعنی تم کو مار لے گا۔ (۳) ’’حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ (النساء: ۱۵)‘‘ نوٹ: ان سب آیات میں توفّی سے موت مراد لینے کے لئے موت اور ملک الموت قرائن ہیں اور یہ معنی مجازی ہیں۔ چنانچہ آئندہ واضح ہوگا۔ ان شاءاللہ!

تنبیہ: واضح ہو کہ توفی بمعنی موت مجازاً ہے نہ حقیقتاً و وضعاً جیسا کہ اساس البلاغہ میں ہے۔

ومن المجاز[1]: ’’تُوُفِّیَ فُلَانٌ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَاَدْرَکَتْهُ الْوَفَاةُ‘‘ یعنی یہ مجازات ہیں اور لسان العرب میں اس کی وجہ میں کہا ہے۔ ’’تَوَفِّی الْمَیِّتِ اِسْتِیْفَآءُ مُدَّتِهِ الَّتِیْ وُفِّیَتْ لَهٗ وَعَدَدِ اَیَّامِهٖ وَشُهُوْرِهٖ وَاَعْوَامِهٖ فِیْ الدُّنْیَا‘‘ ترجمہ: میّت کی توفی مراد ہے۔ اس کی مقررہ مدت اور اس کے دنیا میں رہنے کے دنوں، مہینوں اور سالوں کی گنتی کو پورا کرنا۔

[1] اکمل صاحب اپنی شہادت کے (ص۲۰) میں خاکسار کو الزاماً کہتے ہیں: ’’موت کے معنی کو مجاز کہنا آپ ہی کی ایجاد ہے۔‘‘ جواب: مرزا قادیانی خود اور ان کی جماعت بھی علوم عربیہ سے بالکل بے بہرہ ہے میں تو علامہ زمخشری کا حوالہ دیتا ہوں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آپ ہی کی ایجاد ہے۔ چہ خوش! (سعادت)

ائمہ لغت اور ائمہ تفسیر بلا خلاف مادہ وفا کے باب تفعّل اور استفعال کو ہم معنی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ علاّمہ قیومی مصباح میں فرماتے ہیں: ’’تَوَفَّیْتُهٗ وَاسْتَوْفَیْتُهٗ‘‘ بمعنی ترجمہ توفّیته اور استوفیته ہم معنی ہیں۔ یعنی دونوں کے معنی ہیں۔ میں نے اسے پورا لے لیا۔

اسی طرح تفسیر کبیر، تفسیر خازن اور تفسیر معالم میں بھی ان کو ہم معنی ذکر کیا گیا ہے اور صراح اور قاموس میں بھی ایسا ہی بیان ہے اور اساس البلاغۃ میں لکھا ہے: ’’وَاسْتَوْفَاهُ وَتَوَفَّاهُ اِسْتَکْمَلَهٗ‘‘ کہ استوفاہ اور توفاہ دونوں کے معنی ہیں اس نے اسے کامل لے لیا۔

مرزا قادیانی نے اپنے (آئینہ وساوس[1] ص۵۶۴، خزائن ج۵ ص ایضاً) میں جہاں اپنے آپ کو خدا بنایا ہے۔ استوفانی لکھا ہے اور اس جگہ فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور مفعول خود مرزا قادیانی ذی روح اور اس سے مراد موت نہیں ہے۔ پس مرزا قادیانی کا یہ کہنا کہ لفظ توفی سوائے قبض روح کے کسی اور معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ بالکل غلط اور مردود ٹھہرا۔ کیونکہ جب بتصریح ائمہ لغت وتفسیر ثابت ہو چکا ہے کہ توفی اور استیفاء ہم معنی ہیں تو جس طرح استیفاء سوائے معنی موت کے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح توفی کے سوائے معنی موت کے استعمال کو کون مانع ہے۔ خصوصاً جب محاورہ تَوَفَّیْتُ مِنْهُ دَرَاهِمِیْ مندرجہ (تفسیر کبیر ج دوم ص۴۸۱) یعنی میں نے اس سے اپنے درہم پورے بھر پائے۔ زبان عرب میں ذائع وشائع ہو۔

پس جب ائمہ لغت وتفسیر بالاتفاق لکھتے ہیں کہ اس مادہ کے باب تفعل اور استفعال کے معنی ایک ہی ہیں اور قرآن مجید اور لغت میں سے استیفاء کے معنی پورا پورا لے لینا ثابت کیا گیا ہے تو اب توفی کے معنی پورا پورا لینا کرنے میں کیا تردد باقی رہا۔ علاوہ بریں جب علم اشتقاق وتصریف سے بھی واضح ہو گیا کہ یہ لفظ توفی مادہ وفا کا مزید فیہ ہے اور وفا کے معنی بحسب الوضع موت نہیں۔ بلکہ پورا کرنے کے ہیں تو پھر بھی باوجود اتنی تصریحات کے کوئی شخص اپنی ضد نہ چھوڑے اور بے تکی ہانکتا جائے کہ توفی موت اور قبض روح کے لئے موضوع ہے تو کیا اس کی لیاقت علمی ہنسی کے قابل نہیں ہوگی؟

باقی رہا یہ امر کہ یہ لفظ قرآن شریف میں بمعنی موت مستعمل ہوا ہے۔ سو ہم اس سے انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ معنی مستعمل فیہ اور موضوع لہٗ میں فرق ہوتا ہے۔ استعمال سے یہ

[1] یہ کتاب مرزا قادیانی کی تصنیف ہے۔ اس کے دو نام ہیں آئینہ کمالات اسلام اور دافع الوساوس۔ ہم نے دونوں کو ترکیب امتزاجی سے ایک کر کے لکھا ہے۔

لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ اصل میں موت کے لئے وضع کیا گیا تھا اور اس کے حقیقی معنی بس قبض روح ہی کے ہیں۔ جس قدر محاورات میں لفظ توفی جن معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی کوئی مدعی علم وفضل ہم کو اس کے وضعی اور حقیقی معنوں ’’پورا پورا لے لینا‘‘ سے باہر ثابت کر دے تو بے شک ہم اس کے لے بے درم غلام ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق موت کے معنی پر بھی صرف اس لئے ہے کہ موت بھی ایک قسم[1] کی توفی یعنی پوری پوری گرفت ہوتی ہے۔ نہ اس اعتبار سے کہ یہ لفظ بمعنی موت موضوع ہے۔

چنانچہ تفسیر بیضاوی میں زیر آیت: ’’فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ‘‘ لکھا ہے: ’’اَلتَّوَفِّىْ اَخْذُا لشَّىْءِ وَافِيًا وَالْمَوْتُ نَوْعٌ مِّنْهُ‘‘ توفی کے معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا لینا اور موت اس کی ایک نوع ہے۔

اسی طرح توفی کا اطلاق قرآن شریف میں نیند پر بھی آیا ہے۔ یہ بھی اسی لئے ہے کہ نیند بھی ایک قسم کی توفی یعنی پوری پوری گرفت ہوتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے مقدمہ میں جو توفی کے معنی ’’رفع الی السمآء‘‘ لئے جاتے ہیں تو اسی اعتبار سے کہ یہ بھی ایک قسم کی توفّی یعنی پوری پوری گرفت ہے اور قرض وصول کر لینے پر بھی اس کا اطلاق محاورہ زبان عرب میں پایا گیا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ قرض پورا پورا لے لیا جاتا ہے۔ الغرض توفی کے جس قدر محاورات واستعمالات ہیں۔ خواہ وہ قرآن مجید میں ہیں، خواہ حدیث شریف میں، خواہ دواوین عرب میں، ان سب میں اس کے وضعی اور حقیقی معنی ’’اَخْذُا لشَّىْءِ وَافِيًا‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہی ملحوظ ہیں اور بس...... اور ظاہر ہے کہ جس لفظ کے کئی معنی یا کئی استعمالات ہوں۔ اس کو ایک معنی میں معیّن کرنے کے لئے ضرور ضرور کوئی قرینہ موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ متکلم کی مراد ایک وقت میں اس لفظ سے ایک ہی ہے۔ پس توفی کے ساتھ اگر موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہوگا تو اس کے معنی موت ہوں گے اور اگر نیند اور اس کے

[1] اکمل صاحب قادیانی علمی باتوں کے نہ سمجھنے میں بہت کامل ہیں۔ ہم نے جو تفاسیر معتبرہ کی عبارات سے موت کو توفی کی ایک نوع ثابت کر کے ظاہر کر دیا کہ توفی موت کے لئے موضوع نہیں تو ہمارے اکمل صاحب ایسی بات کو بھی نہ سمجھ کر اس پر لکھتے ہیں: ’’جب موت توفی کی قسم ہے تو بھی وضعی معنی ہوئے نہ کہ مجازی‘‘ (ص۲۰) جواب: ’’بریں اکملیت بباید گریست‘‘ جناب من! قسم اور مقسم کی وضع ایک نہیں ہوتی۔ لہٰذا کوئی لفظ اپنے مفہوم کلی اور اس کی انواع ہر دو کے لئے موضوع نہیں ہوتا۔ فافهم!

مقتضیات مذکور ہوں گے تو توفی کے معنی سلا دینا ہوں گے اور اگر اس کے ساتھ ذکر رفع کا ہوگا تو اس سے مراد رفع ہوگی اور اگر اس کے ساتھ درہم و دینار وغیرہ اشیاء کا ذکر ہوگا تو اس کے معنی ان کا قبض کرنا ہوں گے اور اگر اس کے ساتھ عدد اور گنتی کا ذکر ہوگا تو اس کے معنی پورا پورا گن لینا ہوں گے۔

ثانیاً برائے اثبات جہالت قادیانی

سورۂ زمر میں ہے: ''اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (زمر: ۴۲) '' اللہ ہی پورا پکڑتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور جو ابھی نہیں مریں ان کو (پورا پکڑتا ہے) ان کی نیند کے وقت۔ پس اس جان کو بند رکھتا ہے، جس پر موت کا حکم جاری کیا اور دوسری کو چھوڑ دیتا ہے۔ مقررہ مدت تک۔

سورہ انعام میں فرمایا: ''وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّھَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْہِ لِیُقْضٰی اَجَلٌ مُّسَمًّی (انعام: ۶۰) '' اللہ وہ ہے جو تم کو رات کے وقت پوری گرفت کرتا ہے اور جو کچھ تم دن کو کرتے ہو جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں اٹھا کھڑا کرتا ہے تا کہ اجل مسمی پوری کی جائے۔

ان آیتوں میں توفی کی دو انواع اموات اور منام، مذکور ہوئی ہیں، توفی بالموت کی صورت قبض روح مع الامساک ذکر کی گئی ہے اور توفی بالنوم کی صورت قبض روح مع الارسال بیان کی گئی ہے۔ پس قبض روح جو دونوں میں مشترک ہے، جنس ہے امساک اور ارسال فصل ہے۔

''وَھُوَالَّذِیْ یُمَیِّزُ الشَّیْئَ عَمَّا یُشَارِکُہٗ فِی الْجِنْسِ (کتب منطق) '' یعنی فصل اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو اس چیز سے متمیّز کرے جو جنس میں اس کی شریک ہو۔

پس بموجب مذہب مرزا قادیانی توفی صرف قبض روح کے لئے موضوع چاہئے، نہ موت اور قبض روح ہر دو کے لئے۔ کیونکہ ان دونوں میں نسبت عموم وخصوص ہے اور کوئی لفظ معنی اعم واخص ہر دو کے لئے موضوع[1] نہیں ہوتا۔ فافھم!

[1] اکمل صاحب نے اس عموم وخصوص کے متعلق ایک خاص علمی کمال دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں: ''حالانکہ قبض روح عین موت کا مرادف ہے۔'' (ص۲۱) بندہ خدا! عام وخاص میں ترادف کہاں؟ ترادف میں تو اتحاد ومساوات کا لحاظ ہوتا ہے اور عام وخاص میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ پس ان میں ترادف کا ادّعا باطل ہے۔ (سعادت)

ثالثاً: اگر مرزا قادیانی صرف قبض روح ہی کو مدلول وضعی قرار دیں تو یہ بھی ان کی بے علمی و بے استعدادی پر دلیل ظاہر ہوگی۔ کیونکہ توفی لفظ مفرد ہے اور قبض روح مرکب، زیرا کہ ثانی میں جز ولفظ جزء معنی پر دال ہے۔ یعنی قبض دال ہے، اخذ پر اور روح دال ہے شئے مقبوض پر۔ بخلاف اوّل کے کہ اس میں جزء لفظ جزء معنی پر دلالت نہیں کرتی۔ لہٰذا لفظ توفی مفرد کا مدلول قبض روح جو مرکب ہے۔ درست نہیں۔ اسی لئے سورہ زمر کی آیت میں صرف یتوفی نہیں کہا۔ بلکہ یتوفی الانفس کہا ہے تا کہ توفی دلالت کرے۔ اخذ پر اور انفس کے مدلول اس کا ارواح ہے دلالت کرے شئے مقبوض پر اور بعد ترکیب کے معنی مرکب پیدا ہوں۔ اگر توفی (مفرد) کے معنی قبض روح (مرکب) ہیں تو لفظ انفس کی کیا ضرورت تھی۔ پس ثابت ہوا کہ توفی کے حقیقی معنی مطلق قبض کے ہیں، نہ قبض روح کے۔ وھذاھو المراد!

رابعاً: بالفرض اگر مان بھی لیں کہ توفی کے حقیقی معنی قبض روح ہیں تو پھر بھی آیت: ''اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ جب قبض روح کی کیفیتیں دو ہیں۔ ایک مع الامساک اور دوسری مع الارسال تو آیت: ''اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' میں توفی بقرینہ ''وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' جو رفع جسمی پر روز روشن کی طرح دلالت کررہی ہے۔ بمعنی نیند معین ہوگی۔ کیونکہ منام اور رفع جسمی میں منافاۃ نہیں۔ بلکہ ان میں جمع ممکن ہے۔ جیسا کہ ایک جماعت مفسرین رحمۃ اللہ علیہم اس طرف بھی گئی ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن میں ہے:

(الثانی) ''اَلْمُرَادُ بِالتَّوَفِّیْ النَّوْمِ وَمِنْهُ قَوْلُهٗ تَعَالٰی اَللّٰهُ یَتوفّٰی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَجَعَلَ النَّوْمَ وَفَاةً وَکَانَ عِیْسٰی قَدْ نَامَ فَرَفَعَهُ اللّٰهُ وَهُوَ نَائِمٌ لِئَلَّا یَلْحِقَهٗ خَوْفٌ (تفسیر خازن)'' (اس جگہ) توفی سے مراد نیند ہے اور اسی سے ہے آیت: ''اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ ...... الخ'' پس اس میں خداتعالیٰ نے نیند کو بھی وفات کہا ہے۔ پس ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' سے مراد یہ ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے۔ پس خدا نے آپ کو نیند ہی میں اوپر اٹھالیا تا کہ آپ کو خوف لاحق نہ ہو۔

اور اسی طرح دیگر تفاسیر مثل درمنثور، ابن کثیر، فتح البیان، معالم، تفسیر کبیر میں بھی اس امر کی تصریح موجود ہے۔

پس اب تو مرزا قادیانی کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا اوران کے ہاتھوں میں سوائے ابلہ فریبی وتاویلات باطلہ وتحریفات کاسدہ کے اور کچھ نہ رہا۔ کیونکہ صاف ثابت ہوگیا کہ توفی کے معنی ''اَخْذُالشَّیْءِ وَافِیًا'' ہیں۔اس پر''زیادۃ بالنظر الی المتعلق والقرائن'' کی جائے گی۔نہ بحسب الوضع۔ پس توفی کا متعلق یا تو صرف جسم ہوگا یا صرف روح یا جسم مع روح۔ پھر اگر روح ہے تو یا تو مقبوض مع الامساک ہوگا۔اسے موت کہیں گے یا مع الارسال اسے (نیند) بولیں گے۔ان ہر دو میں دو دو امر علاوہ مفہوم توفی کے اعتبار کئے گئے۔موت میں روح اور امساک اور منام میں روح اور ارسال۔ پس مرکب معانی کے لئے ترکیب الفاظ بھی ضروری ہے۔لہٰذا اس ترکیب کے لئے ضروری ہوا کہ متعلق توفی اور قرائن کی طرف نظر کی جائے۔

۱...... قبض روح مع الامساک اور قبض روح مع الارسال کی مثال سورۂ زمر کی وہ آیت ہے جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔یعنی: ''اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (زمر:۴۲)'' اللہ ہی روحوں کو قبض کرتا ہے۔ان کی موت (مفارقت روح وبدن) کے وقت اور جو روحیں ابھی نہیں مریں،ان کو قبض کرتا ہے،ان کی نیند میں۔پس جس روح پر موت کا حکم جاری کیا ہے اس کو تو روک رکھتا ہے اور دوسری (نیند والی) کو مدّت مقرر (موت) تک بھیجتا رہتا ہے۔

اس آیت میں ہر معنی کے لئے ایک لفظ مذکور ہے۔یعنی قبض کے لئے یتوفی اور روح کے لئے الانفس اور مرنے کے موت اور امساک کے لئے یمسک اور نیند کے لئے منام اور ارسال کے لئے یرسل۔

۲...... صرف قبض جسم کی مثال محاورہ عرب شائعہ فی اللسان مندرجہ تفسیر کبیر،خازن وغیرہ ''تَوَفَّیْتُ مِنْہُ دَرَاھِمِی'' (میں نے اس سے اپنے درہم پورے پالئے)

۳...... قبض جسم مع روح یعنی زندہ چیز کو اخذ کرنے کی مثال آیات ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' اور ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ'' بقرینہ ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' اور ''بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ'' فافھم وتدبر!

<u>سوال:</u> بے شک علم تصریف اور علمی تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ توفی کے معنی پورا پورا لے لینا ہیں۔لیکن لغت کی بعض کتابوں میں جو توفی بمعنی موت کہا ہے،اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: کتب لغت میں حقیقی، منقولی اور مجازی ہر طرح کے معنی لکھے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تعیین حسب قرائن حالیہ ومقالیہ سلسلہ عبارت سے مفہوم ہوتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ابتداء میں لفظ جس معنی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اسے اس کے حقیقی اور وضعی معنی کہتے ہیں۔ پھر یا تو لفظ کا ایک ہی معنی ہوگا یا زیادہ۔ پھر زیادہ یا تو بحسب الوضع ہوں گے، اسے مشترک کہتے ہیں۔ مثلاً عین جو بمعنی زر، زانو، چشمۂ آب اور آنکھ ہے یا وضع میں تو ایک معنی تھا۔ مگر اس کے مفہوم میں کئی چیزیں پائی گئیں، اسے جنس کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اس کی نوع کہتے ہیں۔ مثلاً حیوان کہ جنس ہے اور گھوڑا اور گدھا اس کی انواع ہیں، صرف اس اعتبار سے کہ وہ جاندار ہیں۔ نہ اس لئے کہ حیوان بحسب الوضع ان سب کے لئے موضوع ہے۔

اور یا کثرت بہ سبب دیگر معانی میں منقول ہونے کے ہوگی۔ پھر اگر عرف عام نے نقل کیا ہے تو اسے منقول عرفی کہتے ہیں۔ مثلاً دابۃ کہ اصل میں موضوع ہے ہر جاندار کے لئے جو زمین پر چلے اور غالب معنی اس کے سواری کے جانور ہیں اور اس کی ناقل شرع ہے تو اسے منقول شرعی کہتے ہیں۔ مثلاً صوم وصلوٰۃ وزکوٰۃ وحج کہ لغت میں ان کے وضعی معنی اور ہیں۔ مگر شریعت میں یہ الفاظ اور معانی میں مخصوص ہیں اور اگر اس کا ناقل کوئی خاص طائفہ ہے تو اسے منقول اصطلاحی کہیں گے۔ مثلاً مصطلحات علمیّہ (کتب منطق، قطبی وغیرہ)

اب ظاہر ہے کہ توفی بحسب الوضع بمعنی موت موضوع نہیں۔ کیونکہ اس کا ماخذ ومادہ وفا ہے اور نہ یہ لفظ مشترک المعنی ہے کہ اس کے معانی متعددہ میں اسے ایک موت بھی ہو اور نہ منقول شرعی ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ میں تصرّف کرنے سے شریعت کو کچھ تعلق نہیں اور نہ منقول اصطلاحی ہے۔ کیونکہ یہ کسی علم اور فن کی اصطلاح نہیں۔ اگر ہے تو یہی کہ یہ لفظ بروئے علم اشتقاق وفا سے ماخوذ ہے اور اس کے حقیقی اور وضعی معنی اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا یعنی ''کسی چیز کو پورا پورا پکڑ لینا'' ہیں اور چونکہ اس کے مفہوم میں رفع اور موت اور نیند بھی داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بھی پوری پوری گرفت ہیں۔ اس لئے اس لفظ کا اطلاق رفع اور موت اور نیند پر بھی درست ہوگا۔ صرف اس اعتبار سے کہ توفی جنس ہے اور رفع اور موت اور نوم اس کی انواع ہیں۔ نہ اس لئے کہ یہ لفظ بحسب الواضع موت کے لئے موضوع ہے۔ توفی کے جنس اور رفع

اور موت اور نیند کے انواع ہونے پر تفاسیر معتبرہ شاہد ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''قَوْلُهُ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ یَدُلُّ عَلٰی حُصُوْلِ التَّوَفِّیْ وَهُوَ جِنْسٌ تَحْتَهُ اَنْوَاعٌ بَعْضُهَا بِالْمَوْتِ وَبَعْضُهَا بِالْاِصْعَادِ اِلَی السَّمَآءِ فَلَمَّا قَالَ بَعْدَهُ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کَانَ هٰذَا تَعْیِیْنًا لِلنَّوْعِ وَلَمْ یَکُنْ تَکْرَارًا'' خدا تعالیٰ کا قول ''انّی متوفّیک'' صرف حصول توفی پر دلالت کرتا ہے اور وہ جنس ہے جس کے تحت کئی انواع ہیں۔ کوئی بالموت اور کوئی بالرفع الی السماء۔ پس جب خدا تعالیٰ نے اس کے بعد ''ورافعک الیّ'' فرمادیا تو یہ نوع کی تعیین کے لئے ہوا نہ کہ تکرار[۱]۔

اسی طرح تفسیر بیضاوی وسراج منیر میں بذیل آیت: ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ'' لکھا ہے: ''تَوَفَّیْتَنِیْ بِالرَّفْعِ اِلَی السَّمَآءِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَالتَّوَفِّیْ اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا وَالْمَوْتُ نَوْعٌ مِنْهُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَللّٰهُ یَتوفّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (بیضاوی والسراج المنیر)'' ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ'' کے معنی یہ ہیں کہ خدایا جب تو مجھے آسمان پر اٹھالیا بدلیل ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' کیونکہ توفی کے معنی ہیں کسی شئے کو پورا پورا لے لینا اور موت اس کی ایک نوع ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: ''اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ (زمر:۴۲)''

حاصل مطلب یہ کہ لفظ توفی بحسب الوضع موت کے لئے موضوع نہیں ہے۔ صرف اس کا استعمال اس نسبت سے جو جنس اور نوع میں ہوا کرتی ہے، بمعنی موت ہے اور بس اور چونکہ تعیین نوع کے لئے حاجت قرینہ کی پڑا کرتی ہے۔ لہٰذا سلسلہ عبارت میں قرائن حالیہ ومقالیہ پر نظر کریں گے۔ جیسے کہ عینؔ کہ یہ موضوع ہے، معانی متعددہ مثل زر، چشم، زانو اور

۱؎ اکمل صاحب نے تفسیر کبیر کے اس حوالہ پر بہت غضب ڈھایا ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں حقارت آمیز طریق بیان اختیار کیا ہے۔ افسوس اکمل صاحب نے یہ کتاب مرزا قادیانی آنجہانی کی وفات کے بعد لکھی۔ اگر وہ ان کی زندگی میں لکھتے تو ہم امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب کا کوئی ورق جناب مرزا قادیانی کے سامنے رکھ کر کہتے کہ جناب اسے حل کیجئے۔ پھر اگر وہ اپنے مددگاروں سمیت اسے حل فرمادیتے تو جانتے۔ اگرچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کا امتحان کے لئے بھی مرزا قادیانی کے سامنے پیش کرنا امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی بے قدری ہے۔ سبحان اللہ! کجا رام رام، کجا ٹیں ٹیں! (سعادت)

چشمہ آب کے لئے (بالاوضاع المختلفہ) تو اب ہر جگہ اس کا ایک ہی معنی نہ ہوگا اور نہ ایک جگہ سارے معنی مراد ہوں گے۔ بلکہ حسب حال مضمون عبارت والفاظ جس معنی کو اس جگہ مناسبت ہوگی وہ اس جگہ معیّن ہو جائے گا۔

چنانچہ آیت: ''فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا (البقرہ:۶۰)'' میں عین کے معنی چشمۂ آب ہیں۔ کیونکہ اس جگہ استسقاء یعنی طلب آب اور انفجار یعنی پانی کا پھوٹ پڑنا اور مشرب یعنی پانی کی گھاٹ کا ذکر ہے۔ ان قرائن حالیہ ومقالیہ نے اسے اس جگہ چشمۂ آب کے معنوں میں کر دیا اور آیت: ''فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ'' میں قرینہ حمئۃ نے اس سے چشمۂ آب مراد ہونے پر دلالت کی اور آیت: ''اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَا یُبْصِرُوْنَ بِهَا'' میں قرینہ بصارت نے جارحہ (بمعنی عضو) یعنی آنکھ پر دلالت کی۔ اسی طرح جنس کو اس کی کسی نوع میں معین کرنے کے لئے حاجت قرینہ کی ہوتی ہے۔ ورنہ مضمون ومفہوم میں خلل پڑتا ہے۔ پس چونکہ ''انّی متوفّیک'' کو ''ورافعک الیّ'' کے ساتھ ضم کیا۔ اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کی توفی ''بالرفع الی السمآء'' ہوئی۔ مزید تفصیل لفظ توفی کی اس وقت کی جائے گی۔ جب آیات قرآنیہ جن میں لفظ توفی کے مشتقات آئے ہیں۔ ان کا ایک نقشہ کھینچ کر ہر ایک کے ساتھ اس کے قرینۂ صارفہ کا ذکر کیا جائے گا اور عن قریب آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

کسی لفظ کے کسی معنی میں زیادہ مستعمل ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ ان معنوں میں مخصوص ہوگیا ہے اور اس کے دیگر معانی واطلاقات متروک ومہجور ہوگئے ہیں۔ مثلاً قاموس میں دابّہ کی نسبت لکھا ہے: ''وَالدَّآبَّةُ مَا دَبَّ مِنَ الْحَیَوَانِ وَغَلَبَ عَلٰی مَا یُرْکَبُ (قاموس)'' کہ دابہ اصل میں ہر جاندار چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے اور غالب استعمال اس کا سواری والے جانوروں پر ہوتا ہے تو قاموس کے لکھنے سے آیت: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود:۶)'' یعنی زمین میں کوئی جانور نہیں جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو۔

اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ صرف سواری کے جانوروں کا رازق ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنے اصلی وسیع معنوں میں لیا جائے گا کہ جو چیز زمین پر حرکت کرنے والی ہے۔ ان سب کا رزق حسب وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اسی طرح اگر کتب لغت میں ہر قسم کے معانی وضعی، مجازی اور منقولی خواہ منقول شرعی ہوں، خواہ عرفی، خواہ اصطلاحی سب لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی خاص مقام پر معانی مخصوصہ کا چسپاں ہونا سلسلۂ عبارت اور قرائن حالیہ ومقالیہ

پر موقوف ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جملہ قرائن کتب لغت میں مصرّح ہوں۔ کیونکہ قرائن محصور نہیں ہوسکتے۔ بلکہ حسب مقام سلسلۂ عبارت ومفہوم کلام میں قرائن مختلف ہوتے ہیں۔

چنانچہ حصول المامول جو امام شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول کا اختصار ہے۔ اس میں لکھا ہے:''وَلَا یُشْتَرَطُ النَّقْلُ فِیْ اٰحَادِ الْمَجَازِ بَلِ الْعِلَاقَةُ کَافِیَةٌ وَالْمُعْتَبَرُ نَوْعُهَا وَاِلَیْهِ ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ وَهُوَالْحَقُّ وَلَمْ یَأْتِ مِنَ اشْتَرَطَ ذٰلِکَ بِحُجَّةٍ یَّصْلَحُ لِذِکْرِهَا وَتَسْتَدْعِیْ التَّعَرُّضَ لِدَفْعِهَا وَکُلُّ مَنْ لَّهُ عِلْمٌ وَّفَهْمٌ یَعْلَمُ اَنَّ اَهْلَ الْعَرَبِیَّةِ مَا زَالُوْ یَخْتَرِعُوْنَ الْمَجَازَاتِ عِنْدَ وُجُوْدِ الْعِلَاقَةِ وَنَصْبَ الْقَرِیْنَةِ وَهٰکَذَا مَنْ جَآءَ بَعْدَهُمْ مِنْ اَهْلِ الْبَلَاغَةِ فِیْ فَنِّیْ النَّظْمِ وَالنَّثْرِ وَیَتَمَادَحُوْنَ بِاخْتِرَاعِ الشَّیْءِ الْغَرِیْبِ مِنَ الْمَجَازَاتِ عِنْدَ وُجُوْدِ الْمُصَحِّحِ لِلتَّجَوُّزِ. انتهٰی!''اور مجاز کے افراد میں (اہل لغت سے) نقل ضروری نہیں۔ بلکہ صرف علاقہ کافی ہے اور (زیادہ تر) اس کی نوع کا اعتبار ہے اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے اور یہی حق ہے اور جس نے اس کے (نقل کو) ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے ایسی حجت کوئی بھی پیش نہیں کی۔ جو ذکر اور پھر اس کی تردید کے لائق ہو۔ یعنی بالکل قابل التفات نہیں اور جو شخص علم اور فہم رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اہل عربیت ہمیشہ علاقہ کے پائے جانے پر مجازات اور قرآئن کا مقرر کرنا اختراع کرتے رہے ہیں اور اسی طرح نظم اور نثر کے علمائے بلاغت جو ان سے بعد ہوتے آئے ہیں (وہ بھی اس بارہ میں اختراعات کرتے رہے ہیں) اور صحت مجاز کے قرینہ کے وقت کسی نادر مجاز کے اختراع کے سبب ایک دوسرے پر فخر کرتے رہے ہیں۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ جس جگہ توفی کے ساتھ موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہو۔ اس جگہ توفی کی تعیین نوع موت میں ہوگی اور جہاں نیند اور اس کے مقتضیات موجود ہوں گے۔ وہاں اس کی تعیین نوع نوم میں ہوگی اور جس مقام پر قرینہ رفع مذکور ہو۔ اس جگہ یہ لفظ نوع رفع میں معین ہوگا۔ جیسا کہ عن قریب نقشہ آیات توفی سے ظاہر ہوگا۔ ان شاء اللہ! غرض کتب لغت میں توفی بمعنی موت لکھا ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ موت کے لئے موضوع ہے۔ کیونکہ علم تصریف اس کا برملا انکار کررہا ہے اور نہ یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ اپنے اصلی معنوں سے ہٹ کر بمعنی موت مخصوص ہوگیا ہے۔ کیونکہ اہل لغت کا اس کو مجاز لکھنا اس کی صریح تردید کررہا ہے۔ چنانچہ تاج العروس شرح قاموس میں ہے:''وَمِنَ

اَلْمَجَازِ اَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ اَيِ الْمَوْتُ وَالْمَنِيَّةُ وَتُوُفِّيَ فُلَانٌ اِذَا مَاتَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِذَا قَبَضَ رُوْحَهٗ (سیف) ‘‘اور مجاز میں سے ایک یہ ہے ’’ادرکته الوفاة‘‘ یعنی اسے موت نے پالیا یا پکڑ لیا اور توفی فلانٌ وہ پورا ہوگیا، کے معنی ہیں وہ مرگیا اور توفّاه الله (خدا نے اسے پورا کرلیا) کے معنی ہیں خدا نے اس کی روح قبض کرلی۔

اور اسی طرح اساس البلاغۃ زمخشری میں لکھا ہے: ’’وَمِنَ الْمَجَازِ تُوُفِّيَ فُلَانٌ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَاَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ‘‘ توفّی فلانٌ اور توفّاه الله اور ادركته الوفاة سب مجازیں ہیں[1] اور مجاز بولنا تب ہی درست ہے جب حقیقی معنی متروک نہ ہوں۔

چنانچہ قطبی میں بعد تقسیم لفظ باعتبار معانی جو اوپر گزر چکی ہے یہ لکھا ہے کہ: ’’وَاِنْ لَّمْ يُتْرَكِ الْاَوَّلُ بَلْ يُسْتَعْمَلُ فِيْهِ اَيْضًا سُمِّيَ حَقِيْقَةً اَنِ اسْتُعْمِلَ فِي الْاَوَّلِ وَهُوَ الْمَنْقُوْلُ عَنْهُ وَمَجَازٌ اَنِ اسْتُعْمِلَ فِي الثَّانِيْ وَهُوَ الْمَنْقُوْلُ اِلَيْهِ (قطبی ص ۴۴ مطبع رحیمیہ دیوبند) ‘‘اگر معنی اوّل متروک نہ ہوں بلکہ اس میں بھی اس لفظ کا استعمال ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔ جب پہلے معنوں میں مستعمل ہو اور وہ اس کا معنی منقول عنہ (جس سے نقل کر کے مجازی معنی لئے گئے ہیں) ہے اور اگر دوسرے معنوں میں مستعمل ہو تو اسے مجاز کہتے ہیں اور وہ معنی منقول الیہ ہے (نقل کر کے جو معنی مراد لئے گئے ہیں)

ائمہ لغت کے توفی کو مجازاً بمعنی موت لکھنے سے صاف ثابت ہوگیا کہ توفی کے اپنے وضعی معنی اَخْذُ الشَّيْءِ وَافِيًا متروک نہ ہوں گے۔ آسان طریق جو جلدی راہ راست پر لادے۔ وہ یہ ہے کہ توفی کو کتب لغت سے تلاش کرو۔ اگر یہ لفظ وفا کے ضمن میں مذکور ہو تو اسے وفا سے ماخوذ سمجھو، ورنہ نہیں اور پھر جملہ تصریفات وفا پر نظر کرو تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اس کے معنی پورا کرنے کے ہیں اور جو معنی مجازی ہوں گے وہ باعتبار اس علاقہ کے ہوں گے جو حقیقت اور مجاز میں ضروری ہے۔

چنانچہ حصول المامول میں ہے: ’’لَابُدَّ مِنَ الْعِلَاقَةِ فِيْ كُلِّ مَجَازٍ فِيْ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْحَقِيْقَةِ وَالْعِلَاقَةُ هِيَ اتِّصَالُ الْمَعْنَى الْمُسْتَعْمَلِ فِيْهِ بِالْمَوْضُوْعِ

[1] اکمل صاحب بھی عجب کمال کے پتلے ہیں کہ باوجود ائمہ لغت کی تصریح کے کہ توفی بمعنی موت مجازاً ہے الزاماً لکھتے ہیں۔ ’’موت کے معنی کو مجازاً کہنا آپ ہی کی ایجاد ہے۔ (ص۲۰) کیا تاج العروس اور اساس البلاغہ بھی میری تصانیف ہیں؟

لَہٗ (حصول ص ۱۴ مصری) ’’ہر مجاز میں اس علاقہ کا ہونا ضروری ہے جو اس میں اور حقیقت میں ہوتا ہے اور علاقہ اس اتصال (معنوی) کو کہتے ہیں جو معنی مستعمل فیہ (مجازی) اور معنی موضوع لہٗ (حقیقی) میں ہوتا ہے۔

اور چونکہ علاقات واتصالات معنی مستعمل فیہ اور موضوع لہٗ میں حسب اقتضائے مقام مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تقریر کتب لغت میں ضروری نہیں۔ چنانچہ حصول المامول میں سے گزر چکا ہے کہ علاقات مقتضیہ مجاز کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کتاب میں مذکور ہوں بلکہ وہ علاقہ جس سے معنی مستعمل فیہ وموضوع لہٗ میں نسبت پیدا ہوسکے، کافی ہے۔ پس کتب لغت میں سے وضعی اور منقول اور مجازی معنی میں تمیز کرنے کے لئے ان قواعد کا جاننا ضروری ہے۔ جن پر ان کی سمجھ موقوف ہے اور وہ کتب اصول وبلاغت میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ فافہم!

پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ توفی کے معنی اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا ہیں اور یہ بھی محقق ہو چکا ہے کہ توفی جنس ہے اور ’’رفع‘‘ اور ’’موت‘‘ اور ’’نیند‘‘ اس کی انواع ہیں اور یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ تعیین نوع کے لئے وجود قرینہ یا تعذر حقیقت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے مراد متکلم (کہ ان معنی وانواع میں سے کون سی نوع اس کی مراد ہے) معیّن نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا قرآن شریف وہ سب آیات جن میں مشتقات توفی (باب تفعل) وارد ہوئے ہیں، لکھ کر ناظرین کے پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرائن صارفہ پر بھی اشارات کرتے جاتے ہیں۔

نقشہ آیات توفی مع بیان قرینہ

۱...... (۱) ’’وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِہِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْہُرٍ وَّعَشْرًا (بقرہ:۲۳۴)‘‘ ترجمہ:تم میں سے جو قبض کئے جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں (دوسرے نکاح کے لئے) چار مہینے اور دس دن رات انتظار کریں۔

<u>بیان قرینہ:</u> ان ہر دو آیات میں عورتیں بیوہ چھوڑنا اور عدّت حالت بیوگی اور وصیّت توفی سے موت مراد لینے کے قرینے ہیں۔

۲...... (۲) ’’وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِہِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ (بقرہ:۲۴۰)‘‘ ترجمہ:تم میں سے جو لوگ قبض لئے جاتے ہیں۔ یعنی مر جاتے ہیں اور (پیچھے) بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی بیویوں کے لئے ایک سال کے گزارے اور سکونت کی وصیت کر جائیں۔

۳...... (۱)''حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ (نساء:۱۵)''ترجمہ:حتیٰ کہ قبض کرے ان کو موت۔

بیان قرینہ: نمبر۳ سے نمبر۱۱ تک ان نو آیات میں توفی سے موت مراد لینے کے لئے ملائکہ موت اور جان کندن کے وقت کفار کو عذاب کرنا اور مومنوں کو سلام اور بشارت جنت سنانا صاف اور صریح قرینے ہیں۔احادیث میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

۴...... (۲)''اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ ظَالِمِیْ اَنْفُسِھِمْ (نساء:۹۷)''ترجمہ:جن کو فرشتے قبض کرتے ہیں۔حالانکہ وہ (فرشتے) ان (کفار) کی جانوں پر سختی کرتے ہیں۔

۵...... (۳)''حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا (انعام:۶۱)''ترجمہ: حتیٰ کہ جب تم میں سے ایک کی موت آجاتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کو قبض کر لیتے ہیں۔

۶...... (۴)''حَتّٰی اِذَا جَآءَ تْھُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَھُمْ (اعراف:۳۷)''ترجمہ:حتیٰ کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے آجاتے ہیں تو ان کو قبض کر لیتے ہیں۔

۷...... (۵)''وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ (انفعال:۵۰)''ترجمہ: کاش تو دیکھے جب قبض کرتے ہیں فرشتے کفار کو مارتے ہیں،ان کے چہروں پر اور پشتوں پر۔

۸...... (۶)''فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ (محمد:۲۷)''ترجمہ:پس کس طرح ہوگا جب قبض کریں گے،ان کو فرشتے مارتے ہوئے ان کے چہروں پر اور ان کی پشتوں پر۔

۹...... (۷)''اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ ظَالِمِیْ اَنْفُسِھِمْ (نحل:۲۸)''ترجمہ: جن کو قبض کرتے ہیں۔فرشتے سختی کرتے ہوئے ان کی جانوں پر۔

۱۰...... (۸)''اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ (نحل:۳۲)''ترجمہ:جن کو قبض کرتے ہیں فرشتے خوشحالی میں۔

۱۱...... (۹)''قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ (الم سجدہ:۱۱)'' ترجمہ:(اے پیغمبر) ان سے کہو تم کو قبض کر لے گا ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

۱۲...... (۱)''وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ (یونس:۴۶)'' ترجمہ:اگر ہم تجھ کو اپنے وعدے کے ایک حصہ کی باتیں دکھادیں یا تجھ کو قبض کر لیں۔

بیان قرینہ: ان تین آیات میں توفی بمقابلہ نرینّک آئی ہے۔ جومعنی موت کے لئے قوی قرینہ ہے۔ کیونکہ وعدہ نرینّک زندگی چاہتا ہے۔ پس نتوفّینّک ضرور اس کی ضد یعنی موت ہونا چاہئے۔ دیگر یہ کہ اس مضمون میں سورۃ (زخرف:۴۲) میں نتوفّینّک کی بجائے نذھبنّ بک وارد ہے جو کنایہ ہے فنا سے۔

۱۳...... (۲)''وَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ (رعد:۴۰)''

۱۴...... (۳)''فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ (مؤمن:۷۷)''

۱۵...... (۱)''وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا (نحل:۷۰)'' ترجمہ: خدا نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم کو قبض کرے گا اور بعض تم میں سے اس لئے ارذل عمر تک پہنچائے جاتے ہیں کہ بعد جاننے کے کچھ بھی نہ جانیں۔

بیان قرینہ: ان آیات میں جس جس موقع پر لفظ توفی وارد ہوا ہے۔ سورت (مومنون:۱۵) میں اس موقعہ پر لفظ میّتون وارد ہوا ہے۔ پس صاف معلوم ہوگیا کہ یہ آیت توفی کی تفسیر موت سے کرتی ہے۔ علاوہ بریں یہ کہ قبل پیدائش سے موت تک جس قدر مختلف قدرتی حالات انسان پر وارد ہوتے ہیں۔ ان آیات میں ان سب کا بالتفصیل ذکر ہے۔ مثلاً پہلے مٹی، پھر نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ (گوشت کا ٹکڑا) پھر ہڈی پر گوشت پھر مدت حمل تک رحم میں رہنا، پھر طفل ہوکر پیدا ہونا پھر بڑھنا پھر جوان ہونا، پھر بوڑھا ہونا، پھر اجل مقرر تک پہنچ کر مرنا۔ یہ سب حالتیں اس بات کے قرائن ہیں کہ ان مقامات پر توفی سے مراد موت ہے۔ کیونکہ موت بھی ایک حالت ہے۔ پچھلی آیت (سورہ مومن) میں ایک اور نکتہ ہے کہ چونکہ جملہ معلّلہ ''لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّکُمْ'' کا عطف خبریہ یُخْرِجُکُمْ پر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے لامحالہ یُبْقِیْکُمْ مقدر نکالنا پڑے گا (جامع البیان زیر آیت ہذا) لہٰذا بقا کے مقابلے میں جو توفی ہوگی ضرور اس سے مراد فنا یعنی موت ہوگی۔

۱۶...... ''یَا أَیُّھَا النَّاسُ إِن کُنتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاکُم مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ وَنُقِرُّ فِیْ الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَی أَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا أَشُدَّکُمْ وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ إِلَی أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْ

بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (حج:۵) ’’ترجمہ: اے لوگو! اگر تم (دوبارہ) جی اٹھنے سے شک میں ہو تو (خیال کرو کہ) ہم نے (پہلے) تو تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے خون سے، پھر پورے بنے ہوئے اور نہ بنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے سے۔ تا کہ تم کو بتائیں اور ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ ہم رحموں میں جو چاہیں، مدت مقرر تک پھر تم کو بچے کی صورت میں باہر نکالتے ہیں۔ پھر (تم کو زندہ رکھتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور بعض تم میں سے (پہلے) قبض کئے جاتے ہیں اور بعض ارذل عمر تک پہنچائے جاتے ہیں تا کہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہ جانیں۔

۱۷...... ’’هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَّمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْا أَجَلًا مُّسَمًّى (مؤمن:۶۷) ’’ترجمہ: پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر جمے خون سے، پھر تم کو بچے کی صورت میں نکالتا ہے۔ پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ پھر تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور بعض تم میں سے (پہلے) بھی قبض کر لئے جاتے ہیں اور تا کہ تم اپنی اجل مقررہ کو پہنچو۔

۱۸...... ’’رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (آل عمران:۱۹۳) ’’ترجمہ: خداوند! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیاں دور کر دے اور ہم کو نیکوں کے ساتھ قبض کرنا۔

بیان قرینہ: ان آیات میں قرینہ صارفہ موجود ہے اور وہ دعائے لحوق بالصالحین والابرار ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ کنایہ ہیں موت سے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ’’اَوَّلُكُنَّ لُحُوْقًا بِىْ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا ‘‘اور نیز صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں ’’مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ. الايه ‘‘پڑھا اور نیز ’’اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِىْ وَارْحَمْنِىْ وَالْحِقْنِىْ بِالرَّفِيْقِ ‘‘اور نیز آخر کلمہ آپ ﷺ کا ’’اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى ‘‘تھا۔ ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ دعائے لحوق بالصالحین والابرار والرفیق الاعلیٰ سے موت بخاتمہ حسنہ مراد ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ آیات بھی قرینہ سے خالی نہیں۔

۱۹...... ’’رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (اعراف:۱۲۶) ’’ترجمہ: خداوند! ہم پر فضل انڈیل دے اور قبض کرنا ہم کو مسلمان کر کے۔

۲۰...... (۲)''اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف:۱۰۱)''ترجمہ: تو ہی میرا مددگار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی قبض کرنا مجھے مسلمان کر کے اور ملانا مجھے صالحین سے۔

۲۱...... (۱)''وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِاللَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰی اَجَلٌ مُّسَمًّی (انعام:۶۰)''ترجمہ: خدا وہ ذات ہے جو تم کو رات کو قبض کرتا ہے اور جانتا ہے جو تم دن کو کرتے ہو۔ پھر تم کو دن کے وقت اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ زندگی کی مدّت مقرر پوری کی جائے۔

۲۲...... (۲)''اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (زمر:۴۲)''ترجمہ: خدا ہی قبض کرتا ہے جانوں کو موت (روح اور جسم کی مفارقت) کے وقت اور جو ابھی نہیں مریں ان کو (قبض کرتا ہے) ان کی نیند میں۔ پس جس پر موت (کا حکم) جاری کیا ہے۔ اس کو تو بند رکھتا ہے اور دوسری (نیند والی) کو مدت مقرر (موت) تک بھیجتا رہتا ہے۔

بیان قرینہ: ان آیتوں میں بھی قرائن موجود ہیں۔ پہلی آیت میں توفی سے مراد نیند ہے۔ کیونکہ قرینہ لیل (رات) موجود ہے اور پھر ساتھ ہی پھر دن کو اٹھ کھڑے ہونے اور کام کاج کرنے کا ذکر ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد اس توفی سے جو رات کے وقت ہو اور پھر اس کے بعد دن کو کھڑے ہوں، نیند ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں پہلے موقع پر توفی سے مراد موت ہے بقرینہ ''حین موتها'' اور دوسرے موقع پر جو بقاعدہ عطف محذوف ہے۔ اس سے مراد نیند ہے۔ بقرینہ منامها۔

اس پچھلی آیت میں ایک اور نکتہ ہے کہ جس نفس کی توفی بالموت ہوتی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ''فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ''فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ توفی کے وضعی معنی صرف اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا ہیں۔ کیونکہ امساک سے مراد ابقاء ہے۔ اسی حالت ماخوذہ پر نہ تجدّد اور اسی لئے قضا بالموت کی تصریح ضروری ہوئی۔ اس آیت کی دوسری شق میں جہاں توفی سے مراد نیند ہے۔ علاوہ قرینہ ''فی منامها'' کے ''یُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی'' قرینہ ہے۔ توفی سے نیند مراد لینے پر۔ کیونکہ اس کے معنی

وہی ہیں جو پہلی آیت سورت انعام میں ’’ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰی اَجَلٌ مُّسَمًّی‘‘ کے ہیں۔ غرض ان آیات میں حسب قرائن لیل و منام و بعثة فی النهار (دن کو اٹھا کھڑا ہونا) توفی سے مراد نیند ہے اور یہ توفی کی دوسری نوع ہے۔

گزشتہ آیات میں توفی کی ایک نوع موت آئی تھی بقرائن موجبہ معنی موت اور اس جگہ بقرائن موجبہ معنی نیند توفی کی دوسری نوع نیند ثابت ہوئی۔ کیا اب بھی توفی کے جنس اور موت اور نیند کے انواع ہونے میں شک باقی رہا ہے۔

تنبیہ: واضح ہو کہ نیند کے موقع پر قبض روح کا لفظ بولنے سے کسی کو یہ دھوکہ نہ لگ جاوے کہ نیند موت ہوتی ہے، نفی کے لئے اسی آیت سورہ زمر میں ’’وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ‘‘ موجود ہے۔ مرزا قادیانی نے اس آیت میں لفظ ’’لَمْ تَمُتْ‘‘ چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ کسی کو یہ خبر نہ ہو جائے کہ سوئے ہوئے کا حکم ’’لَمْ تَمُتْ‘‘ ہے یعنی یہ کہ وہ مردہ نہیں اور حدیث شریف میں جو ’’اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا‘‘ آیا ہے۔ وہ اس آیت کے معارض نہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں نفی حقیقت موت کی گئی ہے اور حدیث میں نیند کو موت مجازاً کہا گیا ہے۔ بموجب اس تحقیق کے جو ہم نے ذکر کی، نہ مطابق زعم مرزا قادیانی کے۔

اور اہل علم پر روشن ہے کہ حقیقت ومجاز کے رو سے نفی واثبات کا فرق ہو تو ان میں تعارض وتناقض نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر دو میں ذوات مختلف ہیں۔

۲۳...... (۲)’’قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَا اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ اَعْبُدُاللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (یونس:۱۰۴)‘‘ ترجمہ: (اے پیغمبر) کہو اے لوگو! اگر تم میرے دین سے شک میں ہو تو (سن رکھو) میں تو ان کو جن کو تم پوجتے ہو کبھی نہیں پوجوں گا۔ ہاں! میں تو صرف اللہ کی عبادت کروں گا جو تم کو قبض کرتا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ ایمانداروں میں سے ہوں۔

بیان قرینہ: مراد اس آیت سے یہ ہے کہ میں تو اپنا معبود صرف اس ذات برحق کو بناتا ہوں۔ جس کے قبضہ واختیار میں تمہارا ایجاد وابقا اور اعدام وافناء اور ارجاع ہے۔ جیسا کہ آیت: ’’کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرہ:۲۸)‘‘ وامثالہا سے ظاہر ہے اور صرف اعدام وافنا کے ذکر پر اکتفاء کی یہ وجہ ہے کہ علوم عقلیہ میں ثابت شدہ ہے کہ ذکر احد الضّدین کا استلزاماً ضد آخر پر دلالت

کرتا ہے۔ جیسے نور کہ اس کے ذکر سے اس کی ضد ظلمت کا بھی تصور حاصل ہوتا ہے اور اسی طرح سواد سے بیاض۔ پس اسی طرح ذکر اعدام استلزاماً ایجاد کا بھی مشعر ہے۔ قرآن شریف میں اس کی نظائر بہت ہیں۔ دیکھو تفسیر کبیر وکشاف وابی السعود تحت آیت: ''سَرَابِیلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ'' کہ مجرّد گرمی کے ذکر سے اس کی ضد سردی بھی معلوم ہوسکتی ہے اور نیز فتح الباری شرح صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ میں تحت ''ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ الَّذِیْنَ بَاتُوْا فِیْکُمْ'' مسطور ہے کہ اس سے ''الذین ظلّوا'' پر بھی دلالت ہوسکتی ہے۔ پس ثانی کو استغناء حذف کیا۔ ''لِاَنَّ ذِکْرَا اَحَدِ الضِّدَّیْنِ تَنْبِیْہٌ عَلَی الضِّدِّ الْاٰخِرِ'' نیز اس لئے کہ تحقق فناء واعدام بغیر تحقق ایجاد کے متصور نہیں ہوسکتا۔ پس جو توفی بمقابلہ ایجاد مذکور ہو لابد اس سے مراد اعدام ہوگی ''وھو الموت'' اور باوجود ہر شئے کے قبضہ قدرت باری عزاسمہ، میں ہونے کے جیسا کہ ''فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ (یٰسین:۸۳)'' سے ثابت ہے۔ صرف مخاطبین یعنی کفار ہی کو متعلق توفی گردانئے میں تہدید کفار ملحوظ ہے۔ جیسا کہ سباق سے ظاہر ہے اور یہی امر مؤید ہے تخصیص ذکر توفی کا ''دُوْنَ ذِکْرِ نِعْمَۃِ الْاِیْجَادِ لِاَنَّ الْمَقَامَ مَقَامُ تَخْوِیْفٍ وَتَھْدِیْدٍ'' یعنی ایجاد وخلق کی نعمت کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ مقام تخویف وتہدید کا ہے اور اصل بلاغت یہی ہے کہ مقتضائے حال کا لحاظ کیا جائے۔

اور نیز چونکہ اس آیت: ''مَانَحْنُ فِیْھَا'' سے پہلے اہلاک کفار اور ''انجاء رسل اللّٰہ مومنین'' کا ذکر ہے۔ اس لئے مراد اس پارۂ آیت سے یہ ہوگی کہ میں اسی ایک معبود برحق کی پرستش کرتا ہوں۔ جس نے مجھ سے تمہاری ہلاکت اور میرے بقاء کا وعدہ کیا ہے۔ پس اس طریق سے بھی توفی بمقابلہ ابقاء مذکور ہوئی۔ ''فَثَبَتَ الْقَرِیْنَۃُ وَانْدَفَعَتِ الرِّیْبَۃُ'' مضمون مذکورہ تفاسیر معتبرہ مثل تفسیر کبیر، ابن کثیر، فتح البیان، ابی السعود، رحمانی، کشّاف وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ فتامّل ولا تعجل!

۲۴...... (۲) ''یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران:۵۵)'' ترجمہ: اے عیسیٰ! میں ہوں تیرا بھر لینے والا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لینے والا اور کافروں سے تجھے پاک رکھنے والا۔

<u>بیان قرینہ:</u> ان ہر دو آیات میں توفی سے مراد رفع جسمی ہے بقرینہ صریحہ ''رَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (اٹھا لینے والا ہوں تجھ کو اپنی طرف) اور آیت وافیہ

’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (النساء:۱۵۸)‘‘ (بلکہ اٹھالیا خدا نے اس کو طرف اپنی اور بموجب حدیث نزول کے بتصریح ’’من السمآء ‘‘ (کتاب الاسمآء والصفات للبیھقی رحمۃ اللہ علیہ و نیز کنز العمال) کما سیجیء ذکر ذلک مستوفٰی ان شاء اللّٰہ تعالٰی!

بس اب قرآن شریف کی جملہ آیات توفی کا پورا بیان ہو چکا اور ایک نیک باطن، پاک طینت، صاحب بصیرت کے لئے کوئی گنجائش انکار باقی نہ رہی اور مرزا قادیانی کے طعن کا جواب جس میں انہوں نے اپنے (ازالہ اوہام ص۳۳۵ ملخص، خزائن ج۳ ص۲۷۰) میں کل علمائے سلف وخلف کو ملحد ومحرّف قرار دے دیا ہے، کافی طور پر ہو چکا کہ دیگر مواقع پر توفی سے موت اور نیند مراد لینے کی یہ وجوہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں توفی سے رفع مراد لینے کی یہ وجہ ہے۔ لہٰذا مرزا قادیانی کو کوئی حق نہیں کہ ناحق علمائے اسلام کی شان میں بدزبانی کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں[1]:

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں کند

اگر کوئی لفظ کئی معنوں میں اطلاق پذیر ہے۔ خواہ وہ معنی حقیقی ہوں خواہ منقولی باقسامہا تو قرآن شریف میں اس کے مواضع کثیرہ میں ایک ہی معنی میں مستعمل ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ دیگر مواضع میں بھی اس کے یہی معنی لیں گے۔ کیونکہ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ سارے قرآن شریف میں کسی لفظ کے ایک ہی معنی ہیں اور صرف ایک جگہ پر اس لفظ کے اور معنی ہیں۔ یہاں صرف پانچ مثالوں پر اکتفاء کی جاتی ہے۔ زیادہ تحقیقات کے لئے تفسیر اتقان کو ملاحظہ فرماویں۔

اوّل: لفظ ’’اصحاب النّار ‘‘ (قرآن مجید میں جس جگہ آیا ہے اس کے معنی دوزخ میں جلنے والے کفّار وفسّاق ہیں) سوائے سورت مدثر کے کہ اس میں اس کے معنی وہ فرشتے ہیں جو دوزخ پر مقرر ہیں۔

دوم: ’’بعل ‘‘ کے معنی سورہ بقرہ اور نسآء میں شوہر ہیں اور صافّات میں نام ہے، اس بت کا جسے وہ قوم پوجتی تھی۔ جن کی طرف حضرت الیاس علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔

سوم: ’’عود اور عادۃ‘‘ کے معنی سارے قرآن شریف میں تکرار فعل کے ہیں۔ بجز آیت: ’’وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (المجادلہ:۳)‘‘ کے کہ اس میں توبہ اور پشیمانی مراد ہے۔

[1] اب تو برزخ میں اس بدزبانی کا مزہ چکھ رہے ہوں گے۔

چہارم: ’’ریب‘‘ کے معنی ہر جگہ شک ہیں۔ مگر آیت: ’’رَیْبَ الْمَنُوْن (الطور: ۳۰)‘‘ میں حوادث زمانہ مراد ہے۔

پنجم: ’’بروج‘‘ سے مراد ہر جگہ کواکب ہیں۔ مگر ’’بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (نسآء: ۷۸)‘‘ میں اونچے اور محکم محل مراد ہیں۔

ورافعک الیّ

لفظ توفی کی نسبت کافی طور پر تحقیق ہو چکی اور علم تصریف اور کتب لغت اور تفاسیر معتبرہ سے بہ بسط محقق ہو چکا کہ لفظ ’’تَوَفِّیْ اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینے کے لئے موضوع ہے اور موت اور نیند اور رفع اس کے انواع ہیں اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کسی ایک نوع کی تعیین کے لئے حاجت قرینہ کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نقشہ آیات توفی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ پس قول الٰہی ’’یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ‘‘ سے رفع جسد الی السماء مراد لینے کے لئے پہلا قرینہ ’’وَرَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ ہے اور ’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ سے رفع روح اور عزت کی موت مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ مرزا قادیانی کہتے ہیں۔ بلکہ مراد اس سے رفع جسم الی السماء ہے۔ لاغیر!

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ صراح میں لکھا ہے ’’رفع برداشتن‘‘ ’’وَھُوَ خِلَافُ الْوَضْعِ‘‘ یعنی رفع کے معنی اوپر کی طرف اٹھانا ہیں۔ برخلاف لفظ وضع کے کہ اس کے معنی ’’نیچے رکھنا‘‘ ہیں۔ اسی طرح ’’المصباح المنیر‘‘ میں لکھا ہے: ’’رَفَعْتُہٗ رَفْعًا خِلَافُ خَفَضْتُہٗ‘‘

لغت کی کسی کتاب میں رفع کے معنی ’’عزت کی موت‘‘ نہیں لکھے اور نہ کسی محاورہ میں اس کا استعمال اس معنی میں پایا گیا ہے۔ یہ صرف مرزا قادیانی کا تصرف فی اللغۃ ہے۔ جس طرح چاہتے ہیں قرآن وحدیث اور لغت کو اپنی مرضی کے تابع کر لیتے ہیں[1]۔

[1] اکمل صاحب قادیانی نے اس موقع پر عجیب کمال دکھایا ہے۔ آپ رفع الی اللہ سے ’’عزت کی موت‘‘ مراد لینے کی وجہ میں فرماتے ہیں: ’’اگر کہیں عزت کی موت (مرزا قادیانی نے) لکھا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ توفی کے معنی موت اور رفع الی اللہ سے مراد عزت دونوں کو ملا کر حاصل ’’میں نے اس کو اوپر اٹھایا‘‘ برخلاف میں نے اسے نیچے رکھا۔ (عبدالقیوم میر) مطلب عزت کی موت ہوا۔‘‘ (ص۲۷) جواب: سبحان اللہ! دو اور دو چار روٹیاں اسی کو کہتے ہیں۔ جناب! عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت توفی اور رفع الی اللہ ہر دو مستعمل بالمفہومیہ اور متساوق ہیں۔ ایک کو دوسرے کا ضمیمہ بنا کر معجون مرکب نہیں بنا سکتے۔ ’’سخن شناس نہ اکملا! خطا ایں جاست‘‘ (سعادت)

اگر کہا جائے کہ جب رفع کا صلہ الیٰ آتا ہے تو یہ کنایہ ہوتا ہے۔ اعزاز واکرام سے۔ جیسا کہ محاورہ ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' صراح میں موجود ہے[1] تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ اس محاورہ سے تمسک کرنے سے مرزا قادیانی کو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو رفع الی اللہ سے ''عزت کی موت'' مراد لیتے ہیں۔ پس جب تک محاورہ ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' میں بھی عزت کی موت مراد نہ ہو۔ تب تک اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں۔

ثانیاً یہ کہ محاورہ ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' کو رفع جسمی کے انکار میں پیش کرنا استعداد علمی سے عاری ہونے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ صراح کی پوری عبارت یوں ہے ''ونزدیک گردانیدن کسے را بکسے'' ''صِلَتُهٗ بِاِلٰی وَمِنْ ذٰلِکَ قَوْلُهُمْ رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' جب عبارت ''نزدیک گردانیدن کسے را بکسے'' موجود ہے تو اس سے ذی علم وفہم کو یہ وہم نہیں ہوسکتا کہ اس جگہ رفع سے مراد صرف رفعت منزلت ہے۔ کیونکہ کسی کو کسی کے نزدیک کرنے میں قرب جسمی ملحوظ ہوتا ہے۔ پس محاورہ ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' کے معنی یہ نہیں کہ اس شخص کو گھر بیٹھے بٹھائے عزّت دلا دی۔ بلکہ معنی تو یہ ہیں کہ میں اس کو پادشاہ کے حضور لے گیا۔ عزت اور ذلت سے اس میں کوئی بحث نہیں۔ اگر وہ شخص منظور نظر شاہی ہے تو حضور شاہی میں اس کی عزت ہوگی اور اگر کوئی مجرم ہے تو مورد سخطات شاہی ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ اور حاکم کی حضوری میں عزت وذلت اپنی حیثیت اور استعداد کے لحاظ سے ہے۔ نہ باعتبار بادشاہ کے...... ۔ چنانچہ (فتح الباری شرح صحیح بخاری جزء۹ص۴۳۱) میں محاورہ ''رَفَعَهٗ اِلَی الْحَاکِمِ'' کے معنی جو ہر طرح سے ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' کا ہم پلّہ ہے ''اَحْضَرَهٗ لِلشِّکْوٰی'' یعنی شکایت کے لئے حاکم کے حضور میں لے جانا لکھے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ صراح کی عبارت کا مطلب عندارادۃ الاعزاز یہ ہے کہ برتقدیر ارادۂ معنی اعزاز ومرتبہ رفع کا صلہ الیٰ آنا چاہئے۔ نہ یہ کہ جس جگہ رفع کا صلہ الیٰ ہو۔ اس سے بغیر اعزاز واکرام کے اور کچھ ارادہ ہی نہیں کرسکتے۔ تاکہ رفع جسمی ممنوع خیال کیا جائے اور مخالف کو کامیابی ہو۔ بلکہ الیٰ کے صلہ ہونے کے وقت نظر بر اصل واقعہ کہیں رفع جسمی اور اعزاز دونوں مجتمع ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ''رَفَعْتُهٗ اِلَی السُّلْطَانِ'' میں، جس صورت میں کہ متکلم نے مفعول کو اصالۃً یا وکالۃً بجسمہٖ لے جاکر سلطان کے ہاں معزز بنایا ہو اور ظاہر ہے کہ معنی وضعی

[1] جیسا کہ مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی احمدی نے اپنے رسالہ ''القول الجمیل'' میں لکھا ہے۔

اور معنی کنائی کا اجتماع ممتنع نہیں بخلاف حقیقی اور مجازی کے۔ کما سیجی!

اور کسی جگہ صرف رفع جسمی بغیر ارادۂ اعزاز کے پایا جاتا ہے جیسا کہ امثلہ ذیل اس امر کی مشعر ہیں۔

المثال الاوّل: المصباح المنیر میں بذیل لفظ رفع لکھا ہے۔ ''رَفَعْتُ الزَّرْعَ اِلَی الْبَیْدَرِ'' اور اس کے معنی صراح میں یوں کئے ہیں ''برداشتم غلہ درودہ وبخرمن گاہ آوردم'' یعنی ''میں کھیت کو کاٹ کر اور غلّہ اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آیا''

ایسا ہی قاموس میں ہے: ''اَلزَّرْعَ حَمَلُوْہُ بَعْدَ الْحِصَادِ اِلَی الْبَیْدَرِ'' رفعوالزرع کے یہ معنی ہیں کہ کسان کھیت کاٹنے کے بعد اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آئے۔ اسی طرح اساس البلاغۃ میں بھی ہے۔

المثال الثانی: صحیح بخاری باب ''اَذَا وَکَّلَ رَجُلًا فَتَرَکَ الْوَکِیْلُ شَیْئًا'' میں حدیث: ''وکالۃ ابی ہریرۃ بحفظ زکوٰۃ رمضان'' میں الفاظ ''لَاَرْفَعَنَّکَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ'' وارد ہیں اور (فتح الباری شرح صحیح بخاری باب الوکالۃ جزء۹ص۴۳۱) میں ''لَاَرْفَعَنَّکَ'' کے ذیل میں لکھا ہے: ''اَیْ لَاَذْھَبَنَّ بِکَ اَشْکُوْکَ یُقَالُ رَفَعَہٗ اِلَی الْحَاکِمِ اِذَا اَحْضَرَہٗ لِلشِّکْوٰی'' یعنی ابوہریرہؓ نے (شیطان لعین سارق غلہ صدقات کو کہا کہ) آج تو میں تجھے ضرور ضرور رسول اللہ ﷺ کی جناب میں تیری (بدعملی) کی شکایت کے لئے لے چلوں گا۔

اور اسی طرح یہ محاورہ ہے: ''رَفَعَہٗ اِلَی الْحَاکِمِ'' یعنی وہ اس کو حاکم کے حضور میں اس کی (بدعملی) کی شکایت کے لئے لے گیا۔ اگر رفع کے معنی بوقت صلہ الیٰ صرف اعزاز واکرام ہوتے ہیں تو کیا معاذ اللہ حضرت ابوہریرہؓ نے شیطان سارق (چور) کو عزّت دلانی چاہی تھی؟ اور پھر رسول اللہ ﷺ کی جناب پاک میں؟ نعوذ باللہ من ذلک!

المثال الثالث: صحیح بخاری باب: ''فَضْلِ الْکَھْفِ وَنُزُوْلِ السَّکِیْنَۃِ'' ونیز (مشکوٰۃ المصابیح ص۱۷۶) حدیث قراۃ اسید بن حضیرؓ سورۃ الکہف میں: ''رَفَعَ رَأْسَہٗ اِلَی السَّمَآءِ'' یعنی پس اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور نیز ''فَرَفَعْتُ رَأْسِیْ اِلَی السَّمَآءِ'' یعنی پس میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، وارد ہے۔ اس حدیث میں بھی دو دفعہ رفع کے ساتھ صلہ الیٰ آیا ہے اور دونوں جگہ رفع جسمی مراد ہے بغیر ارادۂ رفع منزلت کے۔

المثال الرابع: صحیح بخاری وصحیح مسلم ونیز (مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب البکاء علی المیّت ص۱۴۲) میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کے فرزند ارجمند رضی اللہ عنہ کے فوت ہونے کی حدیث میں: ’’فَرُفِعَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اَلصَّبِیُّ ‘‘یعنی وہ لڑکا (رسول اللہ ﷺ کا نواسہ) آپ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ سبحان اللہ! رفع جسمی کے لئے کیا عمدہ مثال ہے۔ موت کا وقت بھی ہے اور پھر یہاں عزّت کی موت مراد نہیں۔

المثال الخامس: اللہ تعالیٰ نے سورہ فاطر میں فرمایا: ’’اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (فاطر:۱۰)‘‘ کلمہ طیب خدا ہی کی طرف چڑھتا ہے اور نیک عمل کو خدا بلند کرتا ہے۔

تفسیر فتح البیان میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے: ’’(اِلَیْہِ) تَعَالٰی لَا اِلٰی غَیْرِہٖ (یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ) اَلصَّعُوْدُ ھُوَ الْحَرْکَۃُ اِلٰی فَوْقٍ وَھُوَ الْعُرُوْجُ اَیْضًا وَمَوْضَعُ الثَّوَابِ فَوْقٌ وَمَوْضَعُ الْعَذَابِ اَسْفَلُ وَمَعْنٰی صُعُوْدِہٖ اِلَیْہٖ قُبُوْلُہٗ لَہٗ اَوْ صُعُوْدُ الْکَتَبَۃِ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ بِمَا یَکْتُبُوْنَہٗ مِنَ الصُّحُفِ انتہٰی!‘‘ کلمہ طیب صرف خدا ہی کی طرف چڑھتا ہے اور صعود اس حرکت کو کہتے ہیں جو اوپر کی جانب ہو اور اسے عروج بھی کہتے ہیں اور ثواب کی جگہ اوپر کو ہے اور عذاب کی جگہ نیچے کو ہے اور خدا کی طرف کلمہ کے صعود کے معنی ہیں۔ خدا کا اس کو قبول کر لینا یا اس کے معنی ہیں۔ کراماً کاتبین فرشتوں کا ان صحیفوں کو لے کر چڑھنا جو وہ لکھتے ہیں۔

قلت: صورت ثانیہ یعنی ملائکہ کا اعمال عباد کو کتابت میں لا کر صعود الی السماء کرنا حدیث شریف کے بالکل موافق ہے۔ جیسا کہ اسی تفسیر میں آگے بروایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے: ’’اِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمِ اِذَا قَالَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَتَبَارَکَ اللّٰہُ، قَبَضَ عَلَیْھِنَّ مَلَکٌ فَضَمَّھُنَّ تَحْتَ جَنَاحِہٖ ثُمَّ یَصْعَدُ بِھِنَّ اِلَی السَّمَآءِ فَلَا یَمُرُّبِھِنَّ عَلٰی جَمْعٍ مِّنَ الْمَلَائِکَۃِ اِلَّا اسْتَغْفَرَ لِقَائِلِھِنَّ حَتّٰی یُحَیّٰ بِھِنَّ وَجْہُ الرَّحْمٰنِ ثُمَّ قَرَءَ ’’اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ‘‘ الایۃ ‘‘یعنی جس وقت کوئی مسلمان سبحان اللہ وبحمدہ...... الخ! پڑھتا ہے تو ایک فرشتہ (جو ان کلمات پر مؤکل ہوتا ہے) ان کلمات کو لے لیتا ہے اور اپنے بازوؤں کے نیچے لگا کر آسمان پر لے چڑھتا ہے۔ پس فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے وہ گزرتا ہے۔ وہ

سب اس کے قائل کے لئے دعائے استغفار کرتے ہیں۔حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں تحفۂ پیش کئے جاتے ہیں۔

(عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ حدیث سنا کر) پھر یہ آیت: ''یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ'' پڑھی۔

اور اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں بھی اس آیت کے ذیل میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ معنی دیگر کئی احادیث سے بھی ثابت ہیں۔چنانچہ صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ میں کراماً کاتبین کی نسبت ''ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ الَّذِیْنَ بَاتُوْا فِیْکُمْ'' (پھر وہ جو رات کو تم میں رہے خدا کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں) وارد ہے۔نیز معلوم رہے کہ اس جگہ بھی عروج جو صعود کا مترادف ہے۔اس کا صلہ الیٰ آیا ہے اور مراد عروج حقیقی ہے، نہ کنائی، نہ مجازی۔

دیگر یہ کہ ''صعود الی اللہ'' قبولیت مراد رکھنا بنابر ارادۂ معنی لازمی کے ہے اور ممارس کتب فن پر ظاہر ہے کہ لازمی معنوں کے ساتھ حقیقی معنوں کا ارادہ جائز ہے۔جیسا کہ آگے بحث کنایہ میں مفصل طور پر مطوّل سے نقل کیا جائے گا۔ان شاءاللہ! کیونکہ کلمات طیّبات مکتوب ہوکر آسمان کی طرف مرفوع ہوتے اور جناب خدا میں قبول ہوتے ہیں۔فافهم!

المثال السادس: صحیح مسلم میں ہے: ''یُرْفَعُ اِلَیْهِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ (الحدیث)'' رات کا عمل خدا کی طرف مرفوع ہوجاتا ہے۔پیشتر اس کے کہ دن کا عمل صادر ہو۔

اس میں بھی رفع کا صلہ الیٰ آیا ہے اور صورت صعود اعمال کی اوپر کی مثال میں گزر چکی۔گویا یہ حدیث من وجہ تفسیر ہے آیت: ''اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ'' کی۔شیخ عبدالحق صاحب محدّث دہلویؒ شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں یوں فرماتے ہیں ''یُرْفَعُ اِلَیْهِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ'' یعنی برداشتہ میشود و بالا بردہ میشود بسوئے درگاہ وے علمائے بندگان کہ در شب مے کند پیش از عملہائے کہ در روزے کنند ''وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّیْلِ'' وبرداشتہ میشو عمل روز پیش از عمل شب نرسیدہ کہ عمل روز بیرند و دریں مبالغہ است در مساعت ملائکہ مؤکل باعمال عباد و امتثال امر وسرعت عروج ایشان بحال عرض و مصاعد سمٰوٰت ایشان بر رفع اعمال در ادنیٰ ساعت، چہ فرق میان روز وشب جز آنی و جزو لایتجزیٰ نبود۔انتہیٰ!

ایسا ہی امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا: ’’فَاِنَّ الْمَلَائِکَۃَ الْحَفَظَۃَ یَصْعَدُوْنَ بِاَعْمَالِ اللَّیْلِ بَعْدَ انْقِضَآئِہٖ فِیْ اَوَّلِ النَّھَارِ وَیَصْعَدُوْنَ بِاَعْمَالِ النَّھَارِ بَعْدَ انْقِضَائِہٖ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ ‘‘ ملائکہ محافظین رات کے اعمال اس کے گزر جانے پر دن کے اوّل وقت میں لے چڑھتے ہیں اور (اسی طرح) دن کے اعمال اس کے گزرنے پر رات کے شروع میں لے چڑھتے ہیں۔

المثال السابع: مجمع البحار میں زیر لفظ رفع لکھا ہے: ’’فَرَفَعَہٗ اِلٰی یَدِہٖ اَیْ رَفَعَہٗ اِلٰی غَایَۃِ طُوْلِ یَدِہٖ لَیَرَاہُ النَّاسُ فَیُفْطِرُوْنَ (ج ثانی ص ۲۳) ‘‘یعنی آنحضرت ﷺ نے پیالہ اپنے دست مبارک کی لمبائی کے برابر اوپر اٹھایا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور روزے افطار کریں۔ اس حدیث میں بھی رفع کا صلہ الٰی آیا ہے اور اس سے حقیقتاً مفعول رفع یعنی برتن کا مدخول الٰی کی طرف اٹھانا ہے۔ پس رفع جسمی ثابت ہے۔

المثال الثامن: (مجمع البحار ج۲ ص۲۳) ’’یَرْفَعُہٗ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ ‘‘اس میں بھی صلہ الٰی آیا ہے اور مراد اس سے مدخول الٰی کی طرف بات کو نسبت کرنا اور اس تک پہنچانا ہے ’’وَفِیْ تِلْکَ الْاَمْثِلَۃِ کِفَایَۃٌ لِمَنْ لَّہٗ دِرَایَۃٌ‘‘ (اتنی مثالیں سمجھ والے کے لئے کافی ہیں[1])

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ جب رفع کا صلہ الٰی آتا ہے تو اس کے معنی ’’شئے مذکور کو مدخول الٰی کی طرف اٹھانا۔‘‘ ہوا کرتے ہیں بغیر ارادۂ معنی موت واعزاز واکرام کے، خواہ وہ شئے جوہر ہو خواہ عرض۔ خلاصۃ المرام یہ کہ لغت میں رفع کے حقیقی اور وضعی معنی ’’اوپر کو اٹھانا‘‘ ہیں۔ برخلاف وضع اور خفض کے کہ ان کے معنی ’’نیچے رکھنا‘‘ ہیں۔ پس جہاں رفع کا مفعول کوئی جسم ہوگا۔ وہاں اس سے مراد نیچے سے اوپر کو حرکت دینا ہوگی اور اگر اس کا متعلق ومعمول کوئی معنی ہوگا تو اقتضاء مقام پر محمول ہوگا۔ جیسے محاورہ ’’رَفَعْتُہٗ اِلَی الْحَاکِم ‘‘میں اگر ضمیر منصوب سے مراد کوئی جسم ہو تو اس سے مراد رفع جسمی ہوگی اور اگر کوئی امر ومعاملہ ہو تو صرف اس امر کا پیش کرنا مراد ہوگا۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے المصباح

[1] مولوی اکمل صاحب مہاجر قادیانی ان مثالوں کی کثرت سے سخت گھبرا گئے ہیں اور ایسی بہکی ہوئی باتیں کرنے لگے ہیں کہ بامذاق آدمی کو بے اختیار ہنسی آجائے اور علمی کمال کا قدردان نفرت سے ان کی کتاب کے دیکھنے سے بیزار ہو جائے۔ میں تو حیران ہوں کہ انہوں نے اپنا تخلص اکمل کیوں رکھ لیا جو شخص شہادت القرآن نہیں سمجھ سکتا وہ اکمل کیوں بنے۔ (سعادت)

المنیر کی عبارت ذیل ملاحظہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ظلمات شکوک سے نجات دے۔

’’فَالرَّفْعُ فِی الْاَجْسَامِ حَقِیْقَۃٌ فِی الْحَرْکَۃِ وَالْاِنْتِقَالِ وَفِی الْمَعَانِیْ عَلٰی مَا یَقْتَضِیْہِ الْمَقَامُ‘‘ لفظ رفع جسموں کے متعلق حقیقی معنی کے رو سے حرکت اور انتقال کے لئے ہوتا ہے اور معانی کے متعلق جیسا موقع ومقام ہو، ویسی مراد ہوتی ہے۔

مصباح کی اس تصریح سے واضح ہوگیا کہ رفع کے حقیقی اور وضعی معنی نیچے سے اوپر کو حرکت اور انتقال کے ہوتے ہیں اور نیز محاورات سابقہ سے روشن ہوگیا کہ رفع کا صلہ جب الیٰ آئے تو اس کے معنی شئے مذکور کا مدخول الیٰ کی طرف مرفوع ہونا ہوا کرتے ہیں۔ پس اس بیان وتحقیق سے ’’ورافعک الیّ‘‘ سے یہ محقق ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بجسدہ زندہ مرفوع الی السماء ہوئے۔ کیونکہ ’’رافعک‘‘ میں ضمیر مخاطب راجع بطرف منادی یعنی عیسیٰ علیہ السلام ہے اور اسماء اجسام مع ارواح کے ہوا کرتے ہیں، نہ مجرد ارواح کے اور نہ مجرّد اجسام کے اور کلمات الی اللہ والی السماء ہر دو سے ایک ہی مقصود ہے۔ علٰی ما سنبیّن ان شاء اللہ!

ثالثاً یہ کہ کنایات بغیر ارادہ ومعنی کنائی وبغیر مطابقت باصل واقعہ کے اور مجازات بغیر تعذّر حقیقت یا وجود قرینہ صارفہ کے مراد نہیں لئے جاسکتے۔ مثلاً کشف عن الساق جو کنایہ شدّت اور مستعدی سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ محاورہ اپنے معانی حقیقیہ یعنی ’’پنڈلی کو برہنہ کرنا‘‘ پر کبھی بھی دال نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پانی سے گزرنے کے وقت یا کسی اور تقریب سے اپنی ساق (پنڈلی) کو فی الواقع برہنہ کرے تو یہ الفاظ معانی حقیقیہ پر محمول ہوں گے۔ جیسے آیت سورہ نمل میں ہے: ’’وَکَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْہَا (نمل)‘‘ کہ بلقیس نے (شیش محل میں جاتے وقت شیشے کے فرش کو پانی خیال کر کے اپنے پائینچوں کو سمیٹا اور) اپنی پنڈلی کو ننگا کیا (علیٰ قولٍ) اور اگر حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس شخص نے اپنی پنڈلی برہنہ نہیں کی اور متکلم نے بھی اس معنی کا ارادہ نہیں کیا تو یہی الفاظ کنایہ ہوں گے۔ مستعدّی یا شدّت سے جیسا کہ اس شعر میں ہے:

اصبر عناق انہ شر باق قد سنّ لی قومک ضرب الاعناق

وقامت الحرب بنا علی ساق

(تفسیر اتقان)

مع ہذا معنی حقیقی اور معنی کنائی دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔ برخلاف مجاز کے کہ یہ حقیقت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی اور کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے۔ جیسا کہ مطوّل میں بالتصریح مذکور ہے:’’**الکنایة لفظ اريد به لازم معناه مع جواز ارادته معه ای ارادة ذلک المعنی مع لازمه کلفظ ’’طویل النجاد‘‘ والمراد به لازم معناه اعنی طول القامة مع جواز ان یراد حقیة طول النجاد ایضاً فظهر انها تخالف المجاز من جهة ارادة المعنی الحقیقی للفظ مع ارادة طول القامة بخلاف المجاز فانه لا یصح فیه ان یراد المعنی الحقیقی. انتهیٰ!**‘‘ کنایہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے اس کے لازمی معنی کا ارادہ کیا جائے اور اس لازمی معنی کے ساتھ اس لفظ کے اصلی معنی کا ارادہ بھی جائز ہو۔ مثلاً لفظ ’’طویل النجاد‘‘ کہ اس سے اس کے لازمی معنی یعنی ’’قد کی درازی‘‘ مراد ہیں اور ساتھ ہی اس کے حقیقی معنی (شرافت نسب) بھی مراد لینے جائز ہیں۔ پس ظاہر ہوگیا کہ کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی اور لازمی ہر دو معنی جمع ہوسکتے ہیں۔ بخلاف مجاز کہ اس کے ساتھ حقیقی معنی جمع نہیں ہوسکتے۔

اسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:’’**رافعک الیّ**‘‘ کے معنی حقیقی یعنی رفع جسمی جو بالکل حق ہیں اور معنی کنائی (فرضی) یعنی رفع منزلت جو مراد نہیں ہیں۔ ان دونوں میں تبائن کلی ومنافات نہیں ہے۔ بلکہ دونوں معاً مجتمع ومتحقق ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ رفع جسمی بہ نسبت عبد صالح مستلزم اعزاز واکرام ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:’’**وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ**‘‘ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر چڑھا کر بٹھایا۔

خصوصاً مسئلہ ’’**مَا نَحْنُ فِیْهَا**‘‘ یعنی رفع مسیح علیہ السلام الی السمآء میں رفعت قدر ومنزلت بھی بطریق اولیٰ واحسن پائی جاتی ہے۔ پس معنی کنائی ہم کو مضر نہیں۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ارادہ معنی کنائی کے وقت ارادہ معنی حقیقی بالضرور ممنوع ہے اور معنی مجازی کی نسبت یہ جواب ہے کہ ارادۂ مجازات بغیر حقیقت کے ممنوع ہونے کے یا بغیر قرینہ موجود ہونے کے ممنوع ہے جیسا کہ علم اصول اور بیان میں مصرّح ہے۔

اسی لئے قرآن شریف میں جہاں کہیں رفع سے مراد رفع بحسب الدرجہ مراد ہے۔ وہاں بالضرور قرائن صارفہ موجود ہیں۔ مثلاً آیات:’’**رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ** (بقرہ:۲۵۳)‘‘ اور ’’**نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآء** (انعام:۸۳، یوسف:۷۶)‘‘ اور ’’**رَفَعَ**

بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (انعام:۱۶۵)‘‘اور’’رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (زخرف: ۳۲)‘‘میں لفظ درجات بالتصریح موجود ہے۔ پس چونکہ آیت: ’’وَرَافِعُكَ اِلَیَّ‘‘میں ارادۂ رفع جسم الی السمآء کے لئے نہ تو تعذر حقیقت لازم آتا ہے اور نہ کوئی قرینہ موجود ہے۔ اس لئے اس جگہ محض رفع منزلت مراد نہیں لے سکتے۔

عوام کے افہام کے لئے اس قدر کافی ہے کہ وہ آیت:’’وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف:۱۰۰)‘‘کو جو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے والدین کو تخت کے اوپر بٹھانے کے بارے میں ہے۔ یاد رکھیں کہ جس طرح اس آیت میں مفعول’’رفع‘‘کا مدخول ’’علیٰ‘‘پر حقیقتاً بالجسد مرفوع ہونا مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح’’یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ‘‘میں حضرت مسیح علیہ السلام کا بجسدہ العنصری مرفوع الی السمآء ہونا مراد ہے اور اسی طرح آیت:’’اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر:۱۰)‘‘ میں مفعول’’یصعد‘‘یعنی کلمہ طیب کا مدخول الیٰ یعنی جناب باری عزاسمہٗ میں آسمان پر مرفوع ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل حدیث شریف میں وارد ہے اور اس کی کچھ شرح (ص۴۱، ۴۲) میں گزر چکی ہے۔ نیز آیت ثانیہ سورہ فاطر سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ ارتفاع الی اللہ اور صعود الی السمآء متساوق فی المعنی ہیں۔ کیونکہ صورت صعود کلمات طیّبات کی یہ ہے کہ کراماً کاتبین اعمال عباد لکھ کر آسمان پر جناب باری عزاسمہٗ میں پیش کرتے ہیں۔

جملہ تفاسیر معتبرہ مثل (۱)تفسیر کبیر، (۲)معالم، (۳)جلالین، (۴)سواطع الالہام، (۵)تفسیر رحمانی جو بیان نکات قرآنی میں بے مثل ولا ثانی ہے اور (۶)تفسیر فتح البیان، (۷)جامع البیان، (۸)ابن کثیر، (۹)مدارک، (۱۰)درمنثور، (۱۱)بیضاوی، (۱۲)السراج المنیر، (۱۳)خازن، (۱۴)کشاف، (۱۵)ابی السعود اور (۱۶)عباسی ان سب منقولی ومعقولی تفاسیر میں بلاخلاف’’رافعک الیّ‘‘سے رفع الی السمآء مراد لکھا ہے۔ چنانچہ بعض کی عبارات احاطہ تحریر میں لائی جاتی ہیں۔

تفسیر رحمانی جو بیان معارف قرآنی میں لاثانی ہے اس میں لکھا ہے:’’(و) لا ادع لک شهوة طعام وشراب فتحتاج الیٰ مساكنة الارض و رافعك الیّ ای الی سمائی (و)انما ارفعك لانی (مُطَهِّرُكَ مِنْ) جوار (اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا) لئلا يصل اليك من آثار هم شئ (و) كمااجعلك فوق اهل الارض فانا (جَاعِلُ

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ) من المسلمین والنصاریٰ (فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) لک من الیھود یغلونھم (اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ) ’’اور میں تجھے کھانے پینے کی خواہش ہی باقی نہ رکھوں گا کہ تجھے زمینی سکونت کے اسباب کی حاجت پڑے۔ کیونکہ میں تجھے اپنے آسمان کی طرف اٹھانے والا ہوں کہ تجھے کفار کی مصاحبت سے پاک رکھوں تاکہ تجھے ان کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے اور جس طرح تجھے زمین والوں سے اونچا کروں گا۔ اسی طرح تیرے تابعداروں کو (جو مسلمان اور عیسائی ہیں) تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

علامہ صوفی علی مہائمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت جامعہ میں منکرین کے شبہ کا بھی ازالہ کردیا ہے کہ اگر حضرت روح اللہ آسمان پر موجود ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں؟

اسی طرح تفسیر کشّاف اور مدارک میں ہے: ’’(وَرَافِعُکَ اِلَیَّ) ای الیٰ سمائی ومقرّ ملائکتی ‘‘یعنی تجھے کو اپنے آسمان اور اپنے فرشتوں کی قرارگاہ میں اٹھا لینے والا ہوں۔ یہ اس لئے کہ حضرت روح اللہ بوجہ ولادت بلا پدر مشابہ بالملائکہ ہیں۔ جیسا کہ عنقریب بالتفصیل مذکور ہوگا۔ ان شاء اللہ!

سبحان اللہ! علامہ محمود جاراللہ زمخشری باوجود اہل اعتزال کا امام ہونے کے اپنی اس تفسیر میں جو قرآن مجید کی عربیت کے بیان کرنے میں سب کی استاد تسلیم کی گئی ہے ’’رافعک الیّ ‘‘میں حقیقی معنی ’’رفع الی السمآء ‘‘ کو چھوڑ کر تاویل نہیں کر سکے۔ اگر ان کو عربیت اجازت دیتی تو وہ ضرور تاویل کرتے۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی وسراج منیر اور ابی سعود میں بھی ہے۔

وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

دوسرا قرینہ: ’’وَمُتَــــــوَفِّیْکَ‘‘ سے رفع جسم مراد لینے کے لئے الفاظ ’’وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا‘‘ ہیں۔

اس جگہ تطہیر سے مراد کفار کے ہاتھ سے صاف بچالینا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو نجس اور پلید قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ’’اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (توبہ:۲۸) ‘‘یعنی مشرکین (بوجہ خباثت شرک) نجس ہیں۔

محدّث ابن جریر اپنی تفسیر میں حضرت ابن جریج رومی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں: ’’عن ابن جریج قوله اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا قال

فرفعۂ ایّاہ الیہ توفّیہ ایاہ وتطہیرہ من الذین کفروا (ج ۳ ص۱۴۷، ۱۴۸)‘‘ کہ انہوں نے قول الٰہی ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ…… الخ!‘‘ کے بارے میں کہا کہ خداتعالیٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالینا ہی آپ کی توفی ہے اور یہی کفار سے تطہیر ہے۔[1]

جملہ تفاسیر معتبرہ کیا معقولی اور کیا منقولی مثل (۱)تفسیر کبیر و(۲)معالم و(۳)جلالین و(۴)تفسیر فیضی و(۵)رحمانی و(۶)فتح البیان و(۷)جامع البیان و(۸)مدارک و(۹)سراج منیر و(۱۰)خازن و(۱۱)کشاف و(۱۲)تفسیر ابی السعود و(۱۳)عباسی و (۱۴)بیضاوی و (۱۵)تفسیر ابن کثیر میں: ’’وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا‘‘ کے معنی کفار کے ہاتھ سے خلاصی اور نجات لکھے ہیں۔ بلکہ تفسیر فتح البیان اور ابن کثیر میں اس جگہ رفع الی السماء بھی ذکر کیا ہے۔

پس آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ…… الخ!‘‘ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ اے عیسیٰ! میں تجھے پورا پورا لے لوں گا اور تجھے اپنی طرف آسمان پر اٹھالوں گا اور تجھے کفار کے شر سے صاف بچالوں گا۔[2]

۱؎ ہمارے اکمل صاحب اس مقام پر سخت حیران ہیں، کبھی تو تطہیر سے مراد تخلیص مان جاتے ہیں۔ گو الٹی طرف سے ناک پکڑ کر اور کبھی صاف انکار کر جاتے ہیں اور کبھی نہایت سادگی سے کہتے ہیں۔ مگر یہ تخلیص وانجاء کیا آسمان پر جانے ہی سے ممکن ہے؟ کیا دوسرے ملک میں چلے جانے سے ممکن نہ تھی؟ (ص۳۱) جواب: جناب معقولات جانے آپ کی بلا۔ سنئے! ممکنات میں سے جب ایک صورت واقع ہوجائے تو وہ ممکن درجہ وجوب میں آجاتا ہے۔ پس اس کے علاوہ دوسری ممکن صورتوں کے امکان کی وجہ سے اس ’’واجب‘‘ کا انکار سفاہت ہے اور اس جگہ تطہیر سے مراد تخلیص بنابر موقع ذکر ہے۔ اسے اصطلاح علمائے اصول میں ’’سوق کلام‘‘ کہتے ہیں جو آپ نہیں جانتے اور قرآئن حالیہ اور مقالیہ اس کے مؤید ہیں۔ (سعادت الاقران)

۲؎ اکمل صاحب نہایت بے باکی سے لکھتے ہیں: ’’اور پندرہ تفاسیر کا حوالہ جو دیا کہ ان میں اس آیت کے معنی کفار کے ہاتھ خلاصی ونجات کے لکھے ہیں۔ وہ برابر ہمارے اعتقاد کی تصدیق کررہے ہیں کہ اﷲتعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کے ہاتھوں سے خلاصی ونجات دی اور وہ کشمیر چلے آئے۔‘‘ (ص۳۷) جواب: اکمل صاحب! مفسرین پر یہ افتراء کیسا؟ ان میں سے جس تفسیر میں کشمیر کی تصدیق لکھی ہے۔ بھلا کسی مجلس میں دکھائیں تو سہی ورنہ قادیان میں ہی شرما چھوڑیں۔ ہاں سماء کے معنی کشمیر کرلیں تو امر دیگر ہے۔ سچ ہے: ’’اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ وَاُوْلٰئِکَ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ (نحل:۱۰۵)‘‘ یعنی افتراء باندھنا بے ایمانوں کا کام ہے اور وہ سب جھوٹے ہوتے ہیں۔ قادیان میں بھی تو مزے ہیں کہ جھوٹ بنایا اور خلقت کو لوٹا۔

تعجب ہے کہ قرآن مجید کی صاف صاف تصریحات کے برخلاف ایک مسلمان کس طرح تسلیم کرسکتا ہے کہ یہود نے آپ کو پکڑوا کر صلیب پر چڑھوا دیا اور آپ کے سر پر (استہزاءً) کانٹوں کا تاج پہنایا گیا اور آپ کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھونکی گئیں اور آپ کی پسلی میں نیزہ مارا گیا۔ نعوذباللہ من ذلک[1]!

[1] یہ سب امور نصاریٰ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن کے اعتبار سے سرسید احمد صاحب علی گڑھی اور مرزا قادیانی تصلیب مسیح علیہ السلام کے قائل ہوئے ہیں۔ نہ تو یہ کتابیں معتبر ہیں اور نہ ان کے بیانات قابل اعتبار ہیں۔ (اوّل) اس وجہ سے کہ ان کتابوں کے مصنّفین تک ان کی سند متصل نہیں اور نہ ان کی طرف ان کی نسبت کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (دوم) اس وجہ سے کہ جن مصنفوں نے بھی ان کو لکھا۔ انہوں نے واقعات مندرجہ کی کوئی سند نہیں بیان کی اور نہ سلسلہ روایت ذکر کیا۔ (سوم) اس وجہ سے کہ ان میں یہ بھی مرقوم ہے کہ جب سپاہی حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرنے آئے تو آپ کے ''شاگرد بھاگ گئے'' دیکھو (متی باب ۲۶ آیت ۵۶) اور (مرقس باب ۱۴ آیت ۵۰) پس جب واقعہ کے وقت کوئی بھی مومن موجود نہیں تھا تو کس کی شہادت سے اس کا اعتبار کیا جائے؟ (چہارم) اس وجہ سے کہ واقعہ صلیب اور اس کے ضمیمہ جات کی نسبت انہیں مصنّفین اناجیل میں کئی قسم کی اختلاف بیانیاں ہیں۔ مثلاً (۱) (متی باب ۲۶ آیت ۴۸ اور مرقس باب ۱۴ آیت ۴۴ اور لوقا باب ۴۲ آیت ۴۷) میں مرقوم ہے کہ: ''یہوداہ اسکریوطی نے آپ کی پیشانی پر بوسہ دے کر آپ کو شناخت کرایا۔'' لیکن اس کے برخلاف (یوحنا باب ۱۸ آیت ۵) میں مرقوم ہے کہ: ''خود حضرت مسیح نے سپاہیوں کو اپنے آپ بتایا کہ میں مسیح علیہ السلام ہوں اور انہوں نے آپ کو گرفتار کرلیا۔'' (۲) اسی طرح (متی باب ۲۷ آیت ۳۲ اور مرقس باب ۱۵ آیت ۲۱ اور لوقا باب ۲۳ آیت ۲۶) میں مسطور ہے کہ: ''سپاہیوں نے ایک دیہاتی شخص شمعون کرینی کو جو دیہات سے آرہا تھا، بیگاری پکڑا اور اسے حضرت مسیح علیہ السلام کی صلیب اٹھائی اور وہ اسے اٹھا کر مقام گلگتا تک جہاں وہ صلیب دیئے گئے لے گیا۔'' لیکن اس کے برخلاف (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۱۷) میں سطور ہے کہ ''صلیب خود حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے کندھوں پر اٹھائی اور مقام گلگتا تک لے گئے۔'' (۳) اسی طرح (متی باب ۲۷ آیت ۵) میں اس روپیہ کی بابت جو یہوداہ اسکریوطی نے حضرت مسیح علیہ السلام کو پکڑوانے کی رشوت میں لیا۔ یہ لکھا ہے کہ: ''واقعہ صلیب کے بعد یہوداہ وہ روپیہ مقدس میں پھینک کر چلا گیا اور جا کر اپنے آپ کو پھانسی دی۔'' لیکن اس کے برخلاف کتاب (رسولوں کے اعمال باب ۱ آیت ۱۸) میں لکھا ہے کہ: ''اس نے اس روپے سے ایک کھیت حاصل کیا اور سر کے بل گرا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس کی ساری انتڑیاں نکل پڑیں۔'' پس ایسے صاف اختلافات کے ہوتے ان کا بیان ہرگز قابل اعتبار نہیں رہتا اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو فرمایا: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اگر کوئی کہے کہ اس جگہ تطہیر سے مراد ان الزاموں سے بری کرنا ہے جو یہود آپ کی ولادت بلا پدر کے بارے میں لگاتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سب الزاموں سے پاک کیا اور بری بیان کیا اور یہ امر قرآن شریف میں متعدد مقامات پر اشارۃً وصراحۃً مذکور ہے۔ لیکن خاص اس مقام پر تطہیر سے مراد سوائے ان کے مکر[۱] سے بچالینے کے اور کچھ نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ''مطھّرک'' کا وعدہ بوقت تبلیغ رسالت ہے۔ جب یہود آپ کے قتل کے درپے تھے۔ جیسا کہ سابقاً ''فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ (آل عمران:۵۲)'' اور ''وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہ'' کی تفسیر میں مذکور ہو چکا اور ان الزامات سے برأت اس سے پیشتر تکلم فی المھد سے ہو چکی تھی اور جو امر پہلے گزر چکا ہو، اس کا آئندہ وعدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وعدہ ہمیشہ اس امر کا کیا جاتا ہے جو حاصل نہ ہو۔ پس وعدہ ''وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران:۵۵)'' جو تکلم فی المھد سے کئی سال بعد ہوا۔ اس سے برأت از طعن مراد نہیں ہوسکتی اور چونکہ بالکلیہ صاف صاف بچالینا تھا[۲]۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ''وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (نساء:۱۵۷)'' بالکل حق ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اس امر میں (حق سے) اختلاف کیا وہ بالضرور شک میں ہیں۔ ان کو سوائے گمان کی پیروی کے کوئی بھی علم نہیں۔ کتاب ہذا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا کسی قدر ایفاء اس جگہ کردیا ہے۔ (سعادت)

۱؎ اکمل صاحب بھی عجب کمال کے بندے ہیں کہ لفظ مکر کی اس تشریح کو جو ہم نے سابقاً کئی صفحوں میں بیان کی ہے، نظرانداز کر کے فرماتے ہیں ''مکر کیا تھا؟'' آپ خود ہی حسب قول اپنے بول اٹھے ''قتل'' بس اس سے اللہ نے نجات دے دی۔ (ص۳۰) جواب: جناب والا! اس جگہ مکر سے مراد قتل مع اس کے اسباب کے ہے۔ کیونکہ قتل کے لئے کوئی نہ کوئی صورت اور اس کے اسباب ضروری ہیں اور وعدہ مطھرک میں قتل اور اس کے اسباب سے بالکلیہ صاف صاف بچالینا مقصود ہے۔ پس نہ قتل ہوا اور نہ اسباب قتل جن کا انہوں نے منصوبہ باندھا تھا۔ منعقد ہوسکے۔ اسی لئے ما قتلوہ کے بعد ما صلبوہ کی تصریح ضروری ہوئی کہ صلیب پر چڑھانا قتل کا ذریعہ اور سبب تھا۔ پس اس کی بھی نفی کردی۔ فافھم ولا تکن من القاصرین!

۲؎ اکمل صاحب نے اس موقع پر عجب کمال دکھایا ہے کہ صلیب پر کئی ایک مصیبتیں اٹھا کر اور نیم مردہ ہوکر صرف موت سے بچ رہنے کی بابت بھی لکھتے ہیں ''صاف بچ نکلے'' جواب: سبحان اللہ! صاف صاف بچنے کی یہ صورت قادیان والے ہی سمجھتے ہوں گے۔ بندہ خدا! کیوں عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے ہو اور جس امر کو خدا تعالیٰ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ''وما صلبوہ'' یعنی اسے سولی پر بھی نہ چڑھایا۔ خواہ مخواہ اس کے خلاف کیوں باتیں بناتے ہو؟ (سعادت)

اس لئے مبالغۃً اس معنی کو لفظ تطہیر سے بیان کیا۔ چنانچہ اس کی کچھ تفصیل ’’متوفیک‘‘ کی بحث میں گزر چکی اور کچھ ابھی مذکور ہوگی۔ ان شاء اللہ!

اگر کہا جائے کہ تطہیر از طعن، محمد رسول اللہ ﷺ کی معرفت قرآن شریف میں کی جانے کی بابت وعدہ ہوسکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف نے صرف حکایۃً وہ مضمون بیان کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام نے عادۃً کلام نہ کرنے کی عمر میں بیان کیا تھا۔ پس اصل برأت تو اس سے ہوگئی اور کوئی فعل نقل کرنے والے کی طرف اصالۃً منسوب نہیں ہوسکتا۔ پس یہ عذر بھی درست نہیں[1]۔

[1] اکمل صاحب نے یہاں پر نئی توجیہ نکالی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ’’یہ وعدہ تطہیر علاوہ اس کے اس الزام کے متعلق ہے جو لعنتی موت کا یہود لگاتے تھے۔‘‘ (ص۱۳۱) جواب: جناب من! علاوہ کا علاوہ کیوں ساتھ رکھ دیا۔ اس کی تو کافی تردید ہوچکی۔ کچھ جواب تو بن آیا نہیں اور علاوہ یونہی لکھ مارا۔ دیگر یہ کہ: ’’لگاتے تھے‘‘ کیسے دھر گسیٹا۔ ذرا سوچو تو یہ بشارت تو آپ کو زندگی میں واقعہ صلیب سے پیشتر لعنتی موت کا الزام کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ آپ نے ’’لگاتے تھے‘‘ بصیغہ ماضی لکھ مارا۔ ’’بریں اکملیت بباید گریست‘‘ دیگر یہ کہ صلیب پر چڑھایا جانا یا اس سے قتل کیا جانا کوئی گناہ نہیں کہ موجب الزام ہوسکے۔ پس اس سے تطہیر کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کہا جائے کہ یہود کے خیال میں صلیب کی موت لعنتی تھی جیسا کہ کتاب استثناء میں مذکور ہے۔ پس اس نظر سے صلیب کی موت موجب الزام ہوسکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کتاب استثناء کے اس حوالہ سے یہ نتیجہ نکالنا قادیانی ایجاد ہے۔ وہاں کہیں بھی مذکور نہیں کہ مطلقاً ہر صلیب پر لٹکایا ہوا لعنتی ہوتا ہے۔ بلکہ خاص اسی شخص کو ملعون کہا گیا ہے جو کسی جرم واجب الصلیب کی سزا میں مصلوب ہو۔ جیسا کہ نفس عبارت میں مذکور ہے۔ (دیکھو کتاب استثناء باب ۲۱ آیت ۲۲) میں مکتوب ہے (۲۲) اور اگر کسی نے ایسا گناہ کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو...... الخ! دیگر یہ کہ قرآن شریف میں یہود کا ادعائے قتل صرف ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: ’’اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ ...... الخ!‘‘ اور اس کے ساتھ ان کے قول سے صلبنا ذکر نہیں کیا۔ اس سے صاف کھل سکتا ہے کہ یہود نفس قتل پر فخر کرتے تھے اور اس کے ذریعہ یعنی صلیب کی کوئی اہمیت ان کی نظر میں نہ تھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اسے بھی ان کی طرف اس ادعائے مفاخرت کے ساتھ ہی ذکر کرتا۔ پس جب وہ صلیب پر لٹکانے پر فخر ہی نہیں کرتے تو اسے ان کے نزدیک موجب طعن والزام گردانا صرف قادیانی تصور وتخیّل کا نتیجہ ہے اور ’’بلی کو چھیچھڑوں کے خواب‘‘ کے مصداق ہے۔ اس کی مزید تشریح آیت: ’’وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ‘‘ کی تفسیر میں مذکور ہوگی۔ (سعادت)

نکتہ: اس جگہ رفع الی السمآء کو توفی سے تعبیر کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے جو تفسیر کبیر اور خازن میں مذکور ہے کہ: ’’اِنَّ التَّوَفِّیُ اَخْذُالشَّیْءِ وَافِیًا وَلَمَّا عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّخْطُرُ بِبَالِہٖ اَنَّ الَّذِیْ رَفَعَہُ اللّٰہُ ھُوَ رُوْحُہٗ لَا جَسَدُہٗ ذَکَرَ ھٰذَالْکَلَامَ لِیَدُلَّ عَلٰی اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ رُفِعَ بِتَمَامِہٖ اَلَی السَّمَآءِ بِرُوْحِہٖ وَبِجَسَدِہٖ (تفسیر کبیر ج دوم) ’’توفی کے معنی ہیں کسی چیز کو بتمامہ لے لینا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ کسی شخص کے دل میں یہ بھی گزرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی (صرف) روح کو اٹھایا تھا اور جسم کو نہیں اٹھایا تھا۔ اس لئے اللہ نے یہ کلام ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ‘‘ فرمایا تا کہ اس امر پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتمامہ مع جسم اور روح کے (زندہ) آسمان پر اٹھالیا۔

سبحان اللہ! قرآن شریف کیسا معجز کلام ہے اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی قرآن شریف کے کیسے رمز شناس ہیں کہ جو بات مرزا جی کئی صدیاں بعد کہنے والے تھے۔ اس کی تردید پہلے ہی فرمادی۔ یہ ایک عظیم الشان پیش گوئی ہے، جو پوری پوری واقع ہوئی۔ سُبْحَانَ مَا اَصْدَقَ کَلَامَہٗ!

کشف مغالطہ

صحیح بخاری میں مذکور ہے: ’’قَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ مُتَوَفِّیْکَ مُمِیْتُکَ (کتاب التفسیر سورۂ مائدہ) ‘‘یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ ’’مُتَوَفِّیْکَ‘‘ کے معنی ’’مُمِیْتُکَ‘‘ کرتے ہیں۔

مرزا قادیانی کو الہام بافی کے علاوہ مغالطہ دہی میں خاص کمال تھا اور کسی سیدھی بات کو بھی الٹا کر کے کیا کچھ کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اس ’’مُمِیْتُکَ‘‘ سے پہاڑ سر پر اٹھالیا اور ایک طوفان برپا کر دیا کہ لو جی ’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی وفات مسیح علیہ السلام کے قائل تھے اور امام بخاری کا بھی یہی مذہب تھا۔‘‘ (حمامۃ البشریٰ ص۵۶، خزائن ج۷ ص۲۵۴)

مرزا قادیانی نے نہ تو صحیح بخاری کسی استاد حدیث سے پڑھی کہ اسے سمجھتے اور نہ اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی رکھتے تھے، بلکہ جیسا کہ وہ اقرار کرتے ہیں: ’’علم حدیث سے مناسبت ہی نہ رکھتے تھے۔‘‘ (حمامۃ البشریٰ و تبلیغ مصنفہ مرزا قادیانی)

پھر علم حدیث میں ان کے قول کا کیا اعتبار؟

کسی روایت کی تشریح کے لئے ضروری ہے کہ اس کی صحت معلوم کرنے کے بعد اوّل تو اس کے جملہ طرق جمع کئے جائیں۔ پھر اس مضمون کی جملہ روایات کو سامنے رکھ کر علوم آلیہ کی مدد سے اسے حل کیا جائے۔ مرزاجی کی علمی بضاعت جاننے والے اصحاب جانتے ہیں کہ مرزاجی کی نظر علم روایت میں بہت ناقص تھی اور فہم قاصر۔ پھر خودغرضی کا بھوت سر پر سوار مزید برآں کذب وافترا اور مغالطہ سے بےخوفی، پھر وہ ایک مضمون کی جملہ روایات اور ایک روایت کے جملہ طرق کو کس طرح اور کیوں جمع کریں۔ بالخصوص جب اس طرح کی تحقیقات کا نتیجہ اپنے ادّعا اور مدّعا کے خلاف ہو، وہ تو صرف ’’لَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ‘‘ جانتے تھے اور ’’اَنْتُمْ سُکَارٰی‘‘ سے ان کا کچھ واسطہ نہ تھا۔

چنانچہ ہم خدا کے فضل سے ان کے ہر دو مغالطات کو دور کر کے حقیقت الامر کو منکشف کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عقیدہ حیات مسیح علیہ السلام

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وفات مسیح علیہ السلام کے قائل تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سراسر افتراء ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کے قائل ہرگز نہ تھے۔ صحابہ میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی کی بیشتر روایات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردوں ہی سے مروی ہیں۔ چنانچہ تفاسیر مبسوط ان سے بھری پڑی ہیں۔ آپ نے جو ’’متوفیک‘‘ سے مراد ’’ممیتک‘‘ بتائی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آئندہ زمانہ میں کسی وقت فوت کرے گا۔ کیونکہ ’’متوفّی‘‘ اسم فاعل کی وضع میں زمان مستقبل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشتقاق فعل مضارع سے ہوتا ہے۔

چنانچہ صراح میں ہے: ’’اِسْمُ الْفَاعِلِ وَهُوَ اِسْمٌ مَشْتَقٌّ مِّنَ الْمَضَارِعِ‘‘ اور اس امر کا لحاظ قرآن شریف میں بھی کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ’’وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْئٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ

(کہف:۲۳، ۲۴) ''اس آیت میں فاعلؔ سے جو اسم فاعل کا صیغہ ہے لفظ غداً منضم کیا ہے جس کے معنی کل آئندہ کے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ''ممیتک'' سے مقصد یہ ہے کہ میں تجھے آئندہ زمانہ میں ماروں گا۔[۱]

پس ابن عباسؓ اس آیت کے اجزا میں تقدیم وتاخیر کے قائل ہیں۔ جیسے کہ مفسرین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ اگر اس جگہ توفی سے مراد موت بھی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توفی بالموت کا تحقق ووقوع بعد آسمان[۲] سے نازل ہونے کے ہوگا۔ اگرچہ آیت میں مقدم ہے اور ''رَفعَ اِلَی السَّمَآءِ'' کا تحقق ووقوع قبل موت کے ہوچکا۔ اگرچہ ذکر میں مؤخر ہے۔ کیونکہ ترتیب ذکری اور ترتیب وقوعی میں مطابقت ضروری نہیں۔ اس لئے کہ واؤ عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف جمع کے لئے آتی ہے۔[۳]

چنانچہ امام رازیؒ اس آیت میں تقدیم وتاخیر کی بحث میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس میں تقدیم وتاخیر کے قائل، ان کا قول یہ ہے کہ: ''قالوا ان قوله ورافعک الیٰ یقتضی انه رفعه حیا والواو لا یقتضی الترتیب فلم یبق الا ان یقول فیها تقدیم وتاخیر والمعنی انی رافعک الیّ ومطهّرک من الذین کفروا ومتوفّیک بعد انزالی ایاک فی الدنیا ومثله من التقدیم والتّاخیر کثیر فی القرآن (تفسیر کبیر ج دوم) ''قول الٰہی ''ورافعک الیّ '' تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ اٹھالیا اور واو (عاطفہ) ترتیب کی مقتضی نہیں۔ پس سوائے اس کے اور کچھ نہ رہا کہ کہا جائے کہ اس میں تقدیم وتاخیر ہے اور معنی یہ ہیں کہ میں تجھے اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور کفار سے بالکل پاک صاف رکھنے والا ہوں اور تجھے دنیا میں نازل کرنے کے بعد فوت کرنے والا ہوں اور اس قسم کی تقدیم وتاخیر قرآن شریف میں بکثرت ہے۔

۱؎ چنانچہ اکمل صاحب نے بھی اس آیت کے ترجمہ میں سب جگہ مستقبل کے صیغے لکھے ہیں۔ دیکھو ان کی کتاب کا (ص۱۳۱ سطر۱۵ سے ۲۰ تک)۔ (سعادت)

۲؎ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضرتﷺ نے فرمایا کہ ان (مذکورہ) واقعات کے وقت میرا بھائی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے اترے گا۔ (مختصر کنز العمال) (سعادت)

۳؎ چنانچہ کافیہ میں ہے: ''الواو للجمع المطلق لا ترتیب فیها''

اور اس سے پیشتر فرماتے ہیں: ’’(الوجه الرابع) فی تاویل الأیة ان الواو فی قوله متوفّیک ورافعک الیّ لا تفیدالترتیب فالأیة تدل علی انه تعالٰی یفعل به هذه الافعال فامّا کیف یفعل ومتٰی یفعل فالامر فیه موقوف علی الدلیل وقد ثبت الدلیل انه حیٌّ وورد الخبر عن النّبی ﷺ انه سینزل ویقتل الدّجال ثمّ انه تعالٰی یتوفّاه بعد ذلک (تفسیر کبیر ج دوم سورہ آل عمران)‘‘ (چوتھی وجہ یہ کہ) اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ واؤ عاطفہ جو ’’متوفّیک ورافعک الیّ‘‘ میں ہے وہ مفید ترتیب نہیں۔ پس یہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے یہ سب معاملے کرے گا۔ لیکن کس طرح کرے گا اور کب کرے گا۔ پس یہ سب کچھ کسی اور دلیل پر موقوف ہے اور (اس کی) دلیل ثابت ہو چکی ہے کہ آپ زندہ ہیں اور نبی ﷺ سے حدیث وارد ہے کہ آپ ضرور اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے بعد فوت کرے گا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ میں جو یہ مذکور ہے کہ قرآن مجید میں تقدیم وتاخیر کی مثالیں بکثرت ہیں[۱] بالکل درست ہے۔ مثلاً اسی مقام سے تھوڑا پیشتر سلسلۂ ذکر مریم علیہا السلام میں آیت: ’’یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (آل عمران:۴۳)‘‘ میں سجدہ کو رکوع سے پہلے ذکر کیا۔ حالانکہ ترتیب خارجی وعملی میں متاخر ہوتا ہے۔ اس کی دیگر مثالوں کے لئے تفسیر اتقان فی علوم القرآن کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ اس میں مستقل طور پر ایک خاص فصل اسی امر کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

رفع وتوفی کے بارہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب

اب معتبر کتابوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب دربارہ رفع وتوفی حضرت مسیح علیہ السلام بیان کیا جاتا ہے۔

۱؎ ہر چند کہ تقدیم وتاخیر کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ لیکن اکمل صاحب کبھی تو اسے غیر معقولی کہہ دیتے ہیں اور کبھی الٹی طرف سے ناک پکڑ کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر شاباش ان کی ہمت پر کہ اپنی ہٹ سے نہیں ہٹتے۔ سوان کے جواب میں حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر مناسب وکافی ہے:

آنکس کہ بقرآن و خبر زونرہی آنست جوابش کہ جوابش ندہی

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر الدرّ المنثور میں فرماتے ہیں کہ: ’’عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہ فی قولہ انّی متوفّیک ورافعک الیّ یعنی رافعک ثم متوفّیک فی اٰخر الزمان (الدرالمنثور) ‘‘ حضرت ضحاک تابعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قول الٰہی: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ‘‘ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مراد اس جگہ یہ ہے کہ تجھے اٹھالوں گا۔ پھر آخری زمانہ میں فوت کروں گا۔[1]

اسی طرح ابی السعود میں ہے: ’’والصحیح ان اللہ تعالٰی رفعہ من غیر وفات ولا نوم کما قال الحسن وابن زید وھو اختیار الطبری وھو الصحیح عن ابن عباس (ابی السعود) ‘‘ کہ صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر موت اور نیند کے اٹھا لیا۔ جیسے کہ حضرت حسن بصری اور ابن زید تابعین نے کہا اور یہی امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح (طور پر ثابت) ہے۔

اسی طرح تفسیر ابن کثیر اور تفسیر فتح البیان میں بذیل آیت: ’’وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ (زخرف:۶۱) ‘‘ یعنی تحقیق وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کا ایک نشان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب دربارہ نزول عیسیٰ علیہ السلام مذکور[2] ہے کہ وہ اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو قرب قیامت کی ایک نشانی جانتے تھے۔

اسی طرح محدّث ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ (نساء:۱۶۹) ‘‘ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کے شاگرد حضرت سعید بن جبیر تابعی کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ: ’’عن سعید بن

[1] باوجود اس کے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ تصریح کرتے ہیں اور ہم سب کا یہی مذہب ہے کہ حضرت عیسیٰ آخری زمانہ میں فوت ہوں گے۔ پھر بھی اکمل صاحب کہتے ہیں ’’جب قیامت کے بعد تک موت نہ ہوئی تو اچھے خاصے خدا بن گئے۔‘‘ (ص۲۴) جواب: جناب والا! پھر روح بھی خدا ہوئی، کیونکہ اسے بھی فنا نہیں۔ غالباً اسی لئے مولوی سید سرور شاہ صاحب احمدی قادیانی نے مباحثہ سیالکوٹ میں پادری عبدالحق صاحب مسیحی مناظر کے جواب میں کہا تھا کہ خدا روح ہے (معاذ اللہ) ان لوگوں کو نہ علم ہے نہ عقل۔ (سعادت)

[2] اکمل صاحب قادیانی بدمذاقی میں نہایت کامل ہیں۔ اس مقام پر اعتراض کرتے ہیں: ’’اگر نزول ثانی کے اعتقاد کا ذکر ہے تو آپ نے اسے مفصل کیوں نہ لکھا۔‘‘ (ص۳۴) جواب: جناب! مفصل اس لئے نہ لکھا کہ اس کتاب کا موضوع نزول مسیح نہیں۔ فافھم! آداب تصنیف سیکھئے پھر اعتراض کیجئے۔ (سعادت)

جبیر عن ابن عباس وان من اھل الکتاب الّا لیومننّ بہ قبل موتہ قال قبل موت عیسٰی (ابن جریر ج۵ ص ۱۲) ’’آپ نے فرمایا کہ: ’’قَبْلَ مَوْتِہٖ‘‘ سے مراد قبل موت عیسیٰ علیہ السلام ہے۔

نیز فتح الباری، ارشاد الساری اور عمدۃ القاری ہر سہ شرح صحیح بخاری میں آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ‘‘ میں قبل موتہ کی ضمیر کے بارے میں لکھا ہے کہ بسند صحیح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی ثابت ہے کہ یہ ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے اور ان سے جو یہ مروی ہے کہ یہ ضمیر کتابی کی طرف پھرتی ہے، اسے ضعیف لکھا ہے۔ کیونکہ اس کی اسناد میں ایک راوی خصیف ہے جو ضعیف ہے۔ (فتح)

پس تصریحات بالا سے ثابت ہوگیا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں[۱] اور آخری زمانہ میں آسمان سے نازل[۲] ہوں گے اور اس کے بعد فوت ہوں گے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ

۱؎ اکمل صاحب علم میں تو جو کمال رکھتے تھے وہ معلوم ہو چکا ہوگا۔ آپ عقل میں بھی اکمل ہی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب ہم نے بدلائل ثابت کر دیا کہ وہ نزول من السماء اور بعد نزول کے وفات مسیح علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اس پر اکمل صاحب سے کچھ بن نہ پڑا تو آپ فرماتے ہیں: ’’ان کا اپنا مذہب خواہ کیا ہو ایک اہل زبان اور پھر صحابی کی شہادت تو مل گئی کہ توفی کے وضعی معنی موت کے ہیں۔‘‘ (ص۳۲) جواب: اس وقت زیر نزاع یہی امر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب دربارہ وفات ونزول مسیح علیہ السلام کیا ہے؟ پس جب ثابت ہوگیا کہ وہ رفع ونزول ہر دو کے قائل ہیں اور وفات بعد النزول مانتے ہیں جو اہل سنت کا مذہب ہے تو آپ کے مرزا قادیانی کا مغالطہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وفات قبل النزول کے قائل ہیں، طشت از بام ہوگیا اور یہ جو آپ نے لکھا کہ توفی کے وضعی معنی موت کے ثابت ہوگئے۔ یہ آپ کی علمی بے کمالی ہے۔ اس سے بعض اوقات موت مراد ہونا تو محل کلام نہیں، تحقیقات تو یہ ہے کہ اس سے مراد موت از روئے حقیقت ہے یا از روئے مجاز سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت میں اس امر کا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ پھر ثابت کس طرح ہوگیا؟ فافھم! (سعات الاقران)

۲؎ اکمل صاحب کو قادیانی تقلید میں اسلام اور کفر میں بھی تمیز نہیں رہتی۔ چنانچہ اس نزول کی بابت فرماتے ہیں ’’نزول سے مراد کسی چیز کا بروزی طور سے آنا ہے۔ یعنی اس کی روح وقوت میں۔‘‘ (ص۳۴) جواب: جناب والا! پھر تناسخ کیا ہوا؟ (سعادت)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’فَعِنْدَ ذٰلِکَ یَنْزِلُ اَخِیْ عِیْسٰی بْنُ مَرْیَمَ مِنَ السَّمَآءِ (مختصر کنزالعمال)‘‘ پس ان مذکورہ واقعات کے وقت میرا بھائی عیسیٰ بن مریم آسمان سے اترے گا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حیات مسیح علیہ السلام

باقی رہا دوسرا مغالطہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی وفات مسیح علیہ السلام کے قائل تھے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پہلے سے بھی بڑا دلیرانہ افترا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ائمہ محدثین سے ہیں۔ وہ خلاف قرآن وحدیث واجماع صحابہ کوئی اعتقاد کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یہ مرزا قادیانی کا افتراء ہے اور عوام کو دھوکا ہے۔

اوّل: اس وجہ سے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے معنی معلوم ہو چکے کہ محدثین کے نزدیک کیا ہیں۔ پس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی بوجہ امام حدیث وحافظ روایات ہونے کے وہی ہے، نظر بر روایات دیگر۔

دوم: اس وجہ سے کہ نقل قول صحابی مستلزم اعتقاد ناقل نہیں۔ کما لا یخفی علی الماہر الذکی!

سوم: یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مستقبل باب باندھا ہے اور اس کے ذیل میں صحیح حدیث نزول کی ذکر کی ہے اور اسی حدیث کو سب محدثین نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اصل دستاویز بنایا اور دیگر سب روایات کو اس کے تابع رکھا۔

چہارم: یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موقع پر آیت: ’’وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ...... الخ (المائدہ:۱۱۶)!‘‘ کی تفسیر میں کہا کہ اذ صلہ ہے اور قال معنی یقول یعنی بمعنی مستقبل ہے اور اس صورت میں معاملہ قیامت[1] پر جا پڑتا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت کے ساتھ رہتے ہیں۔ پس امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وفات قبل النزول کے قائل ہرگز نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا مرزا قادیانی کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ واللہ الموفق!

تذییل وتتمہ

اب ذیل میں بطور تتمہ کے ان کتابوں کا نام لکھا جاتا ہے، جن میں اس امر کی تصریح

[1] اس امر کی مزید تفصیل (شہادت القرآن حصہ دوم میں دیکھو۔

کی گئی ہے کہ واؤ عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں۔ بلکہ مطلق جمع کے لئے آتی ہے۔ یہ اس لئے کہ اگر بالفرض توفی سے مراد موت بھی لی جائے تو بھی رفع ونزول سے پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا واقع ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ واقعات کی صورت یوں ہوگی کہ پہلے رفع آسمانی ہوئی۔ پھر قرب قیامت میں نزول ہوگا۔ پھر اس کے چند سال بعد وفات ہوگی[1]۔

جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ضحاک اور ائمہ مفسرین کا مذہب ہے۔ کیونکہ آیت: ''**بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ**'' رفع آسمانی میں نص قطعی ہے۔ **كَمَا سَيَجِيْءُ بَيَانُهٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ**! اور مجموع احادیث نزول جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول اور ان کے بعض کام اور حج وعمرہ اور مدت اقامت اور وفات اور مدفن کا ذکر ہے۔ اسی ترتیب کو چاہتی ہیں۔

چنانچہ محدث ابن جریر توفی کی مختلف صورتیں نقل کرنے کے بطور فیصلہ لکھتے ہیں:

''**قال ابو جعفر و اولیٰ هذه الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنی ذلک انی قابضک من الارض ورافعک الیّ لتواتر الاخبار عن رسول الله ﷺ انه قال ینزل عیسیٰ بن مریم فیقتل الدجال ثم یمکث فی الارض مدة ذکرها اختلف الروایات فی مبلغها ثم یموت فیصلی علیه المسلمون ویدفنونه**(ج سوم ص ۱۸۴)'' ابوجعفر (محدث بن جریر) کہتا ہے کہ ان سب اقوال میں سے ہمارے نزدیک اولیٰ بصحت ان کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تجھے زمین سے لے لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ سے متواتر حدیثیں مروی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ پھر

[1] اکمل صاحب بڑے مزے کی باتیں بناتے ہیں۔ چنانچہ آپ عنوان آیت: ''**انی متوفیک**'' کی ترتیب کی حکمت میں فرماتے ہیں ''پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چونکہ یہ خیال تھا کہ مشابہ بالمصلوب کی حالت پیش آنے سے فائدہ اٹھا کر یہود میری لعنتی موت کی خبر اڑا دیں گے تو اس کے جواب میں فرمایا۔ میں تجھے کفار کے الزام سے پاک رکھوں گا۔'' (ص ۳۱) جواب: سبحان اللہ! جناب والا! صلیب سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا معلوم تھا کہ مجھے نیم جان اتارا جائے گا اور یہ پروپیگنڈا بنایا جائے گا۔ اکمل صاحب تو اس طرح لکھتے ہیں کہ: ''گویا آپ موقع پر موجود تھے۔ بلکہ شریف کار تھے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ بات ایسی بہکی ہوئی کہتے ہیں کہ موقع پر چسپاں ہی نہیں ہوسکتی۔'' سچ ہے تعصب سے عقل بھی ماری جاتی ہے۔ (سعادت الاقران)

زمین میں اتنی مدت رہیں گے جو آپ نے ذکر کی اور اس کی تحدید میں مختلف روایتیں ہیں۔ پھر مریں گے اور مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے اور ان کو دفن کریں[1] گے۔

اس کے بعد امام ممدوح نے بعض احادیث نزول ذکر کی ہیں جن کی بناء پر انہوں نے فیصلہ بالا دیا ہے۔

اب ہر فن کی کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں، جن میں لکھا ہے کہ واؤ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی۔

علم نحو

(۱) کافیہ، (۲) شرح جامی، (۳) رضی شرح کافیہ، (۴) زینی زادہ، (۵) ترتیب سعیدی، (۶) تکملہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، (۷) الفیہ ابن مالک، (۸) حاشیہ الفیہ، (۹) شرح الفیہ لابن عقیل، (۱۰) للزمخشری، (۱۱) الفیہ للسیوطی۔

علم اصول

(۱۲) حصول المامول، (۱۳) ارشاد الفحول، (۱۴) اصول شاشی، (۱۵) حواشی اصول شاشی، (۱۶) حسامی، (۱۷) نورالانوار، (۱۸) کاشف اسرار اصول بزدوی، (۱۹) آیات بیّنات شرح جمع الجوامع، (۲۰) منہاج للبیضاوی، (۲۱) شرح الاسنوی، (۲۲) مسلم الثبوت، (۲۳) فواتح الرحموت، (۲۴) توضیح تلویح، (۲۵) حاشیہ للغزی، (۲۶) تحریر لابن الہمام، (۲۷) تقریر لابن امیر الحجاج۔

علم بلاغت

(۲۸) مختصر المعانی، (۲۹) مواہب المفتاح، (۳۰) عروس الافراح، (۳۱) نہایۃ الایجاز للامام الرازی رحمۃ اللہ علیہ۔

[1] مشکوٰۃ میں باب نزول عیسیٰ علیہ السلام میں عبداللہ بن عمر کی روایت میں مرفوعاً مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (مدینہ طیبہ) داخل حجرہ نبویہ ﷺ مدفون ہوں گے۔ اس کا پورا بیان ہم نے ''رسالۃ الخبر الصحیح عن قبر المسیح'' میں کر دیا ہے۔

علم ادب

شرح سبعہ معلّقہ، قصیدہ لبید بن ربیعہ میں مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سہارنپوری جو ہندیوں میں زبان عربی کے ماہر ادیب مانے گئے ہیں۔اس کی تصریح فرماتے ہیں، یہ شعر ہے:

اُغْلِیُ السَّبَاءَ بِکُلِّ اَدْکَنِ عَاتِقٍ اَوْ جَوْنَةٍ قُدِحَتْ وَفُضَّ خِتَامُهَا

اس شعر میں شراب کا نکالنا پہلے مذکور ہوا اور ڈاٹ کا کھولنا پیچھے۔ حالانکہ ترتیب واقعی وعملی میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔یعنی بوتل کا ڈاٹ پہلے کھولا جاتا ہے اور شراب یا جو کچھ بوتل کے اندر ہو پیچھے نکالا جاتا ہے۔

(۱) قرآن کریم سورہ نحل میں فرمایا: ’’وَاللّٰهُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (نحل:۷۸) ‘‘اور خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں خارج کیا تھا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں ماں کے پیٹ سے نکالنا پہلے ذکر کیا گیا ہے اور دل اور آنکھ اور کان کا بنانا پیچھے، لیکن ترتیب واقعی میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔یعنی اعضا پہلے بنتے ہیں اور بہت مدّت بعد ازاں بچہ پیٹ سے خارج ہوتا ہے۔

(۲) سورہ (بقرہ:۵۸) میں ہے: ’’وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ‘‘ یعنی خدا تعالیٰ نے یہودیوں کو حکم کیا کہ دروازۂ شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور (زبان سے) کہنا بخشش۔‘‘

اسی مضمون کو سورہ (اعراف:۱۶۱) میں یوں بیان کیا ہے: ’’وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا‘‘ اس جگہ اوپر کے مقام کی ترتیب کے خلاف کلمہ ’’حطّة‘‘ کا کہنا پہلے ذکر کیا اور شہر کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا ذکر پیچھے کیا، حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے۔

چنانچہ شرح رضی میں اسی آیت کی بناء پر کہا ہے کہ: ’’ولو کانت للترتیب لناقض قَوْلُهٗ تَعَالٰی وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ قَوْلُهٗ فِیْ مَوْضِعٍ اٰخَرِیْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اِذَا لُقِصَّةُ وَاحِدَةٌ (رضی شرح کافیہ ص ۵۰۳)‘‘

اگر واؤ ترتیب کے لئے ہو تو اللہ تعالیٰ کا قول ’’وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا...... الخ!‘‘ اس قول کو جو دوسری جگہ بالفاظ ’’وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ‘‘ وارد ہے۔ توڑ دیوے۔ کیونکہ ہر (دو آیات میں) قصہ ایک ہی ہے[1]۔

(۳) سورہ (مومنون:۳۷) میں فرمایا کہ منکرین قیامت کہتے ہیں: ’’نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ‘‘ یعنی ہم مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور (اس کے بعد) ہم (دوسری دفعہ) زندہ نہیں کئے جائیں گے۔

اس جگہ مرنے کو پہلے ذکر کیا اور زندہ رہنے کو پیچھے، حالانکہ ترتیب خارجی میں پہلے ’’جینا‘‘ ہوتا ہے، پیچھے ’’مرنا‘‘ علامہ رضی اس آیت کو بھی واؤ عاطفہ کے ترتیب کے لئے نہ ہونے پر شاہد لائے ہیں۔ قرآن شریف میں اس کی مثالیں اس قدر ہیں کہ ان کے نقل کرنے سے خوف طوالت ہے۔

غرض جمہور ائمہ نحو واصول کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ واؤ عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی اور نیز یہ کہ ترتیب ذکری اور ترتیب خارجی یا وقوعی وعملی میں مطابقت ضروری نہیں۔

پس جب اس قدر شواہد واسناد سے یہ مسئلہ پایۂ یقین کو پہنچ گیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب کہ آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ‘‘ میں تقدیم وتاخیر ہے، خلاف محاورہ زبان عرب نہ ہوا۔

’’فالحمد لله معلم الحقائق وملهم الدقائق ومعطی الخیرات من معادنها ومنزل الرحمة من اماکنها ومجری البرکات علیٰ اهلها‘‘ ترجمہ: پس سب تعریف خدا کو ہے جو سچے امور کا سکھانے والا اور باریک امور کا الہام کرنے والا اور نیکیوں کا ان کی معدنوں سے عطاء کرنے والا اور رحمت کا اس کی جگہ سے نازل کرنے والا اور برکات کا ان کے اہل پر جاری رکھنے والا ہے۔

دوسری آیت جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع آسمانی قطعی طور پر ثابت ہے۔ آیت سورہ نساء ہے: ’’وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

[1] واؤ عاطفہ کے مفید ترتیب نہ ہونے کے متعلق علامہ فزی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ تلویح میں انہی دو آیتوں کو ذکر کر کے پھر ان پر یہی نوٹ لکھا ہے جو علامہ رضی نے لکھا ہے۔ (سعادت)

لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُم بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا. بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا (نساء:۱۵۷، ۱۵۸) ’’اور ہم نے ان کو اس قول کے بدلے (بھی ملعون کیا) کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول خدا کو قتل کر دیا۔ حالانکہ انہوں نے اس کو نہ قتل کیا اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا۔ لیکن انہوں نے اس شخص کو قتل کیا اور صلیب دیا جو ان کے لئے مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا۔ (یعنی نصاریٰ) البتہ وہ اس شک میں پڑے ہیں۔ ان کو اس کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔ بلکہ خدا نے اس کا کوئی بھی علم نہیں۔ سوائے ظن کی پیروی کے اور انہوں نے اس کو اوپر اپنی طرف اٹھالیا اور خدا غالب اور حکمت والا ہے۔

’’وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ‘‘ کی تفسیر اور ’’وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ‘‘ کی تشریح اور ’’وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ‘‘ کی توضیح و تنقیح بہ بسط بیان ہو چکی اور حوالہ جارج سیل صاحب جو پر منقول ہو چکا۔

اس سے ظاہر ہو چکا کہ حضرت روح اللہ علیہ السلام کے واقعہ صلیبی کی نسبت صرف فرق نصاریٰ ہی مختلف الآ راہیں۔ لہٰذا ’’اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ‘‘ سے یہی نصاریٰ مراد ہیں ’’دُوْنَ الْیَھُوْد‘‘ کیونکہ یہود تو اپنے زعم میں قتل حضرت روح اللہ علیہ السلام پر جزم رکھتے ہیں۔ کما ھو واضحٌ من قولہ ’’اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ‘‘ اور گزر چکا کہ ’’وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا‘‘ سے یہود کے اس جزم مزعوم کا ابطال اور اس کی تردید منظور ہے۔ ’’فَلَا تَکْرَارَ حِیْنَئِذٍ‘‘ (پس اس صورت میں اس میں کوئی تکرار نہیں)

بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ کی مراد

اب کلمات طیّبات ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہ‘‘ کی صحیح مراد بیان کی جاتی ہے کہ یہ آیت متبرکہ دربارۂ حیات ورفع مسیح الی السمآء نص قطعی بعبارۃ النص ہے۔ سو واضح ہو کہ مرزا قادیانی کا یہ قول ہے کہ ’’حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے تو گئے۔ مگر زندہ اتارے گئے اور پھر خفیہ طور پر علاج کراتے رہے اور بعد ازاں بھاگ کر کشمیر میں آ گئے۔ جہاں ستاسی (۸۷) سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔‘‘ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ھٰذِہٖ الْخُرَافَاتِ!

’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه‘‘ سے کبھی رفع روح بتاتے ہیں اور کبھی عزت کی موت مراد رکھتے ہیں۔ مرزاقادیانی کی صلیب تو فصل اوّل سے بالکل منکسر ہوگئی اور معنی کنائی کی تردید ’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ میں بالاستیفا ہوچکی اور ہجرت الیٰ کشمیر کی تردید ابھی آگے مذکور ہوگی۔ ان شاءاللہ!

چونکہ مرزاقادیانی ’’رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه‘‘ سے رفع روح مراد لیتے ہیں اور اہل سنت والجماعت سلفاً وخلفاً مطابق مراد الٰہی رفع جسم پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لئے بہر دو صورت رفع کے معنی تو حقیقی ہی لئے گئے اور نیز چونکہ مرزاقادیانی بھی رفع روح الی اللہ کی صورت رفع الی السمآء ہی بتاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب (ازالہ اوہام ص۲۶۶، خزائن ج۳ ص۲۳۴) میں اس آیت کے ذیل میں بالتصریح لکھا ہے اور اہل سنت بھی رفع الی اللہ اور رفع الی السمآء کو متساوق فی المعنی جانتے ہیں[1]۔ جیسا کہ ’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ میں محقق ہوچکا ہے۔ اس لئے ’’الیہ‘‘ سے الی السّمآء[2] مراد ہونا بھی مسلم فریقین ہوگیا۔ پس تنازع صرف جسم وروح کے مرفوع ہونے میں رہا اور بس۔ لہٰذا رفع روح کا ابطال اور رفع جسم کا اثبات مدلّل طور پر کیا جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ نِعْمَ الْمُعِيْنُ!

۱؎ اکمل صاحب بے سمجھی میں بھی کامل ہیں، فرماتے ہیں ’’رفع روح الی اللہ کو رفع الی السماء بنانے سے یہ مطلب ہے کہ روح کی رفع الی اللہ ہو تو وہ عنداللہ عندالملائکہ فی السماء چلا جاتا ہے نہ یہ کہ رفع الی اللہ اور رفع الی السمآ کے معنی ایک ہیں۔‘‘ (ص۳۶) جواب: جناب والا! بات تو پھر بھی وہی رہی کہ روح خدا کے پاس آسمان پر چلی گئی۔ بس یہی تو مقصود تھا کہ مرزاقادیانی بھی روح آسمان پر جانا مانتے ہیں۔ حالانکہ آسمان کا لفظ موجود نہیں۔ آپ نے بھی اسے بحال رکھا۔ ہاں! کمال یہ کیا کہ تسلیم کر کے سرکھسکا گئے۔ مان کر بگڑ جانا اسے ہی کہتے ہیں۔ (سعادت)

۲؎ اکمل صاحب شاید قرآن کی بھی ترمیم کر ڈالیں گے (معاذاللہ) آپ رفع الی اللہ اور رفع الی السماء کے تساوق کو نہ سمجھ کر فرماتے ہیں ’’ایسا کہنا خداوند کریم کو مکانی بنانا ہے جو کفر ہے۔‘‘ (ص۲۶) جواب: جناب عالی! پھر ’’أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ (ملک:۱۶)‘‘ وغیرہ آیات میں کیا فرمائیں گے۔ کیا قرآن بھی کفر سکھاتا ہے۔ سنئے! خداوند کریم کے لئے جہت فوق کی طرف ماننا تقضائے فطرت ہے۔ لیکن اسے کسی ’’جہت میں‘‘ ماننا اور ہے اور یہی کفر ہے۔ (سعادت)

وجہ اوّل برائے ابطال رفع روحی واثبات رفع جسمی

چونکہ یہودیوں کا قول ''اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ'' ہے اور ظاہر ہے کہ قتل وصلب کے قابل جسم ہے نہ روح۔ اس لئے مزعوم یہود قتل جسد ہوا، نہ قتل روح، بنابرآں ''وَمَا صَلَبُوْہُ'' اور ''مَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا'' میں بھی نفی قتل وصلب جسم ہی سے کی گئی ہے۔ پس چونکہ جملہ ضمائر منصوب ومتصل جو افعال منفیہ وفعل مثبت کے ساتھ ہیں۔ یعنی جو ''وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ'' اور ''وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ'' میں واقع ہیں۔ ان سب کا مرجع المسیح علیہ السلام ہے۔ اس لئے لامحالہ جسد مسیح علیہ السلام مرفوع ماننا پڑے گا۔ بنابر اتحاد مرجع اور پھر چونکہ رفع اللہ الیہ میں رفع کو بصیغہ ماضی تعبیر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ زمانہ کی ماضویّت واستقبال اضافی امور سے ہے، ذاتی نہیں۔ یعنی ایک ہی زمانے بہ نسبت ایک کے ماضی ہوسکتا ہے اور بہ نسبت دوسرے کی استقبال اس لئے رفع کی ماضویت بھی کسی کی نسبت سے ہوگی اور وہ ماقبل بل ہے۔ یعنی واقعہ صلیبی[1] جس طرح کہ آیات ذیل سے ظاہر ہے۔

(۱) ''اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِہٖ جِنَّۃٌ بَلْ جَآءَ ھُمْ بِالْحَقِّ (مومنون:۷۰)'' کیا یہ کفار کہتے ہیں کہ اسے (پیغمبر ﷺ کو) جنون ہے۔ نہیں بلکہ وہ اس کے پاس حق لے کر آیا ہے۔

(۲) اور آیت: ''وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوْا اٰلِھَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (صافات:۳۶،۳۷)'' اور یہ (دوزخی) کہتے ہیں تھے کہ کیا ہم اس شاعر مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں (ہمارا پیغمبر شاعر ومجنون نہیں) بلکہ وہ تو حق لے کر آیا۔ واقعہ میں ''یجیٔ بالحق'' کا تحقق پہلے ہوا۔ بعدازاں ان کفار بدکردار نے آپ ﷺ کی نسبت زعم جنون کیا۔

[1] اکمل صاحب میں خاص کمال یہ ہے کہ بات تسلیم کر کے بھی سرکھسکا جاتے ہیں۔ چنانچہ (ص۳۶) پر لکھتے ہیں: ''رفع کی ماضویت آپ نے پوچھی وہ واقعہ صلیبی کی نسبت ہی سہی تو یہ معنی ہوئے کہ واقعہ صلیبی سے پہلے ہی حضرت مسیح علیہ السلام مرفوع الشان عنداللہ تھے۔'' جواب: اکمل صاحب! نے بڑا کمال دکھلانا چاہا تھا۔ لیکن افسوس! بات نہ بن سکی۔ کیونکہ مرزا قادیانی کا ساختہ برداختہ سب برباد ہوگیا۔ یعنی رفع الی اللہ سے مراد عزت کی موت نہ رہی۔ فافھم! (سعادت)

(۳)اور آیت: ’’وَقَالُوْا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَہٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (الانبیاء:۲۶)‘‘ اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی وہ پاک ہے بلکہ (وہ تو) اس کے معزز بندے ہیں۔ واقعہ میں تکریم بعض عباد اللہ کا تحقق پہلے ہوا، پیچھے مشرکین نے ان کی نسبت زعم الوہیت کیا۔ اسی طرح ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہ‘‘ میں بھی یہی ملحوظ ہے کہ ماقبل ’’بل‘‘ یعنی واقعہ صلیبی پر زعم یہود بہ نسبت مسیح علیہ السلام پیچھے ہوا اور اس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے آپ کے جسد مبارک کو مرفوع الی السمآء کر لیا تھا اور چونکہ واقعہ صلیبی کے پیشتر حیات مسیح علیہ السلام عندالخصم بھی مسلّم ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جسد حضرت روح اللہ کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور یہود کے ہاتھ میں ہرگز نہ آنے دیا اور یہی امتنان باری آیہ وافی ہدایہ ’’وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ‘‘ میں مذکور ہے اور یہی تھا وعدہ الٰہی ’’وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا‘‘ یعنی میں تجھ کو کفار سے بالکل پاک رکھوں گا۔

نیز اس لئے کہ چونکہ ’’وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہ‘‘ میں ہر دو منصوب متصل ضمیرین المسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہیں اور المسیح علیہ السلام معتبر ہے جسد مع روح سے اس لئے صرف ’’انّی‘‘ ضمیر سے رفع جسد مع روح ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ارواح مجردہ بغیر تعلق بالبدن کے قابل تسمیہ نہیں ہوتے اور نہ جسم بے روح حامل اسم ہوتا ہے۔

مشق اوّل (یعنی مجرّد ارواح کا نام نہ رکھا جانا) آیت: ’’وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (اعراف:۱۷۲)‘‘ (علی قول) اور باب صحیح بخاری ’’اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ‘‘ سے ثابت ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خلق ارواح کا تحقق خلق اجسام سے متقدم ہے اور اس حالت میں ان کے نام نہیں ہوتے اور شق ثانی (یعنی مجرد جسم کا نام نہ رکھا جانا) مسئلہ فقہیّہ عدم تسمیہ صبیّ درصورت غیر مستہل ہونے سے ظاہر ہے۔

پس واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے المسیح یعنی جسم مع روح کو جس کا نام المسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم تھا، آسمان کی طرف اٹھا لیا اور یہ امر بشارت حضرت مریم صفیۃ اللہ سے بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علیٰ لسان الملائکہ فرمایا: ’’یَا مَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ (آل عمران:۴۵)‘‘ اس سے واضح ہوگیا کہ مسمّٰی بالمسیح عیسیٰ بن مریم ہونا بعد تحقق اثر کلمہ ’’کن‘‘ کے ہے اور وہ کیا ہے؟ ولادت مسیح علیہ السلام

’’فَثَبَتَ الْمُرَادُ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ‘‘ اور ایسا ہی ’’اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ ن اسْمُہٗ یَحْیٰی (مریم:۷)‘‘ سے ظاہر ہے۔فافہم وتدبّر وتامّل ولا تعجل!

وجہ ثانی برائے ابطال مزعوم قادیانی

آیت:’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہ‘‘ میں قتل وصلب کی نفی کے بعد اثبات رفع بواسطہ حرف ’’بل‘‘ کیا گیا ہے اور ماہرین علم اصول ونحو پر روشن ہے کہ ’’بل‘‘ ابطالیہ کے اطراف متضاد فی الحکم ہوتے ہیں اور باہم متحقق نہیں ہوسکتے۔کیونکہ اجتماع ضدّین عقلاً محال ہے۔جیسا کہ آیات مذکورہ ذیل سے واضح ولائح ہے:’’الایۃ الاولٰی: وَقَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحَانَہٗ بَلْ لَّہٗ مَا فِیْ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بقرہ:۱۱۶)‘‘ اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدا نے فرزند اختیار کیا۔وہ پاک ہے بلکہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملک ہے۔

’’الآیۃ الثانیہ: وَقَالُوْا اتَّخَذَالرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَہٗ بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (انبیاء:۲۶)‘‘ اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے فرزند اختیار کیا۔ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں۔

ان آیتوں میں ولدیّت وعبودیّت میں کلمہ ’’بل‘‘ سے تضاد وتنافی ظاہر کرکے تنزیہہ باری سبحانہٗ ازاتخاذ ولد کی گئی ہے۔

’’الاٰیۃ الثالثہ: اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِہٖ جِنَّۃٌ بَلْ جَآءَ ھُمْ بِالْحَقِّ (مومنون:۷۰)‘‘ کیا یہ (منکر) کہتے ہیں کہ اسے (یعنی ہمارے پیغمبر ﷺ) کوجنون ہے (نہیں) بلکہ وہ تو ان کے پاس حق لے کر آیا ہے۔

’’الآیۃ الرابعۃ: وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوْا اٰلِھَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ (صافات:۳۶،۳۷)‘‘ اور یہ (دوزخی) کہتے تھے کہ کیا ہم اس شاعر مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں (ہمارا پیغمبر شاعر ومجنون نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا اور دیگر رسولوں کی تصدیق کی۔

ان آیتوں میں کلمہ ’’بل‘‘ سے رسول اللہ ﷺ سے نسبت مجنونیت وشاعریّت کا ابطال اور آپ کے مجیٔ بالحق وتصدیق المرسلین کا اثبات کیا گیا ہے۔کیونکہ جب آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں اور دیگر مرسلین علیہم السلام کی تصدیق کرتے ہیں تو پھر

آپ کی طرف نسبت مجنونیت وشاعریّت بالکل باطل ٹھہری۔ اگر کلمہ ’’بل‘‘ کو افادۂ مذکور کے لئے مفید تسلیم نہ کیا جائے تو معاذ اللہ! پھر تقریب ناتمام رہتی ہے۔ پس آیت معنونہ میں بھی ماقبل ’’بل‘‘ یعنی مقتولیت ومصلوبیت اور مابعد ’’بل‘‘ یعنی مرفوعیت میں منافات وعدم اجتماع فی التحقق پایا جانا چاہئے۔ اگر ’’رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه‘‘ سے مراد رفع روح یا اعزاز واکرام لیا جاوے تو ناقد لبیب پر اس کا بطلان ظاہر ہے۔ کیونکہ مابین مقتولیّت ومصلوبیّت اور رفع روح واعزاز واکرام کے اصلاً منافاۃ نہیں۔ کیونکہ شہداء جو ظلماً مقتول ہوتے ہیں۔ ان کے ارواح عالم بالا کو مرفوع ہوتے ہیں اور وہ جناب باری عزّ اسمہٗ میں بغایت معظم ومکرم بھی ہوتے ہیں۔ پس بمقتضائے کلمہ ’’بل‘‘ ارادۂ رفع روح باطل ٹھہرا اور چونکہ مقتولیت ومصلوبیت اور رفع جسمی بحالت زندگی میں منافاۃ ہے اور ہر دو معاً متحقق نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا لابد ارادۂ رفع جسمی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب زندہ جسم مرفوع الی السماء ہوگیا تو پھر اس کو صلیب پر نہیں چڑھا سکتے۔

__سوال:__ مرزا قادیانی مقتولیت مسیح علیہ السلام کے قائل نہیں۔ لہٰذا تقریب بالا ان کے مذہب کے خلاف مؤثر نہیں اور نیز بموجب ان کے مذہب کے مابعد ’’بل‘‘ یعنی رفع جو کنایہ ہے، اعزاز واکرام سے اس میں اور ماقبل ’’بل‘‘ یعنی قتل بالصلیب میں جو بحکم تورات مستلزم لعن ہے، تنافی وتضاد متصور ہے۔ کیونکہ ملعون عند اللہ معزز نہیں ہوسکتا۔

__اما الجواب عن الشق الاوّل:__ پس واضح ہو کہ تقریر بالا گورداً بزعم الیہود ہے۔ کیونکہ وہی بالجزم اس کے خلاف کہتے تھے۔ مگر اس میں من وجہ قادیانی کے اعتقاد فاسد کا ابطال واستیصال بھی بکمال وضوح عیاں ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہودیّت ونصرانیّت کے رنگ میں ایک الگ مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ مسلک یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر تو چڑھائے گئے۔ مگر اس سے مرے نہیں[1]۔

[1] اکمل صاحب اسے تسلیم تو کرتے ہیں۔ لیکن فرماتے ہیں: ’’اس بروز محمدیہ (چشم بد دور مرزا قادیانی) نے دو قوموں میں بطور حکم فیصلہ کردیا۔ ایک گروہ قائل تھا کہ صلیب پر چڑھائے گئے اور قتل ہوگئے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ نہ قتل ہوئے نہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ آپ (مرزا قادیانی) نے فرمایا صلیب پر چڑھائے تو گئے۔ مگر قتل نہیں ہوئے۔‘‘ (ص۳۶) جواب: اکمل صاحب بقول شاعر:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں ۔۔۔ لو آپ اپنے دام میں صیّاد آگیا

اپنی تحریر سے آپ ہی پھنس گئے۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ وہ ایک گروہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تفصیل اس کی یوں ہے کہ مضمون کسر صلیب میں محقق ہو چکا ہے کہ صلیب کے معنی صرف سولی پر لٹکانے کے ہیں۔ پس چونکہ مرزا قادیانی صاحب مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام کے قائل ہیں۔ اس لئے تقریب بالا سے ان کے مذہب کا بھی ابطال ہوا۔ کیونکہ ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' الیہ میں ابطال مصلوبیّت بھی ملحوظ[1] ہے۔ بوجہ ''بل'' کے قبل مذکور ہونے کے۔ چنانچہ تفسیر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کی نسبت قتل وصلیب ہر دو کا قائل لیکن دوسرے کی نسبت فرماتے ہیں کہ وہ ہر دو سے منکر تھا۔ سو معلوم ہے کہ پہلے قول کے قائل یہود ونصاریٰ ہیں اور قادیانی علماء اس واقعہ کے تواتر کے ثبوت میں یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ پر مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی احمدی کا قول مع تردید گزر چکا۔

اب دریافت طلب یہ ہے کہ دوسرا گروہ جو قتل وصلب میں سے کسی بات کا بھی قائل نہیں، وہ کون سا ہے؟ ماننا پڑے گا کہ وہ دوسرا گروہ مسلمانوں کا ہے جو بحکم ''مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' حضرت مسیح علیہ السلام کو ہر دو سے بری ومحفوظ مانتے ہیں۔ پس اکمل صاحب نے تسلیم کر لیا کہ مرزا قادیانی سے پیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے مقتول نہ ہونے اور صلیب پر بھی نہ چڑھائے جانے پر امت مرحومہ کا اجماع ہو چکا تھا۔ لہٰذا مرزا قادیانی کا یہ قول کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے، اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ٹھہرا۔ صاحبان! آپ اسی کتاب میں میرے اشتہار بنام مرزا قادیانی پر ایک نظر پھر ڈالیں۔ جہاں لکھا ہے۔ جناب مرزا قادیانی! بندہ (محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) جمیع اہل سنت والجماعت سلف وخلف کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ: ''حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر نہیں چڑھائے گئے اور اب تک فوت بھی نہیں ہوئے۔''

الحمدللہ! کہ اب ہمارے اکمل صاحب نے بھی خود ہی مان لیا کہ مرزا قادیانی سے پیشتر مسلمانوں کا یہی اعتقاد تھا ''شکر للہ کہ میان من او صلح فتاد'' ہم اکمل صاحب کو اس تسلیم حق پر مبارک باد دیتے ہیں۔

دیگر یہ کہ یہ بھی بالکل صاف ہو گیا کہ چونکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل وصلیب ہر دو کے قائل تھے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ہر دو امر کی تردید کرنے کے لئے فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' یعنی نہ تو انہوں نے مسیح رسول خدا کو قتل کیا اور نہ سولی دیا۔ (سعادت)

[1] کلمہ ''بل'' کے استعمال کی تحقیق وتدقیق سے اکمل صاحب کے سارے بل پیچ نکل گئے اور انہوں نے بلاتردد اسے تسلیم کر لیا۔ چنانچہ میری عبارت نقل کر کے تصدیق فرماتے ہیں: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' میں ابطال مصلوبیت بھی ملحوظ ہے۔'' ''بے شک'' (ص۳۷) لیکن اس کے بعد پھر مرنے کی راہ نکالتے ہیں اور لکھتے ہیں..... مگر مصلوبیت کے معنی صلیب پر موت واقع ہونے کے ہیں۔'' ورنہ ماننا پڑے گا کہ ''لَاُصَلِّبَنَّكُمْ'' اور ''اَوْ يُصَلَّبُوْا'' میں بھی صرف صلیب پر چڑھنا مراد ہے۔'' (ص۳۷) جواب: جناب والا! (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خازن میں ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ ‘‘ کی تفسیر میں لکھا ہے: ’’والمعنٰی انهم لم یقتلوا عیسٰی ولم یصلبوه ولکن الله عزّوجل رفعه الله الیه (خازن ص ۴۲۰) ‘‘اس کے معنی یہ ہیں کہ یہود نے عیسٰی علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا اور نہ اسے صلیب دیا۔ بلکہ اس کو خدائے عزوجل نے اپنی طرف (اوپر کو) اٹھالیا۔

اور شق ثانی کے جواب میں اوّل تو یہ معروض ہے کہ کتب محرفہ سے استدلال وتمسک کرنا اور بیان قرآنی میں تحریف کرنا سب سے زیادہ موجب لعن ہے۔ جو توریت موسٰی کلیم اللہ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ وہ تو صفحہ دنیا پر نظر نہیں آتی ہے اور اس کا کہیں بھی پتہ نہیں ملتا جو پانچ کتابیں بنام توریت مجموعہ بائبل کے ابتداء میں منضم ہیں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ کسی مؤرخ نے حضرت موسٰی علیہ السلام کی وفات کے بہت دیر بعد وقائع وشرائع موسویہ کو تاریخی طور پر جمع کیا۔ جیسا کہ اس کی اندرونی شہادات سے ثابت ہے۔ مثلاً کتاب استثناء باب اخیر واقعہ وفات حضرت کلیم اللہ اور اسی طرح کئی دیگر مواضع[1]۔ دیگر یہ کہ توریت اور انجیل شریف اور قرآن عظیم، غرض جملہ کتب سماویہ میں اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے کہ شہدا بمراتب عالیہ فائز ہوں گے۔ چنانچہ (سورہ توبہ:۱۱۱) میں فرمایا: ’’اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ (توبه:۱۱۱) ‘‘بے شک خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو (کبھی تو فریق مقابل کو) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) خود قتل ہو جاتے ہیں، خدا نے حق حق وعدہ کیا ہے توریت میں بھی اور انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔

دیگر یہ کہ توریت موجودہ میں بھی مطلقاً قتل بالصلیب کو مستلزم لعن قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ خاص اسی شخص کو ملعون کہا گیا ہے جو کسی سخت جرم واجب الصلیب کی سزا میں مصلوب ہو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مصلوب کی تحقیق سابقاً مولوی مبارک علی صاحب کے جواب باصواب کی تردید میں مفصل گزر چکی۔ اس سے عشوہ نمائی کیوں کی۔ دیکھئے کتاب ہذا اور جو آیات آپ نے لکھی ہیں۔ ان میں بھی وہی تحقیق ملحوظ ہے۔ ’’فَارْجِعِ الْبَصَرَ (الملک:۳)‘‘

[1] مرزا قادیانی نے اپنی آخری کتاب (چشمہ معرفت ص۲۵۵، خزائن ج۲۳ ص۲۶۶) میں خود ان کتابوں کو لچر پوچ اور محرّف مبدّل لکھا ہے۔

جیسا کہ سیاق وسباق بلکہ صریح عبارت سے ظاہر ہے۔ (۲۲) ''اور اگر کسی نے کچھ ایسا گناہ[1] کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو اور وہ مارا جائے اور تو اسے درخت میں لٹکاوے۔ (۲۳) تو اس کی لاش رات بھر لٹکی نہ رہے۔ بلکہ تو اسی دن اسے گاڑ دے۔ کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے، خدا کا ملعون ہے۔ اس لئے چاہئے کہ تیری زمین جس کا وارث خداوند تیرا خداوند تجھ کو کرتا ہے ناپاک نہ کی جاوے۔'' (استثناء باب۲۱) مزید برآں ظاہر ہے کہ کافر مجرم کا مقتول بالصلیب ہونا ہی موجب لعن نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوئی شریعت حقہ کے حکم سے کسی اور طریق سے بھی قتل کیا جائے یا سزا دیا جائے تو پھر بھی وہ زمرۂ مردودین میں معدود ہوگا۔

جیسا کہ آیت مائدہ سے ثابت ہے: ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (مائدہ:۳۳)'' سوائے اس کے نہیں کہ ان لوگوں کی جزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہ ہے کہ ان کو خوب قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو جلاوطن کیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں خواری ہے اور آخرت میں ان کو بڑا عذاب ہوگا۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ مومن عاصی کے لئے حدود کفارہ ہوتی ہیں جیسا کہ صحیح بخاری سے ثابت ہے۔

پس اس بیان سے واضح ہوگیا کہ عنداللہ ملعون وغیر ملعون اور مردود ومقبول ہونا وہ صلاح وفساد کے سبب ہے نہ قتل وصلب کے سبب۔

پس جب ثابت ہوچکا کہ توریت موجودہ میں بھی مطلقاً مقتولیّت بالصلیب کو موجب لعن قرار نہیں دیا گیا بلکہ وہ حکم مجرم فی الواقع کی نسبت ہے تو چونکہ حضرت روح اللہ فی الواقع غیر مجرم تھے۔ لہٰذا بنا برواقعہ ماقبل ''بل'' یعنی قتل بالصلیب اور مابعد ''بل'' یعنی رفع

[1] خدا جانے اکمل صاحب بات کے نہ سمجھنے میں نہایت کمال رکھنے کے سبب اکمل ہیں یا نہ ماننے کے سبب، عبارت میں تو صاف لکھا ہے کہ اگر کسی نے کچھ ایسا گناہ کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو۔ پھر بھی ہمارے اکمل صاحب (ازید کمالہ فی الانکار) فرماتے ہیں ''تورات کی آیات میں پہلے مجرم کا بیان ہو یا نہ ہوالخ (ص۳۸) ''بریں اکملیّت ببایدگریست'' (سعادت الاقران)

اعزازی میں تنافی وتضاد متحقق نہ ہوا بلکہ مومن جو ظلماً مقتول ہو وہ عنداللہ معزز ہوتا ہے۔ پس تقریب کلمۂ بل بعد ابطال تاویل قادیانی رفع جسمی میں محکم رہی۔

اور اگر مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ! بزعم یہود مجرم خیال کر کے تنافی پیدا کی جائے تو ماہر ذکی پر ظاہر ہے کہ ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه'' قصر قلب ہے جس میں مزعوم مخاطب کو برعکس مایذکرہ المتکلم ظاہر کر کے ردّ کیا جاتا ہے اور چونکہ صورت اعتراضیہّ میں بحسب علم المتکلم بھی وصف مزعوم مخاطب کا وجود متصور ہے وہذا خلف۔ لہٰذا قول قائل باطل ہوا۔ فافہم!

ثانیاً یہ کہ (ص۲۷) میں بوضوح محقق ہو چکا ہے کہ: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ'' میں نفی قتل وصلب مقصور علی المفعول ہے یعنی قتل وصلب کی نفی صرف بہ نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کی گئی ہے۔ ''دون غیرہ'' بلکہ ''وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ'' سے وہی قتل وصلب غیر مسیح علیہ السلام کے لئے ثابت کیا گیا ہے اور نیز مذکور ہو چکا ہے کہ مفعول ''قتلنا'' یعنی ''المسیح'' کو موصوف ''برسول اللہ'' ذکر کرنا بنا بر اظہار مفاخرت یہود ہے جو قصر مذکور کے لئے مؤید قوی ہے۔ پس ماہر ذکی پر ظاہر ہو سکتا ہے کہ کلام الٰہی ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْه'' جو کلام قصری ہے وہ ''مِنْ بَابِ الْقَصْرِ الْمَوْصُوْفِ عَلَى الصِّفَةِ'' ہے ''وَهُوَ اَنْ لَّا يَتَجَاوَزَ الْمَوْصُوْفُ تِلْكَ الصِّفَةَ اُخْرٰى'' اور پھر قصر قلب ہے ''لِوُجُوْدِ مَوْجِبِهٖ وَلَيْسَ قَصْرَ اَفْرَادٍ وَّلَا تَعْيِيْنٍ لِفُقْدَانِ مُوْجِبَاتِهِمَا'' اور پھر قصر کے طرق اربعہ مشہورہ میں سے قصر بالعطف ہے۔ ''لِاَنَّهٗ اشْتَمَلَ عَلٰى كَلِمَةِ بَلِ الَّتِىْ تَقْتَضِىْ ثُبُوْتَ ضِدِّ حُكْمِ مَا قَبْلَهٗ لِمَا بَعْدَهٗ'' اور چونکہ قصر میں تمیز بین الخطا والصواب ملحوظ ہوتی ہے اور قصر قلب میں متکلم پر واجب ہوتا ہے کہ مثبت ومنفی کو منصوص ذکر کرے۔ کیونکہ اس میں نفی غیر اور اثبات مذکور بطریق حصر بیان کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ مخاطب کے اعتقاد میں جو خطاء ہے۔ اس کی تردید بھی ہو جائے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ مخاطب کا اعتقاد برعکس یا یذکرہ المتکلم ہے۔ خصوصاً قصر بالعطف میں تو کسی صورت میں بھی ترک تصریح بالمراد جائز نہیں۔ کیونکہ پھر مابعد عاطفہ کا حکم ماقبل کی ضد ثابت نہیں ہو سکتا۔

بعد تمہید اس تقریب کے واضح ہو کہ اگر رفع الی اللہ سے موت طبعی بعد از واقعہ صلیب بعرصۂ دراز بملک کشمیر مراد لی جائے۔ جیسا کہ مزعوم مرزا قادیانی ہے تو بمقتضائے تمہید

مذکورتصریح ’’وَمَا قَتَلُوْہُ بِالصَّلِیْبِ بَلْ بَقِیَ حَیًّا زَمَانًا طَوِیْلًا ثُمَّ اَمَاتَہُ اللّٰہُ وَرَفَعَہُ اِلَیْہِ[۱]‘‘ ضروری ہے[۲]۔ کیونکہ جب مزعوم یہود قتل مسیح بالصلیب تھا اور مراد الٰہی اثبات واقعہ صلیبی مگر برعکس زعم یہود ابطال قتل بالصلیب اور اثبات حیات بعد واقعہ صلیب بعرصۂ دراز تھا تو اتنی تصریحات کا ترک کردینا حسب قواعد علم معانی وبیان فصاحت وبلاغت کے بالکل منافی ہے اور شان قرآن عظیم کے ہرگز شایان نہیں۔ پس چونکہ بنا بر مذہب مرزا قادیانی بوجہ فقدان نص علی المثبت یعنی واقعہ صلیبی وحیات بعرصہ دراز بعد ازاں یہود کے زعم باطل کا ابطال ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ مدعائے الٰہی کا اثبات۔ اس لئے لامحالہ قول مرزا قادیانی باطل ٹھہرے گا اور چونکہ بموجب مذہب فرقہ حقّہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کے نص علی المثبت والمنفی موجود ہے۔ یعنی ابطال واقعہ صلیبی بہ نسبت مسیح علیہ السلام ’’مَا صَلَبُوْہ‘‘ میں منصوص ہے اور رفع الی السمآء ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ میں مصرح ہے اور قتل وصلب غیر مسیح علیہ السلام جس پر آپ کی شباہت ڈالی گئی۔ ’’وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ‘‘ میں مذکور ہے۔ ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ سے سوائے رفع جسد کے اور کچھ مراد لینا ہرگز جائز نہیں۔ **فافھم وتدبر!**

۱؎ مطابق مذہب مرزا قادیانی لکھا گیا ہے۔ فافھم!

۲؎ ہمارے اکمل صاحب نے ہمارے اس بیان قصر قلب کو کان لپیٹ کر مان لیا ہے اور قاعدے کی رو سے ہم نے جتنی تصریحات کا ضروری ہونا ذکر کیا ہے۔ ان سب کو بھی تسلیم کرلیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ’’قصر قلب جس میں مزعوم مخاطب کو برعکس مایذکرہ المتکلم ظاہر کر کے ردّ کیا جاتا ہے۔ بے شک! چنانچہ اس آیت میں بھی مزعوم مخاطب کے برعکس ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ مجرم مزعمی کا مدار قتل بالصلیب تھا۔ جس کی نفی کی گئی اور اصل حال بتادیا گیا کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے اور مشبہ بالمصلوب ہوگئے۔ مگر یونس نبی کی طرح قبر میں زندہ ہی رکھے گئے اور پھر وہاں سے نکل کر لمبا سفر کیا اور کشمیر میں شاہزادہ نبی کہلائے اور باعزت وہاں رہے اور کامیابی کے ساتھ دنیا سے بفحوائے ’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ اٹھائے گئے ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ میں یہ سارا مضمون بالتصریح بتلایا گیا ہے۔‘‘ (ص۳۹) حضرات! جناب اکمل صاحب نے ہمارے بیان کو حرف بحرف تسلیم کرلیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب اور مذکورہ ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ‘‘ میں بالتصریح بتلادیئے گئے ہیں اور ہم عرض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں ان امور کا ذکر مطلقاً نہیں۔ اب آپ خود انصاف کرلیں کہ آیا قرآن شریف میں یہ امور مذکور ہیں یا نہیں۔ اگر مذکور ہیں تو بہتر ورنہ سمجھ لیں کہ قادیانی دعاوی اسی طرح بے بنیاد ہوتے ہیں۔ (سعادت الاقران)

ثالثاً یہ کہ اس سے اوپر انہی یہود کی نسبت کہا گیا ہے ’’وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ (آل عمران: ۱۸۱) ‘‘ اور وہ سب مقتول انبیاء عنداللہ ماجور و مرفوع الدرجات ہوئے اور ہیں۔ اگرچہ وہ یہود کے نزدیک مجرم و لائق قتل تھے۔ پس اس مقام پر رفعت درجہ اور قتل بالظلم جمع ہوگئے۔ اسی طرح اگر حضرت مسیح علیہ السلام ان کے ہاتھ سے قتل بھی ہو جاتے تو پھر بھی عنداللہ مرفوع الدرجات ہی ہوتے۔ کیونکہ آپ نبی صادق ہیں اور مثل دیگر نبیوں کے ناحق قتل کئے جاتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعہ کو دوسرے انبیاء مقتولین کی شمولیت میں بیان نہیں کیا۔ بلکہ ان سے جدا طور پر کیا ہے۔ جو ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ‘‘ ہے اور سابقاً اچھی طرح بدلائل واضح ہو چکا ہے کہ ’’بل‘‘ ابطالیہ کے ماقبل و مابعد میں جمع ممکن نہیں اور مرزا قادیانی ان کو واقعاً جمع کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا قول باطل ہے اور بموجب مذہب اہل سنت جمع ممکن نہیں۔ کیونکہ جب آپ واقعہ صلیبی سے پیشتر آسمان کی طرف اٹھائے گئے تو صلیب پر کس طرح چڑھائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ سابقاً محقق ہو چکا ہے۔

رابعاً یہ کہ وجہ اوّل میں بالدلیل ثابت ہو چکا ہے کہ رفع کی ماضویت بہ نسبت ماقبل ’’بل‘‘ یعنی واقعہ صلیبی کے ہے گو اگر رفعہ اللہ الیہ سے موت طبعی بعد از مدت مدید مراد لی جائے تو معاذ اللہ! کلام باری سبحانہٗ میں کذب لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب موت مسیح علیہ السلام قبل از واقعہ صلیبی واقع ہی نہیں ہوئی تو پھر اس کو قبل از واقعہ ذکر کرنا کذب نہیں تو اور کیا ہے؟ حاشا شانہ عن ذلک!

بعد از قطع احتمالات مردودہ مذکورہ آیت: ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ‘‘ رفع جسمی میں محکم ٹھہری اور مخالف کے لئے اس میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اہل لسان تھے اور اپنی عربی زبان کے محاورات کو خوب سمجھتے تھے اور انہوں نے قرآن شریف ’’من اوّله الی اٰخره ‘‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں شب و روز اقامت کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے مع اس کے بیان و تفسیر کے سیکھا تھا اور علمائے عظام کیا متقدمین اور کیا متاخرین جو اکثر علماء عربیّہ کے موجد اور مجدّد اور میدان فصاحت کے فارس اور بحر بلاغت کے غوّاص تھے اور جن کے مساعی جمیلہ سے آج کل علوم عربیہ زندہ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک سے بھی اس آیت میں اختلاف مروی نہیں اور کسی نے بھی سوائے رفع جسمی کے مراد نہیں لی۔

چنانچہ تفسیر کبیر میں امام ہمام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’رَفَعَ عِیْسٰی اِلَی السَّمَآءِ ثَابِتٌ بِھٰذِہٖ الْاٰیَۃِ وَنَظِیْرُ ھٰذِہٖ الْاٰیَۃِ قَوْلُہٗ فِیْ اٰلِ عِمْرَانَ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاعْلَمْ اَنَّہٗ تَعَالٰی لَمَّا ذَکَرَ عَقِیْبَ مَا شَرَحَ اَنَّہٗ وَصَلَ اِلٰی عِیْسٰی اَنْوَاعٌ کَثِیْرَۃٌ مِنَ الْبَلَاءِ وَالْمِحْنَۃِ اَنَّہٗ رَفَعَہٗ اِلَیْہِ دَلَّ ذٰلِکَ اَنَّ رَفْعَہٗ اِلَیْہِ اَعْظَمُ فِیْ بَابِ الثَّوَابِ مِنَ الْجَنَّۃِ وَمِنْ کُلِّ مَا فِیْھَا مِنَ اللَّذَّاتِ الْجِسْمَانِیَّۃِ وَھٰذِہِ الْاٰیَۃِ تَفْتَحُ عَلَیْکَ بَابَ مَعْرِفَۃِ السَّعَادَاتِ الرُّوْحَانِیَّۃِ‘‘ اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہے اور اس کی نظیر سورہ آل عمران کی آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ!‘‘ ہے اور جان تو کہ جب خداتعالیٰ نے اس کے بعد کہ عیسیٰ علیہ السلام کو کئی قسم کی تکالیف اور مصائب پہنچیں یہ ذکر کیا کہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا تو اس امر نے یہ بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خدا کی طرف مرفوع ہونا جنت وغیرہ ہر جسمانی لذّت کے ثواب سے زیادہ ہے اور یہ آیت تجھ پر سعادت روحانیہ کی معرفت کا دروازہ کھول ڈے گی۔

سوال: اگر یہ سوال کیا جائے کہ جسم خاکی کا آسمان کی طرف صعود کرنا ممتنعات ومحالات میں سے ہے اور نیز یہ کہ جب اللہ تعالیٰ دیگر رسولوں کو انہی اسباب معتادہ سے بچا کر اسی کرۂ زمین میں بساتا رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو ارض مقدسہ اور آنحضرت ﷺ کو مدینہ طیّبہ کی طرف ہجرت کرائی تو حضرت روح اللہ کو کیوں آسمان پر اٹھا لیا اور کس لئے اتنی دیر تک زندہ رکھ کر پھر زمین میں نازل کرے گا؟

۱؎ اکمل صاحب بھی کمال کے پتلے ہیں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا کہ یہ آیت تجھ پر سعادت روحانیہ کی معرفت کا دروازہ کھول دے گی تو اکمل صاحب نے اپنی اکملیت سے یہ سمجھ لیا کہ بس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع روحانی ہے۔ چنانچہ (ص۴۱) میں فرماتے ہیں ’’تفسیر کبیر میں پیش کردہ عبارت ’’تفتح علیک...... الـخ ‘‘میں اشارہ ہے رفع روحانی کی طرف۔‘‘ جواب: حالانکہ اس عبارت کے شروع میں الی السماء کی تصریح موجود ہے۔ پھر بھی بے تکی ہانکے جاتے ہیں کہ اشارہ ہے رفع روحانی کی طرف، صحیح مطلب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رفع آسمانی کی جو نعمت ملی وہ دیگر جسمانی نعمتوں سے برتر ہے۔ اس سے قبولیت اور قرب الٰہی کی حقیقت معلوم ہوکر سعادت روحانی حاصل ہوسکتی ہے۔ (سعادت الاقران)

جواب: تو سوال کی شق اوّل کا جواب حسب وعدہ اوّلاً یہ ہے کہ امر خارق عادت کے وقوع میں شک بدو وجہ ہوسکتا ہے۔ اوّل واقع کرنے والے کے نقص علم کی نظر سے۔ دوم اس کے عجز ونقص قدرت کے اعتبار سے اور یہ امر عندالخصم بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہر دونقصوں سے مبرّا ومنزّہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' میں ''رفع'' کو اپنی طرف منسوب کیا۔ کیونکہ ''صَعُوْد اِلَى السَّمَآءِ'' اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی حول وقوّت سے بعید ہے۔ مگر اللہ عزیز کی قدرت کاملہ کے سامنے کچھ بھی نہیں اور اسی طرح اللہ سبحانہ نے اسراء نبوی کو اپنی طرف نسبت کیا اور فرمایا: ''سُبْحَانَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا (بنی اسرائیل: ۱)'' پاک ہے وہ (خدا) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) کو راتوں رات سیر کرائی۔

یعنی اتنی مسافت بعیدہ اتنے تھوڑے وقت میں طے کرنا اگرچہ بہ نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کی قدرت کے متعذر رہے۔ مگر اللہ سبحانہ کی قدرت کے سامنے مہمل ہے۔

چنانچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ''وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' کے ذیل میں کہا کہ:

''کما قال الامام الرازی رحمۃ اللہ علیہ تحت قوله تعالٰی الاٰتی وكان الله عزيزاً حكيماً حيث قال والمراد من العزة كمال القدرة ومن الحكمة كمال العلم فنبّه بهذا علٰى ان رفع عيسٰى من الدنيا الى السمٰوٰت وان كان كالمتعذر على البشر لكنه لا تعذر فيه بالنسبة الى قدرتى والى حكمتى وهو نظير قوله تعالٰى سبحان الذى اسرى بعبده ليلاً فان الاسراء وان كان متعذراً بالنسبة الى قدرة محمد (ﷺ) الا انه سهل بالنسبة الٰى قدرة الحق سبحانهٗ!'' اس آیت میں عزت سے کمال قدرت مراد ہے اور حکمت سے کمال علم مراد ہے۔ پس اس سے خدا نے اس امر پر متنبہ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا سے آسمان پر اٹھایا جانا۔ اگرچہ بشر کی طاقت سے بالا ہے۔ لیکن میری قدرت اور حکمت کی نسبت کوئی چیز بھی نہیں اور یہ آیت دوسری آیت: ''سُبْحَانَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ'' کی نظیر ہے کہ اسراء اگرچہ آنحضرت ﷺ کی قدرت کی نسبت مشکل ہے۔ مگر حق سبحانہ کی قدرت کے آگے بالکل سہل ہے۔

اور اسی نکتہ عجیبہ کے لئے ''بَلْ رَّفَعَهُ اِلَيْهِ'' میں اسم جلالۃ (اللہ) ذکر کیا کیونکہ یہ اسم دلالت کرتا ہے۔ اس ذات پر جو مستجمع جمیع صفات کمال ہو ''هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا

ھُوَ ''مزید برآں اسی دقیق لطیفہ کے لئے اپنی اور دو صفتیں جو کمال علم اور کمال قدرت کی مظہر ومثبت ہیں، ذکر کیں۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ چونکہ قرآن عظیم کی آیات مثل دعاوی مع بیّنات کے ہیں۔ اس لئے ذکر ہر اسم اور صفت کا حسب اقتضائے مقام ومفہوم کلام ہوتا ہے اور وہ اسم بمنزلۂ علّت مضمون ہوتا ہے۔ پس چونکہ ''رَفَعَ اِلَی السَّمَآء'' میں وہم واستبعاد و وسوسہ عبثیّت واقع ہوسکتا تھا۔ اس لئے اس کے ازالہ کے لئے ''وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا'' فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مستجمع جمیع صفات کمال اپنے ارادے پر غالب اور قادر ہے جو کچھ چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ لہٰذا حضرت روح اللہ کو آسمان پر چڑھا سکنا۔ اس کے دائرہ قدرت سے خارج نہیں اور چونکہ وہ حکیم ہے۔ اس لئے آپ کا رفع الی السمآء اور حیات سماوی اور نزول بعینہٖ عبث اور خلاف حکمت نہیں ہے۔

سائنس کا کمال

دیگر یہ کہ سائنس اس کمال پر پہنچ گیا ہے اور نئی نئی انسانی ایجادات اور عجائب المخلوقات کے نئے نئے انکشافات اس حد تک ہو چکے ہیں کہ گزشتہ زمانہ کے بہت سے محالات عادیہ مشاہدات و واقعات سے ثابت ہو چکے ہیں۔ جن پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر امور بھی اسی طرح ممکنات سے ہیں اور اس ذہنیّت کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ ہر محال عادی ممکن بالذات ہوتا ہے۔

اسفل (نیچے) سے اعلیٰ (اوپر) کی طرف حرکت کرنے کو صعود کہتے ہیں۔ انسان طبعی طور پر اپنے ارادہ وقوت سے ایک چھلانگ سے زیادہ ایسی حرکت نہیں کرسکتا۔ لیکن ایروپلین (ہوائی جہاز) نے ثابت کردیا کہ کسی تدبیر وحکمت عملی سے انسان بھی پرواز کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ تدبیر ہمارے علم میں آجائے اور ہم عملی طور پر اس پر قدرت وقابو بھی رکھ سکیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت ہوا میں اڑتا تھا۔ اس کے لئے بھی عالم اسباب میں کوئی سبب ہوگا۔ جس کا ہم کو علم نہیں۔ ہم ایروپلین (ہوائی جہاز) سے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ممکن ہے۔

اسی بناء پر خداوند عزوجل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع کے ساتھ فرمایا ''وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا'' یعنی سمجھایا کہ میں حکیم ہوں۔ مجھے سب تدبیریں آتی ہیں اور عزیز ہوں، سب تدبیریں اور حکمتیں میرے احاطہ قدرت میں ہیں۔ جس امر کا ارادہ کروں۔ اس

کے وجود میں لانے سے کوئی امر مجھے عاجز نہیں کرسکتا۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ''وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعْجِزَہٗ مِنْ شَیْءٍ فِیْ السَّمٰوٰتِ وَلَا فِیْ الْاَرْضِ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا (فاطر:۴۴) ''یعنی خداوند عزّ وجل ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی شئے بھی آسمانوں یا زمین میں عاجز کردیوے، بے شک وہ سب کچھ جانتا ہے اور بڑی قدرت والا ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث سے ثابت ہے کہ معراج کی رات سرور عالم آنحضرت ﷺ کی سواری کے لئے براق لایا گیا، یہ کیا تھا؟ خداتعالیٰ نے جب چاہا کہ اپنے حبیب ﷺ کو بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کرائے اور تجلیات ونشانات قدرت دکھائے تو اس ارادہ کے فعل میں آنے کی ایک عملی تدبیر تھی اور صحیح بخاری میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ثُمَّ اُخِذَ بِیَدِیْ فَعُرِجَ بِیْ اِلَی السَّمَآءِ (کتاب الصلوٰۃ)'' یعنی پھر جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف لے چڑھا۔ یہ بھی عالم اسباب میں سے ایک سبب تھا کہ ایک فرشتہ جس کے لئے اوپر چڑھنا۔ اس کی طبیعت کے برخلاف نہیں۔ ایک انسان کو جو طبعی طور پر اپنے ارادہ وقوّت سے آسمان پر نہیں چڑھ سکتا، چڑھا کر لے گیا۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ اللہ عزّ وجلّ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آسمان پر اٹھایا ہو۔ چنانچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ آیت: ''وَاَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ:۲۵۳) '' کی تفسیر میں اس امر کے بیان میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دیگر انبیاء کی نسبت مزید اختصاص ہے۔

فرماتے ہیں: ''لانہ ھو الذی بشّر مریم بولادتہ انما ولد عیسیٰ علیہ السلام بنفخۃ جبرئیل علیہ السلام وھو الذی ربّاہ فی جمیع الاحوال وکان یسیر معہ حیث سار وکان معہ حین صعد الیٰ السمآء (ج اوّل ص ۴۲۶) ''یعنی اس لئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی نے حضرت مریم علیہا السلام کو پیدائش کی بشارت دی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبرئیل ہی کی پھونک سے پیدا ہوئے اور اسی (جبرئیل) نے سارے احوال میں آپ کی تربیت کی اور جہاں آپ جاتے تھے۔ وہ بھی ساتھ ساتھ جاتا تھا اور وہ اس وقت بھی آپ کے ساتھ تھا جب آپ آسمان کو چڑھے۔

فرشتہ تو بڑی شے ہے، واقعات میں تو یہ بھی ہوچکا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک صحابی کو جن اٹھا کر لے گیا۔ کئی سالوں کے بعد پھر مدینہ طیّبہ میں چھوڑ گیا۔ یہ وہی

واقعہ ہے، جس پر حضرت نے اس کی بیوی کو چار سال کے بعد بیوہ ہونے کی عدّت (یعنی چار مہینے اور دس دن رات) گزار کر دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت دی تھی۔ (مستفاد از سبل السلام)

ثانیاً یہ کہ کسی امر کا امکان شئے دیگر ہے اور اس کا وقوع شئے دیگر عقل کے متعلق صرف اثبات امکان ہے نہ وقوع۔ جس طرح کہ وقوع صرف رویت یا نقل یعنی مخبر صادق کی روایت وخبر کے متعلق ہے نہ کہ عقل کے۔ پس برہان عقلی سے صعود الی السمآء کے امکان کا بیان اس طریق سے ہے کہ ممتنعات دو قسم پر ہیں۔ بالذات وبالغیر اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے۔ کیونکہ عرف میں امکان بدو معنی مستعمل ہوتا ہے اور ان میں سے امکان ذاتی ہے کہ اس کا وجود وعدم بالنظر الی ذات الممکن متساوی ہوتا ہے۔ گو بلحاظ امور خارجیّہ از علل موجبہ یا موانع وعوائق احدہما واقع بلکہ واجب ہو اور یہ (امکان ذاتی) جامع ہوتا ہے وجوب بالغیر اور امتناع بالغیر کو یعنی واجب بالغیر اور ممتنع بالغیر عین حالت وجوب وامتناع میں ممکن ذاتی ہوتے ہیں۔ کیونکہ عین حالت وجوب وامتناع میں بھی اس کا وجود عدم متساوی ہوتا ہے۔ اگرچہ بلحاظ امور خارجیہ احدہما واجب ہوگیا ہو[1]۔

[1] اس مقام پر امکان وامتناع اور وقوع ولا وقوع کی بحث ایسی صفائی اور سہولت سے بیان کی گئی ہے کہ معقولات میں کچھ بھی دسترس رکھنے والا آسانی سے سمجھ کر شکر گزار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے اکمل صاحب ایسے کوڑ مغز ہیں کہ آپ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔ چنانچہ آپ خیریت سے فرماتے ہیں۔ آپ (خاکسار) نے صعود کو ممتنع بالغیر ثابت کیا ہے۔ بہت اچھا! اب آپ فرمائیے! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ممتنع بالغیر کے لئے امکان وقوعی نہیں ہوتا۔ (ص۴۲) اس کا جواب ہم سوائے اس کے اور کیا دیں کہ اکمل صاحب باوجود ادعائے اکملیت نہ تو ان مصطلحات سے واقف ہیں اور نہ شہادت القرآن کے اس مقام کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے اجہل اکمل سے کون کہے کہ جب ممتنع بالغیر ہوا تو اس کا وقوع کیوں ممکن نہیں کیونکہ ممتنع بالغیر اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات میں ناممکن ہو۔ لیکن موانع وعوائق کے وقت واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر ممتنع بالغیر بھی وقوع میں آسکتا ہے۔ کیونکہ امکان ذاتی جامع وشامل ہوتا ہے۔ وجوب بالغیر اور امتناع بالغیر کو جیسا کہ متن میں مدلل ومفصل بیان ہو چکا ہے۔ ہاں وقوع کی دلیل کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ سو اس کے لئے ہم نے شروع تقریر میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ اثبات وقوع صرف رویت یا نقل (یعنی مخبر صادق کی خبر رویت یا شہادت کے متعلق ہے نہ کہ عقل کے اور وہ خبر وشہادت آیت: ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ‘‘ میں مذکور ہے جس کی تفسیر وتوضیح ہم کر رہے ہیں۔ فافہم! (سعادت القرآن)

پس چونکہ صعود ونزول سماوی ممتنع بالذات نہیں ہے بلکہ واجب بالغیر ہے ’’لثبوت صعود الملائکۃ ونزولھم‘‘ اس لئے بہ نسبت بشر کے ممتنع بالغیر ہوگا، بالنظر الی الامور الخارجیہ۔ مثل عدم استعداد درفطرت انسان وعدم صعود فردے از افراد بنی آدم قبل از مسیح علیہ السلام اور تمہید بالا سے محقق ہو چکا ہے کہ ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے۔ کیونکہ امکان ذاتی جامع ہوتا ہے۔ وجوب بالغیر اور امتناع بالغیر کو۔ اس لئے صعود البشر الی السمآ ممکن بالذات ہوا۔

دیگر یہ کہ صعود البشر الی السمآء محالات عادیہ میں سے ہوگا، نہ کہ عقلیہ میں سے اور محالات عادیہ کا ممکنات ذاتیہ میں سے ہونا ظاہر ہے ’’لِتَعَذُّرِ الْاِحَاطَۃِ بِقُدْرَۃِ الْحَقِّ سُبْحَانَہٗ‘‘ پس جب صعود البشر الی السمآء ممکن بالذات ٹھہرا اور یہ امر عند الخصم بھی مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے تو رفع مسیح علیہ السلام الی السمآء بہر دو طریق تحت قدرت باری عزّ اسمہ، ثابت ہوا۔ یعنی اس نظر سے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی فطرت میں بنفخ روح قدسی مادہ ملکیت پیدا کیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلکہ کل بنی آدم کی فطرت میں مادہ ملکیت یا ان کی مثل ملائکہ پیدا کر لینا داخل قدرت باری عزّ اسمہ ہے۔ کیونکہ جب الوف الوف ملائکہ کو پیدا کر لیا تو ان کی مثل پیدا کر لینے پر بھی قادر ہے۔

جیسا کہ ضمن ذکر مسیح علیہ السلام ہی میں فرمایا: ’’وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَلَائِکَۃً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (زخرف:۶۰)‘‘ اگر ہم چاہتے تو تم میں سے[1] فرشتے پیدا کرتے جو زمین میں آباد ہوتے۔

[1] ہم نے ’’لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَلَائِکَۃً‘‘ کا ترجمہ کیا ہے: ’’ہم (چاہتے تو) تم میں سے فرشتے پیدا کرتے۔‘‘ اس پر جناب اکمل صاحب (لکھنے نہ پڑھے نام محمد فاضل) فرماتے ہیں: ’’لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ‘‘ کے معنی تمام معتبر تفسیروں میں ’’بَدْلًا مِنْکُمْ‘‘ لکھے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ: ’’تم میں سے فرشتے پیدا ہونے لگ جائیں۔‘‘ جواب: خدا جانے اکمل صاحب بلا مطالعہ کتب وبلا استعداد اکمل کس طرح بن گئے۔ (اوّل) تو یہ کہ آپ تو میرے حوالہ جات تفسیری سے سخت شاکی ہیں اور اب تفاسیر ہی کا حوالہ پیش کرتے اور حقیقت میں طلب کرتے ہیں۔ دوم: یہ کہ لیجئے جناب عالیٰ! ان تفاسیر کے نام سنتے جائیں جن میں اس کے معنی ’’تم سے فرشتے پیدا کردیں یا کردیتے‘‘ لکھے ہیں۔ تفسیر کشاف جو بلحاظ عربیت کے سب سے اوّل نمبر پر ہے۔ اس میں بھی یہی معنی لکھے ہیں۔ دیگر یہ کہ امام زمخشری کے بعد امام رازی، قاضی بیضاوی، امام خطیب شربینی، نواب صدیق حسن صاحب اور مخدوم علی مہائی مفسرین نے بھی یہ معنی ذکر کئے ہیں۔ بلکہ حضرت نواب صاحب نے امام سمین سے اسی کو مشہور نقل کیا ہے۔ سنئے ابھی تسلی ہوئی یا نہیں۔ یہ عذر نہ کرنا کہ یہ کتابیں میں نے دیکھی نہ تھیں کیونکہ پھر اکملیت کی شیخی کرکری ہوجائے گی۔ (سعادت)

اوراس اعتبار سے بھی کہ افراد بنی آدم میں سے حضرت مسیح علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ بنانے کے لئے مخصوص کیا۔ جیسا کہ فرمایا: ’’وَلِنَجْعَلَهٗ اٰیَةً لِّلنَّاسِ (مریم:۲۱)‘‘ اور تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کا ایک نشان بنائیں۔

نیز فرمایا: ’’اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (زخرف:۵۹)‘‘ وہ تو ہمارا ایک بندہ ہی ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے (اپنی قدرت کا) نمونہ بنایا۔

اوراس نظر سے بھی کہ صعود الی السمآء ممکن بالذات ہے اور ہر ممکن بالذات تحت قدرت باری تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ باوجود قادر ہونے کے صرف مسیح علیہ السلام ہی کو کیوں مثل ملائکہ[۱] کے پیدا کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مختار ہے، قادر مجبور نہیں جیسا کہ آریوں کے خیال سے لازم آتا ہے اور فاعل مختار فعل کی کسی خاص صورت کو اختیار کرلے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ علیم کل اور حکیم مطلق بھی ہو۔

جیسا کہ فرمایا: ’’وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ (قصص:۶۸)‘‘ اور تیرا رب جو کچھ چاہے پیدا کرے اور جو کچھ چاہے پسند کرے۔ اس میں غیروں کا کوئی اختیار نہیں۔

[۱] اکمل صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مثل ملائکہ کہنے پر سخت ناراض ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور خوب گستاخی سے فرماتے ہیں: ’’پھر عیسیٰ علیہ السلام کس طرح فرشتے ہو سکتے ہیں جو عورت کے پیٹ میں حسب معمول نو ماہ خون حیض سے پرورش پاتے رہے۔‘‘ (ص۴۲) جواب: سنئے جناب! خفگی معاف کیجئے۔ میں اکیلا حضرت روح اللہ کو مثل ملائکہ نہیں کہتا۔ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان سے پہلے مخدوم علی مہائمی بھی میرے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب تو ’’تاویل الاحادیث‘‘ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حال میں فرماتے ہیں: ’’کان عیسٰی علیہ السلام کانه ملک یمشی علی وجه الارض (ص۵۹)‘‘ یعنی عیسیٰ علیہ السلام گویا ایک فرشتہ تھے جو روئے زمین پر چلتے پھرتے تھے۔

اور مخدوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر رحمانی میں فرماتے ہیں: ’’وکیف لا یکون ملکیة (وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ) ای من اشراطها ینزل بقربها والبشیر المحض لا یبقی الی هذه المدة (زخرف:۶۱)‘‘ یعنی عیسیٰ علیہ السلام میں ملکیت کس طرح نہ ہو، کیونکہ وہ تو قیامت کا ایک نشان ہیں کہ اس کے قریب نازل ہوں گے اور بشر محض اتنی مدت تک زندہ نہیں رہتا۔ (سعادت الاقران)

اور نیز فرمایا: ’’لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (انبیاء:۲۳)‘‘ جو کچھ خدا کرے اس کی بابت اس سے کوئی پرسش نہیں اور دیگر سب کو پرسش ہے۔

اور نیز: ’’اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد (ھود:۱۰۷)‘‘ بے شک تیرا رب کر لینے والا ہے اس امر کو جسے وہ چاہے۔

’’فلا اعتراض علیه فی تخصیص بعض دون بعض (میر)‘‘ پس اس کے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو مخصوص کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔

مرزا قادیانی نے اس مقام پر ایک اور غلطی کی ہے کہ اپنی کتاب (ازالہ اوہام) میں اس آیت: ’’وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا‘‘ کے ذیل میں عزیز کا ترجمہ عزت والا یعنی آبرو والا کیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی عزت والا ہے۔ مگر اس کی صفت عزیز سے مراد غلبہ وقدرت ہے[1]۔ چنانچہ علامہ فیومی رحمۃ اللہ علیہ مصباح میں فرماتے ہیں: ’’عز الہ جل عزّا بالکسر و عزازة بالفتح قوی و عز یعز من باب تعب لغة فهو عزیز و جمعه اعزة والاسم العزة وتعزز قوی وعززته باخر قویته بالثقیل والتخفیف من باب قتل. انتهٰی‘‘ مصباح کا سارا بیان قرآن شریف کے بالکل مطابق ہے۔ چنانچہ سورہ یاسین میں ہے: ’’فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (یٰس:۱۴)‘‘ اور سورہ فتح میں اسی معنی میں ’’اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (فتح:۲۹)‘‘ فرمایا اور مواضع متعددہ میں صفت عزیز کو صفت قوی کے ساتھ جمع کیا۔ مثلاً حج، احزاب، شوریٰ اور مجادلہ میں اس بیان سے واضح ولائح ہوگیا کہ اسم الٰہی عزیز کے معنی ’’اَلْغَالِبُ عَلٰی مَا یُرِیْدُ‘‘ ہیں۔

سوال کی دوسری دونوں شقوں کے جواب میں اللہ سبحانہٗ نے اپنی صفت ’’حکیما‘‘ فرمائی۔ کیونکہ جب فعل رفع اللہ عزیز حکیم کی طرف منسوب ہوا تو اگرچہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شرّ یہود سے محفوظ رکھ کر اسی سطح زمین پر زندہ رکھنے پر بھی قادر تھا۔ مگر بحکم ’’فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْا عَنِ الْحِکْمَةِ‘‘ ضرور ہے کہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہ ہو۔ کیونکہ صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت حکیم بھی ہے اور وہ ہر شئے کو اس کے مقام مناسب پر

[1] اکمل صاحب اس کا جواب دیتے ہیں کہ جب عزت کے معنی غلبہ ہیں تو مرزا قادیانی کی عبارت میں عزت کے معنی ’’آبرووالا‘‘ کیوں کئے جائیں۔ جواب: جناب اس لئے کہ اردو زبان میں عزت بمعنی غلبہ مستعمل نہیں ہے۔ اگر مرزا قادیانی کے خیال شریف میں عزت کے معنی غلبہ تھے تو وہ خطوط ہلالی میں ظاہر کر دیتے۔ فافهم!

رکھتا ہے اور ہر شخص سے اس کے مادۂ فطری کے موافق اور استعداد نفس ناطقہ[۱] کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ لہٰذا مقتضائے حکمت الٰہیہ یہی ہوا ہے کہ چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام کی پیدائش پر اسباب ارضیہ منعقد نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ کی پیدائش نفخ روح القدس سے عالم الامر میں سے۔ یعنی کلمہ ''کن'' سے ہوئی ہے۔ پس آپ کو کمال تشبّہ بالملائکہ ایک خاص طور پر حاصل ہے۔ لہٰذا آپ کو مرفوع الی السماء کر کے آسمان کو آپ کا مقرّ بنا دینا بمقابلہ آپ کے مادۂ فطری کے مقام تعجب وخلاف حکمت نہیں ہے۔ اسی تاثیر جبرائیلی[۲] سے معجزہ تکلم فی المهد

۱؎ اکمل قادیانی عبارت کو الٹا سمجھنے میں بہت کمال رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''اس عبارت سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت نبی کریم ﷺ کا مادہ فطرتی اور استعداد نفس ناطقہ ایسی نہ تھی ورنہ وہ بھی مقرّ ملائکہ یعنی آسمان پر مرفوع ہوتے۔'' (ص۴۳) جناب! آنحضرت ﷺ بھی آسمان پر مرفوع ہوئے۔ لیکن آپ اسے بھی نہیں مانتے۔ ''فَاَبٰی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا کُفُوْرًا (بنی اسرائیل:۹۹) ''شب معراج میں نبی کریم ﷺ اپنے جسم پاک سے آسمانوں پر لے جائے گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام سے بہت آگے گئے۔ جہاں پر رفیق راہ جبرئیل علیہ السلام بھی رہ گئے۔ شاید آپ نے بوستان تو پڑھی ہوگی۔ اس میں سعدی مرحوم فرماتے ہیں:

چناں گرم در تیہ قربت براند   کہ در سدرہ جبرئیل زد با زماند

دیگر یہ کہ شہادت القرآن کی اگلی سطروں میں آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خصوصیت میں الفاظ ''خاص طور پر'' کی طرف نظر نہیں کی۔ حالانکہ آپ اپنی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں: ''شہادت القرآن حصہ اوّل اس وقت میرے سامنے ہے۔'' (ص۲) ''حَفِظْتَ شَیْئًا وَغَابَتْ عَنْکَ اَشْیَاءُ''

اسی طرح ہم حضرت آدم علیہ السلام کے بھی آسمان پر رہنے کے قائل ہیں۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ قیامت کو لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جاکر شفاعت کے لئے التجا کریں گے تو آپ کی تعریف میں یہ بھی کہیں گے۔ ''واسکنک جنته (مشکوۃ) ''یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے بہشت میں بسایا اور معلوم ہے کہ جنت آسمان پر ہے بدلیل: ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (النجم:۱۴،۱۵) ''اور حدیث صحیح بخاری میں ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے۔

۲؎ اکمل صاحب کی استعداد ومطالعہ ناقص ہے۔ اس لئے وہ اس تاثیر کا بھی انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان امور خارقہ کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ لیجئے صاحب! شاید آپ اسے میری ایجاد جانیں، اس لئے میں اپنے سے بہت پیشتر کے دو بڑے بڑے بزرگوں کے کلام اگر اس پر بھی نہ سمجھے تو پھر تم سے خدا سمجھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم ''تاویل الاحادیث'' میں فرماتے ہیں: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ظاہر ہوا اور یہی تاثیر روح القدسی احیاء موتی اور دیگر معجزات کا باعث ہوئی۔ اسی لئے قرآن شریف میں خبر سعادت اثر ''وَاَیَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (بقرہ:۲۵۳)'' آپ ہی سے مخصوص ہے اور یہی تائید جبرائیلی صعود الی السمآء کے وقت آپ کے ہمرکاب تھی۔ جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا جو سابقاً گذر چکا۔

دوسری حکمت الٰہیہ حضرت روح اللہ کے زندہ رکھنے اور پھر دنیا میں نازل کرنے میں یہ ہے کہ نظر بر کمالات انبیاء علیہ السلام چار وصف ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا حصول بہ نسبت انبیاء اولی العزم علیہم السلام کے ضروری ہے۔ گوان میں سے کسی کی نسبت کوئی وصف بباعث عدم ضرورت ذکر قرآن شریف میں مذکور نہ ہو یا بسبب موانع وعوائق خارجیہ مثل عدم ضرورت ظہور بالفعل ظاہر نہ ہوا۔ مگر بالقوہ وہ سب ان صفات اربعہ سے متصف ہیں۔ اوّل مبشر بہ (بصیغہ اسم مفعول) اس اعتبار سے کہ اس پیغمبر کے ہونے کی بشارت پہلے دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت روح اللہ علیہ السلام کی نسبت علی لسان الملائکہ حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت دی گئی۔ ''یَا مَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ (اٰل عمران:۴۵)'' اے مریم خدا تجھ کو اپنے کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، بشارت دیتا ہے اور نیز ''وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ: (اٰل عمران:۴۹)'' اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف۔ پس حضرت مسیح علیہ السلام مبشّر بہ ہوئے۔

دوم مصدق، سوم مبشر ہر دو بصیغہ اسم فاعل مصدق اس نظر سے کہ وہ رسول اپنے سے پہلے رسولوں کی تصدیق کرتا ہے اور مبشر اس لحاظ سے کہ وہ رسول کسی دیگر رسول کے آنے کی بشارت سناتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ روح اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ اور محمد رسول اللہ حبیب اللہ علیہم السلام کی نسبت حکایۃً عن روح اللہ علیہ السلام سورہ وصف میں ذکر کیا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) ''فحصلت فی جبلته ملكة راسخة شبيهة بجبرئيل وهذا معنى تائيد الله له بروح القدس (ص ۵۹)'' یعنی حضرت جبرئیل کے نفخ کی وجہ سے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جبلت میں جبرئیل کے مشابہ پختہ ملکہ پیدا ہوگیا اور یہ ہیں معنی خداتعالیٰ کے آپ کی تائید روح القدس سے کرنے کے اور حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں: ''وما كان فيه من قوة الاحياء والابراء فمن جهة نفخ جبرئيل علیہ السلام (ص ۲۵۴)'' (مع شرح بالی افندی مطبوعہ مطبع عثمانیہ) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں مردوں کو کرنے اور بیماروں اور کوڑھیوں اور اندھوں کو چنگا کرنے کی قوت نفخ جبرئیل علیہ السلام کی جہت سے تھی۔ (سعادت الاقران)

’’وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرَاۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ (صف:۶)‘‘ تصدیق کرنے والا توریت کی جو میرے آگے ہے اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دونوں وصف یعنی مصدق ومبشر ہر دو بصیغہ اسم فاعل ثابت ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصدق ہونا (بصیغہ اسم مفعول) جو وصف چہارم ہے۔ کیونکہ تصدیق کتاب مستلزم ہے۔ تصدیق رسول کی اور آنحضرت سرور عالم ﷺ کا مبشر بہ ہونا اور وصف چہارم جناب رسالت مآب ﷺ کی نسبت سورہ صافات میں فرمایا: ’’بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ (صافات:۳۷)‘‘ بلکہ حق لے کر آیا ہے اور رسولوں کی تصدیق کرتا ہے۔

اس میں آپ ﷺ کا وصف مصدّق اسم فاعل مذکور ہوا اور چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام بھی زمرۂ مرسلین میں سے ہیں۔ اس لئے ان کی صفت مصدّق بصیغہ اسم مفعول ثابت ہوئی۔ پس اس سلسلہ میں حضرت روح اللہ علیہ السلام کے چاروں وصف ثابت ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے صرف دو یعنی مبشّر بہ بصیغہ اسم مفعول اور مصدّق بصیغہ اسم فاعل۔ آنحضرت ﷺ کے لئے بوجہ سیادت اور ختم رسالت ان اوصاف اربعہ کا ظہور بالفعل ضروری ہے۔ پس اگر آپ ﷺ کے اوصاف کی تکمیل بالفعل کے لئے کوئی نیا رسول پیدا کیا جاتا تو خاتم النّبیین کا شرف باقی نہیں رہتا اور بلحاظ مبشّر بصیغہ اسم فاعل اور مصدّق بصیغہ اسم مفعول کا ظہور نہیں ہوتا۔ جو شان سیادت کے شایان نہیں ہے۔ اس لئے اللہ حکیم کی حکمت بالغہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا جائے۔ جن کی آمد ثانی کی بشارت سے آپ کا لقب مبشّر بصیغہ اسم فاعل ظاہر ہوجائے اور حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آکر اس امر کی تصدیق کریں کہ محمد رسول اللہ ﷺ حق ہے، حق ہے اور آپ ﷺ کی صفت مصدّق بصیغہ اسم مفعول بالفعل ظاہر ہوجائے۔ پس اس طریق حکیمانہ سے ختم نبوت بھی قائم رہی۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام آپ ﷺ سے پہلے رسول بن چکے ہوئے ہیں اور اسی نبوت سے پھر آئیں گے اور نیز رسول اللہ ﷺ کے اوصاف اربعہ بھی پورے ہوگئے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام میں بتخریج طبرانی من حدیث عبداللہ بن مغفل مذکور ہے۔

’’یَنْزِلُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا بِمُحَمَّدٍ عَلٰی مِلَّتِہٖ (فتح الباری)‘‘حضرت عیسیٰ بن مریم، محمد ﷺ کی تصدیق کے لئے نازل ہوں گے اور آپ کی ملت پر ہوں گے۔[1]

اسی طرح تفسیر رحمانی میں اس آیت میں حکیماً کی تفسیر کے متعلق لکھا ہے: ’’وھی حفظہ لتقویۃ دین محمد ﷺ حین انتھائہ الٰی غایۃ الضعف لظھور الدّجال فیقتلہ (ص۱۷۳)‘‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع میں یہ حکمت ہے کہ خدا نے آپ کو دین محمدی ﷺ کی تقویت کے لئے محفوظ رکھا۔ جب کہ (دین محمدی) دجال کے ظہور سے بہت ہی ضعف میں ہو جائے گا تو آپ اس (دجّال) کو قتل کریں گے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو اس نعمۃ جزیلہ ومنحۃ جلیلہ کے لئے۔ اس واسطے مخصوص کیا گیا کہ آپ کی نسبت حضرت مریم صفیۃ اللہ کو آپ کی ولادت سے پیشتر ہی بشارت سنائی گئی تھی۔ ’’وَلِنَجْعَلَہٗ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ (مریم:۲۱)‘‘ تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنائیں۔

لٰہذا آپ اس انعام کے زیادہ مستحق ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ’’اَنَا اَوْلٰی النَّاسِ بِعِیْسٰی ابْنِ مَرْیَمَ (رواہ البخاری وغیرہ)‘‘ مجھے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ نسبت ہے۔[2]

الحمدللہ کہ اس کے فضل غیر متناہی اور حسن توفیق سے آیت: ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا (النساء:۱۵۸)‘‘ کی تفسیر معقولاً ومنقولاً پوری ہوئی اور بدلائل قاہرہ وقویہ وبراہین ظاہرہ وباہرہ وحجج قاطعہ ساطعہ وبیّنات غیر مرفوعہ حضرت مسیح علیہ السلام کا صعود الی السماء اور اب تک زندہ ہونا ثابت کر دیا گیا۔

اب مختصراً دیگر آیات ودلائل مثبتہ رفع وحیات آسمانی بیان کی جاتی ہیں اور ان میں سے جو مثبتہ نزول بھی ہیں۔ ان کا تفصیلی بیان رسالہ ’’نُزُوْلُ الْمَسِیْحِ مِنَ السَّمَآءِ[3]‘‘ میں

[1] حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ میں اس شرح میں جو حدیث لاؤں گا وہ صحیح ہوگی یا حسن (مقدمہ ص۴) مطبوعہ دہلی (سعادت)

[2] اس حدیث کی مزید توضیح وتشریح رسالہ ’’نزول المسیح من السماء‘‘ میں کی جائے گی۔ ان شاءاللہ! اور نیز مخالفین جو جو ایرادات ومناقضات عیسیٰ علیہ السلام کے نزول...... پر وارد کرتے ہیں ان کے مفصل جواب دیئے جائیں گے۔

[3] یہ رسالہ مدتوں سے لکھا پڑا ہے کثرت مشاغل کی وجہ سے نوبت چھپوانے کی نہیں آسکی۔ اللہ توفیق دے۔

کیا جائے گا۔ان شاء اللہ!

تیسری آیت: جس سے حضرت روح اللہ علیہ السلام کی حیات الی الآن اور نزول عیسیٰ فی آخرالزمان ثابت ہوتا ہے، یہ ہے:''وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا (نساء:۱۵۹)''اور نہیں ہوگا کوئی اہل کتاب میں سے مگر ایمان لے آئے گا اس پر اس کی موت سے پہلے اور وہ قیامت کے دن ان پر شاہد ہوگا۔

وجہ استدلال کی یہ ہے کہ''لیؤمننّ''میں لام قسم کا اور نون تاکید کا ہے اور متون وشروح کتب نحو میں مصرّح ہے کہ نون تاکید مضارع کو خالص استقبال کے لئے کر دیتا ہے اور ماضی اور حال کے لئے نون تاکید نہیں آتا۔اس مسئلہ میں کسی نحوی کو خلاف نہیں اور نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی ﷺ یا کلام عرب عرباء میں اس کے خلاف نون تاکید کا استعمال پایا گیا ہے۔

چنانچہ امام ابن ہشام نحوی''مغنی''میں تحریر کرتے ہیں:''وَاَمَّا الْمُضَارِعُ فَاِنْ کَانَ حَالًا لَمْ یُؤَکَّدْ بِھِمَا وَاِنْ کَانَ مُسْتَقْبَلًا اُکِّدَ بِھِمَا وُجُوْبًا فِیْ نَحْوِ تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ (مغنی ج ثانی ص ۲۲)''اگر مضارع حال کے معنی میں ہو تو ان ہر دو (نون خفیفہ وثقیلہ) سے اس کی تاکید نہیں کی جاتی اور اگر مستقبل کے معنی میں ہو تو اس (مستقبل) کی تاکید آیت:''تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ''کی مثل میں، یعنی جب فعل کے اوّل میں قسم کا کوئی حرف ہو، ان ہر دو (نون ثقیلہ یا خفیفہ) میں سے کسی کے ساتھ واجب ہوتی ہے۔

اسی طرح علامہ رضی شرح کافیہ میں فرماتے ہیں:''وَاَمَّا فِی الْمُسْتَقْبَلِ الَّذِیْ ھُوَ خَبْرٌ مَحْضٌ فَلَا یَدْخُلُ اِلَّا بَعْدَ اَنْ یَّدْخُلَ عَلٰی اَوَّلِ الْفِعْلِ مَا یَدُلُّ عَلَی التَّوْکِیْدِ اَیْضًا کَلَامِ الْقَسْمِ!''لیکن اس مستقبل میں جو محض خبری ہو نون تاکید (خفیفہ یا ثقیلہ) داخل نہیں ہوگا۔مگر اس صورت میں کہ فعل کے اوّل میں کوئی تاکید کا کلمہ بھی داخل ہو، مثلاً لام قسم۔

بعد اس تمہید کے واضح ہو کہ چونکہ آیت:مَا نَحْنُ فِیْھَا میں''لَیُؤْمِنَنَّ''مع لام قسم اور نون تاکید ثقیلہ کے ہے۔پس حسب تصریحات بالا یہ خاص استقبال کا صیغہ ہے۔اس لئے مراد الٰہی اس آیت مبارکہ سے یہ ہوئی کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔جس میں سب اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کے مرنے سے پہلے ضرور ایمان لے آئیں گے اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔

موافق محاورہ کتاب وسنت وقواعد نحو وکلام عرب عرباء اس آیت کے صحیح معنی یہی ہیں اور جتنے معنی اس کے سوا ہیں، وہ سب غلط اور باطل ہیں۔[1] پس چونکہ ابھی تک اتفاق اہل کتاب قاطبۃً (سب کے سب) عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے پر محقق نہیں ہوا۔ لہٰذا آپ ابھی تک فوت نہیں ہوئے۔ ’’وَهٰذَا هُوَ الْمُرَادُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى حُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ‘‘

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ’’عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتِلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْحَرْبَ وَيَفِيْضُ الْمَالَ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ وَاقْرَأُوْا اِنْ شِئْتُمْ ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا‘‘ (صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام)‘‘ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ البتہ عنقریب تم میں (حضرت) ابن مریم علیہ السلام، صاحب عدل وانصاف حاکم ہوکر اتریں گے۔ پس صلیب کو توڑیں گے اور خنزیروں کو قتل کروادیں گے اور لڑائی (بوجہ غلبہ اسلام) موقوف کردیں گے اور مال اس قدر کثرت سے ہوجائے گا کہ کوئی اس کو قبول نہ کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سجدہ ساری دنیا کے مال ومتاع سے بہتر ہوگا۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا‘‘

ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں اس حدیث کے ذیل میں اس آیت کا مفہوم یوں ادا کیا گیا ہے: ’’ای وان من اهل الكتاب احد الّا ليؤمنن بعيسىٰ قبل موت عيسىٰ وهم اهل الكتاب الذين يكونون فى زمانه فتكون الملة واحدة وهى ملة الاسلام وبهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير من طريق سعيد ابن جبير عنه باسناد صحيح (ارشاد السارى صحيح بخارى) ‘‘یعنی اہل کتاب میں سے کوئی بھی نہ ہوگا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے

[1] اس کی مفصل بحث ’’شہادت القرآن حصہ دوم‘‘ عالمانہ طریق پر نہایت تحقیق وتدقیق سے کی گئی ہے۔ طالب تفصیل اس کا مطالعہ کرے۔ (سعادت القرآن)

ایمان لے آئے گا اور وہ، وہ اہل کتاب ہوں گے جو ان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے زمانہ (نزول) میں ہوں گے۔ پس صرف ایک ہی ملّت اسلام ہوجائے گی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جو ابن جریر رضی اللہ عنہ نے ان سے سعید بن جبیر کے طریق سے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی۔

اس آیت کو اپنے ماقبل سے دو ارتباط ہیں۔ اوّل یہ کہ جب آیت: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' میں مسیح علیہ السلام کا صعود الی السمآء مذکور ہوا تو سامع کے دل میں ایک سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان سے کبھی نازل بھی ہوں گے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے بطور استیناف بیانی (جواب سوال مقدر) فرمادیا کہ زمانہ[۱] اخیر میں آپ نزول فرما ہوں گے اور ان کے نزول کے وقت یہ ہوگا کہ اہل کتاب بالاتفاق[۲] آپ پر ایمان لے آئیں گے[۳]۔ دوم: یہ کہ

۱؎ اکمل صاحب قادیانی نے اپنی بے کمالی کی وجہ سے اس مقام پر ایک سوال کیا ہے کہ یہ کس آیت کا ترجمہ ہے۔ (ص۴۴) جناب والا! فہم سخن نصیب اعداء۔ صحیحین کی احادیث نزول اور سلسلہ کلام کو ملحوظ رکھ کر مراد الٰہی سمجھائی گئی ہے۔ اسی لئے ''استیناف بیانی'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ جسے آپ غالباً نہیں جانتے۔ (سعادت)

۲؎ اکمل صاحب دریافت کرتے ہیں کہ: ''سب اہل کتاب کس طرح ایمان لائیں گے جب کہ جنگ میں تقریباً سب کے سب ہلاک ہوچکیں گے۔'' جواب: سب اہل کتاب کا جنگ میں ہلاک ہونا کسی آیت یا حدیث میں وارد نہیں ہوا۔ ہاں سوائے ملت اسلام کے باقی سب ملتوں کی ہلاکت کا ذکر حدیث ابی داؤد میں آیا ہے۔ سو ملت کی ہلاکت دیگر امر ہے اور اہل ملت کی ہلاکت دیگر۔ دیکھئے! آنحضرت ﷺ کے وقت کچھ کفار جنگوں میں مارے گئے اور باقی سب اسلام لے آئے۔ پس حجاز سے کفر مٹ گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر ہوگا۔ فافہم (سعادت)

۳؎ اکمل صاحب فرماتے ہیں کہ سب اہل کتاب کا ایمان لے آنا آیت: ''وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدة:۶۴) '' کے برخلاف ہے۔ (۴۴) جواب: ''سخن شناس نہ اکملا خطاایں جاست'' جناب من! ایمان اور عداوت میں منافاۃ نہیں ہے کہ دونوں یکجا جمع نہ ہوسکیں، نہ سمجھ سکیں تو قادیانی اور لاہوری پارٹی کے حالات سے سمجھ لیں۔ دیگر یہ کہ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ سے مراد قرب یوم القیامۃ ہے۔ کیونکہ فنائے عالم کے بہت عرصہ بعد قیامت ہوگی۔ پس جب کوئی آدمی ہی نہ زندہ نہ ہوگا تو دشمنی کس میں ہوگی؟ پس لامحالہ اس سے قرب یوم القیامۃ مراد لینی پڑے گی اور جب قرب یوم القیامۃ مراد ہوئی تو اس سے مراد زمانہ نزول عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں وارد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر بغض اور عداوتیں جاتی رہیں گی۔ پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ یہودیوں میں آپس میں اور عیسائیوں میں آپس میں بغض رہیں گے۔ جب تک وہ یہودیت ونصرانیت پر رہیں گے اور وہ اس حالت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول تک رہیں گے۔ جب وہ نازل ہوں گے تو یہ سب ان پر ایمان لاکر مسلمان ہوجائیں گے۔ پس ان میں عداوتیں بھی نہ رہیں گی۔ کیونکہ اس وقت وہ یہودی اور عیسائی نہ ہوں گے گویا یہ قضیہ مشروط ہے۔ فافم! (سعادت)

چونکہ اس مضمون کا شروع ’’یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ‘‘ سے ہے اور اس میں اہل کتاب یہود کا سرور کائنات ﷺ کی جناب میں اقتراحاً یہ سوال پیش کرنا مذکور ہے کہ ہم آپ پر تب ایمان لائیں گے۔ جب آپ ہم پر آسمان سے کتاب نازل کر دکھلائیں۔

جیسا کہ (سورہ بنی اسرائیل آیت:۹۳) میں بھی مذکور ہے: ’’وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتَابًا نَقْرَءُ ہٗ‘‘ یعنی (یہ کفار کہتے ہیں کہ) ہم تیرے (آسمان پر) چڑھنے ہی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ جب تک تو ہم پر کوئی کتاب نہ اتارے، جسے ہم خود پڑھ لیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اس سوال کے دو جواب تعلیم فرمائے۔ اوّل یہ ظاہر کیا کہ ایسے ایسے مقترحات کا پیش کرنا ان کی موروثی اور جدّی عادت ہے۔ چنانچہ انہوں نے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے کے آپ سے اس سے بھی بھاری سوال کیا۔ یعنی کہا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ ظاہر اُدکھا اور انہوں نے فلاں شرارت کی اور وہ فلاں فعل قبیح اور خلق شنیع کے مرتکب ہوئے۔ اسی سلسلۂ ذکر شناعات یہود میں ان کا یہ قول بھی ذکر کیا کہ وہ فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا۔ حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر چڑھایا۔ لیکن اس شخص کو سولی پر چڑھا کر قتل کیا۔ جس پر حضرت مسیح علیہ السلام کی شکل وشباہت ڈالی گئی تھی۔ ’’اِلٰی قَوْلِہٖ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا‘‘ پس اس ذکر کے ضمن میں اوّل تو آیت مانحن فیہا میں اس طور پر تقریع وتبکیت یہود پائی گئی کہ جس رسول کی نسبت یہود فخر سے بے باکانہ یہ اخبار بے سروپا اور افواہ بے بنیاد اڑا رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہود اس نبی برحق روح اللہ علیہ السلام کے سامنے سخت پست اور ذلیل ہو کر ایمان لائیں گے۔[1]

[1] ہر چند کہ ہم نے بال کی کھال اتار کر نہایت وضاحت سے ان آیات کا ربط مضمون سابق سے بیان کر دیا اور تائید کے لئے تفسیر رحمانی کا حوالہ بھی دے دیا جو ربط آیات میں لاثانی ہے۔ لیکن ہمارے اکمل صاحب اس پر بھی راضی نہ ہو کر لکھتے ہیں۔ ’’سوال تو یہ ہے کہ آسمان سے کوئی کتاب نازل ہو اور جواب یہ کہ مسیح علیہ السلام اتر کر تمہاری خوب خبر لے گا۔ پھر وہ بھی ان کی نہیں، کیونکہ وہ تو مر چکے ہوں گے۔ بلکہ ان کی اولاد کی کسی آخری پشت کی۔‘‘ جواب: جناب! شاید ہمارے الفاظ تقریع وتبکیت پر آپ کی نظر نہیں پڑی۔ جناب من! قرآن شریف میں اس کی نظائر بکثرت ہیں، سیالکوٹ میں آ کر ہم سے تفسیر جلالین پڑھیں، ہم آپ کو اس طریق جواب کی تصریح دکھا دیں گے۔ ہاں! یہ خوب کہا کہ ان کی اولاد کو ڈرا دیا گیا۔ ہاں جناب! یہ بھی قرآن میں بکثرت ہے ’’یٰبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا‘‘ والے رکوع یہاں آ کر پڑھیں۔ افسوس آپ نے مولوی نورالدین صاحب کو یہ بات نہ سمجھائی اور نہ وہ مرزا قادیانی کی پشت سے کسی لڑکے کا نکاح محمدی بیگم کے بطن سے کسی لڑکی کے ساتھ تجویز نہ کرتے۔

چنانچہ تفسیر رحمانی میں اسی آیت کے متعلق لکھا ہے: ’’ثم اشار الیٰ ان من کان یفتخر بقتلہ سیتذلل لہ قبل موتہ (رحمانی ص ۱۷۲) ‘‘ پھر خدا تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر فخر کرتے ہیں۔ وہ عنقریب اس کی موت سے پہلے اس کے تابع ہو کر اس کے سامنے عاجز و ذلیل ہوں گے۔

ثانیاً: اس طور پر کہ جو کتاب ہم اپنے حبیب ﷺ پر بواسطۂ رسول امین یعنی جبرئیل علیہ السلام نازل کر رہے ہیں۔ وہ اسی طریق پر نازل ہوتی رہے گی۔ یہود کے اقتراح بے جا پر اس طریق تنزیل کو بدل نہیں دیں گے۔ ہاں! ہم زمانہ اخیر میں مسیح ابن مریم علیہ السلام کو ان کو سرکوبی اور تذلیل کے لئے پھر نازل کریں گے۔ یہ تو جواب اوّل کی تقریر ختم ہوئی۔ حاصل یہ کہ یہود کے ایسے ناشائستہ و بے جا مقترحات سے دل تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ان کی عادت متوارثہ ہے۔

جواب ثانی یہ تعلیم فرمایا: ’’اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِہٖ (نساء:۱۶۳) ‘‘ بے شک ہم نے تیری طرف ٹھیک اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح علیہ السلام کی طرف اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف کی تھی۔

یہ طریق جواب احسن الخطابات میں سے ہے۔ واللہ الموفق والملہم!

وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃَ

چوتھی آیت: جس سے حضرت روح اللہ علیہ السلام کی رفع اور نزول اور حیات الی الآن ہر سہ امور ثابت ہیں آیت: ’’وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ (زخرف:۶۱) ‘‘ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام[۱] کا (نزول[۲]) علامات قیامت[۳] میں سے ہے۔

۱،۲،۳ جناب اکمل صاحب نے ہمارے اس ترجمہ پر کمال علمی یا بے کمالی کی بنا پر چند سوالات کئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ کیوں جناب (۱) آیہ عیسیٰ (ہٗ) (ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے) اور پھر (۲) اس کا نزول کہاں سے نکالا اور پھر (۳) ’’علم‘‘ یعنی علامات کون سی لغات میں دیکھا اور (۴) ساعت کے معنی عذاب کی گھڑی بھی موافق محاورہ قرآن مجید ہوسکتے ہیں، یقیناً ’’قیامت‘‘ کیونکر ہوئے؟ (ص۴۴،۴۵)

جوابات: اس آیت سے پیشتر اور بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر صریح الفاظ میں موجود ہے۔ دیکھئے: ’’وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا (اِلٰی قَوْلِہٖ) وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ (الزخرف:۵۷تا۶۳) ‘‘ ’’گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ‘‘ اور قابل لحاظ وہ اختلاف ہوتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سنن ابن ماجہ میں موقوفاً اور مسند امام احمد میں مرفوعاً مروی ہے کہ: ''عن عبداللہ بن مسعود قال لمّا کان لیلۃ اسری برسول اللہ ﷺ لقی ابراہیم و موسیٰ وعیسیٰ فتذاکروا الساعۃ نبدؤا بابراہیم فسألوہ عنہا فلم یکن عندہ منہا علم ثم سألوا موسیٰ فلم یکن عندہ منہا علم فرد الحدیث الٰی عیسیٰ بن مریم فقال قد عہد الیّ فیما دون وجبتہا فاما وجبتہا فلا یعلمہا الّا اللہ فذکر خروج الدّجال قال فانزل فاقتلہٗ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جو ناشی از دلیل ہو اور اس میں فیصلہ کی قوی دلیل نہ ہو۔ ورنہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ وجود باری تعالیٰ اور نبوت محمد ﷺ سے بھی اس بناپر انکار نہ کردیں کہ ان میں بھی اختلاف ہے۔ محققین نے اس ضمیر کے مرجع کی نسبت صاف فیصلہ کر دیا ہے کہ سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے سب مرجع ضعیف اور بعید ہیں۔ کیونکہ سابقاً ولاحقاً انہی کا ذکر ہے اور نزول حدیث ابن مسعود سے لیا ہے۔ آپ علم حدیث سے ناواقف ہیں اس لئے آپ نے سوال کر دیا اور یہاں علم یعنی علامت لسان العرب میں مرقوم ہے۔

دیکھئے ہر سہ امور بالا کی نسبت علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں: ''وفی التنزیل فی صفۃ عیسیٰ صلوٰت اللہ علیٰ نبینا وعلیہ وانہ لعلم للساعۃ وہ قرأۃ اکثر القراء وقرء بعضہم وانہ لعلم للساعۃ المعنی ان ظہور عیسیٰ ونزولہ الی الارض علامۃ تدل علی اقتراب الساعۃ (لسان العرب ج۱۵ ص۳۱۴)''

اسی طرح تفسیر کبیر میں مسطور ہے: ''وان عیسیٰ لعلم للساعۃ ای شرط من اشراطہا تعلم بہ فسمی الشرط الدال علی الشی علما لحصول العلم بہ وقرء ابن عباس لعلم وہو العلامۃ''

اور ایک دوسری حدیث میں جو حضرت حذیفہؓ سے تفسیر ابن جریر میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو آیات قیامت میں گنایا ہے۔ ہاں! آپ نے یہ خوب کہا کہ ''چونکہ ساعۃ بمعنی عذاب کی گھڑی بھی قرآن مجید میں وارد ہے، اس لئے اس کے معنی یقیناً قیامت نہیں لے سکتے۔'' جناب والا! جب مرزا قادیانی آنجہانی نے اس مقام کی نسبت ساعۃ کے معنی میں یہ حجت نکالی تھی تو ہمیں اس وقت سوجھا تھا کہ یہ انکار قیامت کی پیش بندی ہے۔ کیونکہ جب قاعدہ یہ ٹھہرا کہ جس لفظ مفرد سے چند ایک معنی مراد لئے جائیں تو کوئی معنی بھی کسی مقام پر بھی یقینی نہیں ہوسکتا تو جہاں جہاں پر قیامت مراد ہوگی۔ وہاں وہاں پر آپ کہہ سکیں گے کہ چونکہ ساعۃ کے معنی عذاب کی گھڑی بھی ہیں۔ اس لئے یقیناً قیامت کیونکر ہوئے؟ العیاذ باللہ جب ایمان کمزور ہوجاتا ہے تو حجت باز طبیعت کوئی نہ کوئی وجہ تراش لیتی ہے۔ (سعادت)

(الحدیث) واللفظ لابن ماجة (ص ۳۰۹ باب فتنه الدجال وخروج عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) ’’جس رات رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی (اس رات) آپ حضرات ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام سے ملے[1] تو قیامت کے متعلق تذکرہ ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سوال شروع ہوا تو ان کو قیامت کا کوئی علم نہ تھا (کہ کب ہوگی) پھر موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا، تو ان کو بھی اس کا کوئی علم نہ تھا۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نوبت آئی تو آپ نے کہا کہ مجھ سے قیامت کے نزدیک کا عہد کیا ہوا ہے۔ پس آپ نے دجّال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔ (الحدیث بطولہ)

اس آیت کی تفسیر میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا قرب قیامت کی علامت ہونا۔ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابو مالک رضی اللہ عنہ، عوف، مجاہد، قتادہ، سدی، ضحاک اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ (ابن جریر) چنانچہ ضحاک کے الفاظ یہ ہیں: ’’خروج عیسیٰ بن مریم ونزوله من السمآء قبل یوم القیامة‘‘ (ابن جریر سورہ زخرف) یعنی قیامت سے پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔

جب اس آیت اور حدیث سے پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ثابت ہوگیا تو چونکہ نزول مستلزم صعود ہے۔ ’’اذ لا یمکن ولا یتصور نزول البشر من السمآء الا بعد صعوده الیها‘‘ یعنی کیونکہ کسی بشر کا آسمان سے نازل ہونا ممکن ومتصور نہیں۔ مگر بعد اس کے کہ وہ اس سے پیشتر آسمان پر چڑھا ہو۔ اس لئے یہ آیت مثبت صعود (رفع) بھی ہے اور چونکہ زمان ماقبل النزول میں حیات بھی ضروری ہے۔ اس لئے یہ آیت مثبت حیات بھی ہے۔

[1] مرزا قادیانی نے ازالہ اوہام میں کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دیگر انبیاء کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ملاقات کی۔ پس جس طرح دیگر انبیاء فوت ہوکر آسمان پر ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اس کا مفصل جواب شہادت القرآن حصہ دوم میں دے دیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ملاقات کی تین صورتیں ہیں، دونوں طرف سے جسمانی، دونوں طرف سے روحانی، ایک طرف سے روحانی، دوسری طرف سے جسمانی۔ جیسا کہ حدیث صحیح بخاری وصحیح مسلم میں ہے کہ دو قبروں میں آپ نے عذاب ہوتے دیکھا۔ اس وقت صحابہ کے ساتھ آپ ﷺ کی ملاقات ہر دو جانب سے جسمانی تھی اور مردوں کے ساتھ آپ ﷺ کی طرف سے جسمانی اور ان کی طرف عالم برزخ کی۔ اسی طرح شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آپ ﷺ کی ملاقات ہر دو جانب سے جسمانی تھی اور دیگر انبیاء سے آپ ﷺ کی طرف سے جسمانی اور ان کی طرف سے عالم برزخی۔

پانچویں آیت: ومن المقربین جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السمآ ثابت ہے۔ آیۃ ’’وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (آل عمران:۴۵)‘‘ ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ صفت مقرب قرآن شریف میں تین موقع پر وارد ہے۔ اوّل اسی آیت میں مسیح علیہ السلام کی شان میں۔ دوم فرشتوں کے لئے، آخر سورہ نساء میں ذکر رفع مسیح علیہ السلام کے تھوڑا آگے فرمایا: ’’لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِلّٰہِ وَلَا الْمَلٰئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ (نساء:۱۷۲)‘‘ نہ تو مسیح خدا کا بندہ بننے کو عار سمجھتا ہے اور نہ ملائکہ مقربین۔

سوم: جنتیوں کے لئے سورہ واقعہ میں فرمایا: ’’اُوْلٰئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (واقعہ:۱۱،۱۲)‘‘ نعمت کے باغوں میں وہی مقرب ہوں گے۔

ان ہر سہ مقامات پر قرب جسمی، حسّی، سماویؔ ملحوظ ہے نہ فقط رتبی۔

ؔ اکمل صاحب قادیانی اس پر فرماتے ہیں: ’’قرب جسمی، حسی، سماوی کہاں سے نکالا‘‘ جواب: جناب والا! فرشتے اپنے اجسام سے آسمان پر ہیں اور جنتی بھی اپنے اجسام سے جنت میں ہوں گے اور جنت آسمان پر ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے جسم سے آسمان پر ہیں۔ آپ اپنے دماغ سے اکملیت کا دھواں نکال دیں تو یہ باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔ دیگر یہ کہ آپ نے شہادت القرآن کی عبارت ہی نہیں سمجھی۔ وہاں تو صاف لکھا ہے: ’’قرب جسمی، حسی، سماوی ملحوظ ہے، نہ فقط رتبی۔‘‘ لیکن جناب نے اس لفظ ’’ملحوظ‘‘ کا لحاظ بالکل نہیں کیا اور نہ الفاظ ’’فقط رتبی‘‘ کا خیال کیا۔ پھر یہ کہ تفہیم ناقصین کے لئے اس کے بعد معنی کنائی اور معنی حقیقی کا باہم جمع ہوسکنا بھی ذکر کردیا گیا ہے۔ ورنہ محصلین جن کی نظر حمد اللہ وغیرہ معقولی کتب پر ہو ان کے لئے الفاظ ’’ملحوظ ہے، نہ فقط رتبی‘‘ ہی کافی تھے۔ (سعادت)

اکمل صاحب نے ایک اور کمال دکھایا کہ قرب سماوی پر ایک اعتراضی حاشیہ بھی جڑ دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ’’اس سے مکانی ہونا اللہ کا لازم آتا ہے۔‘‘ (حاشیہ نمبراص۴۵) جناب من! آپ نہ تو قرآن جانیں، نہ حدیث، نہ فطرت اللہ کو سمجھ سکیں اور دعویٰ اکملیت کا کردیں تو اس شعر کے مصداق بنیں گے:

آنکس کہ نداند وبداند کہ بداند ‖ در جہل مرکب ابدالدہر بماند

سنئے! مکانی ہونا تو لازم آئے۔ جب اسے محصور ومحاط مانا جائے اور اگر حد واحاطہ کے تصور کے بغیر فوق العرش اس کیفیت سے مانا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے تو اس سے مکانی ہونا لازم نہیں آتا۔ ورنہ معاذ اللہ! تمام سلف صالحین کو مثبت مکان ماننا پڑے گا۔ کسی حافظ قرآن سے پوچھئے کہ آیت: ’’ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ (الملک:۱۶)‘‘ کہاں سے ہے اور کسی حدیث دان سے دریافت کیجئے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

’’وَلَوْ اَرَدْنَا بِہٖ لَازِمَ مَعْنَاهُ فَلَا یَضُرُّنَا لِاَنَّ الْمَعْنٰی الْحَقِیْقِیَ لِلَّفْظِ یَجْتَمِعُ مَعَهٗ لَازِمُ مَعْنَاهُ وَھٰذَا الرَّسْمُ ھُوَالْمُصْطَلَحُ عِنْدَ عُلَمَاءِ الْبَیَانِ بِالْکِنَایَةِ کَمَا ھُوَ مُصَرَّحٌ فِیْ کُتُبِ الْبَلَاغَةِ وَقَدْ مَرَّ ذٰلِکَ اٰنِفًا فَلَا فَائِدَةَ فِی الْاِعَادَةِ‘‘ اور اگر ہم اس (قرب) سے لازمی معنی بھی مراد لیں تو بھی ہمیں مضر نہیں۔ کیونکہ لازمی معنی حقیقی معنوں کے ساتھ جمع ہو سکتے اور اس رسم کا نام علمائے بیان کی اصطلاح میں کنایہ ہے۔ جیسا کہ کتب بلاغت میں مصرح ہے اور اس کا حوالہ ابھی گزر چکا ہے۔ پس مکرر ذکر کرنے میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کو جو بکلمہ تبعیض ’’مِنَ الْمُقَرَّبِیْن‘‘ فرمایا تو مراد ان مقربین سے ملائکہ مقربین ہیں جو آیت سورہ نساء میں بالتنصیص مذکور ہیں۔ چنانچہ وہ آیت ان شاء اللہ!

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) کہ وہ حدیث جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لونڈی سے پوچھا تھا: ’’اَیْنَ اللّٰہُ‘‘ یعنی خدا کہاں ہے؟ تو اس نے کہا تھا ’’فِی السَّمَآءِ‘‘ یعنی آسمان میں، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا۔ ’’اِنَّھَا مُؤْمِنَةٌ‘‘ یعنی بے شک یہ لونڈی ایمان دار ہے اور کسی باہوش دعا گو سے سوال کیجئے کہ دعا کے وقت تمہاری توجہ اور خیال کدھر کو ہوتا ہے اور ساتھ ہی کسی قرآن دان سے معلوم کر لیں کہ آنحضرت ﷺ تحویل قبلہ کی آرزو میں آسمان کی طرف کیوں دیکھتے رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْھِکَ فِی السَّمَآءِ (البقرۃ:۱۴۴)‘‘ اس کے بعد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت ذیل پڑھیں تو آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ خدا تعالیٰ کو اوپر ماننا علم جبلی وفطری ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں: ’’ان ھذا الامر فطروا علیه وجبلوا علیه کما قال الشیخ ابو جعفر الھمدانی لبعض من اخذ ینکر الاستواء ویقول لو استوی علی العرش لقامت به الحوادث فقال ابو جعفر معناہ ان الاستواء علم بالسمع ولو لم یردہ به لم نعرفه وانت تناوله فدعنا من ھذا واخبرنا عن ھذہ الضرورۃ التی نجدھا فی قلوبنا فانه ما قال عارف قط یا اللہ الا وقیل ان ینطق لسانه یجد فی قلبه معنی یطلب العلم یلتفت یمنة ویسرۃ فھل عندک من حیلة فی دفع ھذہ الضرورۃ عن قلوبنا فلطم المتکلم وقال حیّر الھمدانی‘‘

اور اس سے تھوڑا آگے فرماتے ہیں: ’’وایضاً فمن المعلوم ان القرآن ینطق بالعلوا فی مواضع کثیرۃ جدا حتی قد قبل انھا ثلثمائة موضع والسنن متواترۃ عن النّبی ﷺ بمثل ذلک وکلام السلف المنقول عنھم بالتواتر یقتضی اتفاقھم علٰی ذلک (منھاج السنة ج اوّل ص۲۶۳)‘‘

ابھی مذکور ہوگی اور یہ بات مسلّم ہے کہ فرشتوں کا مقرّ طبعی آسمان ہے۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ایک فرد[1] ہوئے تو آپ کا صعود ثابت ہوگیا۔ تفاسیر معتبرہ مثل: (۱) تفسیر کبیر، (۲) ابی السعود، (۳) مدارک، (۴) خازن، (۵) بیضاوی، (۶) سراج منیر، (۷) کشاف اور (۸) فیضی۔ ان سب تفاسیر میں اس آیت کے ذیل میں ''رَفَعَ اِلَی السَّمَآء'' کو ذکر کیا ہے۔

چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے: ''وَکَوْنُہٗ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ رَفْعٌ اِلَی السَّمَآءِ وَصُحْبَتُہٗ لِلْمَلَائِکَۃِ'' مقربین میں سے ہونے کے معنی ہیں۔ آپ کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور فرشتوں کے ساتھ رہنا۔

اور تفسیر سواطع الالہام میں ہے: ''لِصُعُوْدِہٖ مَصَاعِدَ السَّمَآءِ وَاِدْرَاکِہٖ مَدَارِکَ الْمَلَکِ'' کیونکہ آپ آسمان پر اٹھائے گئے اور آپ فرشتوں کے مقام پر پہنچے۔

<u>چھٹی آیت:</u> جو مثبت رفع روح اللہ ہے: ''لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِلّٰہِ وَلَا الْمَلٰئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ (نساء:۱۷۲)'' نہ تو مسیح علیہ السلام خدا کا بندہ ہونے کو عار جانتا ہے اور نہ ملائکہ مقربین۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ مناط (مدار) شرک نصاریٰ تین امر ہیں اور انہیں کے سبب نصاریٰ کو وہم الوہیت مسیح علیہ السلام پیدا ہوا۔ اوّل: ولادت مسیح علیہ السلام بلا پدر۔ دوم: ظہور معجزات عجیبہ۔ سوم: رفع الی السمآء اور ظاہر ہے کہ یہ ہر سہ امور یا تو صحیح ہیں یا نہیں۔ اگر صحیح نہیں تو قرآن شریف میں: ''جِسْمًا لِمَادَّۃِ شِرْکِ النَّصَارٰی[2]'' ان سب کا ابطال وتردید چاہئے[3]

[1] مطلب یہ کہ فرشتوں کا مسکن طبعی آسمان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان پر ہونے کی وجہ سے اس سکونت میں سکّان آسمان یعنی جماعت ملائکہ کے ایک فرد ہیں۔ جناب اکمل صاحب اسے سمجھ نہیں سکتے تو اعتراض جانے بیٹھ گئے کہ سب رسول بشر تھے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرشتے کس طرح ہوگئے۔ ''لا حول ولا قوۃ الا باللہ''

[2] نصاریٰ کے شرک کے مادہ کو نابود کرنے کے لئے۔ (عبدالقیوم میر)

[3] مطلب بالکل صاف ہے کہ اگر یہ تینوں امر نفس الامر میں خدا کے نزدیک غلط تھے تو چاہئے تھا کہ خداتعالیٰ صاف فرمادیتا کہ یہ امر غلط ہیں، افتراء ہیں۔ لیکن خداتعالیٰ نے بجائے ابطال وتردید کے ان کو ثابت کر دکھایا اور نصاریٰ کی تردید اس طرح کہ یہ باتیں مثبت الوہیت نہیں ہوسکتیں۔ اکمل صاحب ''شہادۃ القرآن'' کے ایسے صاف بیان کو بھی نہیں سمجھ سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ''رفع جسمانی مسیح علیہ السلام کا تو ضرور ابطال ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہی سب سے بڑا بھاری ثبوت ہے۔ نصاریٰ کے پاس الوہیت مسیح علیہ السلام کا۔ (ص۴۶) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اگر صحیح ہیں تو پھر یہ ثابت کرنا چاہئے کہ یہ امور مقتضی الوہیّت نہیں ہوسکتے۔ ناقد ممارس کتاب اللہ پر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو باطل نہیں کہا۔ بلکہ ان کو ثابت رکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ امور مقتضی الوہیّت نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ وجہ اوّل یعنی بلا پدر کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے توڑا اور فرمایا: ''اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ کُنْ فَیَکُوْنُ (آل عمران: ۵۹) ''عیسیٰ علیہ السلام کی مثال تو خدا کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے کہ اسے خدا نے مٹی سے بنایا تو پھر اسے کہا کہ ہوجا تو وہ ہوگیا۔

اور یہ ''من باب تمثیل الغریب بالاغرب'' ہے۔

وجہ دوم: یعنی ظہور خوارق کی نسبت فرمایا: ''مَاالْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (مائدہ: ۷۵) ''مسیح علیہ السلام تو صرف ایک رسول ہیں۔ اس سے پیشتر کئی رسول ہوچکے ہیں۔

اس میں ظاہر کیا کہ ظہور خوارق دیگر انبیاء کے ہاتھ پر بھی ہوا ہے۔ اس لئے یہ وجہ بھی مثبت لاہوتیت نہیں ہوسکتی۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے آپ کے عصا کا سانپ بن جانا، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتی سے اعجب ہے۔ کیونکہ میت وہ چیز ہے جو کسی وقت زندہ ہو اور پھر اس سے حیات منتزع ہو اور لکڑی ایسی چیز ہے، جس کی شان میں حیات نہیں ہے۔

وجہ سوم: یعنی ارفع الی السماء کو آیت: ''لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ'' سے توڑا اور ظاہر کیا کہ ملائکہ مقربین اور حاملین عرش رفع آسمانی میں حضرت روح اللہ علیہ السلام سے ارفع ہیں۔ پس یہ وجہ بھی مقتضی لاہوتیت نہیں ہوسکتی۔

بادنیٰ تامل ظاہر ہوسکتا ہے کہ اس پچھلی آیت میں ان ہرسہ وجوہ کا جواب ہے۔ کیونکہ ملائکہ کی پیدائش بھی بغیر اسباب کے محض کلمۂ کن سے ہے اور اظہار خوارق میں بھی وہ بشر سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں اور رفع سماوی میں بھی اکثر ان میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ بلند ہیں۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کا رفع مع دیگر خوارق کے اسی ایک آیت سے بھی ثابت ہے۔ اس آیت کے ذیل میں رفع عیسیٰ علیہ السلام کو ذکر کرنے میں بندہ منفرد نہیں ہے۔ بلکہ علامہ ابوالسعود

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) جناب من! قرآن نے رفع جسمانی کا ابطال نہیں کیا بلکہ نصاریٰ نے جو اسے وجہ الوہیت بنایا تھا، اس کا ابطال ''وَلَا الْمَلٰئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء: ۱۷۲) '' سے کیا جیسا کہ اگلی سطروں میں مفصل ومدلل مذکور ہے۔ فافہم! (سعادت)

ابوالسعود تفسیر ’’ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم ‘‘میں یہی لکھتے ہیں۔

ملاحظہ ہو عبارت ذیل: ’’ان مناط کفر النصاریٰ ورفعھم لہ علیہ السلام عن رتبۃ العبودیۃ کما کان اختصاصہ علیہ السلام وامتیازہ عن سائر البشر بالولادۃ من غیر اب وبالعلم بالمغیبات وبالرفع علی السمآء عطف علٰی عدم استنکافہ عن عبودیتہٖ تعالٰی عدم استنکاف من ھو اعلٰی درجۃ منہ فیما ذکر فان الملائکۃ مخلوقون من غیر اب وامّ وعالمون بما لا یعلمہ البشر من المغیبات ومقارّھم السمٰوٰت العلٰی (ابی السعود زیر آیت لن یستنکف الخ) ‘‘نصاریٰ کے کفر اوران کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رتبہ عبودیت سے برتر جاننے کا مناط ومدار اس وجہ سے ہے کہ آپ بلا باپ پیدا ہونے اور (خدا کے جتانے سے بعض) مغیبات کے جاننے اور آسمان پر چڑھائے جانے میں دیگر بشروں سے ممتاز ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس بات پر کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبودیت سے عار نہیں۔ ان لوگوں (فرشتوں) کے عدم استنکاف کو عطف کیا جو ان امور مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اعلیٰ وارفع ہیں۔ کیونکہ فرشتے بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا شدہ ہیں اور وہ (خدا تعالیٰ کے جتانے سے) ان مغیبات کو بھی جانتے ہیں، جو انسان کے علم میں نہیں ہیں اور بلند ان کے رہنے کی جگہ ہے۔

ساتویں آیت: مثبت حیات روح اللہ علیہ السلام یہ ہے: ’’وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (اٰل عمران:۴۶)‘‘ اور کلام کرے گا لوگوں سے گہوارے میں اور کہولت (کی عمر) میں بھی اور صالحین میں سے ہوگا۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو ’’تکلم فی المھد‘‘ اور ’’تکلم فی الکھولۃ‘‘ کی بخشش سے نوازنا ذکر کیا اور یہ دونوں اعجازی امر ہیں۔ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیات تذکیر انعامات[۱] سے واضح ہے: ’’اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ

[۱] اکمل صاحب یوں کمال نمائی کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے) معمولی احسان تو یاد کرادیئے اور اصلی نعمت جو اس سے پہلے کسی نبی کو نہ دی گئی، وہ نہ جتائی۔ (ص۴۷) جواب: جناب والا! ’’وکھلا‘‘ میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے: ’’الفقیہ تکفیۃ الاشارۃ‘‘ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ نعمت (آسمان پر اٹھالینا) گزری ہوئی ہے۔ اس لئے وہ تو اسی اشارہ سے سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ لیکن قادیانی اصحاب کچھ بھی نہیں سمجھیں گے۔ ’’والسفیہ لا تفیدہ العبارۃ‘‘ کیونکہ وہ انکار کے درپے ہیں۔ ’’فَمَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا کَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ (اعراف:۱۰۱)‘‘ مگر یہ لوگ (ایسی سرشت ہی کے) نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے ہوں معجزے دیکھ کر اس پر ایمان لے آئیں۔

اَلْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا (مائدہ:۱۱۰) ’’(اے عیسیٰ) (وہ وقت یاد کر) جب میں نے تیری تائید روح القدس (جبرئیل فرشتے) سے کی کہ تو نے لوگوں سے اپنے گہوارے میں بھی اور کہولت (کی عمر) میں بھی کلام کیا۔

’’تُکَلِّمُ فِی الْمَھْد ‘‘یعنی گہوارے کی باتیں سورہ مریم میں مذکور ہیں۔ جب یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت میں شک کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحکم خدا اپنی ماں کی گود سے بول اٹھے۔

’’اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ اٰتَانِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (مریم:۳۰)‘‘میں خدا کا بندہ ہوں، خدا نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔

پس جس طرح ’’تُکَلِّمُ فِی الْمَھْد ‘‘امر اعجازی اور خلاف عادت ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ’’تُکَلِّمُ فِی الْکُھُوْلَۃ[۱] ‘‘ بھی امر خارق عادت ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر کوئی امر عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کہولت کی عمر میں سب بولنے والے کلام کیا کرتے ہیں۔

[۱] اکمل قادیانی بات نہ سمجھنے اور خواہ بات بنے نہ بنے۔ پھر بھی جواب میں کچھ نہ کچھ کہہ ڈالنے میں بہت کامل ہیں۔ چنانچہ ’’تکلم فی الکھولۃ‘‘ کی نسبت فرماتے ہیں اور ’’تکلم النّاس ‘‘ سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعمر کہولت بھی لوگوں سے کلام کرتے رہے ہوں اور آپ (خاکسار محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) کے اعتقاد کے موافق تو ان پر کہولت کا زمانہ آسمان پر آیا ہے۔ وہاں کون سے انسانوں کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔‘‘(ص۴۷) جواب: ہاں جناب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تکلم فی الکھولۃ ‘‘کو تو بلا ریب وشک مانتے ہیں اور اسی امر کا یہاں بیان ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ دائماً پایا جائے کہ اب ان کے آسمان پر ہونے کے وقت کرنے کے لئے وہاں کئی ایک انسان بک کرا کر بھیجنے پڑیں۔ کیونکہ یہ قضیہ مطلقہ ہے اور اطلاق میں اعتبار لا دوام کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ جملہ کتب منطق میں مرقوم ہے اور فعلیۃ نسبت سے ضرورۃ نسبت کا دوام نسبۃ لازم نہیں آتا۔ بلکہ ثبوت کیے لئے اس کا وجود بالفعل وفی الجملہ احداز منہ ثلاثہ میں کافی ہوتا ہے۔ (قطبی، سلم، حمد اللہ) جس طرح کہ تکلم فی المھد میں دوام نہیں تھا، اسی طرح تکلم فی الکھولۃ میں بھی دوام ضروری نہیں۔ پس جب زمانہ نزول میں اس کیفیت سے جو متن میں مذکور ہے۔ اس کا تحقق ووقوع ہو جائے گا تو پھر اس کے صدق میں کیا کلام؟ سچ سمجھئے کہ قادیانیوں کے سامنے ایسی باتیں بیان کرنا ’’بھینس کے آگے بین بجانا ہے‘‘ لیجئے! تفسیر ابن جریر میں ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ’’قال قد کلمھم عیسیٰ فی المھد وسیکلمھم اذا قتل الدّجال وھو یومئذ کھل‘‘ (ج۳ص۱۵۹)

اور تفسیر معالم میں ہے: ’’قال الحسین بن الفضل (وکھلاً) بعد نزولہ من السمآء (ص۱۵۹)‘‘ دیکھئے! اب تو معقولاً ومنقولاً بہر دو طریق مطلع صاف ہو گیا برائے عذاب تو ضد چھوڑ دیئے اور آنکھیں کھولئے۔ ’’اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ‘‘ اے اللہ! تو ہمیں حق کو حق دکھادے اور اس کی پیروی کی توفیق عطاء کر۔ (سعادت الاقران) (عبدالقیوم میر)

پس اس معجزہ عیسویہ کی صورت یہ ہے کہ رفع آسمانی کے بعد ایک زمانۂ دراز تک بغیر خوراک معتاد کے زندہ رہنا اور اسی حالت میں بغیر کسی قسم کے تغیّر واستحالہ (حالت کے بدلنے) کے نازل ہونا امر خارق عادت ہے۔ ورنہ تخصیص مسیح علیہ السلام کی کوئی وجہ نہیں۔ توضیح اس کی یوں ہے کہ آسمان پر ہونے کے اور فرشتوں کی صحبت میں ہونے کے ذکر وعبادت ہے۔ چنانچہ تفسیر رحمانی کی یہ عبارت سابقاً گزر چکی ہے۔ ’’(انی متوفیک) ای اٰخذ بکلیتک (و) لا ادع لک شھوۃ طعام ولا شراب فتحتاج الٰی مساکنۃ الارض لانی (رافعک الیّ) ای الٰی سمائی (اٰل عمران)‘‘ اور زمانہ رفع ونزول کے درمیان خواہ کتنی ہی مدت مدیدہ وہ آسمان پر رہیں، ان کے جسم میں کوئی بھی تغیّر واستحالہ نہیں ہوگا۔ بلکہ جس حالت میں وہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ اسی[۱] حالت پر نزول فرمائیں گے۔

۱؎ اکمل صاحب قادیانی مذاق علمی سے نہایت کورے ہیں، بہت لمبی عبارت میں جو بے ضرورت مکرر سہ کرر ذکر کر کے لمبی کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں: ’’مسیح کی فطرت جن حوائج کی مقتضی تھی، جب اس سے بوجہ رفع علی السماء کے بے نیازی ہوگئی تو یہ مستلزم صمدیت والوہیت ٹھہری۔ اس سے نصاریٰ ثبوت دے سکتے ہیں کہ ان کی فطرت میں ہی الوہیت تھی۔‘‘ (ص۴۷) جواب: بندہ خدا کبھی تو علم کی بات کیا کرو۔ آپ الفاظ ’’مسیح کی فطرت‘‘ قلم سے تو لکھتے جاتے ہیں۔ لیکن دماغ سے نہیں سمجھتے کہ کہتے کیا ہیں؟ سنئے جناب! فطرت مصدر ہے اور یہاں مسیح علیہ السلام کی طرف مضاف ہونے سے مصدر مجہول ہے۔ پس اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ’’مسیح علیہ السلام جس حالت پر مفطور رہوئے‘‘ پس آپ ہی کے الفاظ سے ثابت ہوگیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صمد نہیں ہیں۔ کیونکہ صمد وہ ہے جو اپنے وجود وبقا میں کسی کا محتاج نہ ہو اور دیگر سب اس کے محتاج ہوں۔ ملاحظہ ہو عبارت ذیل آیت: ’’اَللّٰہُ الصَّمَد‘‘ کے ذیل میں:

(۱) ’’ثم (بیّن) صمدیۃ المقتضیۃ لاستغنائہ الذاتی عمّا سواہ وافتقار جمیع المخلوقات الیہ فی وجودھما وبقائھما وسائر احوالھا‘‘ یعنی پھر صاف صاف بیان کی اپنی بے نیازی جو اپنے ماسوا سے اپنے ذاتی استغناء اور تمام مخلوقات کے اپنے وجود اور اپنی بقا کے لئے اور تمام احوال میں اس کی طرف محتاج ہونے کی مقتضی ہے۔ (عبدالقیوم میر) دیگر یہ کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب آسمان پر بحکم خداتعالیٰ بعض حوائج بشریہ (کھانا پینا) سے بے نیاز ہیں تو اس سے بھی خدا نہیں بن سکتے۔ کیونکہ موجب الوہیت وہ بے نیازی ہے جو ذاتی ہو اور جو خدا کی عطا سے ہو وہ موجب الوہیت نہیں، جیسے کہ معجزات جو حقیقت میں خدا کے افعال ہیں۔ لیکن خدا کے حکم سے نبی برحق کے ہاتھ پر ان کا ظہور ہوتا ہے۔ دیگر یہ کہ ’’کانا یاکلان‘‘ میں لفظ ماضی ذکر کیا، جس میں اس امر پر دلالت ہوسکتی ہے کہ زمان گزشتہ میں وہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ لیکن اب نہیں کھاتے۔ پس کھانے سے استغنا تو قرآن شریف سے ثابت ہوا۔ آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔ (مزید توضیح حصہ دوم میں دیکھئے۔ (سعادت)

کیونکہ آسمان محل تاثر واستحالہ نہیں۔ جیسے جنتیوں کے اجسام میں باوجود مدّت ہائے دراز در دراز کے کوئی تغیرّ واستحالہ نہیں ہوگا۔ فافہم!

آٹھویں آیت: مثبت حیات ورفع نزول حضرت روح اللہ علیہ السلام یہ ہے:

’’وَکُنْتُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْہِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ (مائدہ:۱۱۷)‘‘ اور میں ان پر شاہد رہا جب تک میں ان میں (موجود) رہا۔ پس جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر شئے پر شاہد ہے۔

آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ اور ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ کی تفسیر میں سابقاً امور مندرجہ بہ بسط محقق ہو چکے ہیں۔

اوّل: یہ کہ توفی کا مدلول (معنی) وضعی موت نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں ’’اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا‘‘ یعنی کسی چیز کو بتمامہ لے لینا۔

دوم: یہ کہ چونکہ اس اخذ وقبض کے انواع متعدد ہیں، اس لئے تعیین یک نوع کے لئے وجود قرینہ ضروری ہے۔

سوم: یہ کہ آیت: ’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ اور ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ رفع الی السمآء کے لئے نصوص قطعیہ ہیں۔ کیونکہ رفع الی اللہ اور رفع الی السمآء متساوق فی المعنی ہیں۔ جیسا کہ آیت: ’’اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (فاطر:۱۰)‘‘ اچھی اچھی باتیں اسی کی جناب تک پہنچتی ہیں اور (وہی) نیک عمل (کرنے والوں کے درجوں) کو بلند کرتا ہے (عبدالقیوم میر) سے ثابت ہو چکا ہے اور جناب مرزا قادیانی نے ازالہ اوہام میں ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ کی توضیح کے ضمن میں الیہ سے الی السمآء مراد لی ہے۔ پس آیات ’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘ اور ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ مسیح علیہ السلام کی توفی سے رفع آسمانی مراد لینے کے لئے قرائن قویّہ ہیں۔ لہٰذا نظر بر آیات مثبتہ رفع ’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ سے مراد ’’فَلَمَّا رَفَعْتَنِیْ اِلَی السَّمَآءِ‘‘ ہوگی نہ کچھ اور۔

جملہ تفاسیر معتبرہ مبسوطہ وجیزہ میں ’’تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ سے مراد ’’رَفَعْتَنِیْ‘‘ لکھا ہے، سالک شاہراہ یقین کے لئے اس بیان میں کفایت ہے۔ مگر متعسّف کجرو پر اتمام حجّت کے لئے

مزید توضیح حصہ دوم میں کی جائے گی۔[۱] ان شاء اللہ تعالیٰ!

مرزا قادیانی کا یہ مذہب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے معاذ اللہ! اہانت صلیب برداشت کرنے کے بعد جو وجاہت کے منافی ہے، کشمیر کی طرف ہجرت کی اور وہاں ستاسی سال زندہ رہ کر فوت ہوگئے۔ یہ سراسر باطل اور دروغ بے فروغ ہے۔ کیونکہ کلمہ ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ'' سوال الٰہی ''ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' کے جواب میں واقع ہے۔ پس اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اہل کشمیر نے الٰہ نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ اہل شام اور اس کے قرب وجوار کے اشخاص نے۔

پس اہل شام جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنایا تھا۔ ان کی خبر بموجب قول مرزا قادیانی[۲] حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بوجہ ہجرت الی الکشمیر آپ کی وفات سے ستاسی سال پیشتر منقطع ہوچکی ہے اور اس ستاسی سال کی حیات مزعومہ مرزا قادیانی میں عیسیٰ علیہ السلام کو اہل شام

۱؎ اکمل صاحب غلط گوئی میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ'' کی تحقیق کو کسی اگلے حصے پر ٹالا ہے۔ (ص۴۷) جواب: بندہ خدا کبھی تو درست لکھا کرو۔ تحقیق تو ساری پوری کر کے یہاں اس کا خلاصہ بھی کر دیا گیا کہ کم علم لوگوں کو پچھلا پڑھا ہوا یاد آجائے، اگلے حصے پر تو صرف مزید توضیح چھوڑی گئی تھی نہ کہ تحقیق۔ دیگر یہ کہ دوسرا حصہ بھی آپ کی تصنیف سے کئی سال پیشتر قادیان میں پہنچ چکا تھا، ذرا تکلیف اٹھا کر اسے بھی مطالعہ فرمایا ہوتا اور دیکھا ہوتا کہ اس میں کیا مزید توضیح کی گئی ہے۔ پھر دونوں حصوں کی توضیح کا مقابلہ کر کے نظر کی ہوتی کہ پہلے حصے میں امر مقصود (رفع عیسوی) کے متعلق کیا کسر باقی چھوڑ دی گئی ہے۔ اکمل صاحب کی یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ عجب ناز وادا سے لکھتے ہیں: ''کسی اگلے حصے پر'' جناب! یہ ''کسی'' تنکیر کا کلمہ کیسا؟ جناب مرزا قادیانی آنجہانی کی وفات سے پیشتر ڈھائی سال اور آپ (اکمل صاحب) کی تصنیف سے سوا تین سال پیشتر دوسرا حصہ قادیان میں پہنچ چکا تھا اور ملک میں شائع ہوچکا تھا۔ اس پر بھی آپ کلمہ تنکیر ''کسی'' فرما رہے ہیں۔ گویا کہ آپ کو اس کا نہ علم ہے نہ علم کی ضرورت ہے۔

دیگر یہ کہ لکھتے ہیں: ''ٹالا ہے'' جناب! جس کے پاس قرآن وحدیث صحیح اور قواعد زبان عرب ہوں وہ ٹالے کیوں؟ ٹالے تو وہ جسے ان ہر سہ سے واسطہ نہ ہو یا ان کا علم نہ ہو۔ (سعادت)

۲؎ عدم اطلاع کا عذر مرزا قادیانی کے قول کے مطابق ذکر کیا گیا۔ چنانچہ (شہادت القرآن حصہ دوم ص۱۳،۱۴ طبع دوم) پر بھی بنا بر عدم اطلاع کا عذر ذکر کیا گیا، ورنہ ہماری تحقیق میں اس سے مراد اظہار برأت ہے۔ چنانچہ (شہادت القرآن حصہ دوم ص۲۹ طبع ثانی) پر اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔ (سعادت)

کے تغیر عقائد کی کوئی خبر نہیں کہ پیچھے انہوں نے کیا بنالیا۔ پس سوال ''ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' کے جواب میں عذر موت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ عذر خروج الی الکشمیر چاہئے[۱]۔ جب بدیں صورت ایک پیغمبر برحق تعلیم کردہ حضرت حق جلّ وعلا کے جواب میں قدر وواقع ہوتی ہے تو بالضرور معلوم ہوا کہ یہاں توفی سے مراد موت نہیں ہے اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرفوع الی السمآء ہوکر اقوال نصاریٰ سے بے خبر ہوجانا جواب باصواب[۲] ہے اور یہ ثابت بھی ہوچکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی بالرفع الی السمآ ہوئی ہے تو اس لئے ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' کے معنی ''رَفَعْتَنِیْ اِلَی السَّمَآءِ'' ہیں نہ کچھ اور۔ چنانچہ تفسیر سواطع الالہام میں ہے ''(فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ) اَرَادَ اِعْلَائَہٗ مَصَاعِدَ السَّمَآءِ'' خداتعالیٰ نے اس سے آسمان کی بلندیوں پر اٹھالینا مراد رکھا ہے۔

اور تفسیر کبیر اور خازن میں ہے ''(فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ)'' یعنی ''فَلَمَّا رَفَعْتَنِیْ اِلَی السَّمَآءِ'' یعنی جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھالیا، اسی طرح دیگر تفاسیر میں بھی ہے۔

۱؎ اکمل صاحب قادیانی فرماتے ہیں: ''یہ نہیں بتایا کہ عذر موت کن وجوہات سے باطل ہے۔'' (ص۴۸) جواب: جناب! بتا تو دیا۔ لیکن:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب راچہ گناہ

۲؎ اکمل صاحب قادیانی سوال کرتے ہیں کہ: ''وہ جب دنیا میں آئیں گے تو یہ لاعلمی کیسی؟'' (ص۴۸) جواب: اکمل صاحب نے اس سوال میں کوئی کمال نہیں دکھایا۔ یہ سوال تو میں نے (حصہ دوم ص۱۲) پر ازخود کر کے اس کا کافی ووافی جواب دے دیا ہے۔ جو اکمل صاحب کی تصنیف سے سوا تین سال پیشتر قادیان میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن اکمل صاحب اس سے غشوہ نمائی کریں تو کسی کا کیا قصور؟ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نصاریٰ وغیرہ کے اقوال وافعال پر مطلع ہونے کے دو موقع ہیں۔ اوّل: آسمان پر اٹھائے جانے سے پیشتر یعنی تبلیغ رسالت کے وقت۔ دوم: آسمان سے نازل ہونے کے بعد اور یہ مسلّم ہے کہ نصاریٰ کے اعتقاد ان دونوں زمان کے درمیان یعنی زمانہ رفع میں بگڑے۔ سوآپ کا قول ''وَکُنْتُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْہِمْ (المائدۃ:۱۱۷)'' ان دونوں زمانوں پر شامل ہے۔ چنانچہ آیت نزول میں فرمایا: ''وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا (نساء:۱۵۹)'' ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ (المائدۃ:۱۱۷)'' سے زمانہ مرفوعیت مراد ہے۔ جو دونوں زمانوں کے درمیان ہے ''جَمْعًا بَیْنَ الْاَدِلَّۃِ'' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مراد اس سے اظہار برأت ہے۔ چنانچہ (شہادت القرآن حصہ دوم ص۲۹) پر تصریح کردی گئی ہے۔ (سعادت)

نویں آیت مثبت رفع الی السمآء ''وَجَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ (مریم: ۳۱)'' اور خدا نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے جہاں کہیں میں ہوں۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ برکت خیر کثیر اور علو کو کہتے ہیں۔ جیسے آیت: ''لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اعراف: ۹۶)'' میں برکت سے مراد خیر کثیر اور زیادت نعمت ہے اور آیت صفات مثل ''فَتَبَارَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (اعراف: ۵۴)'' اور ''فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (مومنون: ۱۴)'' اور ''تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ (ملک: ۱)'' اور ''تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (فرقان: ۱)'' اور ''اَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ[1] (نمل: ۸)'' میں مراد علو ہے اور واضح ہو کہ حضرت روح اللہ علیہ السلام میں یہ ہر دو امر باحسن وجہ پائے جاتے ہیں۔ (۱) خیر کثیر، مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے اور نزول مائدہ کی دعا کے قبول ہونے سے ظاہر[2] ہے۔ (قرآن مجید)

[1] اس آخری آیت میں اگر ''من'' سے مراد ذات حق سبحانہ ہو جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے تو برکت سے مراد علو ہوگا اور اگر موسیٰ یا ملائکہ ہوں تو دوسرے معنی یعنی خیر کثیر مراد ہیں۔ اکمل صاحب اس پر کہتے ہیں کہ: ''بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ'' کے آگے ''وَمَنْ حَوْلَهَا'' بھی آیا ہے۔ مدارک میں لکھا ہے: ''وَمَنْ حَوْلَ مَکَانِهَا اَیْ مُوْسٰی'' تو کیا موسیٰ بھی آسمان پر چڑھے تھے۔ (ص۴۸) جواب: موسیٰ علیہ السلام تو آسمان پر نہیں چڑھے، لیکن آپ سمجھ نہیں سکے۔ اگلی سطروں میں صاف لکھا ہے کہ معنی ثانی یعنی علو ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' میں مصرح ہے۔

[2] اکمل قادیانی مذاق علمی خصوصاً علم معقول سے کامل طور پر بے بہرہ ہیں۔ ان معجزات پر فرماتے ہیں۔ اگر خیر کثیر سے مراد کوڑھیوں کا ہی چنگا کرنا ہے تو آسمان پر کون سے مردوں کو زندہ کر رہے اور کون سے اندھوں کو آنکھیں دے رہے ہیں۔ (ص۴۸) جواب: بندۂ خدا قضیۂ مطلقہ میں اعتبار لا دوام کا ہوتا ہے جیسا کہ حواشی سابقہ میں گزر چکا اور اس کا ثبوت بالفعل وفی الجملہ احداز منہ ثلثہ میں کافی ہوتا ہے۔ نبی صادق عیسیٰ علیہ السلام تبلیغ رسالت کے وقت دلیل صداقت میں یہ امر واقعات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اصدق القائلین اپنے کلام میں سے نقل کرتا ہے اور قیامت کے دن بھی واقعات گزشتہ کی صورت میں بطور امتنان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جتائے گا۔ پس اس کے ثبوت میں کیا شک رہا؟ لیکن چونکہ مرزا قادیانی ان معجزات کے قائل نہیں تھے، وہ انہیں مسمریزم اور عمل التراب جانتے تھے۔ (ازالہ اوہام ج اوّل ص ۳۱۲، خزائن ج ۳ ص ۲۵۹) اس لئے آپ ان کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ ''وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیْلِ (البقرة: ۱۰۸)''

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور وہ برکات وخیرات جو آپ کے نزول پر ہوں گی مثلاً دشمنی اور بغض اور حسد کا دور ہو ہو جانا اور مال کا کثرت سے ہو جانا اور لوگوں میں دنیا کی نسبت عاقبت کی طرف رغبت کا زیادہ ہونا اور پھلوں اور دودھ کا معمول سے بہت زیادہ ہو جانا اور شیر اور بکری کا امن سے باہم چرنا وغیرہ ذلک[۱] (صحیح مسلم ودیگر کتب حدیث)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اور سنئے جناب مرزا قادیانی نے بھی ان معجزات عیسویہ سے بناء بر علم وتحقیق انکار نہیں کیا۔ بلکہ ایک مشکل سے بچنے کے لئے حیلہ نکالا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی سرخی اس مضمون کی باندھتے ہیں کہ مسیح بن مریم علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کیا، کوڑھیوں کو چنگا کیا، اس کے مقابلہ میں مثیل مسیح نے کیا کیا؟ (شروع ازالہ اوہام ملخصاً)

پھر اس کے ضمن میں ان معجزات کا انکار کیا ہے۔ پس مرزا قادیانی کا یہ انکار اس شعر کا مصداق ہے:

زاہد نداشت تاب وصال پری رخاں　　　کنجے گرفت وخوف خدا را بہانہ ساخت

ہاں یہ بھی سن لیجئے! کہ جناب مرزا قادیانی ان معجزات کی نسبت یہ رائے بھی رکھتے تھے ”اگر میں ان عملیات کو مکروہ وقابل نفرت نہ سمجھتا تو ان اعجوبہ نمائیوں میں مسیح بن مریم علیہ السلام سے کم نہ رہتا (ازالہ ملخصاً) پھر بھلا آپ ان معجزات کی حقیقت پر کس طرح ایمان رکھ سکتے ہیں:

ما مریداں رو بسوئے کعبہ چون آریم چوں　　　رو بسوئے خانہ خمار دارد پیر ما

[۱] گستاخی وبے ادبی کی روح خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں شوخی وسوء ادبی کی روح تمام مرزائیوں کا مایۂ حیات ہے۔ چنانچہ اکمل صاحب نہایت شوخی سے لکھتے ہیں ”وَجَعَلَنِیْ مُبَارَکًا“ میں آسمان کا رفع کس طرح ثابت ہو۔ جب کہ آپ ہی کے ہم خیالوں کی طرف سے آواز آرہی ہے۔ آپ عمر بھر میں نصاب کے مالک نہیں ہوئے۔ پس دنیاوی برکات کا حصہ مال واولاد کے سوا اور کیا ہے اور یہاں تو اولاد تو درکنار خیر سے آپ کی عورت ہی کوئی نہ تھی، نہ صاحب نصاب، نہ رہنے کو مکان۔“ (ص۴۸)

جواب: (۱) جناب! عقل کے پیچھے لٹھ لے کر کیوں پڑے ہیں۔ بھلا رفع آسمان کے انکار سے ان امور کا کیا تعلق؟ (۲) جناب والا! ہمارے ہم خیال یہ امور اس طریق پر بیان نہیں کرتے۔ یہ طریق قادیانیوں ہی کو مبارک ہو: ”از خدا خواہیم توفیق ادب، بے ادب محروم ماند از فضل رب“ اور جو اس طریق پر بیان کرے وہ ہمارا ہم خیال نہیں ہے۔ (۳) نبی صادق کے مناسب حال تقلیل یا ترک لذائذ اور زہد ودرویشی ہے۔ اکمل صاحب کو زہد ودرویشی منجملہ معائب ونقائص کے نظر آئے ہیں۔ کیونکہ ان کے نبی ورسول قادیان کے ہاں لذائذ کا استعمال بکثرت تھا۔ لیکن اہل اللہ کے لئے زہد ودرویشی صرف مناسب حال ہی نہیں بلکہ ان کو ان سے اکتساب فضائل میں بہت مدد ملتی ہے اور سلوک الی اللہ میں سہولتیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ماسوی اللہ کے شغل سے چھوٹے رہتے ہیں۔ ”فَتَفَکَّرْ فَاِنَّہٗ لَطِیْفٌ جِدًّا“ (بقیہ اگلے پر)

اور معنی علو آیت: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ'' میں مصرح ہے۔ وہ بھی آپ کو حاصل ہے۔ پس ''جَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ'' احوال ثلثہ یعنی قبل رفع اور زمان رفع (عہد مرفوعیت) اور بعد نزول ہرسہ سے ؁ حاکی ہے۔ اسی لئے ''اَیْنَمَا کُنْتُ'' فرمایا جس کا مفاد اتساع ہے۔ فافہم وتدبّر!

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) پس اگر یہ اسباب دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھے تو اس میں آپ کی منقبت ہے نہ کہ منقصت (۴) اہل اللہ اور انبیاء اللہ کے مبارک ہونے کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ خود ان کے پاس حطام دنیوی کے انبار لگے رہیں، بلکہ ان کی برکت کا اثر لوگوں پر پڑتا ہے اور بعض تفاسیر سے جو آپ نے مبارک کے معنی ''نَفَّاعًا لِلْخَیْرِ'' نقل کئے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہیں۔ لیکن آپ اس کو سمجھتے نہیں۔ حدیث میں ہے ''خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ (مشکوٰۃ)'' (۵) نصاب کے مالک تو آنحضرت ﷺ بھی نہیں ہوئے۔ اب سنایئے! کیا ارشاد ہے فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہی طعن کیا تھا کہ وہ مالدار نہیں ''فَلَوْلَا اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (زخرف:۵۳)'' اور آنحضرت ﷺ پر بھی مکہ کے مشرکوں نے یہی اعتراض کیا تھا (زخرف، فرقان، بنی اسرائیل، ہود) یہی حال چال قادیانیوں کی ہے۔ ''اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (الذاریات:۵۳)'' (سعادت الاقران)

؁ اکمل صاحب بھی سمجھ میں خوب کامل ہیں جو سمجھانے سے بھی نہ سمجھے، وہ اکمل کیوں بنے؟ آپ فرماتے ہیں: ''یہ لفظ برکت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاص نہیں، دیکھو حضرت اسحٰق اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے لئے ''وَبَارَکْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰی اِسْحٰقَ'' یعنی دونوں نبی مبارک تھے۔ کیا یہ بھی آسمان پر اٹھائے گئے تھے؟ پھر فرماتے ہیں حضرت! یہ لفظ تو اکثر مقامات کے بارے میں بھی آیا ہے: ''اَلْاَرْضُ الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا...... الخ! (الانبیاء:۸۱)''

جواب: ہاں حضرت! لفظ برکت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاص نہیں بلکہ ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' تو ان سے خاص ہے۔ آپ (شہادت القرآن) کے اس مقام کو مطلقاً نہیں سمجھے۔ جناب! میں نے تو بالتصریح لکھ دیا تھا کہ ''معنی ثانی یعنی علو آیت ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' میں مصرح ہے۔'' اس پر بھی آپ نہ سمجھیں تو کوئی کیا کرے، علمی بات کریں تو اور اگر بالتصریح کھول کر بیان کریں تو آپ کچھ سمجھتے تو ہیں نہیں۔ پھر آپ کو سمجھائیں کس طرح؟ اچھا ایک دفعہ اور کوشش کرتے ہیں۔ شاید آپ سمجھ جائیں۔ سنئے! (شہادت القرآن) کے اس مقام کا حل یوں ہے کہ برکت کے دو معنی ہیں۔ (۱) خیر کثیر اور (۲) علو۔ یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھیں۔ خیر کثیر کی تفصیل میں قرآن وحدیث میں فلاں فلاں امور مذکور ہیں اور علو کا ذکر آیت: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' میں ہے گویا یہ سب مقامات قرآنیہ وحدیثیہ آیت: ''جَعَلَنِیْ مُبَارَکًا'' کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ پس اس کی تفسیر قرآن وحدیث میں مذکور ہے، اس کے رو سے مراد لی گئی اور چونکہ یہ سب باتیں تین حالات میں پوری ہوئی ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت کے ذیل میں رفع الی السمآء کی تصریح تفسیر کبیر اور تفسیر سراج منیر میں موجود ہے۔[1]

دلیل کی دوسری قسم مثبتہ حیات مسیح علیہ السلام

دوسری قسم دلیل کی جس سے ہر سہ امور یعنی (۱) صعود الی السمآء (۲) اور حیات الی الآن (۳) اور نزول فی آخرالزمان ثابت ہیں۔ احادیث مرفوعہ، صحیحہ، صریحہ ہیں جو بموجب آیات مندرجہ ذیل واجب القبول ہیں:

۱...... ’’وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (شوری:۵۱)‘‘ اور کوئی بشر اس لائق نہیں کہ خدا اس سے (بالمشافہ) ہم کلام ہو۔ مگر وحی کے طور پر (ہم کلام ہوتا ہے) یا از پس پردہ یا وہ کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے جو کچھ کہ وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ بے شک وہ (اللہ) بڑا عالی ذات اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں نبی برحق کے پاس فرشتے اور آواز غیبی کے سوا بھی وحی (پیغام الٰہی) پہنچنے کا ذکر ہے جو الہام قلبی کی صورت میں ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی امر جو اسے بتانا منظور ہو نبی برحق کے دل پر القا کر دیتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اور ان کے مواقع مختلف ہیں۔ اس لئے ’’اَیْنَمَا کُنْتُ‘‘ جو مفید اقساع ہے فرمایا گیا۔ اب سنائیے، اب بھی سمجھے یا نہیں؟ اگر اس پر بھی نہ تم سمجھے تو پھر تم سے خدا سمجھے اور چونکہ حضرت ابراہیم اور اسحق علیہما السلام کے لئے قرآن وحدیث میں علو کی یہ صورت مذکور نہیں۔ اس لئے ان کی برکت کی بھی یہ صورت نہیں ہوگی۔ فافهم وتدبر لعلک ترشد۔ (سعادت القرآن)

[1] ہمارے اکمل صاحب جس طرح بات کے نہ سمجھنے میں خوب کامل ہیں۔ اسی طرح نقصان مطالعہ میں بھی بہت کامل ہیں۔ اس آیت میں رفع الی السمآء کے ذکر کی تصریح کے لئے تفسیر کبیر اور تفسیر سراج منیر کے نام لکھے ہیں۔ اس پر بھی اکمل صاحب فرماتے ہیں ’’برکت میں علو اور علو بھی جسمانی کا ثابت کرنا ایجاد بندہ سے کم نہیں۔ (ص۴۸) جواب: سبحان اللہ! اس بے مائیگی پر اکملیت کا دعویٰ!

بت کریں آرزو خدائی کی
شان تیری ہے کبریائی کی

جناب والا! میں نے تو دو تفسیروں کے نام لکھ دیئے تھے۔ پھر ایجاد بندہ کے الزام کے کیا معنی۔

۲...... ’’وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم:۳)‘‘اور یہ (ہمارا رسول) اپنی خواہش سے بولتا (امر دین میں) جو کچھ بھی بولتا ہے، وہ (خدا کی) وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

اس آیت میں آنحضرتﷺ کے دینی نطق کو وحی کہا ہے۔

۳...... ’’وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (حشر:۷)‘‘اور جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے، وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو اور (اس کی مخالفت کی صورت میں) خدا سے ڈرو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

اس آیت میں آنحضرتﷺ کی خلاف ورزی کو موجب عذاب گردانا ہے۔

۴...... ’’ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (القیامۃ:۱۹)‘‘پھر (تم کو اے ہمارے رسول) اس (قرآن) کا بیان وتفسیر (سمجھانا) بھی ہمارا ہی ذمہ ہے۔

اس آیت میں فرمایا کہ ہم اپنے رسول کو اپنے کلام کی تفسیر بھی خود ہی سمجھائیں گے۔

۵...... ’’وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَھُمُ الَّذِیْ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ (نحل:۶۴)‘‘اور (اے پیغمبر) ہم نے (خاص) تم پر (یہ) کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تم دیگر لوگوں کو وہ باتیں واضح کر کے سمجھا دو، جن میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اختلاف کے وقت حق اس طرف ہوگا، جس طرف رسول اللہﷺ کا بیان ہوگا۔

۶...... ’’وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ (نحل:۴۴)‘‘اور (اے پیغمبر) ہم نے تمہاری طرف یہ نصیحت نامہ اس لئے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کو وہ (حکم) جو ان کے لئے اتارا گیا خوب واضح کر کے سمجھا دو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ حدیث نبوی آیت قرآنی کی تفسیر ہوتی ہے اور مراد الٰہی کی مبیّن۔ پس اگر کوئی شخص کسی آیت قرآنی کی ایسی تفسیر کرے جو کسی حدیث نبوی کے خلاف ہو تو اس کی وہ تفسیر غلط اور ناقابل اعتبار ہوگی۔

پس ان آیات کے رو سے احادیث ذیل میں اس امر کا فیصلہ ہے کہ نازل ہونے والا مسیح علیہ السلام وہ ہے جو ابن مریم رسول اللہ ہے۔ جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے اور کہ وہ آسمان سے نازل ہوگا اور نزول کے کئی سال بعد فوت ہوگا اور مدینہ طیبہ داخل حجرہ نبویہ ﷺ مدفون ہوگا۔

حدیث اوّل

''عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَیُوْشِکَنَّ اَنْ یَّنْزِلَ فِیْکُمْ اِبْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا عَدْلًا فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَیَقْتِلُ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعُ الْحَرْبَ وَیَفِیْضُ الْمَالَ حَتّٰی لَا یُقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰی تَکُوْنَ السَّجْدَةُ وَالْوَاحِدَةُ خَیْرًا مِنَ الدُّنْیَا ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْهُرَیْرَةَ وَاقْرَأُوْا اِنْ شِئْتُمْ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَیَوْمَ الْقِیَامَةِ یَکُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا (صحیح بخاری باب نزول عیسٰی) ''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم! عنقریب ابن مریم علیہ السلام تم میں اتریں گے، حاکم عادل ہوکر پھر وہ (عیسائیوں کے معبود) صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کرادیں گے اور (بوجہ غلبہ اسلام) جہاد موقوف کردیں گے اور مال اتنا فراواں ہوجائے گا کہ کوئی شخص قبول نہ کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سجدہ ساری دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہوگا۔ پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تم اس کی تصدیق چاہتے ہو تو پڑھ لو یہ آیت: ''ہر ایک اہل کتاب حضرت عیسیٰ کے مرنے سے پہلے ان پر ایمان لائے گا اور دن قیامت کے ان پر گواہ ہوگا۔''

اس حدیث اور اس کے بعد کی احادیث کا جس قدر تعلق مسئلہ نزول مسیح علیہ السلام سے ہے، اسے ہم کسی اور رسالہ کے لئے چھوڑتے ہیں۔ یہاں پر صرف حیات ورفع سماوی کا اثبات مقصود ہے۔ اس لئے صرف انہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سو واضح ہو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو اس حدیث کی تصدیق میں یہ آیت پڑھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس حدیث میں اس مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر ہے۔ جس کا ذکر آیت: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ...... الخ!'' میں ہے اور یہ مسلّم فریقین ہے کہ اس آیت میں حضرت بن مریم نبی اللہ علیہ السلام کا ذکر ہے۔

پس اس حدیث میں بھی اسی عیسیٰ بن مریم نبی اللہ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر ثابت ہوئی اور چونکہ زمان قبل النزول میں حیات ضروری ہے، اس لئے ثابت ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت تک زندہ ہیں۔ **وھذا ھو المقصود!**

دیگر یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس آیت میں ''**قبل موته**'' کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں: ''**ففیه دلالة ظاهرة علٰی مذهب ابی هریرة فی الآیة ان الضمیر فی موته یعود علٰی عیسٰی علیہ السلام** (باب نزول عیسیٰ ج اوّل ص۸۷) ''اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مذہب کی صریح دلیل ہے کہ اس آیت میں موتہ کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جاتی ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں: ''**وهذا مصیر من ابی هریرة الی ان الضمیر فی قوله لیؤمنن به وکذلک فی قوله قبل موته یعود علٰی عیسٰی ای لیؤمنّن بعیسٰی قبل موت عیسٰی وبهذا جزم ابن عباس فما رواه ابن جریر من طریق سعید بن جبیر عنه باسناد صحیح ومن طریق ابی رجاء عن الحسن قال قبل موت عیسٰی والله انه الاٰن لحیٌّ ولکن اذا نزل اٰمنوا به اجمعون** (فتح الباری مطبوعہ دھلی جزء۱۲ ص ۲۸۱) ''(اس سے ظاہر ہے کہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ قول الٰہی ''**لیؤمنّن به**'' میں اور اسی طرح قول الٰہی ''**قبل موته**'' میں ضمیر (ہٖ) حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ پس معنی اس آیت کے یہ ہوئے کہ (سب اہل کتاب) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پیشتر ایمان لے آئیں گے اور اسی بات پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جزم کیا ہے۔ مطابق اس کے جو امام ابن جریر نے آپ سے بطریق سعید بن جبیر باسناد صحیح روایت کیا ہے اور نیز بطریق ابن رجاء حضرت حسن بصری سے روایت کیا کہ انہوں نے (اس کے متعلق) کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے (ایمان لے آئیں گے) خدا کی قسم آپ اس وقت بالضرور زندہ ہیں۔ جب آپ نازل ہوں گے تو سب (اہل کتاب) آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

چونکہ حضرت ابوہریرہؓ ’’اقرؤا ان شئتم ‘‘جمع کے صیغوں سے کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجمع عام میں پکار کر یہ آیت پڑھا کرتے تھے اور کسی روایت میں مذکور نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے کسی نے بھی انکار کیا ہو۔ اس لئے سب جماعت صحابہ وتابعین کا یہی مذہب سمجھا جائے گا کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے اور کہ وہ زندہ ہیں اور زمانہ اخیر میں نازل ہوں گے اور یہ بھی اجماع سکوتی کی ایک صورت ہے۔

۲...... اگرچہ حضرت ابوہریرہؓ کے اس آیت کے پڑھنے سے صاف کھل کا جاتا ہے[۱] کہ اس حدیث میں جس مسیح علیہ السلام کے آنے کی خبر دی گئی ہے، وہ وہی مسیح علیہ السلام ہے جس کا ذکر اس آیت: ’’وان من اھل الکتاب ...... الخ!‘‘ میں ہے۔ لیکن ہم اس کے علاوہ ایک اور حدیث بھی ذکر کرتے ہیں۔ جس سے علاوہ حیات مسیح علیہ السلام کے ثبوت کے یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ آنے والا مسیح وہی نبی اللہ ہے جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہے نہ کہ ان کا کوئی مثیل۔

دوسری حدیث

’’عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِ ﷺ قَالَ لَيْسَ بَيْنِیْ وَبَيْنَهٗ يَعْنِیْ عِيْسٰی علیہ السلام نَبِیٌّ وَاِنَّهٗ نَازِلٌ فَاِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَاعْرِفُوْهُ رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ اِلَی الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ كَأَنَّ رَأْسَهٗ يَقْطُرُ وَاِنْ لَّمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ فَيُقَاتِلُ النَّاسَ عَلَی الْاِسْلَامَ فَيَدُقُّ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيُهْلِكُ اللّٰهُ فِیْ زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا اِلَّا الْاِسْلَامَ وَيُهْلِكُ الْمَسِيْحُ الدَّجَّالَ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ثُمَّ يُتَوَفّٰی فَيُصَلِّیْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ (ابوداؤد ج۲ ص۲۳۸)‘‘ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں اور تحقیق وہی اترنے والے ہیں۔ پس جب تم ان کو دیکھو تو (یوں) پہچان لینا کہ ان کا چہرہ سرخی سفیدی لئے ہوگا۔ درمیان دو رنگ دار چادروں کے، ان کا سر (چمک سے) قطرے گراتا معلوم ہوگا، اگرچہ اسے تری نہ پہنچی ہو۔ پھر وہ (یہ کام کریں

[۱] حضرت ابوہریرہؓ نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ آیت پڑھی۔ اس کی مزید تشریح شہادت القرآن حصہ دوم میں دیکھو۔

گے) کہ اسلام کی حمایت میں (دیگر) لوگوں سے قتال کریں گے۔ پس صلیب کو پاش پاش کر دیں گے اور خنزیروں کو قتل کروادیں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا سب مذاہب (باطلہ) کو تباہ کردے گا اور آپ (کانے) دجّال کو قتل کریں گے۔ پھر چالیس سال تک زمین پر (باحکومت) رہیں گے۔ پھر فوت ہوں گے اور مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے۔

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنے والا مسیح علیہ السلام وہی نبی اللہ ہے جس کے بعد آنحضرت ﷺ نبی ہوئے ہیں اور یہ بھی مصرّح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد فوت ہوں گے۔

<u>فائدہ:</u> یہ حدیث مسند امام احمد رحمۃ اللہ علیہ میں بھی موجود ہے اور اس کے سب راوی ثقہ اور مقبول ہیں اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اس کی اسناد کو صحیح لکھا ہے۔

تیسری حدیث شریف

۳...... ’’عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو (ابْنِ الْعَاصِ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَنْزِلُ عِیْسٰی بْنُ مَرْیَمَ اِلَی الْاَرْضِ فَیَتَزَوَّجُ وَیُوْلَدُ لَہٗ وَیَمْکُثُ خَمْسًا وَّاَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَمُوْتُ فَیُدْفَنُ مَعِیَ فِیْ قَبْرِیْ فَاَقُوْمُ اَنَا وَعِیْسٰی بْنُ مَرْیَمَ فِیْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ بَیْنَ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ (رواہ ابن الجوزی فی کتاب الوفاء) (مشکوۃ باب نزول عیسیٰ بن مریم ص ۴۸۰) ‘‘عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (فاتح مصر) کے بیٹے عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم زمین پر اتریں گے۔ پس نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی اور پینتالیس سال تک رہیں گے[۱]۔ پھر فوت ہوں گے اور میرے پاس میرے مقبرے[۲] میں دفن ہوں گے۔ پھر میں اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک ہی

[۱] اس حدیث میں میعاد پینتالیس سال اور حدیث نمبر۲ میں چالیس اور بعض دیگر میں ان سے کم مذکور ہے۔ اس اختلاف کی وجہ اختلاف لحاظات واضافات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر بہت سے واقعات عظیمہ واقع ہوں گے۔ پس کسی واقعہ کے بعد مدت کتنی ہوگی اور کسی کے بعد کتنی۔ ھذا دقیق فخذ بہ! (سعادت)

[۲] اس جگہ قبر بمعنی مقبرہ ہے۔ یعنی مصدر بمعنی اسم ظرف (مرقاۃ اشعۃ اللمعات) اور مصدر کا اپنے مشتقات کے معنوں میں آنا مسلم کل ہے۔ جیسے ’’زید عدل‘‘ اور قاموس میں نہر کے معنی لکھے ہیں۔ ’’مجرالماء‘‘ یعنی پانی کے جاری ہونے کی جگہ۔ یعنی مصدر بمعنی اسم ظرف ہے۔

مقبرے سے اٹھیں گے، ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان۱۔

اس حدیث میں بھی صاف طور پر مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نازل ہونے کے بعد فوت ہوں گے اور آنحضرت ﷺ کے روضہ اطہر میں مدفون ہوں گے۔

نکتہ: علاوہ بریں اس حدیث۲ میں ایک نہایت لطیف نکتہ بھی ہے۔ جس سے بلاریب ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک فوت نہیں ہوئے۔ وہ یہ کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’فیدفن معی ‘‘یعنی حضرت ابن مریم علیہ السلام فوت ہونے کے بعد میرے پاس (میرے پہلو میں) دفن کئے جائیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات آنحضرت ﷺ کی وفات سے متاخر ہو گی کیونکہ مقام لحوق پر ملحق یا لاحق ملحق بہ سے متاخر ہوتا ہے۔ یعنی پیچھے سے ملنے والا پہلے سے مؤخر ہوتا ہے۔ پس جب زمانہ

۱ روضہ اطہر میں قبور ثلاثہ آنحضرت ﷺ کی اور حضرت ابوبکرؓ کی اور عمرؓ کی قبروں کے درمیان ایک قبر کی جگہ خالی رکھی ہے (جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفن ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ کی قبر کے متعلق ہمارا ایک رسالہ ’’اَلْخَبَرُ الصَّحِیح عَنْ قَبْرُ الْمَسِیح‘‘ مدت سے شائع ہے۔

۲ تصحیح حدیث: اس حدیث کی صحت پر مرزا قادیانی کے بھی دستخط ہیں۔ وہ اس طرح کہ مرزا قادیانی نے کہیں دیکھ لیا یا سن لیا کہ اس حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نکاح اور ان کے ہاں اولاد ہونے کا بھی ذکر ہے۔ ادھر مرزا قادیانی نے محمدی بیگم...... کے متعلق الہام شائع کر رکھا تھا کہ یہ میرے نکاح میں آئے گی۔ جس کے انتظار میں دن رات باچشم گریاں ودل بریاں گزرتے تھے اور تحصیل مطلب کے لئے کئی قسم کے اندرونی اور بیرونی ڈورے بھی ڈال رکھے تھے۔ آپ موقع شناس تو تھے ہی، جھٹ لکھ مارا کہ اس پیش گوئی یا نکاح کی تصدیق خود آنحضرت ﷺ نے بھی کر دی ہوئی ہے اور اس نکاح کو مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی علامت قرار دیا۔ (حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم ص۵۳، خزائن ج۱۱ ص۳۳۷ وشہادت القرآن) اگرچہ زندگی بھر مرزا قادیانی کی یہ آرزو برنہ آئی اور محمدی بیگم کا نکاح مرزا قادیانی کی وفات سے سالہا پیشتر دوسرے شخص سے ہو گیا۔ جسے مرزا قادیانی نے اپنے حق میں ’’ایک تلوار‘‘ قرار دیا۔ لیکن اس پیش گوئی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مرزا قادیانی نے اس حدیث کی صحت پر مہر لگا دی۔ کیونکہ مرزا قادیانی نے اس حدیث کو اپنی پیش گوئی کی تصدیق کے لئے بطور دلیل گزرا اور مستدل مقام احتجاج میں وہ دلیل پیش کیا کرتا ہے۔ جو اس کے نزدیک صحیح ہو۔ پس یہ حدیث مرزا قادیانی کے نزدیک صحیح ٹھہری۔ اس لئے مولوی غلام رسول صاحب آف راجیکے مبلغ قادیانی نے اپنی کتاب ’’تنقید‘‘ میں اگرچہ اس حدیث کی تاویلات فاسدہ سے زمین وآسمان کے قلابے ملانے چاہے ہیں۔ لیکن اس کی صحت کو کان دبا کر تسلیم کر گئے۔ فتشکّر! (سعادت)

نبی کریم ﷺ تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات واقع نہیں ہوئی اور آپ ﷺ کے بعد بھی ابھی تک نہیں ہوئی تو اب ہم اس حدیث کے برخلاف کس کے کہنے سے مان لیں کہ وہ (مسیح علیہ السلام) آنحضرت ﷺ سے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ **تشکر و خذبه فانه لطیف جدّاً!**

چوتھی حدیث شریف

۴...... ’’**عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اِنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْیَمَ مِنَ السَّمَآءِ فِیْکُمْ وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ** (کتاب الاسماء والصفات للامام البیهقی ص ۲۰۳) ’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کیسے (اچھے حال میں) ہوگے جب تم میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور اس وقت تمہارا امام (سلطان وقت) تم ہی میں سے ایک ہوگا۔

اس حدیث میں آسمان سے نازل ہونے کی تصریح خود آنحضرت ﷺ کے الفاظ طیّبہ میں موجود ہے۔

پانچویں حدیث شریف

۵...... ’’**عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ فَعِنْدَ ذٰلِکَ یَنْزِلُ اَخِیْ عِیْسٰی بْنَ مَرْیَمَ مِنَ السَّمَآءِ** (کنز العمال برحاشیه مسند احمد) ’’ایک لمبی حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ یہ باتیں واقع ہوں گی تو اس وقت میرا بھائی عیسیٰ علیہ السلام بن مریم آسمان سے نازل ہوگا۔

اس حدیث میں بھی آسمان[۱] سے نازل ہونے کی صراحت ہے۔

[۱] بہت افسوس ہے کہ اکمل صاحب قادیانی کا ان احادیث پر آ کر بالکل دم ٹوٹ گیا اور ان کے متعلق غلط یا صحیح روایۃً یا درایۃً کوئی بھی اعتراض نہ لکھ سکے۔ اس نیم تسلیم پر ہم ان کو مبارک باد کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تعجب وافسوس کے قابل مرزا قادیانی کی دلیری ہے کہ بلا دیکھے بھالے اور علم حدیث پڑھے بغیر اپنی کتاب ’’چشمہ معرفت‘‘ میں نہایت بے خوف ہوکر لکھتے ہیں کہ کسی ضعیف حدیث میں بھی مذکور نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے۔ ملخصاً!

مولوی غلام رسول قادیانی کی جرأت قابل ستائش ہے کہ اصالۃً تو اس حدیث نمبر۴ کا انکار نہیں کر سکے۔ لیکن اس کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ بحیثیت ایک احمدی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تیسری قسم

تیسری قسم دلیل کی اجماع امت[1] ہے۔ ذیل کی آیت اور حدیث میں اس کی شہادت

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) (امت مرزا غلام احمد قادیانی) ہونے کے مرزا قادیانی کی تحریر کے خلاف وہ صحت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ مرزا قادیانی سلب کلی کر رہے ہیں۔ یعنی صحیح وضعیف ہر طرح کی ایسی حدیث سے انکار کر رہے ہیں، جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا مذکور ہو اور مولوی غلام رسول صاحب ان کے برخلاف سلب جزئی کرتے ہیں۔ جس سے طرف مقابل میں ایجاب جزئی بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی صرف صحیح حدیث میں وارد ہونے کا انکار کرتے ہیں اور ضعیف حدیث کا انکار نہیں کرتے۔ لیکن حدیث نمبر۴ جو امام بیہقی کی روایت سے ہے، وہ ایسی ہے۔ جس میں مولوی غلام رسول صاحب کا بھی مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بطریق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے اوپر وہی راوی ہیں جو صحیح بخاری میں ہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب اس حدیث کی صحت میں یہ عذر کرتے ہیں کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے۔ (رواہ البخاری) حالانکہ صحیح بخاری کے کسی نسخہ میں من السماء کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ مولوی غلام رسول صاحب نے علم حدیث کسی ماہر استاد حدیث سے نہیں پڑھا اور یہ بات ہم ان کی خدمت میں بارہا مناظروں میں عرض کر چکے ہیں۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بالاستقلال اپنی روایت سے ذکر کیا ہے اور وہ فن روایت کے مستقل صاحب روایت ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچ کر اوپر کے سب شیوخ وہی ہیں۔ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں گو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں من السماء کے الفاظ نہ ہوں، لیکن امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں موجود ہیں اور محدثین کے نزدیک حافظ وثقہ راوی کی زیادت مسلّم ومقبول ہے۔ (کتب اصول حدیث) چونکہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے سب شیوخ ضابطہ وثقہ ہیں۔ اس لئے ان کی من السماء کی تصریح جو بخاری سے زائد ہے۔ وہ مقبول ومسلم ہوئی۔

اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس روایت کو اس لئے منسوب کیا کہ اصل اس کی صحیح بخاری میں بھی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کے محدثین کا دستور رہا ہے کہ وہ کسی ایسی روایت کی توثیق وتصحیح کے لئے جس کا اصل مضمون صحیح بخاری میں موجود ہو کہہ دیا کرتے ہیں اصلہ فی البخاری یا اسی طرح کے اور الفاظ اگرچہ الفاظ میں کمی بیشی ہو۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۰۶ پر)

[1] قاضی اکمل صاحب قادیانی کمال درجہ کے دلیر ہیں، لکھتے ہیں: ’’ہم اجماع امت کے قائل ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرام نے سب سے پہلے وفات مسیح علیہ السلام پر ہی اجماع کیا تھا۔ (ص۴۹) الجواب: یہ محض کذب وافتراء ہے۔ ایک صحابی سے بھی وفات مسیح قبل النزول منقول نہیں۔ اس کی کچھ حقیقت سابقاً اس حصہ شہادت القرآن میں اور کچھ حصہ دوم میں آیت: ’’قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلِ (آل عمران)‘‘ کے ضمن میں مذکور ہو چکی ہے۔ (سعادت الاقران)

شہادت ہے۔ ’’قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰) ‘‘تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے (نمونہ) بنائے گئے ہو۔

’’وَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ (مشکوٰۃ) ‘‘میری امت گمراہی پر اجماع نہیں کرے گی یعنی جس امر پر میری امت کا اجماع ہوگا وہ امر ضلالت نہیں ہوگا۔

حجیت اجماع کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجماعی امر قرآن وحدیث سے ثابت ہو۔

چنانچہ حضرت حجۃ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں: ’’فانہم اتفقوا علی القول بالاجماع الذی مستندہ الکتاب والسنۃ او الاستنباط من احدھما (ج۱ ص۱۲۰ مطبوعہ مصر) ‘‘علماء اہل سنت کا اس اجماع پر اتفاق ہے جس کی سند (اصالۃً) قرآن وحدیث میں موجود ہو یا ان دونوں میں سے کسی ایک سے مستنبط ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۲۰۴) دیگر یہ کہ بعض وقت احادیث میں تطابق معنوی طور پر دیا جاتا ہے اور مضمون مشترک کے لحاظ سے حوالہ کسی ایک کتاب کا دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ الفاظ میں کمی بیشی یا تقدم وتاخر ہوتا ہے۔ اگر مولوی غلام رسول صاحب کتاب مشکوٰۃ المصابیح بھی کسی ماہر محدث سے پڑھتے تو اس کی قریباً ہر فصل اوّل میں ان کو کئی ایک احادیث ایسی ملتیں جن میں حوالہ متفق علیہ کا ہے۔ لیکن الفاظ ان میں سے ایک کے ہیں۔ اسی طرح الفاظ: ’’کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ اِبْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ ‘‘جو صحیح بخاری میں ہیں اور الفاظ: ’’کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ اِبْنُ مَرْیَمَ مِنَ السَّمَاءِ فِیْکُمْ ‘‘جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ ان میں از روئے معنی کوئی فرق نہیں اور مضمون مشترک دونوں میں ایک ہی ہے۔ دورنہ جائیے خاتمۃ الحفاظ حضرت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں باب نزول عیسیٰ بن مریم کی شرح میں وہ حدیث جو ہم نے متن میں نمبر۲ پر بروایت امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ لکھی ہے، بروایت احمد وابی داؤد نقل کرتے ہیں اور حدیث کو جن الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ وہ الفاظ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں موجود ہیں اور ابوداؤد کی روایت میں پورے نہیں ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں مضمون زیادہ ہے اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں مختصر ہے۔ لیکن حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حوالہ دونوں کتابوں کا دیتے ہیں۔ اسی طرح امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں الفاظ زیادہ ہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت مختصر ہے۔ پس امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اصل مضمون کے لحاظ سے اپنی روایت کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کا بھی حوالہ دے دیا کہ اس کی تصحیح وتوثیق میں کسی جاننے والے کو کلام نہ رہے اور اگر کوئی محدثین کے طریق روایت کو نہ جانتا ہو اور وہ انکار کردے تو بلا سے۔ فخذ بہ وتشکر ولا تکن من القاصرین! (سعادت)

ہم سابقاً نہایت تفصیل سے آیات قرآنیہ اور احادیث مرفوعہ سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھائے گئے اور آپ قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہوں گے اور چونکہ جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم اور جمیع ائمہ اہل بیت رحمۃ اللہ علیہم اور جمیع ائمہ اہل سنت رحمۃ اللہ علیہم[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول عینی کے قائل ہیں اور کوئی بھی ان کا نزول مثالی و بروزی کا قائل نہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ قطعاً حق اور پسندیدۂ خدا اور رسول ہے اور اس میں کسی طرح کی گمراہی کا شائبہ نہیں۔

[1] مولوی محمد علی صاحب لاہوری مرزائی اپنی کتاب ''عیسویت کا آخری سہارا'' میں سلسلہ ذکر میں فرماتے ہیں: ''مجمع البحار میں لفظ حکم کی بحث میں نقل کیا ہے۔''قال مالک مات ''یعنی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر گئے اور بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے تھے۔ مثلاً ایک قول ہے کہ تین گھنٹے آپ مرے رہے اور ایک قول ہے کہ تین دن تک مرے رہے اور یہ سب اقوال تفاسیر میں موجود ہیں۔'' (ص۹)

الجواب: ہم مولوی محمد علی صاحب کی زحمت ورق گردانی کی قدر کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ علوم عربیہ سے ناواقف ہیں اور تقلید مرزا کی آفت ان پر سوار ہے۔ اس لئے وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ سچ ہے ''نکتہ داں نشود کرم گر کتاب خورد'' اس تحریر میں جو انہوں نے تفاسیر کے حوالے سے لکھی ہے۔ کئی ایک دھوکے دیئے یا بوجہ کم علمی کے کھائے۔ سو پہلے ہم ان اقوال کی حقیقت سمجھنی آسان ہو جائے گی۔

قولہ: بہت سے لوگ...... الخ!

اقول: یہ محض دھوکا ہے ان ''بہت سے'' لوگوں میں دس بیس کے نام تو گنائے ہوتے۔

قولہ: ''ایک قول ہے کہ تین گھنٹے...... الخ!''

اقول: اوّل تو یہ کہ اس روایت کے راویوں میں سے ایک راوی کا نام معلوم نہیں (ابن جریر) پس یہ روایت درجۂ صحت سے گر گئی۔ ثانیاً یہ کہ اس کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے۔ ''ثُمَّ اَحْیَاهُ ثُمَّ رَفَعَهُ اِلَیْهِ ''(خازن ومعالم) یعنی پھر خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ کیا، پھر اپنی طرف اوپر اٹھا لیا۔ مولوی صاحب نے یہ عبارت نقل کیوں نہیں کی؟ اس لئے کہ یہ اپنے مطلب کے خلاف ہے۔

قولہ: ''ایک قول ہے سات گھنٹے...... الخ!''

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چنانچہ تفسیر وجیز میں ہے: ’’وَالْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّہُ حَیٌّ فِی السَّمَآءِ یَنْزِلُ وَیَقْتُلُ الدَّجَّالَ وَیُؤَیِّدُ الدِّیْنَ (حاشیہ ص۳ جامع البیان متعلق آیت یٰعیسٰی انی متوفیک) ‘‘اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں جو نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور دین (اسلام) کی مدد کریں گے۔

اور حضرت نواب صاحب مرحوم امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کر کے لکھتے ہیں: ’’فھذہ تسعۃ وعشرون حدیثاً تنضم الیھا احادیث آخر ذکر فیھا نزول عیسٰی منھا ما ھو مذکور فی احادیث الدّجال ومنھا ما ھو مذکور فی احادیث المنتظر وتنضم الی ذلک ایضاً الآثار الواردۃ عن الصحابۃ فلھا حکم الرفع اذلا مجال للاجتھاد فی ذلک...... وجمیع ما سقناہ بالغ حدّ التواتر کما لا یخفی علٰی من لہ فضل اطلاع فتقرر بجمیع ما سقناہ فی ھذا ان الاحادیث الواردۃ فی المھدی المنتظر متواترۃ والاحادیث الواردۃ فی الدّجال فی نزول عیسٰی متواترۃ وفی ھذا المقدار کفایۃ لمن لہ ھدایۃ (حجج الکرامہ ص۴۳۲)‘‘

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اقول: اس روایت کے نقل کرنے میں تو مولوی محمد علی صاحب نے یہودیوں کے بھی کان کتر دیئے اور فنافی المرزا کا پورا ثبوت دے دیا۔ کیونکہ تفاسیر میں تو صاف لکھا ہے کہ یہ قول نصاریٰ کا ہے۔ پس اس نسبت کو چھوڑ دینا اور کسی مسلمان امام کا قول جتانا سخت دھوکہ ہے جو کسی مؤمن کا کام نہیں۔ دوم: یہ کہ اس کے آگے بھی صاف لکھا ہے: ’’ثُمَّ اَحْیَاہُ وَرَفَعَہٗ اِلَیْہِ‘‘ (خازن ومعالم) یعنی پھر خدا نے آپ کو زندہ کیا اور اپنی طرف اوپر کو اٹھالیا۔

اس تفصیل سے صاف معلوم ہوگیا کہ ائمہ اہل سنت کی طرف یہ نسبت کرنا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوچکے ہیں، ضعیف ہے اور اس میں بھی زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر ہے جو مرزا قادیانی اور ان کی امت کے دعویٰ اور عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ جب تک ائمہ اہل سنت سے نزول عینی کا انکار ثابت نہ ہو، تب تک مرزا قادیانی کہ ان روایتوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں۔ یہی حال امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے کا ہے کہ اس کی کوئی سند نہیں۔ ’’وَمَنِ ادَّعٰی فَعَلَیْہِ الْاِتْیَانُ بِہٖ‘‘ اور نہ ان سے نزول عینی کا انکار مروی ہے۔ اسی طرح علمائے مالکیہ سے بھی کوئی بھی حیات سماوی اور نزول عینی کا منکر نہیں۔ (سعادت)

پس یہ انتیس حدیثیں ہیں۔ جن کے ساتھ دیگر حدیثیں بھی جن میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، ملائی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث دجال میں اور بعض احادیث مہدی منتظر میں مذکور ہیں اور اسی طرح وہ آثار بھی ضم کئے جاسکتے جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ وہ بھی حکماً مرفوع ہیں۔ کیونکہ اس امر میں اجتہاد کا دخل نہیں (بلکہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سننے پر موقوف ہے) اور جو کچھ ہم نے بترتیب بیان کیا وہ حد تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ جیسا کہ اس شخص پر جسے روایات پر کافی عبور ہے، مخفی نہیں۔ پس اس سے جو ہم نے بیان کیا، مقرر وثابت ہوگیا کہ جو احادیث امام مہدی منتظر کے بارے میں وارد ہیں وہ بھی متواتر ہیں اور جو احادیث دجال (کے خروج) میں مروی ہیں وہ بھی متواتر ہیں اور جو احادیث نزول عیسیٰ علیہ السلام میں وارد ہیں وہ بھی متواتر ہیں اور اس مقدار میں اس شخص کے لئے جسے (خدا کے فضل سے) ہدایت حاصل ہے کفایت ہے۔

اسی طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی حاشیۂ خیالی میں فرماتے ہیں: ’’اور شارح التفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر اکتفا کی کہ ان کی حیات اور ان کا زمین پر نازل ہونا اور پھر زمین پر آپ کا رہنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے۔ اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ (ص۲۵۴) اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ حیات مسیح علیہ السلام کا مسئلہ بموجب آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ واجماع امت محمدیہ ثابت ہے اور مرزاغلام احمد قادیانی نے جو کچھ اس کے برخلاف وفات مسیح کے متعلق لکھا ہے وہ محض شبہات ومغالطات ہیں جو قواعد علمیہ کے بھی برخلاف ہیں۔

تم والحمد للّٰہ الذی بنعمتہ تتم الصّٰلحٰت والصلوٰۃ والسلام علٰی رسولہٖ محمد مع اکرام التّحیات وعلٰی اٰلہٖ واصحابہ وازواجہٖ المطہرات وانا خادم دینہ القدیم ابوتمیم محمد ابراھیم میر سیالکوٹی!

۲۷رشوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹راپریل ۱۹۲۸ء (تصحیح برائے طبع چہارم)

• • •

تقریظ ...... جناب حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی

بر طبع اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله خالق الحب والنّویٰ، الخالق لکل فرعون موسیٰ. والصلوٰۃ والسلام علٰی سیّدالمرسلین صاحب الشفاعة الکبریٰ واٰلہٖ وصحبہٖ اهل التقیٰ والنقیٰ۔

اما بعد! رسالہ مؤلفہ جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا نظر ناقص سے گزرا۔ جس نے اہل اسلام کو الحاد اور تحریف سے بچانے کی وجہ سے ممنون و مامون فرمایا۔ ’’لا ریب فهم اعطیه رجلٌ مسلم‘‘ کے زیور کی سجاوٹ اور پھبن سے بہ نسبت زمانۂ حال کی تالیفات کے جداگانہ جھلک دکھاتا ہے۔ ’’فلِلّٰه درّ المؤلف حیث اریٰ الناظر کل کلمة من الکلمات القرآنیة سلطان دارها وکل اٰیة من الأیات الفرقانیه برهان جارها وان ماتوهم فیها من التکرار فمن رمد الابصار. الّٰهم ایّد الاسلام والمسلمین واخذل الملاحدة والمبتدعین بطول حیاته واعف عن سیئاته وضاعف حسناته واٰخر دعوٰنا ان الحمدلله ربّ العالمین والصلٰوة والسلام علٰی خاتم النّبیین واٰله وصحبه اجمعین ‘‘العبد الملتجی الی الله: المدعو بمهر علی شاه عفی عنه از گولڑه

(کاتب: احقر عبدالحق، مصحح عبدالقیوم میر)

• • •

أنا خاتم النبيين لا نبي بعدي

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

شہادت القرآن

(حصہ دوم)

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ عِوَجًا وَّقَالَ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَمَا اَحْکَمَ مُرَادَہٗ وَمَا اَتْقَنَ بَیَانَہٗ بِتَصْرِیْفِ الْآیَاتِ وَتَکْرِیْرِ الْکَلِمَاتِ وَقَالَ وَلَا یَأْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنَاکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا وَّاَشْهَدُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا وَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الْاَطْہَارِ وَاَصْحَابِہِ الْاَخْیَارِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا!

سبب تالیف

امّا بعد! حضرات انصاف پسند حق نیوش پر واضح ہو کہ رسالہ شہادۃ القرآن کا پہلا حصہ عرصہ کئی سال سے طبع ہو چکا ہے۔ موافقین میں اس کی قبولیت اور مخالفین پر اس کی اتمام حجت اس کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ مطبوع ہو کر ہدیہ ناظرین ہوتا ہے۔

اس میں ان تیس آیتوں کا جواب ہے جو مرزا قادیانی نے اپنے رسالہ ’’ازالہ اوہام‘‘ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ اس حصہ کے لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ پہلے باب میں اپنا عقیدہ حیات ورفع عیسوی کو قرآن شریف سے ثابت کیا گیا ہے اور چونکہ مرزا قادیانی نے رسالہ ’’ازالہ اوہام‘‘ میں بہت زور سے کہا ہے کہ قرآن کریم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت ہے اور اس سے قرآن شریف کے مضامین میں اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اپنے عقیدے کی تائید کے لئے مخالف کے دلائل کو توڑا جائے اور ضعیف بلکہ باطل اور غلط ثابت کیا جائے۔ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ وَعَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ!

وَاَنَا الْعَبْدُ الْمُفْتَقِرُ اِلَی اللّٰہِ الْکَرِیْمِ مُحَمَّدُ اِبْرَاهِیْمِ مِیْرِ السِّیَالْکُوْتِیْ

دیباچہ طبع ثانی از مصنف

سُبْحَانَ مَنْ لَّا یُعَقَّبُ حُکْمُہٗ وَلَا یُرَدُّ قَضَائُہٗ وَاُصَلِّیَ وَاُسَلِّمَ عَلٰی مَنْ شَھِدَتْ لَہٗ اَرْضُہٗ وَسَمَائُہٗ. صَلٰوۃً دَائِمَۃً بَاقِیَۃً یُوَفّٰی بِھَا جَزَائُہٗ!

شہادت القرآن کا یہ دوسرا حصہ بھی پہلے حصہ کی طرح مرزا قادیانی کی زندگی میں رمضان ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوا۔

زندگی بھر نہ ان کو اس کے جواب کی ہمت پڑی اور نہ اب تک ان کے مریدوں کو اس کی جرأت ہوئی۔ حتیٰ کہ طبع اوّل کے (۷۰۰) نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور جلد ہی طبع ثانی کی ضرورت پڑی۔ لیکن متواتر کچھ ایسے امور درپیش رہے کہ طبع ثانی کا ارادہ تسریف وتعویق میں پڑتا رہا۔ ملک کے ہر گوشہ سے بکثرت سفارشیں اور فرمائشیں آتی رہیں اور مخلص احباب اپنی آرزومندی کی تقریروں اور کمال اشتیاق کی تحریروں سے اپنی طرح مجھے بھی بے قرار کرتے رہے۔ لیکن میں روز بروز ایسے حالات میں محصور ہوتا گیا کہ دائرہ عمل بالکل تنگ ہوگیا۔ آخر سردار اہل حدیث جناب مولانا مولوی ابوالوفاء ثناءاللہ صاحب **متعنا اللہ بطول بقائہٖ** نے اس کی طباعت کا اہتمام اپنے ذمہ لیا اور اب وہ آنجناب کے حسن انتظام سے آپ کے سامنے ہے۔

خاکسار: ابراہیم میر سیالکوٹی مصنف رسالہ ہذا

•••

شہادت القرآن حصہ ثانی

در ازالہ اوہام قادیانی ودفع وساوس شیطانی

مرزا قادیانی نے اپنے (ازالہ اوہام ص۵۹۸-۶۲۷، خزائن ج۳ ص۴۲۳-۴۳۸) وہ تیس آیتیں ذکر کی ہیں، جن سے ان کا مقصود برخلاف مراد الٰہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت کرنے کا ہے۔ سو واضح ہو کہ وہ بیان کردہ آیات تین قسم کی ہیں۔ اوّل: وہ آیات جن میں خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ دوم: وہ آیات جو دیگر انبیاء علیہم السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہیں اور مرزا قادیانی نے اس خیال سے کہ مسیح علیہ السلام بھی ایک پیغمبر تھے۔ ان آیتوں سے آپ کی وفات ثابت کرنی چاہی ہے۔ سوم: وہ آیتیں جن میں نہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کا خاص طور پر ذکر ہے اور نہ ضمن عموم میں۔ بلکہ مرزا قادیانی نے صرف اپنی اختراع سے ان سے تمسک کیا ہے۔ ان سب کا جواب حسب ترتیب تقسیم بیان کیا جاتا ہے۔

ناظرین! دونوں کو بغور ملاحظہ کریں اور انصاف کریں کہ موافق کتاب اللہ ومطابق بیان رسول اللہ ﷺ کس کی دلیل ہے اور قرآن شریف کی صحیح مراد کو کون پہنچا ہے۔

فَاَقُوْلُ بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ!

یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ

قسم اوّل میں سے پہلی آیت یہ ہے: ''یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (آل عمران:۵۵)'' ترجمہ مندرجہ (ازالہ اوہام ص۵۹۸، خزائن ج۳ ص۴۲۳)''(یعنی اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا ہوں) اور پھر عزت کے ساتھ اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر قیامت تک غلبہ دینے والا ہوں۔'' انتہیٰ!

مرزا قادیانی کا یہ ترجمہ اور اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول پر استدلال از روئے آیات قرآن شریف ولغت عرب کئی وجوہ سے بالکل غلط ہے۔

وجہ اوّل

اس آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ‘‘ کے متعلق (حصہ اوّل میں) کافی تحریر ہوچکی ہے۔ جس میں بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ توفی کا اصل وفاء ہے اور اس کے اصلی اور وضعی معنی ’’اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا پکڑ لینا ہیں اور رفع یعنی اوپر کو اٹھالینا اور نیند اور موت اور تعداد اور وصولی قرض سب اس کی انواع ہیں اور یہ امر مسلّم ہے کہ مختلف انواع میں سے ایک نوع معیّن کرنے کے لئے قرینے کا ہونا ضروری ہے۔ پس جہاں توفی کے ساتھ موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہوگا۔ اس جگہ توفی سے مراد موت ہوگی اور جہاں نینداور اس کے مقتضیات مذکور ہوں گے، وہاں نیند مراد ہوگی۔ ’’قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ (الم سجدہ)‘‘ یعنی اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ تم کو ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہوا ہے، پورا پورا پکڑے گا اور نیز آیت: ’’اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا (زمر:۴۲)‘‘ یعنی اللہ (ہی) جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ان کو ان کی نیند میں (قبض کرتا ہے) اور نیز آیت: ’’وَھُوَالَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ (انعام:۶۰)‘‘ یعنی اللہ تم کو رات کے وقت قبض کر لیتا ہے اور نیز شعر: ’’فَلَمَّا تَوَفَّاہُ رَسُوْلُ الْکُرٰی...... الخ!‘‘ یعنی جب اس کو نیند کے ایلچی نے پورا پورا پکڑ لیا۔

ان مثالوں میں ملک الموت اور موت توفی سے موت مراد لینے کے قرینے ہیں اور منام اور لیل اور کریٰ (نیند) اس سے نیند مراد لینے کے۔ اسی طرح اس آیت مذکورہ زیر بحث میں اگر توفی کے متصل موت کا ذکر ہے تو اس سے مراد موت ہوگی اور اگر نیند کا ذکر ہے تو پھر نیند مراد ہوگی اور اگر رفع یعنی اوپر اٹھانے کا ذکر ہے تو پھر اس توفی سے مراد رفع یعنی اوپر کو اٹھانا ہوگی۔ پس چونکہ اس آیت میں توفی کے ساتھ سوائے رفع کے ذکر کے اور کچھ مذکور نہیں۔ لہٰذا اس جگہ توفی سے سوائے رفع کے اور کچھ مراد نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ (حصہ اوّل) میں بحوالہ تفسیر کبیر گزر چکا ہے کہ قول الٰہی:

’’قولہ: انّی متوفّیک یدل علٰی حصول التوفی وھو جنس تحتہٗ

انواع بعضها بالموت وبعضها بالاصعاد الی السمآء فلما قال بعده ورافعک الیّ کان هذا تعییناً للنوع ولم یکن تکراراً (تفسیر کبیر ج۲) ’’ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ صرف توفی کے حاصل ہونے پر دلالت کرتا ہے اور توفی جنس ہے جس کی کئی انواع ہیں۔ بعض موت کے ساتھ اور بعض آسمان پر اٹھائے جانے سے۔ پس جب اس کے بعد رَافِعُکَ اِلَیَّ آیا تو یہ تعیین نوع کے لئے قرینہ ہوا اور تکرار نہ ہوا۔

مفسرین رحمۃ اللہ علیہ کا اس امر پر اتفاق اور اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی دلیل ہے۔

اس جگہ انواع توفی (رفع، موت، نیند) میں سے توفی کو خواہ کسی نوع میں معیّن کریں رفع جسمی ثابت ہی رہے گا۔ تفصیل اس اجمال کی اس طرح ہے کہ اگر توفی کو نوع موت میں معیّن کریں تو بموجب مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہوگی۔ جیسے کہ (حصہ اوّل) میں درمنثور سے گزر چکا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ’’رَافِعُکَ ثُمَّ مُتَوَفِّیْکَ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ (درمنثور) ‘‘فرماتے ہیں کہ میں پہلے تجھے اوپر اٹھالوں گا، پھر بعد مدت کے (دنیا میں نازل کر کے) آخر زمانے میں ماروں گا۔

اور نیز تفسیر معالم میں ضحاک رحمۃ اللہ علیہ شاگرد ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تصریح موجود ہے کہ: ’’ان فی الأیة تقدیماً وتاخیراً معناه انی رافعک الیّ ومطهرک من الذین کفروا ومتوفیک بعد انزالک من السمآء (تفسیر معالم) ‘‘اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے اور معنی اس کے یہ ہیں کہ میں تجھ کو اپنی طرف اوپر اٹھاؤں گا اور کفار سے تجھے صاف بچالوں گا اور پھر آسمان سے اتارنے کے بعد ماروں گا۔

اور اگر اس آیت میں توفی کو اس کی دوسری نوع نیند میں معین کیا جائے تو بھی اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اے عیسیٰ! میں تجھ کو سلادوں گا (اور اس نیند کی حالت میں) تجھ کو اپنی طرف اوپر اٹھالوں گا۔ جیسا کہ تفسیر خازن، ابن کثیر، درمنثور، فتح البیان، معالم، کبیر وغیرہ میں ہے کہ: ’’(الثانی) المراد بالتوفی النوم ومنه قوله اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فجعل النوم وفاةً کانّ عیسٰی قد نام رفعه اللّٰه وهو نائم

لئلا یلحقه خوف (تفسیر خازن) ’’اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ توفی سے مراد نیند ہے۔ جیسا کہ اس آیت: ’’**اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ. الآية**‘‘ میں مستعمل ہے (پس اس سے یہ مراد ہوئی) کہ عیسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوتے ہوئے اوپر اٹھایا تا کہ آپ کو خوف لاحق نہ ہو۔

(۳) اور اگر اس آیت میں توفی سے اس کی تیسری نوع رفع مراد لی جائے جو بالکل حق اور مطابق واقع ہے اور جو جمہور مفسرین کا قول ہے تو رفع جسمی بالکل ظاہر ہے۔

غرض اس جگہ توفی کو اس کی انواع رفع، نیند، موت میں سے جو قرآن مجید میں آچکی ہیں۔ جس نوع میں معیّن کیا جائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع جسمی ثابت ہی رہتا ہے اور اس امر پر علماء سلف وخلف، مفسرین ومحدثین وفقہاء ومجتہدین رحمہم اللہ علیہم سب کا اتفاق واجماع ہے۔

دوسری وجہ

مرزا قادیانی نے اس آیت میں واؤ کا ترجمہ ’’پھر‘‘ کیا ہے۔ اس میں انہوں نے لغت، بلاغت، نحو واصول جملہ علوم کا خلاف کیا ہے۔ خواہ دیدہ دانستہ، خواہ غلطی وسہو سے۔ اس کی تفصیل (حصہ اوّل) پر گزر چکی ہے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ واؤ صرف عطف مطلق جمع کے لئے موضوع ہے۔ اس میں ترتیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ کافیہ میں ہے: ’’**اَلْوَاوُ لِلْجَمْعِ الْمُطْلَقِ لَا تَرْتِيْبَ فِيْهَا**‘‘ یعنی واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ اس میں ترتیب نہیں ہوتی اور اسی طرح دیگر کتب نحو میں ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں اس امر کی تصریح کی ہے:

’’**ان الواو فی قوله اِنِّیْ مُتَوَفِّيْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ لا تفید الترتیب فالأیة تدل علیٰ انه تعالیٰ یفعل به هذه الافعال فاما کیف یفعل ومتی یفعل فالامر فیه موقوف علی الدلیل وقد ثبت بالدلیل انه حیّ وورد الخبر عن النّبی ﷺ انه سینزل ویقتل الدجال ثم انه تعالیٰ یتوفّاه بعد ذلک**‘‘ (تفسیر کبیر ج۲) ’’واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔ یہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ یہ معاملات کرے گا۔ مگر یہ بات کہ کس طرح کرے گا اور کب کرے گا؟ سو یہ دلیل پر موقوف ہے اور جب تک یہ بات دلیل سے ثابت ہے کہ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور اس بارے میں نبی ﷺ سے حدیث بھی آچکی ہے کہ آپ ضرور اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کو فوت کرے گا۔

تیسری وجہ

مرزا قادیانی نے اس آیت میں ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' کا ترجمہ ''عزت کے ساتھ اپنی طرف اٹھانے والا ہوں'' کیا ہے اور اس سے عزت کی موت مراد لی ہے۔ یہ بھی ان کی سخت غلطی ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس آیت کے معنی میں عزت کا لفظ از خود بڑھا دیا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے اور اگر مفہوم رفع سے سمجھ کر لکھا ہے تو بھی اس سے موت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ رفع جسمی اور اعزاز میں مخالفت نہیں بلکہ یکجا جمع ہوسکتے ہیں۔ جیسے آیت ''وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلٰی الْعَرْشِ'' میں ہے۔ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو (عزت کے ساتھ) تخت کے اوپر بٹھایا۔ پس اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا۔

دیگر یہ کہ ''عزت کے ساتھ اٹھالینا'' سے موت مراد لینی تو لغت کی کسی کتاب سے ثابت ہے اور نہ محاورۂ زبان اس کی تائید کرتا ہے اور نہ قرآن شریف میں اس کی شہادت ہے۔ یہ صرف مرزا قادیانی کی اپنی من گھڑت بات ہے۔ (حصہ اوّل) میں اس آیت کی تفسیر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

چوتھی وجہ

مرزا قادیانی نے ''مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' سے تہمت سے پاک کرنا مراد بتائی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برأت تو بے شک مسلّم وثابت ہے۔ مگر اس آیت میں اس ''تطهیر'' سے مراد یہ نہیں۔ بلکہ کفار کے مکروں سے پیغمبر برحق کو محفوظ وپاک رکھنا مراد ہے۔ اس کی تفصیل بھی (حصہ اوّل) میں اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

اس بیان وتفصیل سے ثابت وروشن ہوگیا کہ مرزا قادیانی نے اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول ثابت نہ ہوئی۔

قسم اوّل سے دوسری آیت: ''وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ

(مائدہ:۱۱۷) ‘‘(حصہ اوّل) میں آیت:’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘اور آیت: ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ کی تفسیر میں امور مندرجہ ذیل بڑے بسط اور تفصیل کے ساتھ محقق طور پر بیان ہو چکے ہیں۔

۱...... توفی کے حقیقی اور وضعی معنی موت نہیں بلکہ اس کے معنی’’اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا قبض کر لینا اور لے لینا ہیں۔

۲...... چونکہ اس پورا پورا لے لینے کی کئی کیفیتیں اور نوعیں ہیں۔اس لئے توفی کو ایک نوع میں معین کرنے کے لئے قرینہ کا ہونا ضروری ہے۔

۳...... آیات’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘اور’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘قطعی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمی پر دلالت کرتی ہیں اور نیز یہ کہ:’’رَفَعَ اِلَی اللّٰہِ‘‘اور’’رَفَعَ اِلَی السَّمَآءِ‘‘ کے ایک ہی معنی ہیں۔جیسا کہ آیت:’’اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (فاطر:۱۰)‘‘ سے ثابت ہے۔

پس قرآن شریف میں جو توفی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں وارد ہے۔اس کو اس کی نوع رفع میں معین کرنے کے لئے’’رَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘اور’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ‘‘صریح قرینے ہیں۔پس جب ثابت ہو چکا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی رفع آسمانی سے ہوئی تو اب آیت زیر بحث یعنی’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘میں بھی توفی سے مراد رفع آسمانی ہی ہے، نہ کچھ اور۔ کیونکہ یہ اسی قاعدہ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ‘‘کے تحقق و وقوع کی حکایت ہے۔

منصف مزاج ہوش مندوں کے لئے تو اتنا بیان ہی کافی ہے۔مگر کمزور طبیعت کو سمجھانے اور کجرو مخالف پر حجت پوری کرنے کے لئے اس کی خوب بسط سے تفصیل کی جاتی ہے۔سو واضح ہو کہ مرزا قادیانی کا یہ قول ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے (معاذ اللہ اہانت صلیب کے بعد (جو وجاہت کے بالکل منافی ہے) کشمیر کی طرف ہجرت کی اور یہاں ستاسی سال زندہ رہ کر فوت ہوگئے اور شہر سری نگر کے محلہ خانیار میں دفن کئے گئے۔ جہاں ابھی تک ان کی قبر شہزادہ یوز آسف کی قبر کے نام سے مشہور ہے۔(شائقین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کی بابت رسالہ’’الخبر الصحیح عن قبر المسیح‘‘ملاحظہ فرمائیں)

اس بیان سے مرزا قادیانی نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارا اور اپنے برخلاف حجت پوری کرائی۔ اس اجمال کا بیان اس طرح ہے کہ کلمہ ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ'' سوال الٰہی ''أَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' کے جواب میں واقع ہے۔ پس اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں لے سکتے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کو اہل کشمیر نے خدا اور خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اہل شام اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں نے۔ پس بموجب قول مرزا قادیانی اہل شام (جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے سوائے معبود جانا) کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آپ کی وفات سے ستاسی سال پیشتر منقطع ہو چکی تھی اور اس عرصہ ستاسی سال کی حیات (مزعومہ مرزا قادیانی) میں آپ علیہ السلام کو اہل شام کے عقائد باطلہ کی کوئی خبر نہیں کہ پیچھے انہوں نے کیا بنا لیا۔ پس سوال ''أَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' کے جواب میں عذر موت صحیح نہیں۔ بلکہ ہجرت کشمیر کا عذر کرنا چاہئے۔ جب اس صورت میں ایک خدائے تعالیٰ کے سکھائے ہوئے پیغمبر برحق کے جواب میں قدح وضعف واقع ہے تو بالضرور معلوم ہوا کہ اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں اور چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کا بوجہ آسمان پر اٹھائے جانے کے نصاریٰ کے باطل اعتقادوں سے بے خبر ہو جانا ایک صحیح عذر اور باصواب جواب ہے اور یہ ثابت بھی ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی آسمان پر اٹھائے جانے سے ہوئی تو اب ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' کے معنی رفعتنی ہوں گے۔ یعنی آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اے الٰہی جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھا لیا تو اس عرصۂ مرفوعیت میں مجھے ان کے عقائد کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جملہ تفاسیر معتبرہ میں اس مقام پر ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' سے مراد ''رَفَعْتَنِیْ'' لکھا ہے۔ اس سے کسی کو خلاف نہیں۔ ہم بہت خوشی سے قبول کریں گے۔ اگر مرزا قادیانی کسی صحابی سے ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' سے سوائے ''رَفَعْتَنِیْ'' کے کچھ اور مراد نقل کر کے دکھائیں گے۔

اب ذیل میں چند معتبرہ تفاسیر کی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں، جن میں ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' کے معنی جو اس آیت میں ہے ''رَفَعْتَنِیْ'' لکھے ہیں:

۱...... ''(فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ) بالرفع الی السمآء کما فی قوله تعالیٰ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ان التوفّی اخذ الشئ وافیاً والموت نوع منه قال تعالیٰ اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (تفسیر علامه ابی السعود)'' یہی عبارت تفسیر بیضاوی وسراج منیر میں ہے۔

۲...... ’’(فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ) بالرفع الى السمآء والتوفى اخذ الشئ وافياً (تفسير جامع البيان)‘‘

۳...... ’’(فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ) اراد اعلائه مصاعد السمآء انتهىٰ (تفسير فيضى)‘‘

۴...... ’’(فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ)يعنى فلمّا رفعتنى الى السمآء فالمراد به وفاة الرفع لا الموت (تفسير خازن)‘‘

۵...... ’’فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ والمراد منه وفاة الرفع الى السمآء من قوله تعالىٰ اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ (تفسير كبير)‘‘

۶...... ’’(فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ) قبضتنى ورفعتنى اليك (تفسير معالم)‘‘

ان سب عبارات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں توفی سے مراد آسمان کی طرف اٹھالینا ہے، موت نہیں۔ کیونکہ توفی کے معنی کسی چیز کو پوراپورا لے لینا ہے اور موت اس کی نوع ہے اور چونکہ آیت: ’’اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ‘‘ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ترقی سے مراد ان کا آسمان پر اٹھایا جانا ہے تو اب اس آیت کے معنی بھی وہی ہوں گے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ: ’’جب عیسیٰ علیہ السلام بموجب عقیدہ اہل سنت دوسری دفعہ نزول فرما ہوں گے تو نصاریٰ کے افتراؤں اور برے اعتقادوں سے باخبر ہو جائیں گے اور اہل سنت کے نزدیک یہ سوال وجواب بھی قیامت کو ہوں گے تو پھر اس صورت میں قول: ’’كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (المائدة:۱۱۷)‘‘ سے عدم اطلاع کا عذر صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے اور نیز یہ کہ یہ سوال وجواب قیامت کو نہیں ہوگا، بلکہ عالم برزخ میں ہو چکا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کا اقرار کر چکے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نصاریٰ وغیرہ بندوں کے اقوال وافعال پر مطلع ہونے کے دو موقع ہیں اور دونوں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ اوّل: آسمان پر اٹھائے جانے سے پیشتر تبلیغ رسالت کے وقت۔ دوم: آسمان سے نازل ہونے کے بعد اور یہ امر ظاہر ومسلّم ہے کہ نصاریٰ کے اعتقاد ان دونوں زمانوں کی درمیانی مدت میں بگڑے ہوئے ہیں۔ سو آپ کا قول ’’كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (المائدة:۱۱۷)‘‘ یاالٰہی! جب تم میں ان میں رہا، ان کے اقوال وافعال کو دیکھتا سنتا رہا، ان دونوں زمانوں پر شامل ہے اور ’’فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ

(المائدۃ:۱۱۷)‘‘(یعنی جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھالیا تو پھر تو ہی ان کا نگہبان رہا۔یعنی اس عرصہ کی بابت مجھے کچھ علم نہیں) سے درمیانی زمانہ یعنی پہلی اور دوسری بار کی درمیانی مدت رفع میں نصاریٰ کے اقوال وافعال سے واقف نہ ہونے کا اظہار مقصود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اورنزول ثانی اوراس کے بعد قیامت کو یہود ونصاریٰ پر آپ کی شہادت کے لئے یہ آیت قرآن شریف میں موجود ہے۔

’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (نساء:۱۵۹)‘‘اوراہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا،مگرحضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کی موت سے پیشتر ایمان لے آئے گااورآپ قیامت کے دن ان پرشاہد ہوں گے۔

صحیح بخاری باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام میں اسی آیت کو دلیل نزول ثانی ذکر کیا گیاہے۔چنانچہ حدیث یہ ہے:’’عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمْ اِبْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتِلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضُ الْمَالَ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ[۱] ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ

۱ قولہ:’’فَاقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ‘‘ناظرین نے ملاحظہ فرمالیا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو حدیث روایت کی ہے۔اس کے مضمون کی تصدیق کے لئے وہی آیت قرآنی پیش کرتے ہیں۔اس سے صاف ثابت ہوا کہ مسیح موعود وہی ہے،جس کا ذکر اس آیت میں ہے نہ کہ کوئی دیگر مثیل۔پس چونکہ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی اللہ کا ذکر ہے۔اس لئے مرزا قادیانی مسیح موعود نہیں ہوسکتے۔

مرزا قادیانی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس استدلال کے قبول کرنے میں دو عذر پیش کرتے ہیں۔اوّل: یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا فہم ہے اورصحابی کا فہم حجت نہیں ہوتا۔دوم: یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ’’اِنْ شِئْتُمْ‘‘ کہتے ہیں اورکلمہ ان شرطیہ شک کے لئے ہوتاہے۔

عذراوّل کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کی تصدیق کے لئے اس آیت کو پیش کرنا دوحال سے خالی نہیں یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر کہاہے اوریا اپنے فہم واجتہاد سے۔پہلی صورت میں تو مرزا قادیانی کو انکار کی مجال نہیں۔ہاں! دوسری صورت میں کچھ گنجائش سمجھتے ہیں۔سو اس کا بیان اسی طرح ہے کہ قرآن شریف میں سے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ماخذ بیان کرنا اوران میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (صحیح بخاری ج ۲) ''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ وقت قریب آتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تم میں ضرور ضرور اتریں گے۔ فیصلہ کرنے والے ہوکر، منصف ہوکر۔ پس صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیروں کو قتل کرائیں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے اور مال ودولت اس کثرت سے ہو جائے گی کی اس کو کوئی قبول بھی نہ کرے گا۔ حتی کہ ایک سجدہ دنیا کی سب چیزوں سے بہتر خیال کیا جائے گا۔ پھر ابوہریرہؓ کہتے ہیں، اگر تم چاہو تو (اس حدیث کی تصدیق کے لئے) یہ آیت پڑھ لو۔ ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ''

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) آپس میں تطبیق وتوفیق دینا ایک موہبی اور خداداد ملکہ ہے، جو عارفان کتاب اللہ وواقفان حدیث رسول اللہ ﷺ سے مخفی نہیں اور علم دینی کا کمال اور طبیعت کی ذہانت اسی وصف سے ہے۔ چنانچہ امام ابن قیم جو اسی مذاق کے ہیں۔

اپنی کتاب ''زادالمعاد'' میں فرماتے ہیں: ''وَكَانَ الصَّحَابَةُ رضی اللہ عنہم اَحْرَصَ شَیْءٍ عَلٰی اِسْتِنْبَاطِ اَحَادِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْقُرْآنِ وَمَنْ اَلْزَمَ نَفْسَهٗ ذٰلِکَ وَقَرَعَ بَابَهٗ وَوَجَّهَ قَلْبَهٗ اِلَيْهِ وَاعْتَنٰی بِهٖ بِفِطْرَةٍ سَلِيْمَةٍ وَقَلْبٍ زَكِیٍّ رَاَی السُّنَّةَ كُلَّهَا تَفْصِيْلًا لِلْقُرْآنِ وَتَبْيِيْنًا لِّدَلَالَاتِهٖ وَبَيَانًا لِّمُرَادِاللّٰهِ مِنْهُ وَهٰذَا اَعْلٰی مَرَاتِبِ الْعِلْمِ فَمَنْ ظَفَرَ بِهٖ فَلْيَحْمَدِاللّٰهَ وَمَنْ فَاتَهٗ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ وَهِمَّتَهٗ وَعِجْزَهٗ (زاد المعاد ج ۲ ص ۱۷۵) ''اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اس امر کے بہت حریص تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا قرآن شریف سے استنباط کیا کریں اور جو کوئی اس کو لازم پکڑے اور اس کا دروازہ کھٹکھٹائے اور اپنے دل کو اس طرف متوجہ کرے اور فطرت سلیمہ اور پاکیزہ دل کو اس کی تلاش میں لگائے تو جان لے گا کہ سنت نبویہ ﷺ ساری کی ساری قرآن کی تفصیل ہے اور اس کے معنی اور مرادوں کا بیان ہے۔ یہ امر علم کے مراتب میں سے اعلیٰ مرتبہ کا ہے۔ پس جو اس سے کامیاب ہوا سے چاہئے کہ خدا کا شکر کرے اور جسے ہاتھ نہ لگے وہ اپنے نفس اور ہمت اور کمزوری کے سوائے کسی اور کو ملامت نہ کرے۔ واقفان حدیث نبوی پر مخفی نہیں کہ آنحضرت ﷺ بسا اوقات کوئی مسئلہ بیان فرما کر اس کے موافق قرآن شریف کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی عادت تھی کہ اس حدیث کو مع اس آیت کے حوالہ کے روایت کیا کرتے تھے اور یہ بات چنداں نظر کی محتاج نہیں۔ کیونکہ یہ امر کہ نبی ﷺ کسی مسئلہ کی تصدیق کے لئے آیت قرآنی پڑھا کرتے تھے۔ تب ہی معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ویسی حدیث روایت کی۔ فافہم! (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ‘‘ کو نزول عیسیٰ علیہ السلام سے بدیں وجہ تعلق ہے کہ آیت: ’’وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (المائدۃ:۱۱۷)‘‘ (یعنی میں ان کے اعمال واقوال کو دیکھتا سنتا رہا، جب تک ان کے بیچ رہا) سے صاف ثابت ہے کہ شاہد کا اس جماعت میں ہونا ضروری ہے۔ جس پر اس نے شہادت دینی ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۲۲۲) اسی طرح ماہرین حدیث پر یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ جس طرح روایت کے رو سے سب سے اوّل نمبر پر ہیں۔ اسی طرح اس وصف یعنی تصدیق حدیث کے لئے آیت کے بیان کرنے میں بھی آپ ایک خاص مذاق رکھتے تھے۔ آپ کی روایات میں اکثر جگہ قرآن شریف کی آیت سے استدلال کرنا پایا جاتا ہے۔ کسی جگہ تو اس آیت کا حوالہ رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر کے دیتے ہیں اور کسی جگہ آیت کے حوالہ پر بس کرتے ہیں اور اسے رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ ان دونوں طریقوں پر غور وفکر کرنے سے ایک سوچنے والا ہوش مند آدمی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جس طرح حضرت ابوہریرہؓ حدیث کو خاص پیغمبر ﷺ سے بالمشافہ روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح روایت کا حوالہ بھی نبی ﷺ کی زبان مبارک سے روایت کرتے ہیں۔ چاہے اس کی تصریح کر دیں، چاہے نہ کریں۔ کیونکہ غیر مصرح بھی اسی کے قریب ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سن کر کہا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم بغیر نبی ﷺ سے سننے کے کچھ بات اپنی طرف سے کرنے سے بہت پرہیز کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ کتب حدیث کے مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہے۔ خصوصاً ایسے امور میں جن میں رائے بعض اور اجتہاد وقیاس کو دخل نہیں۔ مثلاً پیشین گوئی وغیرہ۔ ان میں تو صحابی کا قول حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ پس اس حدیث نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی تصدیق کے لئے حضرت ابوہریرہؓ کا آیت قرآن ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ‘‘ سے استدلال کرنا علاوہ بہت باریک نکتہ ہونے کے نبی ﷺ کے پاک ارشاد سے باہر نہیں۔

اب ذیل میں چند احادیث بطور نمونہ ذکر کی جاتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوگا کہ تصدیق حدیث کے لئے آیت قرآنی کا حوالہ دینا حضرت ابوہریرہؓ کے خاص مذاق میں تھا اور نیز یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کسی حدیث میں اس حوالہ آیت کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کبھی صرف حوالے ہی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

حدیث اوّل

’’عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِهَا فَاِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ اٰمَنَ مَنْ عَلَيْهَا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پس جب آیت:''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ''(یعنی نہیں ہوگا کوئی اہل کتاب میں سے مگر ایمان لے آئے گا عیسیٰ علیہ السلام پر پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر شاہد ہوں گے) سے ان اہل کتاب پر جو زمانہ اخیر میں ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سچا ایمان لے آئیں گے۔ بروز قیامت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ کے لوگوں میں آئیں گے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى هٰذَا التَّوْفِيْقِ! ان شاءاللہ! اس آیت کی پوری تفسیر باب نزول المسیح میں کی جائے گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۲۲۲) فَذٰلِكَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْكَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (مسند امام احمد ج ۲ ص ۱۳۱) ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ قیامت قائم نہ ہوگی۔ جب تک آفتاب مغرب سے نہ چڑھے گا اور لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو سب لوگ ایمان لائیں گے۔ پس یہ وہ وقت ہوگا کہ کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا، جو پہلے ایمان نہ لایا تھا یا جس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کی تھی۔

حدیث دوم

''عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ اِلَّا نَخَسَهُ الشَّيْطٰنُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِّنْ نَّخْسَةِ الشَّيْطَانِ اِلَّا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ ثُمَّ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اِقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ اِنِّيْ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (مسند احمد ج۲ ص۲۳۳)'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو کوئی پیدا ہوتا ہے، شیطان پیدائش کے وقت اس کو ایذا دیتا ہے۔ پس وہ چیختا ہے۔ مگر ابن مریم اور اس کی ماں کو شیطان یہ ایذا نہیں دے سکا۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو'اِنِّيْ اُعِيْذُهَا بِكَ. الاية''

حدیث سوم

''عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ تَفْضُلُ الصَّلٰوةُ فِي الْجَمِيْعِ عَلٰى صَلٰوةِ الرَّجُلِ وَحْدَهٗ خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ وَيَجْتَمِعُ مَلَائِكَةُ الَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۳۳) ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا باجماعت نماز اکیلے شخص کی نماز سے پچیس درجے بڑھ کر ہے اور فجر کی نماز میں دن اور رات کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب اس سوال کی دوسری شق یعنی اللہ تعالیٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سوال ’’أَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ‘‘ قیامت کے روز کہنے کی مزید تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اوّل: ’’اذ‘‘ اور ’’اذا‘‘ دو کلمے ظروف زمانیہ میں سے ہیں۔ ’’اذ‘‘ ماضی کے لئے آتا ہے اور کبھی بمعنی مستقبل بھی مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ’’اذا‘‘ مستقبل کے لئے اور کبھی ماضی کے لئے بھی آتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۲۲۲) فرشتے اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر چاہو تو قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ لو ’’وَقُرْآنَ الْفَجْرِ...... الخ!‘‘

حدیث چہارم

’’فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ رَوَاهُ اَبُوْهُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْحُمُرِ فَقَالَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیَّ فِیْهَا اِلَّا الْاٰیَةَ الْفَاذَّةَ الْجَامِعَةَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۳۴) ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھے کی بابت پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر اس بارے میں کوئی خاص حکم نازل نہیں ہوا۔ مگر یہی ایک جامع آیت ’’فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ...... الخ!‘‘

حدیث پنجم

’’عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ حَتّٰی اِذَا فَرَغَ مِنْ خَلْقِهٖ قَالَتِ الرَّحِمُ هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِکَ مِنَ الْقَطِیْعَةِ قَالَ نَعَمْ اَمَا تَرْضَیْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَکِ وَاَقْطَعُ مَنْ قَطَعَکِ قَالَتْ بَلٰی یَا رَبِّ قَالَ فَهُوَ لَکِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَاقْرَئُوْا اِنْ شِئْتُمْ فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَکُمْ (صحیح بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله) ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مثالی طور پر) فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کر لیا تو رحم (رشتے داروں کے ساتھ پیوند رکھنے کے علاقہ) نے کہا کہ الٰہی میں تیرے ساتھ رشتہ قطع کرنے والوں سے پناہ مانگنے والا حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو اس پر راضی نہیں کہ میں اپنی رضا اس پر رکھوں جو تیرے پیوند کو قائم رکھے اور جو تجھے قطع کرے۔ میں بھی اس سے قطع کر دوں؟ کہا ہاں! اے میرے رب! فرمایا: پس یہ ہو چکا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر چاہو تو آیت قرآنی پڑھ لو ’’فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ (محمد: ۲۲)‘‘ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چنانچہ مغنی میں بحث ’’اذا‘‘ میں لکھا ہے: ’’اَحَدُھُمَا اَنْ تَجِیْءَ لِلْمَاضِیْ کَمَا تَجِیْءُ اِذْ لِلْمُسْتَقْبِلِ ‘‘ مثال ’’اذا‘‘ بمعنی ’’اذ‘‘ آیت: ’’وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَھْوَ نِ انْفَضُّوْا اِلَیْھَا وَتَرَکُوْکَ قَائِمًا (جمعہ:۱۱)‘‘ ترجمہ اور جس وقت انہوں نے تجارت یا کھیل کا سامان دیکھا تو اس کی طرف اٹھ گئے اور تجھے کھڑے چھوڑ دیا۔

اور نیز آیت: ’’حَتّٰی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ (توبہ:۱۱۸)‘‘ ترجمہ: حتیٰ کہ جس وقت زمین ان پر باوجود فراخ ہونے کے تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان کو گراں معلوم ہوئیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۲۲۲) ناظرین! خود غور فرمالیں کہ ان احادیث سے وہ سب امور جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں، ثابت ہوتے ہیں یا نہیں؟

باقی رہا دوسرا عذر یعنی ان شرطیہ شک کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا یہ استدلال شکی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت ابوہریرہؓ کے کلمہ ’’اِنْ شِئْتُمْ‘‘ کہنے سے اس استدلال کو شک کی طرف نسبت کر سکتے ہیں تو یہی کلمہ ’’اِنْ شِئْتُمْ‘‘ اسی طرح تصدیق حدیث کے لئے آیت قرآنی کا حوالہ دیتے وقت خاص رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے اوپر کی حدیثوں میں سے پانچویں حدیث صلہ رحم میں گزر چکا ہے۔ پس اس نظر سے تو معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ ناطق بالوحی کے استدلال کو بھی شک کی طرف نسبت کرسکنا منع نہ ہوگا ’’وَھَلْ ھٰذِہٖ اِلَّا جُرْاَۃٌ عَظِیْمَۃٌ وَفِرْیَۃٌ فَخِیْمَۃٌ‘‘ اصل بات یہ ہے کہ ایسے مواقع پر کلمہ ’’اِنْ شِئْتُمْ‘‘ اس بات کے لئے نہیں ہوتا کہ متکلم کو اپنے کلام کی تصدیق میں شک وتردد ہے۔ بلکہ مخاطبین کے حال کی نسبت یہ خیال کر کے کہ وہ زیادہ علم اور دلیل کے طالب ہیں۔ ان کی مزید اطمینان کے لئے آیت قرآنی کو پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال میں ’’وَلٰکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ‘‘ یعنی یاالٰہی! اس لئے نہیں پوچھتا کہ مجھے مردوں کے زندہ ہوجانے میں کچھ شک ہے، نہیں زیادہ اطمینان اور تسلی دل کے لئے پوچھتا ہوں۔

جو لوگ علوم میں گہری نگاہ رکھتے ہیں اور مذاق صحیح اور فطرت سلیم والے ہیں۔ وہ اس مسئلہ کو خوب پہچانتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی سلامتی اپنے حال پر نہیں رہی اور کجروی اور تعصب سے ان کا مذاق صحیح جاتا رہا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آنے سے یہ بات غلط نہیں ہوسکتی:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

مثال اوّل: ’’اذ‘‘ بمعنی ’’اذا‘‘ یعنی مستقبل آیت: ’’فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ اِذِا لْاَغْلَالُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ (مومن: ۷۰، ۷۱)‘‘ ترجمہ: پس یہ لوگ اس وقت ضرور جان لیں گے۔ جب ان کی گردنوں میں طوق پڑیں گے۔ کیونکہ سوف جو خاص استقبال کے لئے موضوع ہے قرینہ موجود ہے۔

مثال دوم:

اِذْ مَا دَخَلْتَ عَلَى الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَهٗ حَقًّا عَلَيْکَ اِذَا اطْمَاَنَّ الْمَجْلِسُ

(مفصل زمخشری)

کیونکہ صیغۂ امر اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ ’’اذ‘‘ بمعنی ’’اذا‘‘ ہے۔

مثال سوم:

ثُمَّ جَزَاکَ اللّٰهُ عَنِّیْ اِذْ جَزٰی جَنّٰتِ عَدْنٍ فِی السَّمٰوٰتِ الْعُلٰی

ترجمہ: جب خدا تعالیٰ جزا دینے لگے تو تجھ کو میری طرف سے اونچے آسمانوں میں جنتیں عطاء کرے۔ اس جگہ بھی ’’اذ‘‘ بمعنی ’’اذا‘‘ مستعمل ہوا ہے۔ بقرینہ ’’جَنّٰتِ عَدْنٍ ‘‘ کیونکہ یہ سب قیامت کو ہوگا اور قیامت زمان مستقبل میں ہوگی نہ کہ ماضی میں ہوچکی ہے۔

(تفسیر خازن وقسطلانی شرح صحیح بخاری)

اسی طرح قرآن وحدیث وکتب ادب میں اس کی بہت مثالیں ہیں کہ ’’اذ‘‘ بمعنی ’’اذا‘‘ مستعمل ہوتا ہے اور ’’اذا‘‘ بمعنی ’’اذ‘‘۔ کتب نحو بھی اس کی تائید سے بھری پڑی ہیں۔ طالب تفصیل شرح ملّا جامی، رضی شرح کافیہ، تکملہ مولانا وفخرنا مولوی صاحب سیالکوٹی (ملّا عبدالحکیم) کا مطالعہ کرے۔

وجہ دوم

مضمون آیت: ’’وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یَا عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ أَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ:۱۱۶)‘‘ عطف ہے۔ مضمون آیت: ’’اِذْ قَالَ اللّٰهُ یَا عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ (المائدہ:۱۱۰)‘‘ پر اور اس سے پہلے جہاں سے یہ ذکر شروع ہوتا ہے یہ ہے ’’یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَا اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (مائدہ:۱۰۹)‘‘ یعنی جس

دن اللہ تعالیٰ کل رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ لوگوں نے تم کو کیسے قبول کیا اور کیا کچھ کہا تو وہ کہیں گے کہ الٰہی (ہم کو لوگوں کی نیتوں کی حقیقت اور ان کے دلوں کے رازوں کا) کوئی علم نہیں۔ ہر بات کی حقیقت و راز سے واقف ہونا تیرا ہی خاصہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو خاص طور پر خطاب کر کے کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! میری وہ خاص نعمتیں یاد کر جو میں نے تجھ پر اور تیری والدہ پر انعام کیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ سب نعمتیں ذکر کی ہیں اور نعمتوں کے ذکر کے بعد اصل مقصود کا بیان فرمایا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا لوگوں کو تو نے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوائے معبود مقرر کرلو۔

اب ''یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ'' سے تو صاف معلوم ہوگیا کہ یہ سارا معاملہ اس دن ہوگا، جس دن اللہ تعالیٰ کل رسولوں کو جمع کرے گا اور وہ دن سوائے قیامت کے کون سا ہو سکتا ہے۔ اس کے نظائر قرآن شریف میں بکثرت ہیں۔

مثلاً: ''فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ (اعراف:۶)'' یعنی جن لوگوں کی طرف ہم نے رسول بھیجے ہیں، ان کو اور خود رسولوں کو بھی ہم ضرور ضرور پوچھیں گے۔

اور ''یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ (بنی اسرائیل:۷۱)'' یعنی جس دن ہم لوگوں کو ان کے امام (نبی وقت) سمیت بلائیں گے۔

اور ''یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ (فرقان:۱۷)'' یعنی جس دن اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو اور جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوائے عبادت کرتے ہیں، ان سب کو جمع کرے گا تو ان سے کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود گمراہ ہوگئے تھے۔

اور ''وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلَائِکَةِ هٰؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ (سبا:۴۰)'' یعنی جس دن اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو جمع کرے گا تو فرشتوں سے مخاطب ہوکر کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟

یہ سب آیتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوائے معبود بنائے گئے ہیں، ان کو یہ سوال قیامت کو پوچھا جائے گا اور اس دن پیغمبروں کو بھی تبلیغ اور لوگوں کی قبولیت کی بابت پوچھا جائے گا تو چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی پیغمبر برحق ہیں اور نیز اللہ تعالیٰ کے

سوائے معبود بھی مانے گئے ہیں۔ اس لئے ان کو یہ سوال بروز قیامت ہوگا نہ کہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دیگر یہ کہ اس سارے مذکور کے بعد ''هٰذَا يَوْمَ يَنْفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ:۱۱۹) ''موجود ہے۔ یعنی یہ وہ دن ہے جس دن صادقوں کو ان کا صدق نفع پہنچائے گا۔ اور یہ بھی قیامت ہی کا روز ہے۔

لوگوں اور رسولوں سے یہ سوال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسول وقت کے سامنے اس کی امت پر تبلیغ رسالت ثابت کی جا کر ان پر حجت پوری کی جائے تاکہ عذاب میں گرفتار ہونے کی صورت میں کوئی عذر نہ کر سکیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ بطور استفہام کے سوال کرنے سے پاک ہے۔ پس اسی طرح نصاریٰ کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کو یہ سوال کرنا کہ کیا تو نے ان کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوائے معبود مان لو۔ اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے روبرو تبلیغ رسالت اور تعلیم توحید کی شہادت دیں اور نصاریٰ مشرکین پر الزام قائم ہو کر حجت پوری کی جائے۔ پس ضروری ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت دونوں حاضر ہوں اور یہ حاضری وسوال وجواب قیامت سے پہلے نہیں ہو سکتے۔ کیا (معاذ اللہ) رسول برحق حضرت مسیح علیہ السلام بری از الزام کو شرمندہ کرنا مقصود ہے کہ ان کی امت کی غیر حاضری میں عالم برزخ میں سوال کیا جائے۔ پس ان سب اگلے اور پچھلے قرائن اور دلائل سے صاف روشن ہو گیا کہ یہ سوال قیامت کو ہوگا اور سب سے بڑھ کر آیت سورہ نساء:۱۵۹ ''وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ''یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان (اہل کتاب) پر شاہد ہوں گے۔ تصریح روز قیامت میں ایسی عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ اس سے زیادہ صراحت کیا ہو کہ اللہ تعالیٰ ''يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' کا لفظ فرمادے۔ سبحان ربّنا، ربّنا اٰمنّا!

وجہ سوم

اس سوال کے قیامت کو ہونے کی، صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت: ''اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (المائدہ:۱۱۶) ''میں قال بمعنی یقول ہے۔ یعنی بمعنی مستقبل ہے اور جمہور مفسرین نے بھی اس امر کو تحقیق کیا ہے۔ مثلاً تفسیر خازن، تفسیر سراج منیر وغیرہ وغیرہ اور شارحین صحیحین بخاری مثلاً حافظ ابن حجر اور علامہ قسطلانی اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ حنفی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ بلکہ حافظ عماد الدین ابن

کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں ایک مرفوع حدیث بھی لکھی ہے کہ: ’’قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَةِ دُعِیَ بِالْاَنْبِیَاءِ وَاُمَمِهِمْ ثُمَّ یُدْعٰی یَا عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ فَیُذَکِّرُهُ اللّٰهُ نِعْمَتَهٗ عَلَیْهِ فَیُقِرُّبِهَا فَیَقُوْلُ یٰعِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ الاٰیة ثُمَّ یَقُوْلُ أَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیُنْکِرُ اَنْ یَّکُوْنَ قَالَ ذٰلِکَ (الحدیث) (ابن کثیر) ‘‘جب قیامت کا دن ہوگا کہ کل نبیوں اور امتوں کو بلایا جائے گا۔ پھر خاص طور پر عیسیٰ علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ وہ نعمتیں جو اس نے ان پر کی ہیں، ان کو یاد کرائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اقرار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تجھ پر اور تیری ماں پر انعام کیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوائے دو معبود مان لو؟ پس عیسیٰ علیہ السلام اس بات کے کہنے سے انکار کریں گے۔

پس جب خود اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ’’یَوْمَ الْقِیَامَةِ ‘‘ کی تصریح کر دے اور اس کا رسول بھی فرمادے اور علماء بھی اس کی تحقیق کریں اور کتب نحو اور آیات قرآنی اور محاورات زبان بھی ’’اذ‘‘ کے معنی مستقبل ہونے کی شہادت دیں تو اب اس کا انکار سوائے ضلالت کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَال

سوال: اگر کوئی یہ سوال کہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ روز قیامت کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ: ’’یُؤْخَذُ بِرِّجَالٍ مِنْ اَصْحَابِیْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ فَاَقُوْلُ اُصَیْحَابِیْ فَیُقَالُ اِنَّهُمْ لَمْ یَزَالُوْا مُرْتَدِّیْنَ عَلٰی اَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ فَاَقُوْلُ کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ الایة (صحیح بخاری) ‘‘میری امت کے کچھ لوگوں کو دائیں بائیں سے پکڑا جائے گا تو میں کہوں گا، ہیں؟ یہ تو میری امت کے لوگ ہیں تو مجھے کہا جائے گا کہ نہیں یہ وہ ہیں کہ جب سے تو ان سے جدا ہوا (یعنی فوت ہوا) یہ دین سے برگشتہ ہوکر (موت تک) مرتد ہی رہے تو میں کہوں گا جس طرح کہا ہوگا عبد صالح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے کہ الٰہی میں تو ان پر شاہد اس وقت تک رہا جب تک میں ان کے بیچ موجود رہا۔ جب تو نے مجھے بھرلیا تو صرف تو ہی ان پر نگہبان تھا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال وجواب ہو چکا ہوا ہے۔ کیونکہ الفاظ حدیث یہ ہیں: ''فَاَقُوْلُ کَمَا قَالَ'' اور قال فعل ماضی ہے اور نیز اس حدیث سے یہ حاصل ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی موت سے ہوئی۔ کیونکہ جو الفاظ یعنی ''فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ'' عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہیں وہی نبی ﷺ کہیں گے اور معلوم ہے کہ نبی ﷺ کی توفی موت سے ہوئی۔ ''هٰذَا تَقْرِیْرُ السَّوَالِ''

جواب: اس سوال کا کئی وجوہ سے ہے۔ اوّل یہ کہ الفاظ: ''فَاَقُوْلُ کَمَا قَالَ'' میں قال کو بلفظ ماضی ذکر کرنا بنا بر حکایت ہے۔ اس قول سے جو قرآن شریف میں مذکور ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ: ''کہوں گا میں جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ وہ یہ کہیں گے۔ دیگر یہ کہ صحیح بخاری ہی سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس جگہ قال بمعنی یقول یعنی ماضی بمعنی مستقبل ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے ''پس میں کہوں گا، جس طرح کہے گا عبد صالح عیسیٰ علیہ السلام'' دیگر یہ کہ جب صحیح بخاری سے ثابت ہو چکا کہ اس جگہ ماضی بمعنی مستقبل ہے تو قیامت کو رسول اللہ ﷺ کا قول عیسیٰ علیہ السلام کے قول سے پہلے ہوگا یا پیچھے۔ اگر پہلے ہوگا تو معنی ہوں گے ''کہوں گا میں جس طرح کہے گا عیسیٰ علیہ السلام'' اور اگر پیچھے ہوگا تو معنی یہ ہوں گے ''کہوں گا میں جس طرح کہا ہوگا عیسیٰ علیہ السلام نے۔''

پس اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بہ نسبت نبی ﷺ کے قول کے قیامت ہی کو زمانہ ماضی میں ہو چکا ہوگا۔ پس قال کو ماضی کے صیغے سے ذکر کرنے سے اس قول کا قیامت سے پیشتر واقع ہونا ثابت نہ ہوا۔ دیگر لفظ ماضی کو یقول مستقبل کے معنی میں لینا خلاف قاعدہ نہیں۔ بلکہ یہ تو زبان کا ایک عام قاعدہ ہے کہ جو امر ضرور ضرور واقع ہو جانا ہو۔ اس کو صیغہ ماضی سے بیان کرتے ہیں۔ گویا اس کو دوسرے کی نظر میں ہوا ہوا جتانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن شریف اور دیگر کتابوں میں بکثرت ہیں اور نحویوں کے نزدیک اس مسئلہ کا نام ''نُفِخَ فِیْ الصُّوْرِ'' ہے۔ یعنی جس طرح آیت: ''نُفِخَ فِیْ الصُّوْرِ'' میں نفخ فعل ماضی ہے اور معنی اس کے ینفخ فعل مستقبل کے ہیں۔ یہ لفظ جو فعل ماضی سے مستعمل ہوا ہے ایسا ہی ہے۔

مستقبل کو بہ سبب تحقق ووقوع کے لفظ ماضی سے تعبیر کرنا زبان عربی ہی کا خاصہ نہیں بلکہ ہر زبان میں یہ محاورہ عام پایا جاتا ہے۔ جیسے ہماری اپنی ہندی زبان میں جب کوئی کسی کو

بلاتا ہے تو دوسرا شخص ان لفظوں سے جواب دیتا ہے۔ ’’جی آیا جی‘‘ حالانکہ وہ ابھی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب کوئی کسی کو کسی کام پر بھیجے اور سخت تاکید سے کہے جلدی جانا اور شتاب واپس آنا تو اس کی تسلی کے لئے اور اپنی مستعدی اور شتابی ظاہر کرنے کے لئے اس کو یہ کہا جاتا ہے: ’’بس جی یہ گیا اور وہ آیا‘‘ حالانکہ وہ اس کے روبرو ہی یہ سب کچھ کہہ سن رہا ہوتا ہے۔ یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ تا مخاطب کو اس امر کا ضرور ضرور واقع ہو جانا متیقن ہو جائے۔ پس آیت: ’’اِذْ قَالَ اللّٰہُ‘‘ میں بھی صیغہ ماضی کا ذکر کرنا اسی قبیل سے ہے۔ اس جگہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا قادیانی نے اپنے ازالہ میں جو کچھ ’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ میں لکھا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اذ جب ماضی پر داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی ماضی کے ہوتے ہیں۔ اگر ان کی یہی مراد ہے تو ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی علم نحو میں پختہ نہیں ہیں۔ صرف سادے طور پر چند مسائل جانتے ہیں اور اس علم کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں۔

ثبوت اس کا یہ ہے کہ اذ کے مدخول علیہ کی ماضویت کی کوئی خصوصیت نہیں خواہ اس کا مدخول علیہ صیغہ ماضی ہو، خواہ صیغہ مضارع۔ یہ لفظ بحسب الوضع معنی ماضی میں ہوتا ہے۔ جیسے ’’وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَرَضٌ (احزاب:۱۲)‘‘ اور کبھی مصروف ’’عَنِ الْمَعْنٰی الْوَضْعِیْ‘‘ ہوکر بمعنی ’’اذا‘‘ مستعمل ہوتا ہے، جیسے کہ ’’اذا‘‘ موضوع ہے مستقبل کے لئے اور کبھی بمعنی ماضی مستعمل ہوتا ہے۔ ’’وَقَدْ تَقَدَّمَ نَظَائِرُ ذٰلِکَ فَلَا طَائِلَ فِی الْاِطَالَۃِ‘‘ (اس کی مثالیں پہلے بیان کی جاچکی ہیں۔ پس اب طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں)

اگر کہا جائے کہ تمہارے اس بیان سے معلوم ہوا کہ اگر اذا مضارع پر بھی آئے۔ تب بھی اس کے معنی ماضی ہوتے ہیں تو اگر ’’اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی‘‘ میں قال بمعنی یقول کہیں تو پھر بھی وہ مضارع ماضی کے معنی میں ہوسکتا ہے تو اس کا جواب دو وجہ سے ہے۔ اوّل یہ کہ اذ مضارع کے لفظ پر داخل ہوکر اس کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے، نہ مضارع کے معنی پر داخل ہوکر۔ اسی لئے تقریر میں صیغہ مضارع کہا گیا ہے اور یہاں آیت میں تو قال لفظ مضارع نہیں۔ بلکہ ماضی بمعنی مضارع ہے اور اس قال کو مضارع کے معنی میں ہونے کی وجہیں پہلے گزر چکی ہیں۔

دوم یہ کہ صحیح بخاری میں اس امر کی بابت لکھا ہے کہ ’’اذ‘‘ صلہ یعنی زائد ہے۔ غرض کسی طرح لو۔ اس قول کا وقوع قیامت ہی کو ہوگا۔

باقی رہی سوال کی شق ثانی یعنی ہر دو پیغمبروں کے لئے لفظ توفی کا آنا اور اس پر لفظ کما کا داخل ہونا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کلمہ کما کے ماقبل و مابعد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر طرح اور ہر وصف اور ہر حکم میں ایک جیسے ہوں بلکہ بسا اوقات ان کی کیفیتوں میں بہت مغائرت ہوتی ہے۔ مثلاً آیت: ’’کَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِیْدُهٗ (انبیاء:۱۰۴)‘‘ یعنی جس طرح ہم نے پہلی دفعہ پیدا کر لیا تھا۔ اسی طرح پھر دوسری دفعہ بھی پیدا کر لیں گے جو اسی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس پہلی دفعہ کی پیدائش اور قیامت کی پیدائش کو کلمہ کما (جس طرح) سے ذکر کیا تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلے گا کہ پہلی دفعہ ماں کے پیٹ سے باپ کے نطفے سے پیدا ہوئے تھے تو پھر قیامت کو بھی اسی طرح پیدا ہوں گے۔ معاذ اللہ! پہلی اور پچھلی پیدائش کی مماثلت صرف اس امر میں جتلائی گئی ہے کہ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہیں۔ جس طرح پہلی دفعہ کی پیدائش کو تم دیکھ چکے، اسی طرح دوسری دفعہ موت کے بعد زندہ کرنا بھی اس خالق علم کی قدرت سے باہر نہیں۔ بلکہ اس میں داخل ہے۔ اسی طرح ’’فَاَقُوْلُ کَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ‘‘ میں جو لفظ کما مذکور ہے۔ وہ تو صرف اس بات کے اظہار کے لئے ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرک کی تعلیم سے برأت حاصل کریں گے، اسی طرح میں بھی برأت حاصل کروں گا اور اس کے نظائر قرآن وحدیث اور کتب ادب میں بکثرت ہیں۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے مان لیا کہ کلمہ کما کے ماقبل و مابعد کا ہر طرح سے ایک دوسرے کا مماثل و مشارک ہونا ضروری نہیں۔ مگر جب کہ دونوں پیغمبروں کے لئے ایک ہی لفظ توفی آیا ہے تو اب ہم کس دلیل سے رسول اللہ ﷺ کی توفی کو تو موت کہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی کو رفع آسمانی سے تعبیر کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ پیچھے خاص کر پہلے باب میں بہت تفصیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ توفی جنس ہے اور موت اور رفع وغیرہ! اس کی انواع ہیں۔ پس جس لفظ کے مفہوم میں کئی معنی ہوں اس کو ایک معنی میں معین کرنے کے لئے قرائن اور حالات مخصوصہ اور دلائل خارجیہ پر نظر کرنی پڑتی ہے۔ جیسے کہ اسی آیت: ’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ سے پیشتر ’’تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ

(مائدہ:۱۱۶) ’’یعنی یا اللہ! میرے نفس میں جو کچھ ہے تو اسے خوب جانتا ہے، لیکن جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ میں اسے ہرگز نہیں جانتا۔ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام (بندے) اور اللہ پاک کے لئے ایک ہی لفظ نفس وارد ہوا ہے تو کیا اس سے یہ لازم آیا کہ معاذ اللہ! عیسیٰ علیہ السلام کا نفس اور پاک اور بے مثل نفس الٰہی ایک جیسے ہیں۔ معاذ اللہ!‘‘ تَعَالٰی اللّٰہُ عَنْ ذٰلِکَ عَلُوًّا کَبِیْرًا!

اسی طرح گو ایک ہی لفظ (توفی) دونوں پیغمبروں کے لئے مستعمل ہے۔ مگر ہر دو کے حالات مخصوصہ جو دلائل خارجیہ سے ثابت ہیں۔ ان پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی رفع آسمانی سے ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کی توفی موت سے ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی بالرفع ہونے کے دلائل حصہ اوّل میں بہ بسط مذکور ہو چکے ہیں۔ جیسے آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (آل عمران:۵۵)‘‘ اور ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ (النساء:۱۵۸)‘‘ طالب تفصیل اس کتاب کا مطالعہ کرے اور رسول اللہ ﷺ کی توفی بالموت کی دلیل حدیث صحیح بخاری جو باب ’’وَفَاتُ النَّبِیِّ ﷺ وَمَرْضِہٖ‘‘ میں موجود ہے اور نیز دیگر احادیث مثلاً نبی ﷺ کے غسل وکفن اور جنازے کی۔

پس آیت: ’’فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ‘‘ سے بھی مرزا قادیانی کی مراد موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے خلاف رفع آسمانی ثابت ہوا۔ فالحمد للہ!

قسم اوّل میں تیسری آیت: ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ ہے۔ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے لئے نص قطعی ہے اور اس کی پوری تفصیل حصہ اوّل میں ہو چکی ہے اور اس کے متعلق مرزا قادیانی کے سب خیالات کو عقلی اور نقلی طریق سے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ اس کے جواب میں اگر مرزائی صاحبان مدتوں سر دھنتے رہیں اور زمانوں کوشش کرتے رہیں تو بھی کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ ان شاء اللہ!

مرزا قادیانی کے طریق استدلال پر تعجب آتا ہے کہ کیسی دلیری اور بے باکی سے آیت: ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ کیا اہل علم ودانش دنیا سے معدوم ہوگئے ہیں:

کس نیاید بزیر سایہ بوم　　　　در ہما از جہاں شود معدوم

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کو ثابت کرنا ایسا ہے جیسے بعض عیسائیوں نے قرآن شریف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنی چاہی ہے۔ جب ہم اس آیت کے متعلق مرزا قادیانی کی تقریر پڑھتے ہیں تو ہمیں بے اختیار ہنسی آتی ہے اور خیال آتا ہے کہ مرزا قادیانی کی حالت دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو آپ علوم عربیہ سے ناواقف ہیں یا جان بوجھ کر ان علوم کا خلاف کرتے ہیں۔

دوسری صورت پر ظن غالب ہے۔ کیونکہ بالفرض اگر خود ناواقف بھی ہوں تو بھی متبحر علماء کے اتنی مدت تک مفید کتابیں تصنیف کرنے سے ایک کم علم انصاف پسند بھی صحیح مراد سے واقف ہو جاتا ہے۔ چہ جائے کہ مرزا قادیانی ہوں جو معارف قرآنیہ کے سب سے بڑھ کر مدعی ہیں۔ مرزا قادیانی نے اس آیت سے موت ثابت کرنے کے لئے جو طریق اختیار کیا ہے وہ علاوہ غلط اور ضعیف ہونے کے خود ان کے مقصود کے بھی خلاف ہے۔

آپ لکھتے ہیں: ’’جاننا چاہئے کہ اس رفع سے مراد وہ موت ہے جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ دوسری آیت اس پر دلالت کرتی ہے۔ ’’وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا‘‘

(ازالہ اوہام ص۵۹۹، خزائن ج۳ ص۴۲۳)

پھر تحریر فرماتے ہیں: ’’لہٰذا یہ امر ثابت ہے کہ رفع سے مراد اس جگہ موت ہے۔ مگر ایسی موت جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ مقربین کے لئے ہوتی ہے کہ بعد موت ان کی روحیں علیّین تک پہنچائی جاتی ہیں۔ ’’فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ‘‘ انتہیٰ!

(ازالہ اوہام ص۵۹۹، ۶۰۰، خزائن ج۳ ص۴۲۴)

مرزا قادیانی کا اصل مقصود یہ ہے کہ اس آیت: ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ‘‘ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی ثابت نہ ہو۔ اسی لئے کئی دفعہ کہا کرتے ہیں کہ جسم عنصری کے اٹھائے جانے کی کوئی دلیل نہیں اور نہ آسمان کی تصریح ہے تو پھر ضرور رفع روحانی اور عزت کی موت مراد لی جائے گی۔

’’ازالہ اوہام‘‘ کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس سے اس امر کا فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہے کہ رفع کے معنی اٹھانا اور الیہ کے معنی آسمان کی طرف مرزا قادیانی کے نزدیک مسلّم ہیں۔ کیونکہ آپ جب ارواح کے اٹھائے جانے کے قائل ہیں تو اس صورت میں رفع کے حقیقی معنی اٹھانا ثابت ہیں اور چونکہ ارواح کا اٹھایا جانا آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ جیسا کہ

آپ بھی اسے علّیین کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے آیت: ’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ‘‘ میں آسمان کی طرف حقیقی طور پر اٹھایا جانا آپ کے نزدیک مسلّم ٹھہرا۔ اب تنازع صرف اس امر میں رہا کہ کیا چیز اٹھائی گئی؟ آیا خود مسیح علیہ السلام مع جسم اٹھائے گئے یا صرف آپ کی روح؟ سو اس کا صاف بیان اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (نساء:۱۵۷)‘‘ یعنی یہودیوں پر ان کے اس قول کے سبب لعنت پڑی کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے ضرور ضرور مسیح ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا اور انہوں نے اس کو نہ قتل کیا اور نہ صلیب پر کھینچا۔

اور ظاہر ہے کہ قتل کرنے اور صلیب پر کھینچنے کے قابل جسم ہوتا ہے نہ روح۔ پس یہود کا دعویٰ قتل مسیح علیہ السلام کے جسم کی نسبت ہوا اور اللہ تعالیٰ نے بھی قتل اور صلب کی نفی جسم مسیح علیہ السلام کی نسبت کی۔ پس چونکہ سب منصوب ضمیریں جو ’’وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ‘‘ اور ’’وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ‘‘ میں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا مرجع ’’المسیح‘‘ ہے۔ اس لئے ضرور ضرور مسیح علیہ السلام کے جسم کا اٹھایا جانا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ جس چیز کی نسبت یہود دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے اس کو قتل کر دیا۔ اسی کی نسبت اللہ تعالیٰ تردید کے طور پر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان پر اٹھا لیا اور چونکہ اس کا دعویٰ جسم کے قتل وصلب کی نسبت تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی جسم ہی کو ان کی گزند سے بچانے کے لئے اٹھایا۔ جیسا کہ فرمایا: ’’وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (آل عمران:۵۵)‘‘ یعنی میں تجھ کو کفار سے پاک رکھوں گا۔

اس مقام پر مرزاقادیانی کا آیت: ’’وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا‘‘ کو پیش کرنا بالکل بے محل ہے اور اس سے ان کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ رفع کے معنی ’’عزت کی موت‘‘ نہ تو بشہادت لغت ثابت ہے اور نہ یہ لفظ عرف عام اور عرف شرح میں ان معنوں میں پایا گیا ہے اور نہ یہ کسی فن کی اصطلاح ہے تو پھر مرزاقادیانی کس قاعدے سے اس سے عزت کی موت مراد لیتے ہیں۔ لغت میں رفع کے معنی ہیں۔ ’’برداشتن‘‘ یعنی اوپر اٹھانا اور اس کی ضد ہے وضع اور خفض یعنی نیچے رکھنا۔ جیسے کہ صراح اور نیز مصباح میں لکھا ہے اور اس کی تحقیق حصہ اوّل میں بالتفصیل گزر چکی ہے۔ باقی رہی حضرت ادریس علیہ السلام کے رفع کی صورت۔ سو قرآن شریف نے انہی لفظوں میں اس کا بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد رفعت منزلت ہے۔ کیونکہ جب رفع کے ساتھ کوئی لفظ جو بلندی رتبہ پر دلالت کرے مذکور ہو

تو اس کے مجازی معنی بلندی درجہ لئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ آیت: ''وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (الزخرف:۳۲)''اور اس جیسی دیگر آیات سے ظاہر ہے۔ پس چونکہ اس کے آگے ہی ''مَكَانًا عَلِيًّا'' کی تصریح مذکور ہے۔ اس لئے اس کے معنی اس قرینے سے یہ ہوں گے کہ: ''عزت دی ہم نے اس کو بلند رتبے پر۔''

اس بیان سے دو امر برخلاف مقصود مرزا قادیانی ثابت ہوئے۔ اوّل یہ کہ رفع کے معنی عزت کی موت نہیں ہوتے۔ دوم یہ کہ رفع سے مراد بلندی رتبہ تب لئے جاتے ہیں۔ جب اس کے ساتھ کوئی قرینہ پایا جائے، ورنہ نہیں۔

مرزا قادیانی نے مقربین کی ارواح کے علیّین تک اٹھائے جانے میں آیت پیش کی ہے۔ ''فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ'' مرزا قادیانی کا یہ استدلال بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر یہ ہے: ''اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ (قمر:۵۴،۵۵)'' یعنی پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے، اقتدار والے بادشاہ کے پاس صداقت کے گھر (بہشت میں)

پس پہلی آیت کے ساتھ ملانے سے واضح ہوگیا کہ اس میں پرہیزگاروں کے لئے جنت میں داخل ہونے کی بشارت ہے اور یہ سب کچھ بروز قیامت ہوگا۔ پس مرزا قادیانی کا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ موت کے وقت پرہیزگاروں کی روحیں علیّین پر پہنچائی جاتی ہیں، صحیح نہ ہوا۔ کیونکہ اس آیت میں اس امر کا ہرگز ذکر نہیں۔

چوتھی آیت: ''وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَیَوْمَ الْقِیَامَةِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا (نساء:۱۵۹)'' مرزا قادیانی نے برخلاف مراد الٰہی اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت کرنی چاہی ہے۔ حالانکہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے قطعی الدلالت آیت ہے اور نیز آپ کے نزول کی صاف شہادت دیتی ہے۔ جیسا کہ عنقریب ثابت کیا جائے گا۔ ان شاءاللہ!

مرزا قادیانی نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''اور کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو ہمارے اس بیان مذکورہ بالا پر جو ہم نے اہل کتاب کے خیالات کی نسبت ظاہر کیا ہے، ایمان نہ رکھتا ہو، قبل اس کے جو وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ مسیح اپنی طبعی موت سے مرگیا۔'' (ازالہ اوہام ص۳۷۲، خزائن ج۳ ص۲۹۱)

ناظرین! پیشتر اس کے کہ ہم اس آیت کی صحیح تفسیر ذکر کریں اور آپ کو ثابت کر دکھائیں کہ مرزاقادیانی کا استدلال بالکل غلط بلکہ باطل ہے۔ کیونکہ اس میں تو مرزاقادیانی کی مراد کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا بیان ہے اور نیز ان کے دعویٰ مسیحیت کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر ہے۔ ہم آپ کی باانصاف توجہ اس ترجمہ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں جو ہم نے (ازالہ اوہام ص۳۷۲، خزائن ج۳ ص۲۹۱) میں سے اوپر نقل کیا ہے۔

مرزاقادیانی نے نہ تو قواعد ومحاورات زبان کا خیال کیا ہے اور نہ قرآن شریف کے الفاظ کا لحاظ کیا ہے بلکہ اپنے خیال کے پیرو ہوکر جو کچھ جی میں آیا کہہ دیا ہے۔ اگر خواہش نفسانی یہ نہیں تو پھر کس چیز کا نام ہے؟ اللہ اکبر! اگر قرآن شریف کا ترجمہ اسی طرح کرنا درست قرار دیا جائے کہ ایک امر کو پہلے اپنے جی میں ٹھان لیا اور پھر الفاظ کو موڑ توڑ کر اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں تو پھر شاید کسی الٹی سے الٹی اور باطل سے باطل بات کو بھی ثابت کر لینا مشکل نہیں ہوگا۔ مخاطب وسامع کے لئے ضروری ہے کہ اپنے خیال کو متکلم کے الفاظ کے تابع رکھے، نہ کہ متکلم کے الفاظ کو اپنے خیال کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے، کھینچ لے جائے۔ ترجمہ کرنے کا صحیح طریق یہی ہے کہ پہلے مفردات کے معانی پر غور کیا جائے اور پھر ان کی باہمی ترکیب وتعلق کو زیرنظر رکھ کر مراد کو سمجھا جائے۔ مرزاقادیانی اس طریق کے بالکل خلاف چلتے ہیں۔ تب ہی رفع اور حیات اور نزول کے ثابت کرنے والی آیات سے موت سمجھتے ہیں۔

جہاں تک میں نے مرزاقادیانی اور آپ کی پارٹی کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک مجھے ان کی پارٹی کے بعض مولویوں سے بحث کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی جماعت میں ابھی تک تین آیتوں کے ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ہمیشہ ان کے ترجمہ میں تنسیخ وترمیم ہوتی رہتی ہے۔ جس سے دفع الوقتی کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے اور بات کسی ٹھکانے نہیں لگتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان آیتوں میں مرزاقادیانی کے مذہب اور دعویٰ کی تردید صاف طور پر مصرح ہے۔ پس ان کو ہمیشہ اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ ان آیتوں کے مطالب کو پھیر پھار کر ایسے طریق پر بیان کیا جائے کہ اپنے اوپر حجت پوری نہ ہو اور چونکہ جو معنی وہ کرتے ہیں۔ وہ بلحاظ قواعد مقررہ کسی صورت سے ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اس لئے ہر وقت ان کے ردّوبدل کی نسبت ان کی طبیعت میں تردد رہتا ہے اور ہمیشہ گرگٹ کی طرح نئے رنگ بدلتے ہیں۔

اوّل ان تین آیتوں میں ہے: ’’وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ ‘‘ دوم یہی آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ ‘‘سوم: سورۂ زخرف کی آیت: ’’وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ ‘‘(حصہ اوّل شہادت القرآن ص۱۲۷) میں گزر چکا ہے کہ آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَہِیْدًا ‘‘ کے صحیح معنی یہی ہیں کہ آئندہ زمانہ میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے۔ جس میں سب اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ضرور آپ کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔

موافق محاورہ زبان عرب وقواعد علم نحو اس آیت کے صحیح معنی یہی ہیں اور جتنے معنی اس کے سوائے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ: ’’لَیُؤْمِنَنَّ ‘‘ میں نون ثقیلہ بالام تاکید آیا ہے اور جملہ کتب نحو، کیا متن اور کیا شروح سب میں بالاتفاق مذکور ہے کہ نون تاکید مضارع کو خاص استقبال کے لئے کر دیتا ہے اور ماضی اور حال کے لئے نہیں آتا۔ اس مسئلہ میں کسی امام لغت ونحو کو خلاف نہیں، نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی ﷺ یا کلام عرب میں اس کے خلاف نون تاکید کا استعمال پایا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابن ہشام نحوی اپنی کتاب ’’مغنی اللبیب‘‘ میں فرماتے ہیں: ’’وَاَمَّا الْمُضَارِعُ اِنْ کَانَ حَالًا لَمْ یُؤَکَّدْ بِھِمَا وَاِنْ کَانَ مُسْتَقْبِلًا اُکِّدَ بِھِمَا وَجُوْبًا نَحْوُ قَوْلِہٖ تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ. انتھٰی (مغنی ج ثانی ص ۲۲) ‘‘یعنی مضارع کا صیغہ (جو حال واستقبال دونوں کے لئے آتا ہے) جب حال کے معنی میں ظاہر ہو تو نون تاکید ثقیلہ وخفیفہ اس پر نہیں آسکتے اور اگر مستقبل کے معنی میں ہو تو پھر نون کے ساتھ اس کی تاکید واجب ہوتی ہے، جب کوئی کلمہ قسم کا آیا ہو۔

اسی طرح علامہ رضی شرح کافیہ میں تحریر کرتے ہیں: ’’واما فی المستقبل الذی ھو خبر محض فلا یدخل الا بعد ان یدخل علی اوّل الفعل ما یدل علی التوکیف ایضاً کلام القسم انتھٰی ‘‘یعنی جو مستقبل صرف خبری ہی ہو۔ اس پر نون تاکید کا نہیں آتا۔ مگر اس وقت جب کہ فعل کے پہلے کوئی ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے جیسے لام قسم۔

اسی طرح اس قاعدہ کی نسبت مفصل زمخشری اور کافیہ ابن حاجب اور الفیہ ابن مالک اور شرح ملّا جامی اور تکملہ مولانا عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جملہ کتب نحو میں ایسا ہی مذکور ہے۔

مرزا قادیانی نے اس آیت کے جو معنی کئے ہیں وہ تو اوپر بیان ہوچکے ہیں اور ناظرین معلوم کر چکے ہیں کہ وہ علاوہ قواعد زبان عرب کے رو سے غلط ہوئے کے الفاظ قرآن سے بھی کس قدر دور اور نرالے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے متعلق مولوی محمد احسن صاحب فاضل امروہی اور مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی نے جو گل کھلائے ہیں اور قواعد نحویہ کی جو رعایت رکھی ہے۔ اس کو بیان کیا جائے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مرزائی پارٹی اس آیت کے ترجمے میں کیسی حیران وسرگرداں ہے۔ چنانچہ مولوی مبارک علی صاحب اپنے رسالہ (القول الجمیل ص ۲۸) میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح لکھتے ہیں: ’’اوران اہل کتاب میں سے ہر ایک شخص کے لئے ضروری ہے کہ اس بات کو اپنے جانے کے پیشتر ہی تسلیم کرے (کہ مسیح کی ہڈی نہیں توڑی گئی۔ اس واسطے وہ صلیب پر نہیں مرا) ورنہ یہ تو آخر کو ہونا ہی ہے کہ مسیح جس کی نسبت یہ وہم وگمان بھرے ہوئے اعتقادیات اہل کتاب نے تسلیم کر رکھے ہیں، ان کا حال بتلادے گا اوران کے برخلاف قیامت کے دن اظہار دے گا۔ اس وقت سب اپنی غلطی سے واقف ہو جائیں گے۔‘‘

ناظرین! علاوہ اس امر کے کہ مولوی صاحب کا یہ ترجمہ شریف کے الفاظ اور قواعد زبان سے کس قدر اجنبی ہے۔ آپ اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں کہ یہ ترجمہ مرزا قادیانی کے اپنے ترجمہ سے کیسا صاف نرالا ہے۔ یہ عجیب امر ہے کہ رسول قادیانی کچھ ترجمہ کرتا ہے اوراس کے امتی کچھ اور ہی راگنی گاتے ہیں۔ ان کا آپس ہی میں اتفاق نہیں تو ہم کس کی مانیں؟ یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب نے اس مقام پر ’’لَیُؤْمِنَنَّ‘‘ کے معنی صیغہ امر کے کئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے ’’ضروری ہے کہ اس بات کو تسلیم کرے۔‘‘

جہاں تک ہمیں تجربہ ہے، مولوی صاحب ہمارے بیان سے تو ضرور چڑیں گے اور بوجہ مخالفت کے سیدھے کو بھی ٹیڑھا جانیں گے اور اپنی غلطی کا ہرگز اعتراف نہ کریں گے۔ اس لئے ناظرین! میں آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی صاحب ان کو یہ سمجھائیں کہ مولوی صاحب! بے شک آپ علمی لیاقت کا تو سب سے بڑھ کر دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے مقابلہ میں کسی کو نہیں جانتے۔ مگر یہ تو بتلایئے کہ آپ نے کس قاعدے سے پہچانا کہ ’’لَیُؤْمِنَنَّ‘‘ صیغہ امر غائب موکّد بنون تاکید ہے؟ ہاہ! ہاہ! سچ ہے جان بوجھ کر حق کے خلاف چلنے اور ضد اور تعصّب سے باطل کی پیروی کرنے سے علم وعقل دونوں جاتے رہتے

ہیں۔ مولوی صاحب! یہ امر کا صیغہ نہیں ہے آپ صرف میر وغیرہ ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کریں کہ امر کا لام مکسور ہوتا ہے اور آیت میں تو مفتوح ہے۔

اسی طرح فاضل امروہی نے اور ہی گل کھلایا اور اپنی فضیلت کی پگڑی کو داغ لگایا۔ چنانچہ مباحثہ دہلی کے متعلق آپ بعنوان بحث لام تاکید با نون تاکید ثقیلہ لکھتے ہیں: دیکھو(الحق سیالکوٹ ص۱۱۸، خزائن ج۴ص۲۴۸) ''ازہری وغیرہ نے تصریح میں تصریح کی ہے کہ لام تاکید کا حال کے واسطے آتا ہے۔ اب تسلیم کیا کہ فقط نون تاکید صرف استقبال کے واسطے ہے۔ لیکن جب کہ کسی صیغہ میں لام تاکید بھی موجود ہو جو حال کے واسطے آتا ہے اور نون تاکید بھی ہو۔ چنانچہ ''ما نحن فیه'' میں ہے تو وہاں پر خالص استقبال بالضرور ہونے کی کیا وجہ۔ اس کی کوئی دلیل مولوی[1] صاحب نے نحو سے ارشاد نہیں فرمائی اور تقریب دلیل محض ناتمام رہی۔ یہ مانا کہ صرف نون تاکید استقبال کے واسطے نحو میں لکھا ہے۔ امر، نہی، استفہام، تمنی، عرض وغیرہ ان میں صرف نون تاکید ہوتا ہے۔ بغیر لام تاکید کے۔ پس ان صیغوں میں صرف استقبال ضرور مراد ہوسکتا ہے۔ لیکن جس صیغہ میں لام تاکید بھی ہو اور نون تاکید بھی، اس میں خالص ہونے استقبال کی کیا دلیل ہے۔ انتہیٰ''

فاضل امروہی صاحب کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ن ثقیلہ کا مضارع کو استقبال کے معنوں میں کر دینا تو مسلّم ہے۔ مگر چونکہ لام تاکید کا حال کے واسطے آتا ہے اور ''لَیُؤْمِنَنَّ'' پر لام تاکید اور نون تاکید ہر دو آئے ہیں۔ اس لئے اس صیغہ کو حال اور استقبال دونوں کے لئے سمجھنا چاہئے نہ کہ خالص استقبال کے لئے۔ جب علم نحو کے ابتدائی مسائل میں مولوی محمد احسن صاحب جیسے جیّد علماء کو ایسا التباس واشتباہ واقع ہو، جو علوم رسمیہ میں خود مرزا قادیانی اور مولوی حکیم نورالدین صاحب سے کئی درجے زیادہ لائق ہیں تو ہم اس پارٹی کی لیاقت علمی اور عقل ودانش کے کیسے قائل ہوں۔ بھلا مولوی مبارک علی صاحب کی نسبت تو یہ گمان بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ناواقفی کی وجہ سے ''لَیُؤْمِنَنَّ'' کو امر کا صیغہ سمجھ لیا ہے۔ مگر مولوی محمد احسن صاحب کی فضیلت میں ایسا گمان تو بہت بعید ہے۔ ان کو اس لام قسم اور لام حال میں کیوں اشتباہ ہوا۔ آخر ماننا پڑے گا کہ فاضل امروہی صاحب نے جان بوجھ کر خلق

[1] یعنی فاضل بے نظیر مولانا محمد بشیر سہسوانی جن سے دہلی میں مرزا قادیانی کا مباحثہ ہوا تھا اور مرزا قادیانی اسی نون ثقیلہ کے بوجھ سے ایسے گھبرائے کہ برخلاف شرائط مقررہ بحث کو ناتمام چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔

خدا کو مغالطہ میں ڈالنا چاہا ہے۔ لیجئے! ہم فاضل امروہی صاحب کو ایک ایسی بات یاد کراتے ہیں جو وہ بوجہ پیری کے بھول گئے ہیں۔

امروہی صاحب! ’’لَیُوْمِنُنَّ‘‘ میں لام بمعنی حال نہیں ہے، بلکہ یہ لام قسم کا ہے اور استقبال خبری پر نون تاکید آنے کے لئے اس سے پہلے کوئی ایسا کلمہ ضروری ہے جو قسم پر دلالت کرے۔ کیونکہ جو استقبال محض خبر ہو۔ اس پر نون تاکید بغیر اس کے نہیں آسکتا کہ اس کے اوّل میں ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے اور جو لام حال کے لئے آتا ہے۔ اس کے ساتھ نون تاکید نہیں آسکتا۔ کیونکہ نون تاکید استقبال کے لئے آتا ہے اور حال کی تاکید نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ اس کی مفصل بحث شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی میں اس طرح ہے کہ: ’’**واعلم ان الاصل فی نون التاکید ان تلحق بآخر فعل مستقبل فیه معنی الطلب کالامر والنهی والاستفهام والتمنی والعرض نحو اضربن زیداً ولا تضربن وهل تضربنه ولیتک تضربن مثقلة ومخففة واختص بما فیه معنی الطلب لان وضعه للتاکید والتاکید انما یلیق بما یطلب حتی یوجد ویحصل فیفتنم هو بوجدان المطلوب ولا یلیق بالخبر المحض لانه قد وجد وحصل فلا یناسبه التاکید واختص بالمستقبل لان الطلب انما یتعلق بما لم یحصل بعد لیحصل وهو المستقبل بخلاف الحال والماضی لحصولهما والمستقبل الذی هو خبر محض لا تلحق نون التاکید باٰخره الّا بعد ان یدخل علی اوّل الفعل ما یدل علی التاکید کلام القسم وان لم یکن فیه معنی الطلب لان الغالب ان المتکلم یقسم علی مطلوبه. انتهیٰ**‘‘

نون تاکید کے متعلق اصل قاعدہ یہ ہے کہ جس فعل مستقبل میں طلب کے معنی پائے جائیں اس کے آخر میں آئے۔ مثلاً امر، نہی واستفہام، تمنی اور عرض اور یہ طلب کے معنی والے فعل سے اس لئے مختص ہے کہ اس کی وضع تاکید کے لئے ہے اور تاکید اس کے ساتھ مناسب ہوتی ہے، جس میں طلب پائی جائے تاکہ وہ حاصل اور موجود ہو اور محض خبر کے مناسب نہیں۔ کیونکہ وہ حاصل وموجود ہوتی ہے اور مستقبل کے ساتھ اس لئے مختص ہے کہ طلب اس کے متعلق ہوتی ہے جو ابھی حاصل نہ ہو اور یہ بات مستقبل میں پائی جاتی ہے۔ برخلاف حال اور ماضی کے کہ وہ دونوں حاصل ہوتے ہیں اور جو مستقبل محض خبر ہو اس کے

آخرنون تاکید نہیں آتا۔ مگراس صورت میں کہ فعل کے پہلے کوئی ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے۔ جیسے لام قسم۔ اگرچہ اس میں طلب کے معنی نہ پائے جائیں۔ کیونکہ غالباً متکلم ایسے امر پر قسم کھاتا ہے جو مطلوب ہو۔

فاضل امروہی صاحب اس عبارت پر غور کریں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ’’لَیُؤْمِنَنَّ‘‘ میں لام قسم کا ہے نہ کہ بمعنی حال (دیکھو تفسیر بیضاوی وغیرہ) پس آپ کا اسے حال اور استقبال دونوں کے لئے سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔

پس ہم تشریح اور بسط کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ نون تاکید (ثقیلہ یا خفیفہ) مضارع کو خاص استقبال کے لئے کر دیتا ہے اور نیز یہ کہ ’’لیؤمننّ‘‘ میں لام قسم کا ہے۔ جس کا ہونا استقبال خبری پر نون تاکید داخل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ پس آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ‘‘ کا لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ: ’’نہیں ہوگا اہل کتاب میں سے کوئی مگر البتہ ایمان لائے گا ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہلے مرنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے‘‘ اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ سب اہل کتاب اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔ پس چونکہ ابھی تک اہل کتاب یہود ونصاریٰ کا اتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے بارے میں نہیں پایا گیا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت اہل کتاب کے ایمانی اتفاق کے بعد ہونی ہے اور جب اب تک وہ ایمان میں متفق نہیں ہوئے تو آپ کی موت بھی واقع نہیں ہوئی۔

اس آیت کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں۔ محاورۂ زبان عرب اور قواعد نحو اور محاورہ کتاب وسنت کی رو سے یہی ایک صحیح ہیں اور اس کے سوائے جس قدر احتمالات ہیں۔ وہ سب غلط اور باطل ہیں۔ کیونکہ کسی معنی کی بناء پر ’’لَیُؤْمِنَنَّ‘‘ کا لفظ خاص استقبال کے لئے باقی نہیں رہتا۔

اگر جناب مرزا قادیانی یا فاضل امروہی صاحب ایک آیت یا ایک حدیث یا کوئی کلام عرب عربا کا ایسا پیش کریں۔ جس میں نون تاکید حال یا ماضی کے لئے یقینی طور پر آیا ہو یا علم نحو کی کسی معتبر کتاب کی کوئی عبارت جس میں امر مذکور کی تصریح ہو تو میں اس مقدمہ نون تاکید کہ جس کے رو سے اوپر ترجمہ کیا گیا ہے، غیر صحیح تسلیم کر لوں گا۔

واضح ہو کہ اس آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ‘‘ میں ’’موتہٖ‘‘ کی ضمیر کی بابت دو احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ جیسا کہ اوپر مفصل گزر چکا۔ دوم: یہ کہ کتابی کی طرف پھرتی ہے۔ پھر اس کے معنی اس طرح ہوں گے: ’’نہیں کوئی اہل کتاب میں سے مگر البتہ ایمان لاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے مرنے سے پیشتر۔‘‘ یعنی جان کندن کے وقت۔ اس تقدیر پر ’’لَيُؤْمِنَنَّ‘‘ کا خالص استقبال کے لئے نہ رہنا صاف ظاہر ہے کیونکہ اہل کتاب اس آیت کے نزول سے پہلے بھی مرتے تھے اور اس کے نزول کے وقت بھی۔ پس یہ کتابی کی طرف ضمیر کو پھیرنا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ مفسرین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ یہ ضمیر کتابی کی طرف پھرتی ہے اور نیز یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی احتمال کے ذکر سے اس احتمال کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ دوم: یہ کہ جب ثابت ہو چکا کہ کتابی کی طرف ضمیر پھرنے کی صورت میں ’’لَيُؤْمِنَنَّ‘‘ خالص استقبال کے لئے نہیں رہتا اور یہ امر قواعد نحویہ اور محاورۂ زبان عرب کے بالکل خلاف ہے تو اب اس قول کو ضعیف ماننے میں کیا تامّل ہے۔ سوم: یہ کہ جن لوگوں نے اس ضمیر کو کتابی کی طرف مانا ہے، انہوں نے اس کے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھیرنے سے انکار نہیں کیا اور نہ حیات ونزول علیہ السلام سے انکار کیا ہے بلکہ پھر بھی وہ اسی آیت سے حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں۔ (دیکھو شروح صحیح بخاری فتح الباری وعمدۃ القاری وغیرہما)

پس اس سے مرزا قادیانی کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ باقی رہی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، سو وہ ضعیف ہے اور بروایت صحیح ان سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس ضمیر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرنے کے ذکر کے بعد لکھا ہے: ’’**وبهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير عن طريق سعيد بن جبير عنه باسناد صحيح ومن طريق ابى رجاء عن الحسن قال قبل موت عيسىٰ والله انه الآن لحيٌّ ولكن اذا نزل اٰمنوا به اجمعون ونقله عن اكثر اهل العلم ورجحه ابن جرير وغيره (فتح البارى كتاب بدء الخلق باب نزول عيسىٰ علیہ السلام)**‘‘ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی پر جزم کیا ہے جیسا کہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر کے طریق سے ان سے روایت کیا ہے اور نیز ابورجآء کے طریق سے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہا عیسیٰ علیہ السلام کی

موت سے پہلے۔ خدا کی قسم اب تک وہ زندہ ہیں، لیکن جس وقت نازل ہوں گے، اس وقت سب اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے اور اس بات کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور اسی کو ابن جریر وغیرہ مفسرین نے ترجیح دی ہے۔ انتہیٰ!

صحیح بخاری کی دیگر شروح مثلاً عمدۃ القاری اور ارشاد الساری وغیرہما میں بھی یہی لکھا ہے اور اسی امر کو ترجیح دی ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ چنانچہ شرح قسطلانی میں ہے کہ: ’’**ای وان من اهل الكتاب احد الّا ليؤمننّ بعيسٰى قبل موت عيسٰى وهم اهل الكتاب الّذين يكونون فى زمانه فتكون الملة واحدة وهى ملة الاسلام وبهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير من طريق سعيد بن جبير عنه باسناد صحيح (ارشاد السارى شرح صحيح بخارى)** ‘‘کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر البتہ ایمان لے آئے گا، ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اور یہ وہ اہل کتاب ہوں گے جو آپ کے زمان نزول میں موجود ہوں گے۔ پس صرف ایک ہی مذہب یعنی مذہب اسلام باقی رہ جائے گا اور اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جزم کیا ہے۔ جیسا کہ ابن جریر نے سعید بن جبیر کے طریق سے ان سے باسناد صحیح روایت کیا ہے۔

محقق مفسرین وشارحین حدیث ہر زمانے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو یعنی کتابی کی طرف ضمیر کے پھرنے والی روایت کو ضعیف کہتے چلے آئے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی امر کو صحیح وثابت قرار دیتے چلے آئے ہیں کہ اس ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور بس۔

دیگر یہ کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس آیت کی تفسیر کی گئی ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ جیسا کہ (ص۱۵) میں اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔ پس جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کو نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حدیث کی تصدیق کے لئے سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے پڑھتے ہیں اور ان کو آواز بلند پکار کر کہتے ہیں: ’’فَاقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ‘‘ اور کوئی صحابی ان کے اس استدلال کا انکار نہیں کرتا اور نہ ان کے خلاف قائم ہوکر اس ضمیر کو کتابی کی طرف پھیرنے کے لئے کہتا ہے تو اب ثابت ہوگیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس ضمیر کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرنا بلانکیر مانا گیا ہے اور اس پر ان کا

اجماع واتفاق ہے کیا مرزا قادیانی یا مولوی احسن صاحب کہیں سے بسند صحیح ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی صحابی نے حضرت ابوہریرہؓ کے اس استدلال کی تردید یا ان کے خلاف کیا؟ ہرگز نہیں اور کبھی نہیں۔

اس آیت کے معنی جو ہم نے مضبوط دلائل سے ثابت کر دکھلائے ہیں۔ مرزا قادیانی نے اپنے ازالہ میں ان کے متعلق چار اعتراض کئے ہیں۔ ان سب کے جواب کے لئے نون ثقیلہ کا قاعدہ جو جمیع ائمہ علم نحو کا اتفاقی واجماعی ہے اور اوپر بیان ہو چکا ہے، کافی ہے، لہٰذا تطویل کی ضرورت نہیں۔ اگر مرزا قادیانی کے لئے اتنی تحریر کافی نہ ہوئی اور انہوں نے اس کتاب کا جواب لکھا تو ان شاء اللہ! جواب الجواب میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا منہ بالکل بند کر دیا جائے گا۔

بیان مذکورہ سے ثابت ہوگیا کہ آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ‘‘ میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول کا واقع ہونا مذکور نہیں، بلکہ برخلاف اس کے آپ کے زندہ ہونے کا صاف ثبوت ہے۔ اب اس لطیف نکتہ کا بیان کیا جاتا ہے، جس کے رو سے حضرت ابوہریرہؓ نے علاوہ ’’قَبْلَ مَوْتِہٖ‘‘ کی ضمیر کے اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث کی تصدیق کے لئے سب صحابہ کے سامنے پیش کیا اور ان میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کے اخیر میں فرمایا کہ قیامت کو جب حضرت عیسیٰ کو سوال ہوگا کہ کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدائے واحد کے سوا معبود بنالو؟ تو عیسیٰ علیہ السلام اپنی برأت کے لئے عرض کریں گے کہ یاالٰہی! میں نے تو ان کو وہی کچھ کہا تھا جو تو مجھے حکم کیا۔ ’’وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ (مائدہ:۱۱۷)‘‘ اور میں تو ان پر تب تک ہی شاہد رہا جب تک میں ان کے بیچ رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ شاہد کا مشہود علیہم کی جماعت میں ہونا ضروری ہے۔

اب اس آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ‘‘ میں دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان اہل کتاب کی نسبت جو عیسیٰ علیہ السلام کے زمان نزول میں ان پر ایمان لائیں گے۔ فرماتا ہے کہ: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا (نساء:۱۵۹)‘‘ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر شاہد ہوں گے۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام اس اخیر زمانے کے اہل کتاب پر شہادت دیں گے تو پہلی آیت کو زیر نظر رکھ کر

ثابت ہوا کہ آپ اخیر زمانہ کے لوگوں میں نزول فرما ہوں گے۔ تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی حُسْنِ تَوْفِیْقِہٖ!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس شہادت سے مرزا قادیانی کا اعتراض بھی دور ہوگیا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمان اخیر میں نازل ہوں گے تو اہل کتاب کے عقائد سے خبردار ہوجائیں گے۔ پھر جناب باری میں کیوں نہ کہہ دیں گے کہ الٰہی جب میں پھر دنیا میں گیا تھا تو ان کو ایسا ایسا سمجھا دیا تھا۔

ناظرین! آپ تھوڑا سا غور کریں گے تو آپ کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ’’یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْہِمْ شَہِیْدًا‘‘ میں اسی شہادت کی خبر ہے۔ پس مرزا قادیانی کا اعتراض بالکل دور ہوگیا۔

پانچویں آیت: ’’مَاالْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ کَانَا یَأْکُلَانِ الطَّعَامَ (مائدہ:۷۵)‘‘

مرزا قادیانی اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ’’مسیح صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے نبی فوت ہوچکے ہیں اور ماں اس کی صدیقہ ہے، جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۰۳، خزائن ج۳ ص۴۲۵)

اس کے آگے پھر لکھتے ہیں: ’’یہ آیت بھی صریح نص حضرت مسیح علیہ السلام کی موت پر ہے۔ کیونکہ اس آیت میں بتصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم طعام نہیں کھاتے۔ ہاں کسی زمانہ میں کھایا کرتے تھے۔ جیسا کہ کانا کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے جو حال کو چھوڑ کر گزشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے۔ اب ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام طعام کھانے سے اسی وجہ سے روکی گئی کہ وہ فوت ہوگئی اور چونکہ کانا کے لفظ میں جو تثنیہ کا صیغہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ شامل ہیں اور دونوں ایک ہی حکم کے نیچے داخل ہیں۔ لہٰذا حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ شامل ہیں اور دونوں ایک ہی حکم کے نیچے داخل ہیں۔ لہٰذا حضرت مریم علیہا السلام کی موت کے ساتھ ان کی موت بھی ماننی پڑی۔ کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں ہرگز یہ بیان نہیں کیا گیا کہ حضرت مریم علیہا السلام تو بوجہ موت طعام کھانے سے روکے گئے، لیکن حضرت ابن مریم علیہا السلام کسی اور وجہ سے۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۰۳، ۶۰۴، خزائن ج۳ ص۴۲۵، ۴۲۶)

پیشتر اس کے کہ ہم مرزا قادیانی کے استدلال کو غلط ثابت کریں اور اس آیت کی صحیح تفسیر و مراد بتائیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قادیانی کی عبارت منقولہ میں سے علمی اغلاط اور مغالطے ظاہر کریں۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ مرزا قادیانی اپنی مطلب برآری کے لئے قرآن شریف کے الفاظ اور سیاق وسباق آیت کا ہرگز لحاظ نہیں کرتے اور نہ دیگر علوم کو جو قرآن شریف کی صحیح مراد کو سمجھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، زیر نظر رکھتے ہیں۔

جناب مرزا قادیانی! ''کَانَا یَأْکُلَانِ الطَّعَامَ'' کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے: ''جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔'' حضرت! قرآن شریف سے ایسی دل لگی نہیں چاہئے۔ ''جب وہ دونوں زندہ تھے۔'' کس لفظ کے معنی ہیں؟ قرآن شریف کی آیت کا ترجمہ تو ذرا ہوش اور خدا کے خوف سے کیا کرو۔ تعجب ہے کہ آپ اس آیت کو موت کے ثبوت کے نص صریح اور تصریح کہتے ہیں۔ کیا علم اصول میں نص اور صریح کی یہی تعریف ہے کہ اس میں مقصود کا ذکر تک نہ ہو۔ مرزا قادیانی! یہ کیسا معاملہ ہے؟ کیا آپ علم اصول سے ناواقف ہیں یا عمداً لوگوں کو غلط بیانی سے ایسا کہہ دیتے ہیں؟ فاضل امروہی صاحب! آپ نے تو علم اصول پڑھا ہوا ہے۔ برائے خدا آپ ہی بتلائیں کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے لئے نص صریح ہے: ''وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ یَّکْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرة: ۲۸۳)'' یعنی شہادت کو چھپاؤ نہیں اور جو کوئی شہادت کو چھپائے گا پس ضرور ضرور اس کا دل گنہگار ہے۔

مرزا قادیانی! اگر یہ آیت موت پر نص صریح ہوتی تو کیا تیرہ سو برس تک امت کے علماء اور امام اس سے بے خبر رہتے؟ اگر مفہوم کا نام نص صریح ہے تو پھر آپ مفہوم کس کو قرار دیں گے اور جہاں سچ مچ تصریح ہوگی، اس کا نام کیا رکھیں گے؟

اب ہم اس آیت کا اصل مطلب بیان کرتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ مرزا قادیانی قرآن شریف کے سمجھنے سے کوسوں دور ہیں۔ قرآن شریف منظوم اور مربوط کلام ہے۔ اس کا کلمہ کلمہ اور آیت آیت ایک دوسرے کے ساتھ عجیب طور سے وابستہ ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ اس سے پہلے کی آیات پر نظر کریں تاکہ ظاہر ہو کہ اس سے مقصود خداوندی کیا ہے۔ سو یہ مضمون یہاں سے شروع ہوتا ہے: ''لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ

كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. مَاالْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهُ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (مائدہ:۷۳تا۷۵) ’’بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے۔انہوں نے یہ کفر کا کلمہ کہا اور معبود تو سوائے ایک معبود کے اور کوئی نہیں اور اگر یہ لوگ اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔ کیا (یہ لوگ اصرار کرتے ہیں) پس اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں آتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ مسیح ابن مریم علیہ السلام تو صرف رسول ہیں۔ان سے پیشتر کئی رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ ہے، وہ تو کھانا کھایا کرتے تھے (اے پیغمبر) دیکھو ہم ان کے لئے کیسی واضح طور پر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ لوگ کدھر کو بھٹکے جاتے ہیں۔

ناظرین! آپ کے ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ ان آیات سے مقصود خداوندی صرف اثبات توحید اور ابطال الوہیت حضرت مسیح علیہ السلام ہے نہ کچھ اور۔ اثبات توحید اور تردید تثلیث کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’ما من الله الّا الٰهٌ واحدٌ ‘‘یعنی الٰہ تو صرف ایک ہی ہے۔ کیونکہ الٰہ اس کو کہتے ہیں۔ جسے غایت کمال حاصل ہو اور ظاہر ہے کہ غایت درجے کا کمال صرف ایک ہی ذات میں ہوسکتا ہے، متعدد میں نہیں ہوسکتا۔ پس توحید ثابت ہوگئی اور تثلیث باطل اور حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے ابطال میں فرمایا: ’’مَاالْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهُ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ (المائدہ:۷۵) ‘‘یعنی مسیح ابن مریم تو صرف رسول ہے (خدا نہیں ہے) اس سے پیشتر کئی رسول گزر چکے ہیں اور اس کی ماں صدّیقہ تھی۔ وہ تو دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علاوہ اس بات کے کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک عورت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس بات سے ان کی الوہیت کا ردّ کیا کہ وہ کھانا کھایا کرتے تھے، کھانے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ بدن کی پرورش ہوتی رہے تاکہ کچھ مدت تک بقا حاصل ہو۔ پس جب مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ اپنے بقا میں کھانے کے محتاج تھے تو پھر ان کو معبود ماننا بالکل باطل ہے۔ کیونکہ خدا تو کسی چیز کا محتاج نہیں اور نہ معبود برحق کے لئے کسی چیز کا محتاج ہونا جائز ہے۔ کیونکہ پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ غایت کمال حاصل ہے۔ پس مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ الٰہ نہیں ہوسکتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ صدیقہ کے متعلق باوجود ان کے بہت سی اشیاء کے محتاج ہونے کے صرف ایک امر احتیاج طعام کا ذکر کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف احتیاج ثابت کرنے کا ہے، نہ حاجتوں کے گننے کا۔ اثبات مدّعا کے لئے بطور مثال صرف ایک امر کا بیان کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا سب کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

ناظرین! اس بیان سے آپ یہ بھی سمجھ جائیں گے کہ اس ذکر احتیاج کو زندگی یا موت سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس کا ذکر خواہ محتاج کی زندگی میں کیا جائے، خواہ اس کی موت کے بعد۔ مقصود ہر دو حالت میں یکساں حاصل ہے۔ پس مرزا قادیانی کا اس آیت کو عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے لئے نص صریح کہنا عجیب قسم کی بے سمجھی ہے۔

اس آیت میں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر بھی اس لئے کیا کہ عیسائیوں کے بعض فرقوں کے نزدیک حضرت مریم علیہا السلام بھی خدائی کے رتبے تک پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ اس سورت کے اخیر میں وارد ہے: ’’أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ (مائدہ:۱۱۶)‘‘ یعنی اے عیسیٰ علیہ السلام کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوائے مجھے اور میری ماں کو معبود جانو؟

پس اس مقام پر حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کی تردید کا بھی ساتھ ہی ذکر کیا تاکہ تثلیث کا اچھی طرح ابطال ہو جائے اور توحید ثابت ہو جائے۔ کیونکہ اوپر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ جن لوگوں نے خدائے پاک کو تینوں میں سے تیسرا خدا مانا ہے، وہ کفر پر ہیں اور اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کی تردید کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض نصاریٰ کے نزدیک تثلیث کے ارکان یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام اور جب ثابت ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام بوجہ محتاج ہونے کے الٰہ نہیں ہو سکتے تو بس صرف ایک اللہ ہی باقی رہا، جو سچا معبود ہے اور خدائی کے لائق ہے، کیا ہی خوب کہا گیا ہے:

خدایا جہاں پاد شاہی تراست زما خدمت آید خدائی تراست

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مرتبہ رسالت بیان کی اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے مرتبہ صدّیقیت کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ کو حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام کی نسبت الوہیت کا خیال و وہم ان کے معجزات و کرامات پر نظر کرنے سے ہوا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید اس طرح کی کہ اظہار معجزات

وکرامات سے انسان مرتبۂ رسالت سے بڑھ نہیں سکتا۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اپنے معجزات کے رو سے منجملہ دیگر رسولوں کے ایک رسول ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام بوجہ کرامات صدیقہ ہیں، خدا کس طرح بن گئے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ '' فرمایا۔ یعنی اس سے پیشتر کئی رسول گزر چکے۔ اس ذکر سے یہی مقصود ہے کہ جس طرح دیگر پیغمبروں کو خاص خاص معجزات عطا کئے گئے اور ان کے سبب سے خدا نہیں بن گئے۔ بلکہ رسول ہی رہے۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام بھی بوجہ ظہور معجزات خدا نہیں بن سکتے۔ بلکہ صرف رسول ہی ہو سکتے ہیں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے گئے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیئے گئے۔ مثلاً سونٹے کا سانپ بن جانا اور ید بیضا وغیرہ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا باذن الٰہی سونٹے کا سانپ بنا دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باذن الٰہی مردے زندہ کر دینے سے زیادہ عجیب ہے، ان دلائل کے ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (مائدہ:۷۵) '' یعنی (اے پیغمبر) دیکھو ہم کس طرح صاف صاف توحید کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ لوگ راہ راست سے کدھر بھٹکے جاتے ہیں اور باطل پر ضد اور اصرار کرتے ہیں اور حق کو قبول نہیں کرتے۔

پس ناظرین! اصل مقصود اور صحیح مراد اس آیت کی یہ ہے جو بیان کی گئی ہے، نہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے اور نہ کچھ اور مذکور ہے۔ مفسرین رحمہم اللہ علیہم نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے جو ہم نے کی ہے۔ باقی رہا مرزا قادیانی کا یہ استدلال کہ '' کانا'' ماضی کا صیغہ ہے اور نیز تثنیہ کا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں زمانہ گزشتہ میں کھانا کھایا کرتے تھے اور اب نہیں کھاتے اور جس طرح بوجہ موت کے حضرت مریم علیہا السلام کھانے سے رد کی گئی ہیں۔ اسی طرح موت ہی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی رد کئے گئے ہیں۔ سو یہ استدلال نہایت ہی ضعیف اور مضحکۂ اطفال ہے۔ علماء کے نزدیک مرزا قادیانی ایسے ہی استدلالات کی وجہ سے ہلکے شمار کئے گئے ہیں۔

اوّل اس لئے کہ کسی امر کے کسی زمانے میں مذکور ہونے سے دوسرے زمانے میں اس کی نفی لازم نہیں آتی۔ بلکہ قاعدہ یہی ہے کہ جس امر کو جس زمان میں ثابت کیا گیا ہے یا اس کی نفی کی گئی ہے۔ اسے اس زمان کے متعلق ویسا ہی جانیں اور باقی زمانوں کے لئے اس

کی نسبت دلائل خارجی پر نظر کریں۔ ان کی رو سے جیسا ثابت ہو ویسا اعتقاد رکھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کھانے کی نسبت زمان ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ لوگ اب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد کھانے کا محتاج نہیں جانتے۔ لیکن یہ مانتے ہیں کہ زمین پر ہونے کے ایّام میں کھاتے تھے۔ پس اگر زمان حال کو بھی ساتھ شامل کیا جاتا تو ان پر حجت پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا زمان حال کو ترک کر کے زمان ماضی کا ذکر کیا اور اس زمان ماضی میں حضرت مریم علیہا السلام کو بھی اس لئے ذکر کیا کہ وہ بھی اس کھانے کی احتیاج میں ان کی شریک تھیں۔ پس ایک ہی لفظ اور ایک ہی امر سے دونوں کی الوہیت کے وہم کو دور کر دیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمان حال میں کھانا۔ سو اس سے اس آیت میں بحث ہی نہیں اور نہ اس کے ذکر کی ضرورت ہے۔ باقی رہا مرزا قادیانی کا یہ لکھنا کہ جس طرح یعنی موت سے حضرت مریم علیہا السلام کھانے سے روکی گئی ہیں۔ اسی طرح یعنی موت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی روکے گئے ہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی مرزا قادیانی کی علو نظر کی وجہ سے ہے۔ مرزا قادیانی! آیت میں تو ''کَانَا یَأْکُلَانِ'' وارد ہوا ہے اور آپ ان کے نہ کھا سکنے کی کیفیت کو ایک نہج پر لانے کا استدلال کرتے ہیں۔ عقل تو یہ کہتی ہے کہ: ''کَانَا یَأْکُلَانِ'' جس میں ان دونوں کی مشارکت وصف کھانا میں صاف مذکور ہے۔ اس میں بھی ایک کیفیت پر ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ تثنیہ کے صیغے سے صرف اتنی مراد ہوتی ہے کہ اس حکم میں فاعل کے ساتھ ایک اور بھی شریک ہے اور اس حکم میں ان دونوں کی کیفیت اور حیثیت خارجی دلائل کے ثبوت پر موقوف ہوتی ہے۔ اس کی نظائر قرآن وحدیث اور ہر زبان کے روزمرّہ میں بکثرت ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ کل زید اور بکر میرے پاس دونوں آئے تھے۔ لیکن آج نہیں آئے تو کیا اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جو وجہ زید کے آج نہ آنے کی ہے، وہی بکر کے نہ آنے کی بھی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا استدلال مرزا قادیانی کی نازک خیالی کہو تو اور علوم رسمیہ سے ناواقفی کہو تو، بہرصورت من گھڑت ہے۔ عقل سلیم اور قواعد مقررہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اوّل تو ضرور نہیں کہ ہم تسلیم کر لیں کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کھانا نہیں کھاتے۔ کیونکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو جنت سے کھانا پہنچتا ہے اور اگر مان بھی لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب کھانا نہیں کھاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب بوجہ آسمانی رہائش کے اور صحبت

ملائکہ کے ان کا مایہ حیات ذکر وعبادت الٰہی ہے، نہ طعام اہل دنیا۔ پس حضرت مریم علیہا السلام کا کھانے سے باز رہنا، دوسرے سبب سے ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کھانے سے باز رہنا دوسرے سبب سے ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کھانے سے باز رہنے سے آپ کی موت کا نتیجہ ضروری نہیں۔ کیونکہ کھانے سے باز رہنے کی صورت اور وجہ صرف موت ہی نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام اور اکابر اولیائے کرام کے لئے ذکر وعبادت الٰہی بھی طعام کا فائدہ دے کر ان کے لئے مایۂ حیات بن جاتی ہے۔ جیسے نبی ﷺ وصال کے روزوں میں کچھ نہ کھاتے تھے اور پھر توانا بھی رہتے تھے۔ چنانچہ اسی کی نسبت فرمایا: ''اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ فَھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیُسْقِیْنِیْ''یعنی میں رات کو اپنے رب کے پاس ہوتا ہوں، وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اس بیان سے مرزاقادیانی کا وہ وہم بھی دور ہوگیا، جو ان کو آیت: ''وَمَا جَعَلْنَاھُمْ جَسَدًا لَّا یَأْکُلُوْنَ الطَّعَامَ''میں پڑا ہے۔ تَمَّ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ!

قسم اوّل میں سے چھٹی آیت یہ ہے: ''وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم: ۳۱)''یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ مجھے خدا نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم کیا ہے۔ جب تک میں زندہ رہوں۔

مرزاقادیانی کو اس آیت کے متعلق دو وہم ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندگی بھر تک نماز اور زکوٰۃ کا حکم ہو رہا ہے اور جب وہ آسمان پر زندہ ہیں تو اس حکم کی تعمیل کس طرح کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو انجیلی طریق پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ (ازالہ اوہام ص۶۰۷، خزائن ج۳ ص۴۲۸) اور اگر وہ آخری زمانہ میں نازل ہوکر اس امت میں داخل ہوں گے تو آپ کو مسلمانوں کے مطابق نماز پڑھنی پڑے گی اور نتیجہ ان ہر دو وہموں سے یہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ پھر ہر دو اعتراض مذکور میں سے کوئی بھی نہیں عائد ہوتا۔

ہم ذیل میں ان دونوں وہموں کے دور کر کے اس آیت کی صحیح تفسیر بیان کرتے ہیں۔ جس سے ناظرین کو علاوہ مرزاقادیانی کے استدلال کے ضعیف بلکہ غلط ہونے کے اس امر کو بھی علم ہو جائے گا کہ مرزاقادیانی اسرار شریعت سے ناواقف تھے، ورنہ ان کو ایسے وہم پیش نہ آتے۔

پہلے وہم کا ازالہ کئی طریق پر ہے: اوّل یہ کہ ان احکام شرعیہ کے مکلّف وہ لوگ ہیں جو زمین پر آباد ہیں، نہ وہ جو آسمان پر ہیں کیا فرشتے بھی ان ہی احکام کے اسی طرح مکلّف ہیں، جس طرح ہم ہیں؟ دوم یہ کہ آسمان پر عبادت کا ہوسکنا کیوں بعید نظر آتا ہے۔ کیا آسمان جائے عبادت نہیں؟ اور شب وروز فرشتے تسبیح وذکر الٰہی میں مشغول نہیں رہتے؟ اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام بھی ان فرشتوں کی جماعت میں عبادت کریں تو کیا تعجب ہے؟ سوم یہ کہ اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد صدقہ مفروضہ نہیں، بلکہ طہارت وصلاحیت مراد ہے۔ جیسے کہ اس سے پیشتر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنے پاس سے نرم دلی اور پاکیزگی عطاء کی۔ اس جگہ تو قطعاً زکوٰۃ سے صدقہ مفروضہ مراد نہیں ہے اور نیز چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اس سے پیشتر بشارت دی گئی تھی۔ ''لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا'' یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو کہا کہ میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تا تجھے ایک لڑکا عطا ہونے کی بشارت سنا کر اس بخشش کے لئے ایک نوع کا سبب بن سکوں، اس لئے اگر اس آیت: ''وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکوٰۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم:۳۱)'' کے معنی یہ کئے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں نماز ادا کرتا رہوں اور پاکیزہ رہوں تو بالکل لغت قرآن کے مطابق ہوں گے۔ بلکہ اس صورت میں تو قرآن شریف ہی سے اس کا ثبوت ہے۔ پھر جائے انکار ہی کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے۔ اس جگہ زکوٰۃ سے مراد یہی صدقہ مفروضہ ہوتا ہے نہ کہ لغوی معنی یعنی پاکیزگی تو اس کا جواب کئی طرح سے ہے۔ اوّل یہ کہ یہ استدلال استقرائی ہے اور استقراء ظنی دلیل ہوتی ہے، یقینی نہیں ہوتی۔ پس اس سے اتنا تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ بے شک قرآن شریف میں اکثر جگہ ایسا ہی وارد ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس جگہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آئے، اس جگہ خواہ مخواہ صدقہ مفروضہ ہی مراد لیا جائے۔ کیونکہ لغت اور عقل اس کی شہادت نہیں دیتے۔

دوم یہ کہ معترض کے قاعدے کو تسلیم کر کے بھی اس جگہ زکوٰۃ سے طہارت مراد لینی خلاف محاورہ قرآن شریف نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں نماز کے ساتھ کسی جگہ ایسی عبادت کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کی جزو اور اس کی جنس سے ہے۔ مثلاً آیت: ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ

وَانْحَرْ (الکوثر:۲) ''میں اگر نحر سے مراد قربانی لی جائے تو یہ پہلی صورت یعنی نماز کے علاوہ زکوٰۃ کی طرح مالی عبادت ہے اور اگر اس سے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا یا رکوع کے وقت رفع یدین کرنا مراد لیا جائے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے تو یہ دوسری صورت یعنی نماز کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ پس جس طرح اس آیت میں نماز کے ساتھ اس کے بعض امروں کا ذکر مستحسن ہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حکم کے متعلق بھی نماز کے ساتھ طہارت وصلاحیت کا ذکر ممنوع نہیں۔ کیونکہ طہارت و پاکیزگی نماز کے لئے ضروری اور شرط ہے۔

اور زکوٰۃ کے دوسرے معنی یعنی صلاحیت تو نماز کے ساتھ بہت ہی چسپاں ہیں۔ کیونکہ صلاحیت اور صلوٰۃ میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔

اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد جو طہارت وصلاحت بتائی گئی ہے، اس کو تاویل نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ زکوٰۃ کے لغوی معنی ہی یہی ہیں۔

جیسا کہ قاموس میں ہے: ''قال صاحب القاموس والزکوٰۃ صفوۃ الشئ واما اخرجته من مالک لتطهره به وقال صاحب المصباح زکا الرجل یزکوا اذا صلح وقال اللّٰه صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا فضم التزکیة بالتطهیر وقال صاحب الصراح زکوٰۃ م تزکیه زکوٰۃ دادن وپاکیزہ کردن وستودن خودراوزکوٰۃ از کسے گرفتن قوله تعالیٰ تزکیهم ای تطهرهم انتهٰی ما فی الصراح'' کہ زکوٰۃ کسی شئے کے صاف کرنے اور اس شئے کو کہتے ہیں جو پاک صاف کی گئی ہو اور جو کچھ مال میں سے پاکیزگی کے لئے نکالا جائے اور مصباح میں ہے کہ ''زکا الرجل'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ مرد صلاحیّت والا ہوگیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ اے پیغمبر! ان سے صدقہ لو جس سے تم ان کو پاک صاف کرو اور صراح میں ہے کہ ''تزکیه'' کے معنی زکوٰۃ دینا اور پاک کرنا اور اپنے آپ کو سراہنا اور کسی سے زکوٰۃ لینا ہیں جیسے کہ قرآن میں ہے ''تُزَكِّيهِمْ'' یعنی ان کو پاک کرے۔

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ لغت میں زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی اور صفائی کے ہیں اور شریعت میں جو اس سے ایک مخصوص مالی عبادت مراد رکھی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عبادت طہارت و پاکیزگی کا سبب بنتی ہے۔ یعنی بخیل اور مال کی محبت سے دل پاک وصاف

ہو جاتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ لغوی اور منقولی مضمون میں مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ پس بیان بالا سے واضح ہوگیا کہ: ’’وَ اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکوٰۃِ‘‘ میں زکوٰۃ سے طہارت وصلاحیت مراد لینی لغت اور قرآن شریف کے بالکل مطابق بلکہ مؤید بالقرآن ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جواب جو بہت معقول اور محکم ہے یہ ہے کہ اگر اس آیت زیر بحث میں زکوٰۃ سے صدقہ مفروضہ ہی مراد لیں تو بھی اس سے مرزا قادیانی کی مراد کے موافق عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ علم اصول کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ امر کی تعمیل اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کی شرائط پائی جائیں اور شرطیں موجود نہ ہونے کی صورت میں واجب نہیں ہوتا اور یہ بھی مسلّم ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لئے نصاب یعنی اتنا اور ایسا مال جو وجوب کی حد تک پہنچ جائے، شرط ہے۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر مالک نصاب نہیں تو ان پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں۔ غور وفکر کو کام میں لایئے اور انصاف کیجئے کہ عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہونے کے ساتھ ہی باذن الٰہی اس امر کو ظاہر کررہے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے زندگی تک نماز پڑھنے اور زکوٰۃ کا حکم کیا ہے۔ کیا آپ پر اس وقت بھی نماز اور زکوٰۃ فرض تھے؟ کیونکہ بچپن بھی تو زندگی میں داخل ہے۔ پس جس طرح آپ عیسیٰ علیہ السلام پر بچپن میں اس حکم کی تعمیل واجب نہیں جانتے، اسی طرح آسمان پر بھی اس حکم کی تعمیل ان پر واجب نہیں۔

باقی رہا مرزا کا یہ وہم (۲) کہ عیسیٰ علیہ السلام کو انجیلی طریق پر نماز پڑھنے کا حکم ہے اور اگر وہ آخری زمانے میں نازل ہوں گے تو اس امت میں داخل ہوں گے تو آپ مسلمانوں کے مطابق نماز پڑھنی ہوگی سو اس کا ازالہ اس طرح ہے کہ مرزا قادیانی جب تک انجیلی اور قرآنی نماز میں فرق ثابت نہ کرلیں، تب تک ان کو اس اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ قرآن شریف میں شریعت محمدیہ علی صاحبہا صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے ارکان قیام، رکوع اور سجود بتائے گئے ہیں اور یہی ارکان حضرت مریم علیہا السلام کی نماز کے بتائے گئے ہیں۔ جیسا کہ تیسرے پارے میں ذکر ہے کہ: ’’یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (آل عمران:۴۳) اے مریم! اپنے پروردگار کے لئے قیام کر اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔‘‘ پس قرآن شریف سے تو پہلی امتوں کی نماز اور ہماری امت کی نماز میں کوئی فرق ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر مرزا قادیانی اپنے الہام سے فرمادیں تو یہ دیگر امر ہے۔

دوم یہ کہ اگر بالفرض انجیلی نماز اور قرآنی نماز میں کسی نوع کا فرق بھی ہوتو کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ دین کی اصل توحید ہے اور عبادت اس کا ایک عملی نشان ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی ایک ہی کیفیت پائی جائے۔ بلکہ جس کیفیت سے خدا تعالیٰ چاہے۔ اپنی عبادت کے لئے حکم دے۔ پس اگر عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد انجیلی کیفیت عبادت کو بوجہ اس کو منسوخ ہو جانے کے ترک کر دیں اور شریعت محمدی کی کیفیت سے نماز ادا کریں تو اس میں کیا جائے اعتراض ہے؟ اس کی نسبت تو اللہ تعالیٰ نے شریعت موسوی اور شریعت عیسوی کے ذکر کے بعد فرما دیا ہے کہ: ''لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَّلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَا اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (مائدہ:۴۸)'' ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ طریقہ اور شریعت مقرر کی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک شریعت پر جمع کر دیتا۔ مگر (اس میں ایک حکمت ہے) کہ تم کو ہر زمانہ میں اپنی فرمودہ شریعت کی تعمیل کی بابت آزمائے۔ پس تم نیکیوں میں بڑھو (اور ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ دو)

اس آیت سے دو مفید امر ثابت ہوتے ہیں، جن کا ذکر اس مقام پر چھوڑنا گویا ناظرین کو موقع پر بڑے بھاری فائدے سے محروم کرنا ہے۔ اوّل: نسخ کی حقیقت کہ کس امر میں نسخ واقع ہوتا ہے۔ دوم: نسخ کی حکمت کہ کیوں کیا گیا۔

نسخ اصول دین میں نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہاں! دستور العمل ضابطے اور قانون اور عبادت کی کیفیت میں ہر زمانے کے لوگوں کے لئے ان کی حالت کے مناسب اگر تبدیلی کی جائے تو اس کی کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ عین حکمت ہے۔ نسخ میں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ سچے مطیع دوسروں سے متمیز ہو جاتے ہیں اور فرمانبرداری کے عادی حیلے بہانے کرنے والوں سے الگ ہو پڑتے ہیں۔ عبادات کی کیفیتوں میں فرق ہونے سے کوئی بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ جب خود عبادت کئی انواع پر ہے تو اس کی انواع کیفیت کے فرق میں کیا اعتراض ہے۔ یہ ایک بہت باریک راز ہے، جس سے ہمارے مرزا قادیانی بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ ایسا اعتراض نہ کرتے۔ پس اس آیت سے مرزا قادیانی کی مراد کے موافق حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات ثابت نہ ہوسکی اور نہ ان کے نزول کے انکار کی وجہ نکل سکی۔ کیونکہ اس کی بناء صرف انہی دو وہموں پر تھی۔ جن کا ازالہ ہو چکا ہے۔

قسم اوّل میں سے ساتویں آیت یہ ہے: ’’وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (مریم:۳۳)‘‘ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ: ’’میں جس دن پیدا ہوا ہوں، اس دن بھی مجھ پر سلام ہے اور جس دن مروں گا اس دن بھی اور جس دن میں پھر زندہ کھڑا کیا جاؤں گا، اس دن بھی۔

اس آیت کے متعلق مرزا قادیانی یوں ارقام فرماتے ہیں: ’’اس آیت میں واقعات عظیمہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود کے متعلق تھے صرف تین بیان کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر رفع اور نزول واقعات صحیحہ میں سے ہیں تو ان کا بیان بھی ضروری تھا۔ کیا نعوذ باللہ! رفع اور نزول حضرت مسیح علیہ السلام کا مورد اور محل سلام الٰہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ سو اس جگہ پر خدا تعالیٰ کا اس رفع اور نزول کو ترک کرنا جو مسیح ابن مریم کی نسبت مسلمانوں کے دلوں میں بسا ہوا ہے۔ صاف اس بات پر دلیل ہے کہ وہ خیال ہیچ اور خلاف واقع ہے۔ بلکہ وہ رفع ’’یَوْمَ اَمُوْتُ‘‘ میں داخل ہے اور نزول سراسر باطل ہے۔‘‘ انتہیٰ!

(ازالہ اوہام ص۶۰۸، خزائن ج۳ص۴۳۸)

مرزا قادیانی کے اس وہم کا ازالہ دو طریق سے ہے: اوّل یہ کہ سب عقلاء کے نزدیک مسلّم ہے اور معقولات میں مصرح ہے کہ کسی امر کے مذکور نہ ہونے سے اس کے وقوع کی نفی نہیں کر سکتے اور قرآن وحدیث میں بلکہ ہر شخص کے روزمرّہ میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہ آپ کی نئی منطق ہے کہ کسی امر کے مذکور نہ ہونے سے اس کے عدم وقوع کا نتیجہ نکالتے ہیں[1]۔ ہاں اگر قرآن شریف میں رفع کا ذکر مطلقاً کہیں بھی نہ ہوتا تو بھی آپ کہہ سکتے تھے۔ مگر جب دوسرے مقام پر اس کی تصریح موجود ہے تو اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ تصریح کو چھوڑ کر خلاف عقل ونقل خود ساختہ قاعدے سے تمسک کرنا اتباع ہوئی اور تفسیر بالرائے نہیں تو پھر تفسیر بالرائے اور خواہش کی تابعداری کسے کہیں گے؟ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام ہی کے ذکر میں فرمایا: ’’کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ‘‘ یعنی وہ دونوں کھانے کے محتاج تھے تو صرف طعام کی احتیاج کے مذکور ہونے اور کسی اور احتیاج کے مذکور نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکل نہیں سکتا کہ وہ کسی اور چیز پانی وغیرہ کے محتاج نہ تھے۔

[1] حالانکہ (براہین احمدیہ ص۲۱۰، خزائن ج۱ص۲۳۲،۲۳۳، بقیہ حاشیہ نمبر۱۱) میں لکھ چکے ہیں کہ: ’’عدم علم سے عدم شئی لازم نہیں آتا۔‘‘

مرزا قادیانی کے قاعدہ کے مطابق تو یہاں احتیاج کی جمیع جزئیات اور جملہ انواع شمار کردینی چاہئیں۔ کیونکہ اس جگہ ان کے محتاج ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوم: یہ کہ آیت: ’’اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (آل عمران:۵۵)‘‘ بآواز بلند مسیح علیہ السلام کے رفع جسمانی کو ثابت کررہی ہیں اور آیت: ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ‘‘ ان کے نزول کی شہادت دے رہی ہے تو اب دوسرے مقام پر اس کے مذکور نہ ہونے سے کیا حرج لازم آیا اور ان تصریحات کے مقابلہ میں مرزا قادیانی کو اس عدم ذکر سے انکار کا حق کس طرح حاصل ہوا؟ ثبوت رفع جسمانی کے لئے دیکھو (شہادت القرآن حصہ اوّل) یعنی باب اوّل اور ثبوت نزول کے لئے دیکھو (حصہ دوم) تک بذیل چوتھی آیت یعنی ’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ‘‘

سوم: یہ کہ آیت زیر بحث سے پیشتر رفع کا ذکر موجود ہے جو مرزا قادیانی کو قرآن کریم میں تدبّر نہ کرنے کی وجہ سے معلوم نہیں ہوسکا۔ چنانچہ فرمایا: ’’وَجَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ (مریم:۳۱)‘‘ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبارک کیا ہے جہاں کہیں میں ہوں۔ اس آیت کی تفسیر (حصہ اوّل) میں گزرچکی ہے کہ لغت میں برکت کے معنی خیر کثیر یعنی بہت سی بھلائی اور علو یعنی بلندی ہے۔ جیسا کہ آیات ذیل سے بھی ثابت ہے ’’لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اعراف:۹۶)‘‘ یعنی ہم ان پر آسمان وزمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے اور ’’فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (مؤمنون:۱۴)‘‘ اور ’’فَتَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (مؤمن:۶۴)‘‘ اور ’’تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (الملک:۱)‘‘ میں برکت سے مراد علو اور بلندی ہے۔ برکت کے یہ دونوں معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں باحسن وجہ پائے جاتے ہیں۔

خیر کثیر تو مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے اور نزول مائدہ یعنی آسمان سے تیار کھانا اترنے کی دعا کے قبول ہونے سے ظاہر ہے اور وہ برکات وخیرات جو آپ کے نزول پر ہوں گی۔ مثلاً دشمنی اور بغض اور حسد کا دور ہوجانا اور مال کا کثرت سے ہوجانا اور پھلوں اور دودھ کا معمول سے زیادہ ہوجانا جو صحیح مسلم میں وارد ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے اور دوسرے معنی یعنی بلندی، آیت: ’’بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ‘‘ میں بالتصریح مذکور

ہے۔پس ’’جَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ ‘‘میں ہر سہ اقوال قبل رفع اور زمان رفع اور بعد نزول مذکور ہیں۔اسی لئے ’’اَیْنَمَا کُنْتُ ‘‘جس کے معنوں میں بہت وسعت ہے۔فرمایا: میں اس آیت سے رفع آسمانی ثابت کرنے میں اکیلا نہیں ہوا اور نہ یہ کوئی تفسیر نئی ہے۔ بلکہ پچھلی تفسیروں میں مفسرین برابر لکھتے چلے آئے ہیں۔دیکھو تفسیر کبیر و تفسیر سراج منیر۔

اس بیان سے ثابت ہوا کہ اس آیت سے عیسیٰ کے رفع اور نزول سے انکار کرنا محض جہالت ہے۔چہ جائے کہ اس کو دلائل وفات میں پیش کیا جائے۔

اس مقام پر عیسیٰ علیہ السلام کی بعض برکتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ مرزا قادیانی بھی مدعی عیسویت ہیں۔اس لئے مناسب ہے کہ آپ کے ظہور پر جو کچھ برکتیں ظاہر ہوئیں۔ان کا بھی کچھ ذکر کیا جائے۔تاکہ ایک سوچنے والے کے دونوں میں مبائنت بلکہ ضدّیت کی نسبت ظاہر ہو:

نمبر	عیسیٰ علیہ السلام کی برکتیں	نمبر	مرزا قادیانی کی شامتیں
۱	دشمنی، حسد اور بغض کا دور ہو جانا، جیسا کہ صحیح مسلم میں مروی ہے:’’وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَآءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ‘‘ (صحیح مسلم ومشکوٰۃ باب نزول عیسیٰ)	۱	ہندوستان (یہ کتاب رمضان ۱۳۱۳ھ میں متحدہ ہندوستان کے وقت لکھی گئی تھی) کے عام باشندوں خصوصاً مسلمانوں میں دشمنی، حسد اور بغض کی آگ لگ جانی اور ایسی عداوت کا پیدا ہو جانا جس سے ایک دوسرے سے جدائی اور قطع تعلق بلکہ قطع رحم نتائج نکل رہے ہیں۔
۲	مال کا کثرت سے ہو جانا حتیٰ کہ زکوٰۃ کے قبول کرنے والے نہیں ملیں گے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)’’وَيَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ‘‘ (مشکوٰۃ باب نزول عیسیٰ)	۲	مسلمانوں کا سخت محتاجی اور فقر کی حالت میں ہونا۔اگر ایک شخص خیرات کا دروازہ کھولے تو اس کثرت سے فقراء کا جمع ہو جانا کہ اسے دروازہ بند کرنا پڑے اور بعض کا افلاس کے مارے بے دینی کی طرف مائل ہو جانا۔

۳	دلوں میں آخرت کی تیاری کی فکر اور دنیا سے بے رغبتی کا پیدا ہو جانا (صحیح مسلم) ''حَتّٰی تَکُوْنَ السَّجْدَۃُ الْوَاحِدَۃُ خَیْرًا مِنَ الدُّنْیَا (مشکوٰۃ)''	۳	لالچ اور طمع نفسانی کا بڑھ جانا حتی کہ حلال وحرام میں تمیز نہ رہنا، رشوت ستانی اور خیانت اور غبن کا کثرت سے وقوع میں آنا اور بعض کا لالچ کے مارے بے دینی اختیار کر لینا، عاقبت کو بھلا دینا اور دنیوی فائدوں کو پیش نظر رکھنا۔
۴	کثرت سے بارش کا ہونا اور دودھ اور پھلوں کا معمول سے زیادہ ہونا اور جو امر عام خلق اللہ کے حق میں مضر ہوں ان کا رک جانا۔ (صحیح مسلم)	۴	خشک سالی اور ہر جنس کی گرانی خصوصاً گھی، دودھ کا کم ہو جانا اور آئے دن نئی بیماریاں اور وبائیں اور طاعون اور زلزلے اور بہت سی مصیبتیں۔ دنیا میں عام طور پر بدامنی اور بے آرامی کا ہونا۔

قسم اوّل کی سب آیتوں کا بیان ہو چکا۔ اب قسم دوم کی آیتیں ذکر کی جاتی ہیں:

قسم دوم: میں وہ آیتیں ہیں جو مرزا قادیانی کے خیال میں عموماً دیگر انبیاء علیہم السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اس نظر سے کہ مسیح علیہ السلام بھی ایک نبی ہیں۔ لہٰذا وہ ان آیتوں کے حکم میں داخل ہیں۔ ایسی سب آیتوں کے جواب کے لئے تمہیدی طور پر علم اصول کے دو قاعدے بیان کرنے ضروری ہیں۔ جن سے معلوم ہو جائے گا کہ مرزا قادیانی قواعد علم اصول سے کس قدر دور چلتے ہیں اور اپنی مطلب برآری کے لئے اس علم کو کیسے بھلا دیتے ہیں۔

پہلا قاعدہ یہ ہے کہ ایک امر صراحت کے ساتھ منطوق عبارت سے ثابت ہو تو اس کے خلاف کسی عبارت میں سے بطور اشارہ یا دلالت استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مقابلے کے وقت منطوق کا اعتبار مفہوم پر مقدم ہوتا ہے۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ کوئی امر کسی خاص دلیل سے ثابت ہو تو اس کے خلاف عام دلیل سے تمسک کرنا جائز نہیں۔ یہ دونوں قاعدے نہایت معقول ہیں اور علم اصول کی کتابوں میں ان کی تصریح موجود ہے۔ پس ان کے متعلق زیادہ تفصیل اور نقل عبارت کی ضرورت نہیں۔

قسم دوم میں سے پہلی آیت یہ ہے: ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ (اٰل عمران:۱۴۴)'' یعنی محمد ﷺ تو ایک رسول ہیں، ان سے پیشتر کئی رسول ہو چکے ہیں۔ پس اگر یہ فوت ہو جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر لوٹ کر (بے دین) ہو جاؤ گے؟

اس آیت سے مرزا قادیانی نے اس طرح استدلال کیا ہے ’’کہ جب محمد ﷺ سے پہلے رسول سب کے سب فوت ہو چکے ہیں تو بس مسیح علیہ السلام بھی ان میں آ گئے۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۰۶ خزائن ج۳ ص۴۲۷)

اس آیت کے جواب کے لئے چار امروں کی تحقیق ضروری ہے۔ اوّل تحقیق لفظ خلت کہ لغت میں اس کے کیا معنی ہیں۔ دوم ’’مِنْ قَبْلِهٖ‘‘ بترکیب کیا واقع ہوا ہے۔ سوم ’’اَلرُّسُلُ‘‘ کا الف کیسا ہے۔ چہارم اگر ان ہر سہ امور کو مرزا قادیانی کی مراد کے موافق تسلیم کر لیں تو کیا اس آیت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

تحقیق لفظ خلت

خلت مشتق ہے، خلو سے اور موضوع مکان کی صفت کے لئے اور مراد اس سے جگہ خالی کرنا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے ’’(خلا) خلا المکان والشئ یخلوا خلواً وخلآء ذا خلٰی اذا لم یکن فیه احد ولا شئ فیه وهو خال‘‘ اسی طرح قاموس اور صراح میں بھی ہے اور قرآن شریف میں بھی نقل مکان کے لئے آیا ہے۔ جیسے ’’وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ (البقرہ:۱۴)‘‘ یعنی جس وقت یہ منافق اپنے بڑے شیطانوں یعنی رئیسوں کے پاس جاتے ہیں۔

اور اسی طرح اس آیت زیر بحث سے تھوڑا سا پیشتر ہے ’’وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْکُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ (آل عمران:۱۱۹)‘‘ یعنی منافق لوگ جس وقت تم سے الگ ہوتے ہیں تو تم پر غیظ وغضب کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔

اور اسی طرح یہ آیت ہے: ’’فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ‘‘ یعنی مشرک لوگ جب ایمان لے آئیں اور احکام اسلامی کے پابند ہو جائیں تو ان کا رستہ خالی کر دو۔ یعنی ان سے تعرض نہ کرو۔

ان سب آیات میں ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جانا ہے، جسے انتقال مکانی کہتے ہیں۔ دوسرے معنی لفظ خلو کے جو زمانے کے متعلق ہوتے ہیں، گزرنا ہیں۔ جیسے آیت: ’’بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ (الحاقة:۲۴)‘‘ یعنی جو کچھ تم نے ایام گزشتہ میں کیا اس کے عوض میں جنت کی ان نعمتوں میں رہو۔

اور ہر ذی علم سمجھ سکتا ہے کہ گزرنا زمانے کی صفت بالذات ہوا کرتی ہے اور جن چیزوں پر زمانہ گزرنا بعلاقہ ظرفیت ومظروفیت ان چیزوں کی صفت بھی ہوسکتا ہے۔ مگر بالذات نہیں بلکہ بالعرض۔ پس بہر تقدیر آیت زیر بحث کے معنی یہ ہوں گے کہ: ''جگہ خالی کر گئے اور گزر چکے ہیں پیشتر اس کے کئی رسول'' اور یہ معنی زندوں اور مردوں ہر دو پر آ سکتے ہیں۔ کیونکہ جگہ خالی کرنے اور گزرنے کی کیفیت صرف موت ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ لفظ خلو مردوں کے حق میں انتقال بالموت کے معنوں میں معین ہوگا اور زندوں کے حق میں جگہ تبدیل کرنے کے معنوں میں۔ جس طرح ہم کہا کرتے ہیں کہ اس شہر میں ایسے حاکم کئی ہوگزرے ہیں۔ پس جس طرح یہ جملہ خواہ وہ حاکم مرگیا ہو، خواہ وہاں سے تبدیل ہوکر دوسری جگہ چلا گیا ہو۔ ہر دو حال میں صحیح المعنی رہتا ہے۔ اسی طرح آیت: ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ'' میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں بدلالت آیت: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' وغیرہ دوسرے معنی یعنی جگہ کے تبدیل کرنے میں معین ہوگا۔

خلو کے معنی مرنا اور معدوم ہونا نہیں۔ کیونکہ پھر آیات ''سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِ (الفتح:۲۳)'' اور آیت: ''وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً (الاحزاب:۶۲)'' میں تناقض واقع ہوگا۔ کیونکہ بموجب مذہب مرزا قادیانی پہلی آیت کا مفاد یہ ہے کہ سنت اللہ معدوم ہوچکی ہے اور دوسری آیت کا یہ کہ سنت الٰہی تبدیل بھی نہیں ہوسکتی۔ یعنی اسے ہمیشہ کے لئے اپنے حال پر بقا حاصل ہے۔ پس ''خلت'' سے موت اور عدم مراد سمجھنا بالکل باطل ہیں۔

<u>امر دوم:</u> یعنی ''مِنْ قَبْلِهِ'' کو مرزا قادیانی اور مولوی محمد احسن صاحب امروہی نے ''اَلرُّسُلُ'' کی صفت بنایا ہے۔ چنانچہ اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ ''جو پیغمبر محمد ﷺ سے پیشتر تھے وہ مرگئے۔'' یہ ان کی صریح غلطی ہے اور علم نحو سے ناآشنا ہونے یا دیدہ دانستہ لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی صاف شہادت ہے۔ کیونکہ آیت ''من قبلہ'' لفظ ''الرسل'' پر مقدم ہے اور مبتدی بھی جانتے ہیں کہ موصوف صفت سے پہلے ہوتا ہے۔ پس مرکب ''من قبلہ'' لفظ ''الرسل'' کی صفت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ محض ظرف میں واقع ہے اور متعلق ہے فعل ''خلت'' کے۔ کیونکہ ظرف کے لئے ضروری ہے کہ کسی فعل کے متعلق ہو۔ پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ''اس سے پیشتر کوئی رسول گزر چکے۔''

امر سوم: یعنی ’’الرسل ‘‘ کے الف لام کی تحقیق اس طرح ہے کہ مرزا قادیانی اور مولوی محمد احسن صاحب امروہی اس الف لام کو استغراقی قرار دیتے ہیں اور اس بنا پر اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ ’’چونکہ آنحضرت ﷺ سے پیشتر کے سب رسول فوت ہوچکے ہیں۔‘‘ فاضل امروہی اور مرزا قادیانی کے اس قیام کی بنا غلط مقدمات پر ہے اور الف لام کو استغراقی قرار دینے میں انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔

اوّل اس وجہ سے کہ اوپر ثابت ہوچکا ہے کہ ’’من قبلہ ‘‘فعل ’’خلت‘‘ کے متعلق ہے اور ’’الرسل ‘‘ کی صفت نہیں ہے۔ پس یہی ترکیب اس الف لام کے استغراقی نہ ہونے کے لئے کافی حجت ہے۔ کیونکہ اگر ’’من قبلہ ‘‘ کو ’’خلت‘‘ کے متعلق ظرف ٹھہرائیں جو بالکل درست ہے اور ’’الرسل ‘‘ کے الف لام کو استغراقی مانیں جو بالکل غلط ہے تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! اندریں صورت پہلے قضیہ ’’مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ‘‘ کے خلاف رسول اللہ ﷺ جماعت مرسلین سے خارج ہوں گے۔ کیونکہ پھر تو اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جتنے اشخاص صفت رسالت سے موصوف تھے، وہ محمد ﷺ سے پیشتر فوت ہوچکے ہیں۔ پس آپ معاذ اللہ رسول برحق ثابت نہ ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جس معنی سے قرآن شریف کی آیات میں تعارض واقع ہو خصوصاً کسی نبی برحق کی رسالت کا انکار لازم آتا ہو، وہ معنی بالکل باطل ہیں۔ دیگر یہ کہ یہی الفاظ ’’قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ‘‘ سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں دربارہ نفی الوہیت وارد ہوئے ہیں۔ پس اگر جہالت سے الف لام کو استغراقی مانا جائے تو لابد تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نزول کے وقت فوت ہوگئے تھے اور یہ بالکل باطل ہے یا معاذ اللہ! انکار نبوت محمدی وعیسوی لازم آئے گا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ سب رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر فوت ہوگئے ہیں۔ حالانکہ جناب رسول اللہ ﷺ حضرت مسیح علیہ السلام کی رفع کے کئی زمانے بعد پیدا ہوئے اور شرف نبوت سے ممتاز ہوئے اور اس آیت کے نزول کے وقت زندہ موجود تھے۔ کیونکہ یہ آیت آپ ﷺ ہی پر اتری۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے۔ اس کا ادراک کسی علم نحو کے مذاق سے خالی اردوخوان کا کام نہیں۔

تنبیہ: اس تقریر کے جواب میں جلدی کرکے ’’من قبلہ ‘‘ کو ’’الرسل ‘‘ کی صفت نہ کہہ دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کا ابطال ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔

دوسری وجہ جس سے ’’الرسل‘‘ کے الف لام کو استغراقی کہنا غلط ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اس آیت: ’’وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ‘‘ کا شان نزول یہ ہے کہ آں سرور ﷺ کی نسبت جنگ احد میں غلط خبر اڑ گئی کہ آپ شہید ہوگئے اور بعض لوگوں نے نبوت اور موت میں منافات سمجھی اور ارتداد کا رستہ اختیار کرنے لگے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی اور ظاہر کردیا کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں۔ کیونکہ جس طرح بعض دیگر رسولوں کے حق میں ان کے مرجانے سے ان کی نبوت میں کوئی قدح واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر آنحضرت ﷺ بھی طبعی موت سے فوت ہوجائیں یا میدان جنگ میں شہید ہوجائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ آپ ﷺ نبی برحق نہیں ہیں۔ پس چونکہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کو مقصود یہ ہے کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں ہے۔ اس لئے استغراق افراد یعنی سب رسولوں کو فوت شدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں[1]۔ صرف ایک رسول یا چند رسولوں کی موت کے ذکر سے مقصود حاصل ہوسکتا ہے۔ پس ’’الرسل‘‘ کا الف لام استغراق کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پیشتر کئی رسول ہوچکے ہیں اور الف لام جنسی ہے۔ کیونکہ اسم پر الف لام داخل ہوکر ہمیشہ استغراق افراد کا فائدہ نہیں دیتا۔ بلکہ تین معانی میں سے کسی معنی میں سے ہوتا ہے۔ عہد استغراق اور تعریف جنس۔ جیسا کہ علم نحو کے مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں ہے ’’الرسل‘‘ کا الف لام عہدی اس لئے نہیں کہ اس سے اوپر ان رسولوں کا ذکر نہیں ہے اور اس کے استغراقی نہ ہونے کے لئے ’’من قبلہ‘‘ اور شان نزول کا مانع ہونا بیان ہوچکا ہے۔ پس بقاعدہ تردید ودوران جنسی ہوا اور یہی ہماری مراد ہے۔

[1] معقولی طور پر اس کا بیان اس طرح ہے کہ مشککین کا قول سالبہ کلیہ ہے کہ کوئی نبی مر نہیں سکتا اور خدا تعالیٰ کو اس کی تردید منظور ہے اور معلوم ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزیہ ہوتی ہے نہ کہ موجبہ کلیہ۔ پس الف، لام ’’الرسل‘‘ کا استغراق کے لئے نہ ہوا۔ بلکہ تعریف جنس کے لئے ہوا اور چونکہ ’’الرسل‘‘ کلی ہے اور اس پر کوئی کلمہ حاصر نہیں۔ اس لئے ’’قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ‘‘ قضیہ مہملہ ہوا اور معلوم ہے کہ مہملہ قوت جزیہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی ہوئے۔ تحقیق گزر چکے ہیں۔ پیشتر اس سے کئی رسول۔ قادیانی خلافت سے پہلے حکیم نورالدین قادیانی نے بھی اس آیت کا ترجمہ اپنی کتاب فصل الخطاب میں یہی کیا ہے جو ہم نے کیا ہے (ملاحظہ ہو ص۳۳ حصہ اوّل) پس الف لام کے استغراقی نہ ہونے کے سبب سب رسول فوت شدہ ثابت نہ ہوئے۔ بلکہ بعض رسول۔ لہٰذا یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل از نزول کی دلیل نہ ہوسکی۔ (سعادت)

اگر یہ کہا جائے کہ: ''الف لام جمع کے صیغے پر جب کبھی آتا ہے تو مفید استغراق ہی ہوتا ہے۔'' جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کردیا ہے کہ الف لام کے ہمیشہ استغراقی نہ ہونے کے لئے آیت: ''وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ (البقرہ:۸۷)'' کو غور سے پڑھنا چاہئے کہ یہی لفظ ''الرسل'' بصیغہ جمع باالف ولام موجود ہے اور یہاں استغراق افراد قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی اور اس کے پیچھے اس کے آئین پر کئی رسول بھیجے نہ یہ کہ سب رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے۔ کیونکہ یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے پہلے رسول نہیں ہیں۔ بلکہ کئی رسول آپ کے پہلے ہوئے اور کئی آپ کے بعد۔ پس ہردو آیت میں ''الرسل'' سے مراد کئی پیغمبر ہیں کہ سارے[1]۔ فافہم!

اسی طرح قرآن شریف میں کئی مقام پر جمع کا لفظ الف لام کے ساتھ آیا ہے اور وہاں استغراق افراد مراد نہیں بلکہ کثرت کے معنی ہیں جیسے ''اِذْ جَاءَتْھُمُ الرُّسُلُ (حم سجدہ:۱۴)'' اور ''وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِھِمُ الْمَثُلٰتُ (الرعد:۶)'' میں ''خلت'' اور ''من قبلھم'' اور ''مثلٰت'' صیغہ جمع باالف لام سب کچھ موجود ہے اور مرزا قادیانی اور فاضل امروہی صاحب کی تحقیق ان سب کے خلاف ہے۔

اس آیت کے متعلق مرزا قادیانی نے ایک اور گل کھلایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ اگر نبی کے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ضروری ہے تو ایسا نبی پہلے نبیوں میں سے پیش کرو جو آج تک زندہ موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اگر مسیح ابن مریم علیہ السلام زندہ ہے تو پھر دلیل جو خدا تعالیٰ نے پیش کی صحیح نہیں ہوگی۔'' انتہیٰ!

(ازالہ اوہام ص۶۰۶، خزائن ج۳ ص۴۲۷)

مرزا صاحب! یہ نئی منطق کہاں سے پڑھی؟ کیا الہام سے تو نہیں سیکھی؟ آپ ہر علم دینی و دنیوی میں تجدید کرتے ہیں۔ خواہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ ایسی منطق سے تو آپ نے معلّم اوّل (ارسطو) اور معلّم ثانی (ابونصر فارابی) اور بوعلی سینا کو بھی مات کردیا۔

[1] کیونکہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔

حضرت! واقعہ کو زیرنظر رکھ کر آیت کی صحیح مراد یہ ہے کہ میدان جنگ میں نبی ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر بعض لوگوں نے نبوت اور موت میں منافات کا گمان کر کے ارتداد کی راہ اختیار کرنی چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان کے زعم کی تردید میں نازل کی۔ پس اس کا ماحصل یہ ہوا کہ اگر رسالت اور موت میں منافات ہوتی تو کوئی رسول بھی نہ مرتا۔ کیونکہ جب مقصود یہ ہے کہ وصف رسالت اور موت میں منافات کے گمان کو دور کیا جائے تو خواہ ایک رسول فوت شدہ کو بطور نظیر پیش کریں، خواہ زیادہ کو بہر دوصورت مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ پس آپ کا یہ وہم کہ: ''اگر مسیح ابن مریم زندہ ہے تو پھر دلیل صحیح نہیں ہوگی۔'' باطل ہے۔ اس لئے کہ جب کئی رسول فوت ہو جائیں اور ایک زندہ رہے تو اس کا زندہ رہنا دوسرے کی زندگی کے لئے علت موجبہ نہیں ہوسکتا اور نہ وصف رسالت اور موت میں منافات ہوسکنے کی وجہ بن سکتا ہے۔ بلکہ اس سے تو منافات[۱] کا ابطال صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر منافات ہوتی تو کوئی شخص جو اس صفت سے موصوف ہیں، مر چکے ہیں۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو کہ قضیہ ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ'' کلیہ نہیں ہے۔ بلکہ مہملہ ہے۔ جو جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ پس امروہی صاحب[۲] نے جو منطقی طور پر اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرنی چاہی ہے۔ وہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شکل اوّل کے انتاج کے لئے کلیت کبریٰ شرط ہے۔ جیسا کہ کتب منطق میں مصرح ہے۔

۱؎ کیونکہ منافات ہونے کی صورت میں سلب کلی ضروری ہے اور جب معلوم ہو چکا کہ بعض فوت ہو چکے ہیں تو کلیت ٹوٹ گئی اور منافات کا دعویٰ باطل ہوگیا اور سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہونے کے یہی معنی ہیں۔ فَافْهَمْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَاصِرِيْنَ!

۲؎ (دیکھو رقیمۃ الودود نمبر سوم ص۲۰ جو رسالہ دافع البلاء مصنفہ مرزا قادیانی مطبوعہ سیالکوٹ کے ساتھ شامل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''ہاں! بپاس خاطر طبعہ مدرس صاحب کے قیاس منطقی ہم یہاں لکھے دیتے ہیں سو واضح خاطر عاطر ناظرین ہو کہ ہم نے نہایت بسط کے ساتھ شمس بازغہ میں شکل اوّل بدیہی الانتاج سے حضرت عیسیٰ کی وفات ثابت کر دی۔ مگر یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف دو تین سطروں میں شکل اوّل کو لکھ دیتے ہیں: ''عیسیٰ بن مریم کان نبیاً من الناس الذین کانوا من نبیّنا ومات النّاس الذین کانوا قبلہ کلھم حتی الانبیاء فعیسیٰ ابن مریم ایضاً مات'' مقدمہ صغریٰ تو اس کا مسلّم فریقین ہے اور مقدمہ آیت ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ'' سے بھی ثابت ہو چکا۔ انتہیٰ!

''وشرط انتاجه ایجاب الصّغری و کلیة الکبری ''پس جب شکل اوّل کے رو سے قیاس کے صحیح ہونے کی ایک شرط موجود نہ ہوئی تو قیاس صحیح نہ ہوا۔''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ'' کے کلیہ نہ ہونے کی وجوہ اوپر مذکور ہوچکی ہیں۔''الرسل''میں الف لام استغراقی نہیں۔کیونکہ''من قبله''جو''خلت''کے متعلق ہے، اس کا انکار کرتا ہے۔نیز یہی آیت حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں وارد ہے۔''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ''نیز آیت:''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ''اس کی مخصص موجود ہے۔نیز شان نزول اور زاعمین کے زعم پر نظر رکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ قضیہ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ''موجبہ جزئیہ ہے۔

پہلے تین امروں کی تحقیق بخوبی ہوچکی ہے۔جس سے صاف ثابت ہوگیا کہ آیت ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ'' کے یہ معنی نہیں کہ جو پیغمبر رسول ﷺ سے پیشتر تھے وہ سب مرگئے ہیں۔ بلکہ اس کے معنی جو لغت عرب اور قواعد نحو اور علم منطق کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ یہ ہیں کہ تحقیق گزر چکے پیشتر اس کے کئی رسول۔

اب امر چہارم کی تحقیق کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس کے معنی مرزا قادیانی کی غلط تحقیق کے موافق ہیں تو بھی اس سے مرزا قادیانی کی مراد یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر بھی یہ آیت وفات مسیح علیہ السلام کے بارے میں عام رہے گی، خاص نہ ہوگی۔لیکن آیات:''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ''اور''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ''اور''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ''جن کی تفسیر پیچھے گزر چکی ہے۔آپ کی رفع آسمانی اور نزول بار ثانی کے لئے خاص دلائل اور نصوص قطعیہ ہیں۔جن کے مقابلے میں مرزا قادیانی کا استدلال جو اس آیت زیر بحث کے عموم سے کیا گیا ہے، مفید مطلب نہیں۔ کیونکہ ہم اس آیت کے شروع میں دوسرے قاعدے میں بیان کر آئے ہیں کہ دلیل خاص کے مقابلے میں اس کے خلاف عام دلیل سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔مثلاً سورہ دہر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (دهر:۲)''یعنی ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔

اور چونکہ آدم علیہ السلام بھی انسان ہیں۔اس لئے بموجب امروہی صاحب کی منطق کے آدم علیہ السلام کی پیدائش میں مادہ نطفہ سے ثابت ہوئی (جو بالکل باطل ہے) کیونکہ بروئے

شکل اوّل اس کا قیاس اس طرح ہے۔’’آدم انسان ہے اور سب انسان نطفے سے پیدا ہوئے ہیں۔ پس آدم بھی نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔‘‘

اس وہم کا ازالہ اس طرح ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش دوسرے مقام پر دلیل خاص سے ثابت ہے کہ مادہ مٹی سے ہوئی اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش نفخ روح القدس سے ہوئی۔ پس آدم اور حوّا، اور عیسیٰ علیہم السلام جن کی پیدائش کی کیفیت خاص دلیل سے اور طرح پر ثابت ہے۔ اس آیت سورۂ دہر سے مستثنیٰ رکھے جائیں گے اور ان کے علاوہ دوسرے انسانوں پر اس آیت کا حکم لگایا جائے گا کہ وہ مادہ منی سے پیدا ہوئے۔ اس بیان سے مرزا قادیانی اور فاضل امروہی صاحب انکار نہیں کر سکتے۔ پس اسی طرح جب دوسرے مقام پر حیات عیسیٰ علیہ السلام خاص دلیل سے ثابت ہے تو عیسیٰ علیہ السلام اس آیت:’’قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ‘‘ کے عموم سے باہر رہیں گے۔ پس آپ کی وفات ثابت نہ ہوسکی اور مرزا قادیانی کی مراد پوری نہ ہوئی۔

خطبۂ صدیقی

اس آیت کے متعلق مرزا قادیانی اور مولوی محمد احسن امروہی صاحب ایک اور مغالطہ دیا کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات شریف پر یہی آیت پڑھ کر آپ کی وفات ثابت کی اور لوگوں کے دلوں سے شبہ دور کیا جو یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ اس وہم کے ازالہ کے لئے بیان بالا کافی ہے۔ مگر نیا سوال ہونے اور عام لوگوں کی تسلی کے لئے ہم اس کو کچھ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ جو وہم بعض لوگوں کو جنگ احد کے دن پڑا تھا کہ رسول کو مرنا نہیں چاہئے۔ اسی طرح کا وہم بعض کو آنحضرت ﷺ کی وفات پر ہوا کہ آپ ﷺ وفات نہیں پا سکتے۔ خواہ نبی ﷺ کی وفات کا واقعہ عظیمہ کے سبب طبیعت پر سخت صدمہ گزرنا اس کا موجب ہوا یا کچھ اور۔ غرض وہم یہی تھا کہ آنحضرت ﷺ پر موت نہیں آسکتی۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس وہم کو دور کرنے کے لئے اس آیت کو پڑھنا اسی طرح کا ہوا جیسے خداتعالیٰ نے ابھی نازل کی تھی اور معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے مراد خداوندی صرف یہی ہے کہ رسالت اور موت میں منافات نہیں ہے۔ پس جس طرح اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ اسی

طرح خطبہ صدیقیہ سے بھی نبی ﷺ کے لئے موت کا آسکنا ثابت ہوا نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات جسے مقصود سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہاں امکان ثابت ہوسکتا ہے، مگر وقوع نہیں۔

دوم: یہ کہ اسی آیت میں آگے ’’اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ‘‘ موجود ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی نظر آنحضرت ﷺ کی موت کے ممکن ہونے کے لئے ’’ان مات‘‘ پر ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں موت کو ممکن فرماتا ہے۔ اس وجہ کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے اسی وقت حاضرین کو پڑھ کر سنائی تھی۔ وہ آیت یہ ہے: ’’اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ (زمر:۳۰)‘‘ یعنی اے پیغمبر! تو (بھی اپنے وقت مقررہ پر) مرنے والا ہے اور یہ (کفار بھی اپنے اپنے اوقات مقررہ پر) مرنے والے ہیں۔

دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر میّت کا لفظ فرمایا ہے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا استدلال ’’اَفَاِنْ مَّاتَ‘‘ سے ہے نہ کہ ’’قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ‘‘ سے کہ وفات مسیح علیہ السلام کے لئے ضعیف اور غلط طور پر بھی مفید ہوسکے۔

سوم: یہ کہ دجال کا خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ایک طرح سے دونوں آپس میں ایسے لازم وملزوم ہیں کہ ایک کا ماننے والا ضرور دوسرے کا مصدّق ہے۔ پس جب حضرت ابوبکر صدیقؓ دجال کے خروج کی حدیث کے راوی ہیں تو آپ نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کب غافل ہیں۔ (سنن ابن ماجہ باب خروج الدجال)

چہارم: یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی غرض ان آیات کے پڑھنے سے اس وہم کا ازالہ ہے کہ آنحضرت ﷺ فوت نہیں ہوسکتے۔ پس چونکہ وصف نبوت وموت میں منافات کے ہونے کو علی سبیل الحکایت باطل کرنا مقصود بالذات ہے۔ پس خطبہ صدیقی اس امر پر تو بعبارۃ النص دلالت کرتا ہے۔ لیکن یہ امر کہ سب انبیاء مرچکے ہیں۔ نہ تو خطبہ صدیقی کا مفاد ہے اور نہ اس پر مخاطبین کے مزعوم کی تردید موقوف ہے[۱]۔ پس اس سے وفات مسیح علیہ السلام پر اجماع صحابہؓ کا دعویٰ کرنا خلاف روایت بلکہ درایت بھی ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بالتصریح پکار رہی ہے کہ وہ سب صحابہؓ کے درمیان

[۱] کیونکہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے نہ کلیہ۔ کَمَا مَرَّ مِرَارًا!

آیت:’’وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ‘‘میں’موته‘‘ کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام قرار دے کر آپ کا نزول ثابت کر رہے ہیں اور اس تصریح نزول کے موقع پر کوئی صحابی نہ تو نفس مضمون یعنی نزول حضرت مسیح علیہ السلام سے انکار کرتا ہے اور نہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دینے کو غلط کہتا ہے اور نہ آپ کے استدلال کو ضعیف قرار دیتا ہے۔ پس اجماع حیات ونزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا نہ کہ وفات پر۔ قطع نظر اس سے کہ یہ روایت صحیح بخاری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیات ونزول پر اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کو ثابت کر رہی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اس آیت کو حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث کی تصدیق کے لئے پڑھنا کم سے کم مولوی محمد احسن صاحب کے خیالی اجماع کے توڑنے کے لئے تو کافی ہے۔

قسم دوم میں سے دوسری آیت یہ ہے:’’تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (البقرہ:۱۴۱)‘‘اس آیت کا ترجمہ مرزا قادیانی اس طرح کرتے ہیں’’اس وقت سے جتنے پیغمبر پہلے ہوئے ہیں، یہ ایک گروہ تھا جو فوت ہوگیا۔ ان کے اعمال ان کے لئے تمہارے اعمال تمہارے لئے اور ان کے کاموں سے تم نہیں پوچھے جاؤ گے۔‘‘ انتہیٰ! (ازالہ اوہام ص۶۰۷، خزائن ج۳ ص۴۲۸)

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مرزا قادیانی قرآن شریف کے ترجمے میں الفاظ کی رعایت بالکل نہیں رکھتے اور سلسلہ عبارت اور ماقبل ومابعد کو بالکل بھلا دیتے ہیں اور الفاظ قرآن شریف کو جوڑ توڑ کر اپنے ٹھانے ہوئے مطلب کے پیچھے لے جاتے ہیں۔ زبان کے قواعد پر نظر اور اصول ترجمہ سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ ترجمہ کرنے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور تفسیر بالرائے اور اتباع ہوئی یعنی اپنے خیال ورائے سے تفسیر کرنا اور اپنی خواہش کی پیروی کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ناظرین! انصاف سے قرآن مجید کے الفاظ اور مرزا قادیانی کے ترجمہ پر نظر کریں گے تو ان کو ہماری تصدیق کرنی پڑے گی۔ مرزا قادیانی!’’اس وقت سے جتنے پیغمبر پہلے ہوئے ہیں۔‘‘ کس عبارت کا ترجمہ ہے اور قرآن شریف میں اس کے لئے کون سے الفاظ ہیں؟ آپ ترجمہ میں اور پھر قرآن شریف کے ترجمہ میں ایسی صریح بے دلیل زیادتیاں کرتے ہیں اور ذرا نہیں جھجکتے۔ آپ کی مثال میں کہنا ٹھیک ہے:

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کیا دنیا میں آپ کے سوائے کوئی دوسرا شخص عربی زبان نہیں سمجھتا؟ کہ آپ ایسے دھوکہ سے مطلب برآری چاہتے ہیں۔ ''خلت'' کے معنی مرزا قادیانی نے اس جگہ بھی ''فوت ہوگئے ہیں'' کئے ہیں۔ اس کی تحقیق پہلی آیت میں گزر چکی ہے۔ اس مقام پر مرزا قادیانی سے صرف اتنا پوچھا جاتا ہے کہ خلو کے معنی موت کس زبان کا محاورہ ہے؟ اور کون سی کتاب اس کی شاہد ہے؟

اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت وغیرہ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ نہ عموماً اور نہ خصوصاً کیونکہ لفظ ''تلک'' (یہ) جو اس آیت کے شروع میں ہے۔ اس کا اشارہ ان کی طرف ہے جو اس سے پیشتر مذکور ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے ہیں اور بس۔

اس آیت کی صحیح تفسیر اس طرح ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام وصیّت کر گئے تھے کہ یہودیت کو نہ چھوڑنا اور نیز اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔ خداتعالیٰ نے ان کے دونوں وہموں کو دور کرنے کے لئے پہلے تو فرمایا کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام نے تو اپنے اپنے بیٹوں کو اسلام کی وصیت کی تھی۔ خاص کر یعقوب علیہ السلام نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اسی ایک معبود کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ اور آپ کا باپ اسحٰق اور چچا اسماعیل اور دادا ابراہیم علیہم السلام کرتے رہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کے دوسرے وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ان لوگوں کے اعمال (یعنی ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام جن کے بھروسے پر تم جرأت سے بداعمالیاں کرتے ہو) ان کے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے۔ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے اور مرزا قادیانی کچھ اور کا اور ہی مطلب لے اڑتے ہیں اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے مطالب کو بگاڑ بگاڑ کر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ ناظرین! قرآن شریف میں سے یہ مقام نکال کر شروع مضمون سے اخیر تک مطالعہ کریں اور انصاف سے حق کی داد دیں۔

اگر ''خلت'' کے رو سے اس آیت کو کسی کی موت سے کچھ تعلق ہے بھی تو اوّل چونکہ

عیسیٰ علیہ السلام تلک کے مشار الیہم میں داخل نہیں ہیں۔ اس لئے اسے ان کی وفات کی دلیل گردانناً بالکل باطل ہے۔ دوم یہ کہ یہی آیت اس سے آگے پارے کے اخیر میں بھی آئی ہے اور اس سے پہلے ''تلک'' کے مشار الیہم حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام (عم) اور ان کے بیٹے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان میں داخل نہیں۔ اس سے پیشتر حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر ہے اور وہاں خلت یا موت وغیرہ کا کوئی ذکر تک نہیں۔ پس جس جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خلت کا لفظ فرمایا ہے۔ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں اور جہاں ان کا ذکر ہے۔ وہاں لفظ خلت نہیں۔ پس یہ آیت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی دلیل نہ ہوئی۔ سوم یہ کہ اگر کسی طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کو اس آیت کے عموم میں داخل بھی سمجھ لیں تو پھر بھی یہ آیت عام رہے گی۔ پس بموجب قاعدہ دوم یہ دلیل آیت: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ ''اور اس جیسی دیگر آیتیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر شاہد ناطق ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہرگز قابل قبول نہیں۔ کیونکہ دلیل خاص کے مقابلہ میں دلیل عام کا اعتبار نہیں ہوتا۔

قسم دوم میں سے تیسری آیت: ''وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَاِئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ (انبیاء: ۳۴) ''اس آیت کا بیان مرزا قادیانی اس طرح کرتے ہیں: ''ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو زندہ اور ایک حالت پر رہنے والا نہیں بنایا۔ پس کیا اگر تو مرگیا تو یہ لوگ باقی رہ جائیں گے۔'' (ازالہ اوہام ص۶۰۶، خزائن ج۳ ص۴۲۷)

اس آیت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی موت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس میں ہمیشہ رہنے کی نفی ہے اور ہم عیسیٰ علیہ السلام کے ہمیشہ زندہ رہنے کے قائل نہیں۔ بلکہ بموجب حدیث صحیح اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ علیہ السلام بعد نازل ہونے کے دنیا میں آبادرہ کر فوت ہوں گے اور مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ قادیانی کی مماثلت کی تردید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی تائید میں یہ حدیث کافی ہے۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت نہ ہوئی۔

تیسری قسم کی وہ آیتیں ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں، نہ عموماً اور نہ خصوصاً اور نہ علم اصول کی رو سے ان سے اس امر پر استدلال جائز ہے۔ بلکہ صرف مرزا قادیانی کی اپنی اختراع ہے۔ ان سب کی تردید کے لئے صرف وہی دو قاعدے جو ہم نے

بیان کئے ہیں۔ کافی ہیں کہ جب کوئی امر خاص اور صریح دلائل سے ثابت ہو جائے تو ان کے مقابلہ میں ان کے خلاف عام دلائل اور قیاسی ڈھکوسلے چل نہیں سکتے۔ کیونکہ پھر متکلم کی تصریح کا کوئی فائدہ واعتبار نہیں رہتا۔ مگر ناظرین کی تفہیم کے لئے ان آیات کو بھی ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا قادیانی کے استدلال کس قدر ضعیف ہیں۔

تیسری قسم میں سے پہلی آیت یہ ہے: ''وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (البقرہ)'' مرزا قادیانی اس آیت کا بیان اس طرح فرماتے ہیں: ''تم اپنے جسم خاکی کے ساتھ زمین پر ہی رہو گے۔ یہاں تک کہ اپنے تمتع کے دن پورے کر کے مرجاؤ گے۔ یہ آیت جسم خاکی کو آسمان پر لے جانے سے روکتی ہے۔ کیونکہ ''لکم'' جو اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ اس بات پر بصراحت دلالت کر رہا ہے کہ جسم خاکی آسمان پر جا نہیں سکتا۔ بلکہ زمین سے ہی نکلا اور زمین میں ہی رہے گا اور زمین میں ہی داخل ہوگا۔'' انتہیٰ!

(ازالہ اوہام ص۶۰۹ خزائن ج۳ ص۴۲۹)

اس بیان سے ہر ذی علم مرزا قادیانی کی قوت استدلال کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ استدلال کی صحت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ قرآن وحدیث کی تصریح کے خلاف نہ ہو۔ مگر مرزا قادیانی اس امر کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے اور اپنی بے تکی ہانکے جاتے ہیں۔ ہاں مرزا قادیانی! بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مقرّ طبعی زمین ہی بنائی ہے اور اسی میں وہ دفن کئے جاتے ہیں اور اسی سے قیامت کو اٹھائے جائیں گے۔ یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے وفات مسیح علیہ السلام پر استدلال ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اصلی اور طبعی طور پر کسی جگہ کا جائے رہائش ہونا امر دیگر ہے اور عارضی طور پر کچھ مدت کے لئے کسی اور جگہ کا جائے رہائش ہونا امر دیگر ہے۔ مثلاً ملائکہ کا طبعی اور اصلی مستقر آسمان ہیں۔ مگر باوجود اس کے وہ زمین پر بھی آمد ورفت رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام بھی عارضی طور پر کچھ عرصہ تک کرۂ زمین سے باہر دوسرے کرے میں رہیں تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

اس کے علاوہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا بھی ان کے مادہ طبعی وفطرتی کے سبب سے ہے۔ کیونکہ آپ کی پیدائش عام اسباب معتادہ کے خلاف نفخ روح القدس سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ (باب اوّل) میں بھی گزر چکا ہے۔ علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیدائشی طور پر ملائکہ سے مشابہت تھی۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کا

آسمان پر اٹھایا جانا اوراس آیت کے حکم سے خارج ہونا، ان کے اپنے مادہ فطرتی کے لحاظ سے ہے جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں ہے۔

مرزا قادیانی اس آیت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ ’’لکم‘‘ اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ بے شک مرزا قادیانی! ’’لکم‘‘ اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ مگر یہ تو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔ آپ نے اسے کیوں معرض دلیل میں پیش کیا۔ اسی کو قواعد سے ناواقفی کہا کرتے ہیں کہ اپنے مطلب کے خلاف دلیل بیان کی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ مرزا قادیانی کو کہنا یہ چاہئے تھا کہ اس جگہ ’’فی الارض‘‘ ظرف مقدم واقع ہے اور یہ تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔

اس کے جواب میں اوّل تو ہم یہ کہتے ہیں کہ: اگر ’’فی الارض‘‘ کی تقدیم سے آپ حصر کا فائدہ اٹھا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صرف زمین ہی آدمی کے لئے جائے قرار ہے اور اس کے سوائے اور کوئی جگہ نہیں تو اسی طرح ’’لکم‘‘ بھی مقدم واقع ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زمین صرف انسانوں ہی کے لئے جائے قرار ہے۔ کسی دیگر حیوان کے لئے نہیں۔ حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ ’’لکم‘‘ کی تخصیص مرزا قادیانی کو مفید ہوئی یا مضر؟ حقیقت الامر اس طرح ہے کہ جو حصر ’’فی الارض‘‘ سے حاصل ہوتا ہے جو بہ نسبت استقرار اصلی کے ہے اور تخصیص ’’لکم‘‘ سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ اس بنا پر ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد باذن الٰہی زمینی اشیاء میں خلیفے اور متصرف ہیں۔ لہٰذا ان کو زمین کی آبادی میں ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے جو دوسرے حیوانوں کو نہیں۔ اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا اور اوروں کا نہ کیا۔ علاوہ اس کے یہ کہ روئے سخن بھی انہی کی طرف ہے اور علم معقول پر نظر رکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ ایسی صورت میں جہاں جعل تکوینی پایا جائے۔ اس کا مجعول الیہ لازم نہیں ہوتا۔ بلکہ عارض ہوتا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ فرمایا ہے: ’’وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ جَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا (نبا:۱۰،۱۱)‘‘ ہم نے رات کو آرام کا وقت بنایا ہے اور دن کو معاش کمانے کا۔

’’وَقَالَ وَمِنْ رَّحْمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (قصص:۷۳)‘‘ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو اور دن کو بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرو اور (اس میں) اس کا فضل تلاش کرو۔

تو اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ دن کو آرام نہیں کر سکتے اور رات کو معاش کے لئے کام کاج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ روزمرّہ کے معاملات اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اسی قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے کسی فائدے کے لئے بنایا ہے تو وہ فائدہ اس سے مخصوص نہیں، بلکہ کسی دوسرے چیز سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ ہاں اصلی طور پر اور عارضی طور پر ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اسی دن اور رات کو معاش اور آرام کا وقت بتانے میں یہی قول ٹھیک ہے کہ معاش کا اصلی وقت دن ہے۔ مگر عارضی طور پر رات کو بھی کما سکتے ہیں اور آرام اور نیند کا اصلی وقت رات ہے۔ مگر عارضی طور پر دن کو بھی آرام و نیند کر سکتے ہیں۔ پس اسی طرح اس آیت زیر بحث میں ہے کہ رہائش کا اصلی مقام انسان کے لئے زمین ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو عارضی طور پر کسی خاص مدت تک آسمان پر رکھے تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ کسی شخص کا مادہ فطرتی بھی اس انعام کے قابل ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں بھی ہوں۔ جیسا کہ (باب اوّل) میں بیان ہوئی ہیں۔ پس مرزا قادیانی کا اس آیت کو وفات مسیح علیہ السلام کے لئے پیش کرنا بالکل بے جا ہے۔

قسم سوم میں سے دوسری آیت یہ ہے: ’’کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (رحمٰن:۲۶،۲۷)‘‘ ’’ہر ایک چیز جو زمین میں موجود ہے اور زمین سے نکلتی ہے وہ معرض فنا میں ہے یعنی دم بدم فنا کی طرف میل کر رہی ہے۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۱۹ خزائن ج۳ ص۴۳۴)

اس آیت کو بھی زیر بحث وفات مسیح علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام آخر کار فوت ہوں گے۔ جس سے ہم کو انکار نہیں۔ کیونکہ ہر شئی کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اسی طرح جو وقت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ہے، آپ ضرور ضرور اسی وقت فوت ہوں گے، نہ اس سے آگے، نہ اس سے پیچھے۔ چنانچہ یہ امر مرزا قادیانی کے الفاظ ’’معرض فنا‘‘ سے بھی ثابت ہے اور اس کے بعد آپ کا یہ فرمانا کہ ’’فان‘‘ کا لفظ اس لئے اختیار کیا اور ’’یفنی‘‘ نہیں کہا کہ تا معلوم ہو کہ فنا ایسی چیز نہیں کہ کسی آئندہ زمانہ میں ایک دفعہ واقع ہوگی۔ بلکہ سلسلہ فنا کا ساتھ ساتھ جاری ہے۔

’’فان‘‘ کا نکتہ نہ سمجھنے اور اپنے لکھے ہوئے ’’معرض فنا ہے‘‘ کو بھول جانے کے سبب سے ہے۔ کیونکہ ’’فان‘‘ پر کوئی شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ جو چیزیں دنیا پر قائم اور

موجود نظر آ رہی ہیں ان کو صفت فنا کی حاصل نہیں تو پھر ان کے لئے بھی ’’فـــان‘‘ کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اسم فاعل اور فعل مضارع کے صیغے میں فرق کر کے جو نکتہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ اسم فاعل اور فعل مضارع کی مشابہت کو نظر انداز کر کے لکھا گیا ہے۔ اگر آپ اس طرف توجہ دیں گے تو پھر ایسے نکتے بیان نہ کریں گے۔ پس جب قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا وقت قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہونے کے بعد ہے تو پھر قبل نزول کے اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر استدلال کرنا بالکل غلط ہے۔

قسم سوم میں سے تیسری آیت یہ ہے: ’’وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (نحل:۷۰)‘‘

اس آیت کا بیان مرزا قادیانی یوں کرتے ہیں: ’’اس آیت میں خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ سنت اللہ دو ہی طرح سے تم پر جاری ہے۔ بعض تم میں سے عمر طبعی سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں اور بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف ردّ کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہو جاتے ہیں۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۰۸، خزائن ج۳ ص۴۲۸، ۴۲۹)

مرزا قادیانی نے ترجمہ بالکل غلط کیا ہے اور قرآن شریف کے مطلب کو بالکل بدل دیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاءاللہ!

قسم سوم میں سے چوتھی آیت یہ ہے: ’’وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِى الْخَلْقِ (یٰس:۶۸)‘‘ یعنی جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں تو اس کی پیدائش کو الٹا دیتے ہیں۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۱۰، خزائن ج۳ ص۴۲۹)

قسم سوم میں سے پانچویں آیت یہ ہے: ’’اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً (الروم:۵۴)‘‘ یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا، پھر ضعف کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد ضعف اور پیرانہ سالی دی۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۱۰، خزائن ج۳ ص۴۲۹)

قسم سوم میں سے چھٹی آیت یہ ہے: ’’اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ

(یونس:۲۴) ’’یعنی اس زندگی دنیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے اس پانی کی مثال ہے جس کو ہم آسمان سے اتارتے ہیں۔ پھر زمین کی روئیدگی اس سے مل جاتی ہے۔ پھر وہ روئیدگی بڑھتی اور پھولتی ہے اور آخر کار کاٹی جاتی ہے۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۱۱، خزائن ج۳ ص۴۳۰)

قسم سوم میں سے ساتویں آیت یہ ہے: ’’ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ (مومنون:۱۵) ‘‘ ’’یعنی اوّل رفتہ رفتہ خداتعالیٰ تم کو کمال تک پہنچاتا ہے اور پھر تم اپنا کمال پورا کرنے کے بعد زوال کی طرف میل کرتے ہو، یہاں تک کہ مرجاتے ہو۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۱۱، خزائن ج۳ ص۶۳۰)

قسم سوم میں سے آٹھویں آیت یہ ہے: ’’اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرَاہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُوْلِی الْاَلْبَابِ (زمر:۲۱) ‘‘ ’’ان آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا ذکر نہ تو صراحتاً ہے اور نہ اشارۃً۔ مرزاقادیانی اپنی الٹی منطق سے ان کو بھی وفات ہی کے دلائل سمجھتے ہیں۔ ان کے طریق استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں انسان کی ترقی وکمال اور پھر تنزّل وزوال کا بیان ہے۔ پس ضرور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر بھی بوجہ انسان ہونے کے یہ سب حالات گزریں، وہ بوڑھے بھی ہوں اور پھر بڑھاپے کے بعد فوت بھی ہوں۔ کیونکہ ان آیتوں میں ان کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ نیز فرماتے ہیں کہ بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ کر انسان کے حواس جاتے رہتے ہیں اور وہ عالم ہونے کے بعد نادان محض ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے: ’’وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا‘‘ ’’یعنی بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں، یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف ردّ کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہوجاتے ہیں۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۰۹، خزائن ج۳ ص۴۲۹)

نیز فرماتے ہیں: ’’اور اگر فرض کے طور پر اب تک زندہ رہنا ان کا تسلیم کرلیں تو کچھ شک نہیں کہ اتنی مدت کے گزرنے پر پیرفرتوت ہوگئے ہوں گے اور اس کام کے ہرگز لائق نہ ہوں گے کہ کوئی خدمت دینی ادا کرسکیں۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۵۰، خزائن ج۳ ص۱۲۷)

یہ ہے مرزاقادیانی کے استدلال کا طریق جس کی بناء بالکل قیاسی ڈھکوسلوں اور آیات کو غیرمحل پر استعمال کرنے پر ہے۔

اب اس کی تردید اور جواب ٹھنڈے دل سے سنیں اور انصاف کریں۔ مرزا قادیانی فرماتے ہیں کہ ان آیتوں میں انسان کے کمال وترقی، تنزل وزوال کا ذکر ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس کے جواب میں اوّل تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو ہمیشہ کے لئے موت سے بچنے والا نہیں جانتے، بلکہ مانتے ہیں کہ آخر ایک وقت وہ بھی فوت ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ: ''میرے پاس حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان دفن کئے جائیں گے۔''

ہاں! ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ مرزا قادیانی ان آیتوں کی رو سے جب چاہیں کسی پر موت لے آئیں اور جیتے جی اس کو مردہ بنادیں۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے جس کے قبضے میں موت اور زندگی ہے ہر ایک کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے، جس کے خلاف نہیں ہوسکتا اور ہم کو مرزا قادیانی کی تحریروں سے تجربہ ہو چکا ہے کہ جب وہ کسی خاص میعاد تک کسی کے مرنے کے خبر دیتے ہیں تو وہ اس مدت کے بعد تک زندہ رہتا ہے۔ مثلاً مسٹر آتھم عیسائی کی موت کی نسبت آپ نے بڑے زور سے پیش گوئی کی تھی کہ وہ پانچویں ستمبر ۱۸۹۴ء تک مرجائے گا یا مسلمان ہو جائے گا۔ مگر وہ اس میعاد کے بعد تک مذہب عیسائی پر لوگوں میں زندہ موجود رہا اور اسی طرح آپ نے اپنے رقیب اور اپنی منکوحہ آسمانی کے شوہر مرزا سلطان محمد کی نسبت بھی پیش گوئی کی تھی کہ وہ عرصہ اڑھائی سال تک مرجائے گا اور مسماۃ محمدی بیگم آپ کے پاس آئے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کی زوجہ بنادیا ہوا ہے۔ مگر آج ستمبر ۱۹۲۲ء تک وہ زندہ موجود ہے اور آپ کی ''منکوحہ آسمانی'' سے اللہ تعالیٰ نے مرزا سلطان محمد کو اولاد بھی عطاء فرمائی ہے[1]۔ ان واقعات سے ہمیں کامل یقین ہے کہ مرزا قادیانی کسی کی اجل وقت سے پیشتر نہیں لاسکتے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخرکار مرنا امر دیگر ہے اور اس وقت قبل

[1] مرزا سلطان محمد صاحب (۱۹۴۹ء) میں بمقام لاہور فوت ہوئے اور اپنے پیچھے ۵لڑکے اور ۲ لڑکیاں چھوڑیں۔ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ ابھی تک خدا کے فضل سے زندہ سلامت عارف والا ضلع منٹگمری میں مقیم ہیں۔ (عبدالقیوم میر) ۲۸رمئی ۱۹۵۸ء

محترمہ محمدی بیگم ۱۹رنومبر ۱۹۶۶ء کو لاہور اسلامیہ پارک میں وفات پاگئیں۔

ہفت روزہ الاعتصام لاہور، مؤرخہ ۲۵رنومبر ۱۹۶۶ء (عبدالرحیم اشعر)

نزول فوت شدہ ہونا امر دیگر ہے۔ پس ان آیات سے بھی آپ کی وفات زیر بحث ثابت نہ ہوئی اور مرزا قادیانی کا مدعا پورا نہ ہوا۔

دوم یہ کہ صورت مستثنیٰ کے لئے ضروری نہیں کہ اسی عبارت میں موجود ہو بلکہ سارے قرآن وحدیث میں جہاں کہیں جس امر کو کسی عام حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، وہ مستثنیٰ ہی شمار کیا جاتا ہے۔ خواہ عبارت کے ساتھ ہو، خواہ کسی اور جگہ پر۔ کیونکہ سارا قرآن مجید اور ساری حدیث شریف ''کَکَلِمَةٍ وَاحِدَةٍ'' یعنی مثل ایک کلمہ کے ہے، قرآن وحدیث میں اس کی نظیریں بکثرت ہیں۔ خوف طوالت سے صرف چند ذکر کی جاتی ہیں۔

اوّل: دوسرے پارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ (البقرہ:۲۲۸)'' یعنی طلاق والی عورتیں دوسرے نکاح کے لئے تین حیض تک انتظار کریں۔

اب ظاہر ہے کہ ''المطلقٰت'' جمع کا لفظ ہے اور حاملہ اور غیر حاملہ اور شوہر دیدہ اور شوہر نا دیدہ سب قسم کی مطلقہ عورتیں اس لفظ میں داخل ہیں تو بس مرزا قادیانی کی منطق کی رو سے ان سب کی عدت یہی تین حیض ہونی چاہئے اور یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ حاملہ اور شوہر نا دیدہ مطلقہ عورتیں اور جن کو حیض نہیں آتا۔ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا حکم دوسری جگہ پر فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ غیر ممسوسہ یعنی شوہر نادیدہ کی نسبت (سورۂ احزاب:۴۹) میں فرمایا: ''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَالَکُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا'' یعنی اے مسلمانو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو اور پھر ان کو مجامعت سے پیشتر طلاق دے دو تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدّت نہیں، سے تم کو گن کر پورا کرنا پڑے۔

دیکھئے اس آیت میں شوہر نادیدہ مطلّقہ کی عدت بھی مقرر نہیں کی۔ ایک طرف سے طلاق ہوا اور دوسری طرف نکاح کر لینے کا اختیار دیا ہے۔ اسی طرح سورۂ طلاق پارہ اٹھائیس میں وہ مطلّقہ عورتیں جواب بڑھاپے کی وجہ سے حیض سے مایوس ہیں اور جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں اور جو حاملہ ہیں، ان کی نسبت فرمایا: ''وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِسَآءِ کُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُوْلَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق:۴)'' یعنی تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس

ہو جائیں۔ اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ایسے ہی جن کو ابھی حیض نہیں آیا اور حاملہ عورتوں کی عدّت وضع حمل ہے۔‘‘

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محرّمات کے بیان میں فرمایا: ’’وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ (نساء:۲۳) ‘‘یعنی دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

اور سب محرمات کے ذکر کے بعد فرمایا: ’’وَاُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ (النساء:۲۴) ‘‘یعنی ان مذکورہ بالا عورتوں کے سوائے تم پر حلال ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھوپھی، بھتیجی اور خالہ، بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

ان مثالوں سے صاف ثابت ہوگیا کہ مرزا قادیانی کا یہ کہنا کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان آیتوں میں مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان کے حکم میں وہ بھی داخل ہیں، معقول وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ آیات: ’’یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ‘‘اور’’بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ ‘‘اور’’وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ‘‘اور’’اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ‘‘اور’’وَتُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا‘‘ آپ کے آسمان میں اب تک زندہ موجود ہونے اور قرب قیامت میں نازل ہونے اور تب تک بوڑھے نہ ہونے پر دلائل واضح ہیں۔ جن سے کسی منصف کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ان آیات کی تفسیر تفصیل واختصار سے پیچھے گزر چکی ہے۔ لہٰذا دوبارہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ اسی طرح احادیث صحیحہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر صراحۃً شہادت دیتی ہیں اور بعد اس کے آپ کی وفات ظاہر کرتی ہیں اور آپ کا مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہونا بیان کرتی ہیں۔ آپ کو ان زیر بحث آیات کے حکم سے مستثنیٰ کر رہی ہیں۔

ان آیات زیر بحث میں سے پہلی آیت یعنی ’’وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا ‘‘ کا ترجمہ ایسا کیا ہے جو قواعد زبان کے رو سے غلط اور اصول اسلام کے بالکل خلاف ہے اور مرزا قادیانی نے اس میں ہر دو امر کا لحاظ نہیں کیا۔ مرزا قادیانی اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ’’اور بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف رد کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہو جاتے ہیں۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۰۹، خزائن ج۳ ص۴۲۹)

یہ ترجمہ قواعد زبان عرب کے رو سے اس لئے غلط ہے کہ مرزا قادیانی نے ''لِکَیْلَا یَعْلَمَ '' میں ''لکی '' کے معنی کئے ہیں: ''اس حد تک نوبت پہنچتی ہے۔'' حالانکہ کتب نحو میں مصرح ہے کہ ''کَی '' پر جو لام داخل ہوتا ہے وہ علّت کے لئے ہوتا ہے۔ (دیکھو مغنی اللبیب) پس اس آیت کے صحیح معنی یہ ہیں: ''بعض تم میں سے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ارذل عمر کی پھیرے جاتے ہیں تاکہ وہ بعد جاننے کے کچھ بھی نہ جانیں۔'' یعنی بعض شخصوں کو اللہ تعالیٰ اس لئے بوڑھا کرتا ہے کہ وہ اپنی جانی ہوئی باتیں بھول جائیں اور سب اشیاء میں خدا تعالیٰ کا تصرف ظاہر ہو۔

دیکھئے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں سورۂ نحل کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''فقوله: وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا. يدلّ على انه تعالٰى انما ردّه الٰى ارذل العمر لاجل ان يزيل عقله الخ '' یعنی اللہ تعالیٰ جو بعض انسانوں کو نکمّی عمر تک پہنچاتا ہے تو اس کی علّت یہ ہوتی ہے کہ اس کے عقل کو زائل کردے۔''

پس جب حضرت روح اللہ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے لئے آسمان پر اٹھایا اور قرب قیامت تک ان کی حیات مقرر کی۔ جیسا کہ (حصہ اوّل) میں ''وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا '' کی تفسیر میں گزر چکا ہے تو مرزا قادیانی کا یہ کہنا کہ اگر بالفرض عیسیٰ علیہ السلام اتنی مدت تک زندہ بھی رہیں تو پیر فرتوت ہوجانے کے باعث ان کا نزول کچھ مفید نہیں ہوگا۔ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اتنی لمبی عمر اس لئے نہیں دی کہ وہ اپنا علم بھول جائیں۔ بلکہ کئی مفید امروں اور حکمتوں کے لئے دی ہے۔ نہایت بڑھاپے کو پہنچ کر بھی علم نہ بھولنا اور عقل کا زائل نہ ہونا۔ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے ہزار ہزار برس تک لمبی عمر پانے سے ثابت ہے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا سو سو سال اور اس سے زیادہ تک عمر پانا اور ان کے حواس کا برابر ٹھیک رہنا اور اسی طرح مقبولان بارگاہ رب العالمین حضرات بابرکات محدثین رحمۃ اللہ علیہم کا بڑی بڑی لمبی عمر پانا اور حدیث نبوی ﷺ کی تدریس میں برابر مشغول رہنا واقفان سنت نبویہ ﷺ پر پوشیدہ نہیں ہے، خاص کر ہمارے زمانے میں حضرت شیخنا وشیخ الکل ناصر سنت سیّد الثقلین، ناشر حدیث رسول رب الخافقین سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی نور اللہ ضریحہ، کا ایک سو دس سال تک عمر پانا اور اس وقت تک حدیث نبوی ﷺ کی تعلیم کرتے رہنا چھوٹے بڑے پر ظاہر ہے۔ ہائے افسوس! پھر مرزا قادیانی کے قلم سے کس طرح نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی برحق خاص خدا تعالیٰ کے سکھائے ہوئے

پیغمبر حضرت روح اللہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اتنی لمبی عمر پانے سے پیر فرتوت ہوکر نادان محض ہوجائیں گے اور کسی کام کے نہ رہیں گے آہا! مولانا روم صاحب نے کیا سچ کہا ہے:

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

مرزا قادیانی! اگر ہر شخص کے لئے ارذل عمر کو پہنچنے پر نادان محض ہوجانا ضروری ہے تو آپ بھی اس سے بچ نہیں سکتے۔ کیونکہ آپ نے اپنی عمر پہلے اسّی سال تک بتائی تھی اور پھر اس پر پندرہ سال اور بڑھا لئے ہیں اور ارذل عمر کی ادنیٰ حد پچھتّر سال ہے تو پھر کیا آپ بیس سال تک ارذل عمر میں نہیں رہیں گے اور پیر فرتوت ہوکر نادان محض نہیں رہیں گے اور پھر آپ دینی خدمت کیا کریں گے؟

اس بیان سے ظاہر ہوگیا کہ مرزا قادیانی کا ترجمہ بالکل غلط ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس آیت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اب یہ امر بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا قادیانی کا یہ ترجمہ اصول وعقائد اسلامیہ کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ مرزا قادیانی عمر طبعی کے قائل ہیں اور اس کے بعد موت کو ضروری جانتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی موت کو ایک عدمی امر جانتے ہیں۔ علم عقائد پر نظر رکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ عمر طبعی کو ماننا اور اس کے بعد موت کا ضروری ہونا اور موت کو ایک عدمی امر جاننا حکمائے یونان کا مذہب ہے، نہ کہ مسلمانوں کا۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ نحل کی تفسیر میں عمر طبعی کے متعلق حکماء کا مذہب اور ان کے دلائل ذکر کئے ہیں اور پھر عقلی دلائل سے بہت تفصیل کے ساتھ ان کا ردّ لکھنے کے بعد فرمایا کہ: ''ایک دن میں سورۂ والمرسلات پڑھ رہا تھا جب آیت: ''اَلَمْ نَخْلُقْکُمْ'' پر پہنچا اور ''وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ'' پڑھا (یعنی قیامت کے روز ان جھٹلانے والوں کے لئے ویل ہوگا) تو میں نے کہا بے شک ان مکذین سے مراد وہی لوگ ہیں جو حیوانات کے بدن کی ساخت کو طبیعت کی طرف اور رطوبت میں حرارت کے اثر کرنے کی طرف نسبت کرتے ہیں (اور کہا) اے رب العزت میں سچے اور پختہ دل سے ایمان رکھتا ہوں کہ یہ تدابیر طبیعت کے اثر سے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ تیرا فعل ہے جو خالق اور علیم اور احکم الحاکمین اور اکرم الاکرمین ہے۔''

اور اس کے بعد ''ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''ہم نے (اس سے اوپر) بیان کردیا ہے کہ حکماء نے موت کا سبب جو ذکر کیا ہے وہ فاسد اور باطل ہے اور اس

سے دور لازم آتا ہے اور جب ثابت ہوگیا کہ حکما کا مذہب باطل ہے تو ظاہر ہوگیا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے اور مقدر کرنے سے ہوتی ہے۔''

میں (مصنف) کہتا ہوں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تصدیق قرآن شریف میں کئی جگہ موجود ہے جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورہ ملک میں ''اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاتَ (ملک:۲)'' یعنی خدا نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ اس کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ''وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (الحج:۵)'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''ہم نے (اوپر) بدلائل بیان کر دیا ہے کہ انسان کے حالات کمال سے نقصان اور قوت سے ضعف کی طرف انتقال کرنے کی علّت (فاعلی) طبیعت نہیں ہے۔ پس قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ انسان کا حالت جوانی سے بوڑھا ہونا اور عقل کامل کے بعد پیرانہ سالی کی وجہ سے نادان ہو جانا بمقتضائے طبیعت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار کے فعل سے ہے (اس کے بعد ''اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں) کہ یہ بات یعنی اللہ تعالیٰ علم والا اور قدرت والا ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کی اصل اصول ہے۔ کیونکہ طبیعت تو ایک جاہل چیز ہے جو مصلحت اور فساد کے وقت میں تمیز نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہ سب انتقالات جو انسان میں ہوتے ہیں۔ ان کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن سب جہاں کا معبود اور تدبیر کرنے والا اور سب کو پیدا کرنے والا (خداوند تعالیٰ) اپنے علم اور قدرت میں کامل ہے۔ پس اپنے کمال علم کی رو سے بہتری اور خرابی کے اندازوں کو جانتا ہے اور کمال قدرت کے رو سے بہتری عطا کرنے اور خرابی کے دور کرنے پر قادر ہے۔ پس ضرور ضرور حیوانات کی بناوٹ کو اس معبود حقیقی کی طرف منسوب کرنا چاہئے اور طبیعت کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں ہے۔''

مرزا قادیانی! دیکھئے قرآن شریف کے نکتے ایسے ہوتے ہیں جو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نہ کہ جو آپ بیان فرماتے ہیں اور محاورات عرب اور اصول اسلام کے بھی خلاف ہوتے ہیں۔

قسم سوم میں سے نویں آیت یہ ہے: ''وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا یَأْکُلُوْنَ الطَّعَامَ (انبیاء:۸)'' مرزا قادیانی اس کا یوں ترجمہ کرتے ہیں ''کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو، مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔'' (ازالہ اوہام ص۶۰۴، خزائن ج۳ ص۴۲۶)

ناظرین! خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ قرآن شریف کے الفاظ سے کس قدر اجنبی ہے اور اس کی اردو بھی صحیح نہیں۔

قسم سوم میں سے دسویں آیت یہ ہے: ’’وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ (فرقان:۲۰)‘‘ یعنی ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر رسول بھیجے ہیں، وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۱۲ خزائن ج۳ ص۶۳۱)

ان دونوں آیتوں سے مرزا قادیانی حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ: ’’انسان بغیر کھانے کے زندہ نہیں رہ سکتا اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر کھانا نہیں مل سکتا، اس لئے وہ فوت ہو چکے ہیں۔‘‘

مرزا قادیانی معارف قرآنی تو درکنار مراد قرآنی کے سمجھنے سے بھی کئی منزلیں دور رہتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں نہ سوچتے ہیں اور نہ سلسلہ کلام پر نظر کرتے ہیں، اپنی بے تکی ہانکتے ہیں۔

ان آیتوں کی صحیح مراد یہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ ﷺ کے کھانے پینے اور بازار میں چلنے پر اعتراض کیا تھا کہ یہ کام منصب نبوت کے منافی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان کے شروع میں ذکر کیا کہ (کفار مکہ) ’’وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (فرقان:۷)‘‘ کہتے ہیں کہ یہ رسول کیسا ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے۔

گویا کفار نے رسول برحق کے لئے ضروری مانا ہوا تھا کہ وہ کھانے اور بازاروں میں چلنے سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب فرمایا کہ اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پیشتر جس کسی کو اپنا رسول کر کے بھیجا ہے۔ ان میں بھی یہ باتیں پائی جاتی تھیں۔ جب وہ باوجود ان باتوں کے رسول تسلیم کئے جاتے ہیں تو اگر تم میں بھی یہ اوصاف پائے گئے تو انکار کی کیا وجہ ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا: ’’وَمَا جَعَلْنَاھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ‘‘ یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو بے جان دھڑ نہیں بنایا کہ ان کے لئے نہ کھانا ضروری ہو۔ جس کا ترجمہ مرزا قادیانی یوں کرتے ہیں ’’کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔

دیکھئے تو علاوہ بے ڈھنگی اردو ہونے کے الفاظ و مراد قرآنی سے کس قدر اجنبیت

ہے۔ علاوہ بریں اس طرف خیال فرمائیے کہ ان آیتوں کو اور اس مضمون کو حضرت مسیح علیہ السلام کی موت قبل النزول سے کیا تعلق ونسبت ہے؟

آیئے مرزا قادیانی! ہم آپ کو ایک نکتہ بتاتے ہیں۔ اگر خود سمجھ نہ سکیں تو فاضل امروہی کو پاس بٹھا کر سمجھ لیں کہ آیت: ''وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ (الانبیاء:۸) ''میں جملہ ''لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ''صفت ہے ''جسداً'' کی اور جسد اور جسم آپس میں ہم معنی ہیں اور دلیل ان کے ہم معنی ہونے کی یہ ہے کہ دونوں کے فاکلمہ اور لام کلمہ میں جیم اور سین ہے۔ پس اس آیت سے یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جسد محض (بے جان دھڑ) سے بالضرورت طعام سے فائدہ مند ہونے کی نفی کی ہے اور اس کے لئے نہ کھانا ضروری قرار دیا ہے، لیکن زندہ جسد سواس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کھائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ نہ کھائے۔ کیونکہ لغت میں جسد انسانوں اور فرشتوں اور جنّوں سب کے جسم کے لئے ہے۔ جیسا کہ قاموس میں ہے: ''الجسد محرّكة جسم الانسان والجن والملائكة ''اور معلوم ہے کہ فرشتے فطرۃ طعام وغیرہ حاجات بشریہ کے محتاج نہیں ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں یہ ہرگز ملحوظ نہیں کہ ہر زندہ چیز کے لئے کھانا ضروری ہے۔ ہاں یہ ضرور ملحوظ ہے کہ ہر بے جان جسم کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ کھائے۔ سواس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات سے کچھ تعلق نہیں۔

پس جب آسمان پر فرشتے بغیر طعام کے زندہ ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی جو پیدائش کے لحاظ سے فرشتوں کی مشابہ ہیں اور اسی مشابہت کی وجہ سے آسمان پر اٹھائے گئے ہیں، بغیر طعام کے زندہ رہ سکتے ہیں۔

مرزا قادیانی کا یہ ترجمہ کہ: ''کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو، مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔'' علاوہ اس کے کہ قرآن شریف کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ہے۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فرشتے اجسام ہی ہیں اور زندہ بھی ہیں اور ان پر جسد کا لفظ بولا بھی جاتا ہے اور پھر وہ کھانا نہیں کھاتے۔

اس آیت پر اور زیادہ بھی لکھ سکتے ہیں، مگر اتنا بیان کافی معلوم ہوتا ہے۔

قسم سوم میں سے گیارہویں آیت یہ ہے: ''وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ

(نحل: ۲۰، ۲۱) ’’یعنی جو لوگ بغیر اللہ کے پرستش کئے جاتے اور پکارے جاتے ہیں۔ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ ہیں، مرچکے ہیں، زندہ بھی تو نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔‘‘ (ازالہ اوہام ص۶۱۳،خزائن ج۳ص۴۳۱)

مرزا قادیانی اس آیت سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ جو’’کوئی اللہ کے سوائے پرستش کیا جاتا ہے۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ مردہ کہتا ہے اور چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ وہ بھی فوت شدہ ہیں۔‘‘

مرزا قادیانی نے نہ تو آیت کا ترجمہ ٹھیک کیا ہے اور نہ اس کی مراد صحیح کو پہنچے ہیں۔ مرزا قادیانی! ’’بغیر اللہ کے‘‘ میں ب کس قسم کی ہے؟ اور اس کے کیا معنی ہیں؟ آیا آپ غیر اللہ اور بغیر اللہ میں فرق نہیں جانتے؟

اس آیت پر مرزائی پارٹی بڑا فخر کیا کرتی ہے اور اسے مسیح علیہ السلام کی وفات کے لئے جلالی آیت (دیکھو الدلیل الصریح مصنفہ مولوی مبارک علی سیالکوٹی برحاشیہ ص اخیر) کہا کرتی ہے۔ مگر جس طرح سے مرزا قادیانی محاورات عربیہ کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح ان کے مرید بھی اس کمال سے بے بہرہ ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت بتوں کے حق میں ہے۔ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار مکہ اللہ کے سوائے جن کو پکارتے ہیں، وہ بے جان ہیں۔ کیونکہ سورت نحل جس کی یہ آیت ہے، مکّی ہے۔ لہٰذا یہ آیت مکہ کے کفار کی تردید کے لئے نازل ہوئی، نہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید کے لئے۔ اس پر مرزائیوں کی طرف سے جواب ہوا کرتا ہے کہ آیت میں ’’الذین‘‘ کا لفظ ہے۔ جو ذوی العقول کے لئے آیا کرتا ہے۔ پس اس میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید ہے، جن کے معبوب ذوی العقول اشیاء میں سے ہیں۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام۔ ہم کہتے ہیں کہ ’’الذین‘‘ کا ذوی العقول سے مخصوص ہونا کسی کتاب علم نحو یا لغت میں تو نہیں لکھا۔ مرزا قادیانی اور ان کی ذریّت کی اپنی عربی بولی میں ہوگا جو ہم پر حجت نہیں بلکہ زبان عربی میں ’’الذی‘‘ اور اس کی مؤنث ’’التی‘‘ کا استعمال جاندار و غیر جاندار، ذوی العقول و غیر ذوالعقول دونوں طرح کی اشیاء پر آیا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل:

پہلی آیت: ’’ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (انعام: ۱۵۴)‘‘ ترجمہ: پھر (سنا ان کو کہ) دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو

کتاب پوری کر کے ایسے طریق سے جو بہت خوبصورت ہے اور تفصیل ہر شئے کی۔‘‘

میں لفظ احسن کی نسبت مفسرین کے دوقول ہیں: احسن اس جگہ صیغہ ماضی از باب افعال ہے۔ دوم: یہ کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ پس احسن کو صیغہ ماضی جاننے سے ’’الذی‘‘ ذی عقل کے لئے ہوگا اور اس کے اسم تفضیل ہونے پر اس کا غیر عاقل کے لئے ہونا صاف ظاہر ہے۔ (مغنی اللبیب باب الموصول ص۱۳۷ ج دوم) میں اس آیت کی نسبت لکھا ہے: ’’**ویکون احسن حینئذ اسم تفضیل لا فعلا ماضیاً وفتحته اعراب لا بناء وھی علامة الجر**‘‘

دوسری آیت: ’’**وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ** (انعام:۱۵۲ وبنی اسرائیل:۳۴)‘‘ یعنی یتیم کے مال کے نزدیک نہ جاؤ۔ مگر ایسے طریق سے جو بہتر ہو۔

تیسری آیت: ’’**وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیَامًا** (نساء:۵)‘‘ یعنی اپنے وہ مال جو اللہ نے تمہارے لئے گزران کا سبب بنائے ہیں، بے عقلوں کو نہ پکڑا دو۔

اسی طرح ’’الذی‘‘ کا غیر ذوی العقول کے لئے بھی مستعمل ہونا شعراء کے کلام سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ متنبّی جس نے مرزاقادیانی کی طرح اپنی فصاحت اور بلاغت کے گھمنڈ پر نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اسی لئے اسے متنبّی یعنی بناوٹی نبی کہا جاتا ہے۔ اپنے دیوان میں جس کی فصاحت وبلاغت علماء میں مسلّم ہے، کہتا ہے:

وَالَّذِیْ تُنْبِتُ الْبِلَادُ سُرُوْرٌ وَالَّذِیْ تُمْطِرُ السَّحَابُ مُدَامٌ

ترجمہ: اب جو کچھ شہروں کی زمین میں اگے گا وہ شراب ہی ہوگا اور جو کچھ بادل برسا رہے ہیں وہ بھی شراب ہی ہوگا۔

اسی طرح دیوان ابی العتاہیہ میں ہے:

اِلٰهِیْ لَا تُعَذِّبْنِیْ فَاِنِّیْ مُقِرٌّ بِالَّذِیْ قَدْ كَانَ مِنِّیْ

ترجمہ: اے اللہ مجھے عذاب نہ کر، کیونکہ جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔ اسی طرح رضی شرح قافیہ باب موصول بیان ذو الطائیہ میں ہے:

فَاِنَّ الْمَآءَ مَاءُ اَبِیْ وَجَدِّیْ وَبِیْرِیْ ذُوْحَفَرْتُ وَذُوْ طَوَیْتُ

ترجمہ: کیونکہ وہ پانی تو میرے باپ دادا کا ہے اور کنواں بھی میرا ہے جو میں نے کھودا اور سنوارا تھا۔

اس شعر میں بنی طے کی لغت پر ذو بمعنی ''الــــذی'' ہے اور غیر جاندار کے لئے مستعمل ہوا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ آیت زیر بحث میں ''الــذیـن'' سے کفار مکہ کے بت مراد لینے محاورہ عرب کے خلاف نہیں۔ اگر کہا جائے کہ: ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' عام ہے، چاہے جاندار ہو چاہے بے جان۔ سب کے لئے بولا جاتا ہے۔ پس اس میں کفار مکہ کے بت بھی شامل ہیں اور ان کے سوائے اور بھی مثلاً حضرت مسیح اور عزیر علیہما السلام اور دیگر باطل معبود جو کسی قوم نے ٹھہرایا ہو۔ کیونکہ اس آیت میں دو لفظ اموات اور غیر احیاء فرمائے گئے ہیں۔ یعنی جو جاندار اللہ کے سوائے معبود مانے گئے ہیں۔ ان کے لئے تو اموات فرمایا۔ پس اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور دیگر جاندار آ گئے اور غیر احیاء میں بے جان معبودیت وغیرہ آ گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک کلمہ ''مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ'' عام ہے جاندار اور بے جان دونوں پر بولا جاتا ہے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوائے ہر قسم کے باطل معبودوں کی تردید ہے۔ لیکن اس آیت کے رو سے یہ کہنا کہ وہ سب جاندار ذوی العقول معبود جن کو لوگ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں۔ اس آیت کے نزول کے وقت مردہ تھے یا فی الحال مرے ہوئے ہیں، ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے وقت کفار مکہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں یہ مضمون کئی مقامات پر مذکور ہے۔ حالانکہ فرشتے جن کو کفار پکارتے تھے۔ اس آیت زیر بحث کے نزول کے وقت زندہ تھے اور اب تک زندہ ہیں۔ پس اگر اس آیت کی رو سے جملہ معبودات باطلہ فی الحال مردہ ثابت ہوتے ہیں تو فرشتوں کی نسبت کیا جواب ہوگا؟ جیسا کہ (النحل:۵۷) اور نیز (الزخرف:۱۶) اور نیز (صافات:۱۴۹) اور (الطّور:۳۹) میں مذکور ہے کہ کفار مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

دیگر یہ کہ اگر کوئی شخص یا قوم اس وقت کسی زندہ شخص کو معبود قرار دے لے تو اس کو اس آیت کی رو سے جیتے جی کس طرح مردہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ پس آیت اپنے مطلب میں غیر کافی رہے گی۔ جس سے قرآن شریف پاک ہے۔

اموات کے متعلق اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ لفظ اﷲتعالیٰ کے سوائے ان سب معبودوں پر جو اس وقت مردہ ہیں اور جو اس وقت زندہ ہیں۔ دونوں پر صادق آ سکتا ہے۔ فوت شدوں پر اس طرح کہ وہ موت چکھے ہوئے ہیں اور مردہ خدائی کے لائق نہیں اور جو زندہ ہیں۔ ان پر اس طرح کہ جو آخرکار مر جائے گا، وہ بھی خدائی کے لائق نہیں۔ کیونکہ جو اپنی بقا اور زندگی پر قادر نہیں، وہ کس طرح معبود ہوسکتا ہے۔ دیکھئے قرآن شریف میں زندوں پر بھی میّت کا لفظ آیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان سب کو انجام کار موت چکھنی ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا اﷲ سبحانہٗ نے سورہ زمر میں کہ: ’’اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ (زمر:۳۵)‘‘ تو بھی میّت ہے اور یہ (کافر) بھی میّت ہیں۔

اس آیت میں آنحضرتﷺ کو میّت کہا گیا ہے۔ حالانکہ آپﷺ اس آیت کے نزول کے وقت صفحہ دنیا پر موجود تھے اور اسی طرح آپﷺ کے مخالفین کفار کو بھی میّت کہا گیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی زندہ موجود تھے۔ پس زندوں پر بھی اس لحاظ سے میّت کا لفظ بولنا جائز ہے کہ وہ سب انجام کار اپنے مقررہ وقت پر مر جائیں گے۔ پس اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام اس آیت زیر بحث کے حکم میں اس لحاظ سے داخل ہیں کہ وہ بھی آخرکار مر جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے نہ اس لحاظ سے کہ وہ اس وقت یا اس آیت کے نزول کے وقت مر چکے تھے۔ حاشا وکلّا۔ قرآن شریف کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے۔ اس آیت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی وموت ہردو سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ لفظ میّت کا اطلاق جیسا کہ ہم نے قرآن شریف سے ثابت کر دکھایا ہے۔ مردوں اور زندوں دونوں پر جائز ہے۔ پس اگر کسی خارجی دلیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت ہے تو بے شک آپ علیہ السلام اس آیت میں اس لحاظ سے داخل ہیں کہ آپ مر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کسی خارجی دلیل سے ثابت نہیں۔ اس لئے آپ علیہ السلام مرے بھی نہیں اور اگر کسی خارجی دلیل سے آپ کی حیات ثابت ہے تو بے شک آپ اس آیت میں اس لحاظ سے داخل ہو سکتے ہیں کہ آپ آخرکار مر جائیں گے اور چونکہ آپ کی زندگی قرآن وحدیث ہردو سے ثابت ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کا پہلا حصہ بلند آواز سے شہادت دے رہا ہے۔ اس لئے آپ ابھی مرے نہیں۔

پس مرزا قادیانی کا اس آیت زیر بحث کو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کی دلیل سمجھنا عجب طرح کی الٹی منطق اور غلط استدلال ہے۔

امام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے حکم میں فرشتوں کو بھی داخل کیا ہے اور اس کی وجہ یہی بتائی ہے کہ آخر کار وہ بھی مرجائیں گے۔

چنانچہ فرمایا کہ تیسرا جواب یہ ہے کہ: ’’**الثالث ان یکون المراد بقوله وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الملائکة وکان ناس من غیر احیاء ای غیر باقیة حیاتهم** (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۳۱۱)‘‘ ’’اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ‘‘ سے مراد فرشتے ہیں اور کفار میں سے کئی لوگ ان کی بھی پرستش کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اموات ہیں۔ یعنی موت سے ان کو بھی بچاؤ نہیں وہ غیر احیاء ہیں۔ یعنی ان کی زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔

قسم سوم میں سے بارھویں آیت یہ ہے: ’’**اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ** (روم:۴۰)‘‘ یعنی اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم کو رزق دیا۔ پھر تم کو مارے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا۔

مرزا قادیانی فرماتے ہیں کہ: ’’اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون قدرت یہ بتلایا ہے کہ انسان کی زندگی میں صرف چار واقعات ہیں۔ پہلے وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر تکمیل اور تربیت کے لئے روحانی اور جسمانی طور پر رزق مقسوم اسے ملتا ہے۔ پھر اس پر موت وارد ہوتی ہے۔ پھر وہ زندہ کیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان آیات میں کوئی ایسا کلمہ استثنائی نہیں جس کی رو سے مسیح علیہ السلام کے واقعات خاصہ باہر رکھے گئے ہوں۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۱۸، خزائن ج۳ ص۴۳۴)

قسم سوم میں سے تیرھویں آیت یہ ہے: ’’**اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ** (نساء:۷۸)‘‘ یعنی جس جگہ تم ہو، اسی جگہ تمہیں موت پکڑ لے گی۔ اگرچہ تم بڑے مرتفع برجوں میں بود وباش اختیار کرو۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۲۲، خزائن ج۳ ص۴۳۶)

مرزا قادیانی کہتے ہیں کہ: ’’چونکہ اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس لئے حضرت مسیح مرگئے۔‘‘

ان آیتوں سے جس طریق سے مرزا قادیانی نے استدلال کیا ہے۔ اس کا تفصیلی ردّ اور جواب گزر چکا ہے کہ استثناء کے لئے ضروری نہیں کہ اسی عبارت میں موجود ہو، بلکہ قرآن

شریف میں جہاں کہیں کسی امر کی تصریح پائی جائے اور وہ کسی حکم عام کے خلاف نظر آئے تو وہ اس عام حکم سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے اور اس کی نظیریں بھی گزر چکی ہیں اور آپ کا یہ کہنا کہ انسان کے لئے یہ چاروں مراتب ہیں اور اس سے عمر طبعی کے الحاد کا استدلال کرنا۔ سو یہ بھی اچھی طرح سے باطل ثابت ہو چکا ہے اور اگر بالفرض یہ آیتیں کس طرح اشارۃً یا دلالۃً حضرت مسیح علیہ السلام کی موت پر دلالت کریں بھی تو بھی بمقابلہ ان تصریحات کے جو آیات ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ'' اور ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ'' اور ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ'' میں آپ کی زندگی اور رفع آسمانی کے بارے میں موجود ہیں۔ کچھ مفید نہیں۔ کیونکہ دلیل خاص دلیل عام پر مقدم ہوتی ہے اور عبارت النص کے مقابلے میں اشارۃً اور دلالۃً اعتبار نہیں ہوتا اور اسی طرح منطوق کے مقابلہ میں مفہوم کو پیش نہیں کر سکتے۔

قسم سوم میں سے چودھویں آیت یہ ہے: ''یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ'' (فجر:۲۸تا۳۰)

مرزا قادیانی اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پھر اس کے بعد میرے ان بندوں میں داخل ہو جا جو دنیا کو چھوڑ گئے ہیں اور میری بہشت کے اندر آ۔''

اور پھر اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر اس طرح استدلال کرتے ہیں: ''اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسان جب تک فوت نہ ہو جائے، گزشتہ لوگوں کی جماعت میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ لیکن معراج کی حدیث سے جس کو بخاری نے بھی مضبوط طور پر اپنے صحیح میں لکھا ہے۔ ثابت ہو گیا کہ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام فوت شدہ نبیوں کی جماعت میں داخل ہے۔ لہٰذا حسب دلالت صریحہ اس نص کے مسیح ابن مریم علیہ السلام کا فوت ہو جانا ضروری طور پر ماننا پڑا۔'' (ازالہ اوہام ص۶۱۷،۶۱۸، خزائن ج۳ ص۴۳۳)

قسم سوم میں سے پندرہویں آیت یہ ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خَالِدُوْنَ (انبیاء:۱۰۱،۱۰۲)''

مرزا قادیانی اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''جو لوگ جنتی ہیں اور ان کا جنتی ہونا ہماری طرف سے قرار پا چکا ہے وہ دوزخ سے دور کئے گئے ہیں اور وہ بہشت کی دائمی لذات میں ہیں'' اور پھر کہتے ہیں: ''اس آیت سے مراد حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام ہیں اور ان کا بہشت میں داخل ہو جانا اس سے ثابت ہوتا ہے، جس سے ان کی موت بھی بپایۂ ثبوت پہنچتی ہے۔'' (ازالہ اوہام ص۶۲۱،۶۲۲، خزائن ج۳ ص۴۳۵،۴۳۶)

قسم سوم میں سے سولہویں آیت یہ ہے: ''اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ (قمر: ۵۴،۵۵)'' مرزا قادیانی اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''یعنی متقی لوگ جو خدا تعالیٰ سے ڈر کر ہر ایک قسم کی سرکشی کو چھوڑ دیتے ہیں وہ فوت ہونے کے بعد جنّات اور نہر میں ہیں، صدق کی نشست گاہ میں با اقتدار بادشاہ کے پاس۔'' (ازالہ اوہام ص۶۲۰، خزائن ج۳ ص۴۳۵)

''فوت ہو جانے کے بعد'' مرزا قادیانی نے از خود بڑھایا ہے۔ قرآن شریف میں اس کے لئے لفظ نہیں۔

ان تینوں آیتوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کرنے کے جواب میں اوّل تو یہی کافی ہے کہ ان آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کا ذکر نہیں ہے۔ مرزا قادیانی نے اپنی رائے وقیاس سے نتیجہ نکالا ہے اور ان کا یہ قیاس ان آیات کے منطوق کے خلاف ہے جو خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور نزول ثابت کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ استدلال درست نہیں۔ لیکن تفصیلی جواب یہ ہے کہ بہشت میں داخل ہونا روز قیامت کو ہوگا نہ کہ مرنے کے ساتھ ہی۔ اگر یہ درست ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی بہشت میں دخول ہو جاتا ہے تو پھر قیامت کس لئے ہے؟

پس یہ آیتیں مرزا قادیانی کو کس طرح بھی مفید نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو لوگ جنتی ہیں، ضرور نہیں کہ وہ اس وقت بھی مردہ ہوں۔ مرزا قادیانی نے پہلی آیت کے ساتھ حدیث معراج کو ملا کر جو استدلال کیا ہے۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اوّل تو مرزا قادیانی معراج جسمانی کے منکر ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنے ازالہ میں لکھتے ہیں: ''سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا۔'' (ازالہ اوہام حاشیہ ص۴۷، خزائن ج۳ ص۱۲۶)

دیگر یہ کہ مرزا قادیانی نے معراج کی سب حدیثوں پر نظر نہیں کی۔ اگر کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان مبارک سے نزول ثانی کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفاً اور مسند امام احمد میں مرفوعاً صحیح سند سے مروی ہے کہ: ''**عن عبداللّٰہ ابن مسعود قال لما کان لیلة اسری برسول اللّٰہ ﷺ لقی ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ فتذاکروا الساعة فبدؤا بابراهیم فسألوه عنها فلم یکن عنده منها علم ثم سألوا موسیٰ فلم یکن عنده منها علم فردّ الحدیث الیٰ عیسیٰ ابن مریم فقال قد عهد الیّ فیما دون وجبتها فاما وجبتها فلا یعلمها الا اللّٰہ فذکر خروج الدجال قال فانزل فاقتل (الحدیث)** (سنن ابن ماجه باب فتنة الدجال وخروج عیسیٰ بن مریم وخروج یاجوج وماجوج ص ۳۰۹)'' جس رات رسول اللہ ﷺ کو معراج کرایا گیا۔ اس رات آپ نے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام (اولوالعزم پیغمبروں) سے ملاقات کی تو ان سب میں قیامت کی بابت ذکر چلا۔ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ آپ کو قیامت کے وقوع کی بابت کوئی خبر نہ تھی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ آپ کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باری آئی تو آپ نے کہا کہ ہاں قیامت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا مجھ سے عہد ہے، لیکن قیامت کے واقع ہونے کا وقت سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ پھر آپ نے دجّال کا ذکر کیا اور کہا پھر میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔''

اس حدیث سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ﷺ سے اپنے قرب قیامت میں نازل ہونے کی بابت ذکر کر رہے ہیں۔ مرزا قادیانی چاہے کیسے استدلال پیش کریں اور نصوص کو چاہے کیسے بعید احتمال سے رد کریں۔ اس حدیث کی تصریح کے مقابلہ میں ان کے مفید مطلب کوئی بات بن نہیں پڑتی۔

اگر کہا جائے کہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرات ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام تینوں سے ملاقات کی تو بہرحال تینوں کو ایک حال میں ماننا پڑے گا۔ خواہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ مانو۔ خواہ عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرح فوت شدہ تسلیم کرو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملاقات تین طرح پر ہوتی ہے۔ اوّل ہر دو جانب سے

بدنی ملاقات ومصاحبت ہو۔ دوم یہ کہ ہر دو جانب سے روحانی ہو۔ سوم یہ کہ ایک طرف سے روحانی اور دوسری طرف سے بدنی۔ سو معراج کی رات میں رسول اللہﷺ پر یہ تینوں کیفیتیں پوری کی گئیں تاکہ آپ کو ہر طرح کا کمال حاصل ہو۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام سے آپ کو قسم سوم کی ملاقات ہوئی۔ یعنی آپ کی طرف سے بدنی ملاقات تھی اور ان کی طرف سے روحانی۔ کیونکہ رسول اللہﷺ کو معراج جسم مبارک ساتھ کرایا گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور رسالہ ''سلم الوصول الٰی اسرار الرسول ''میں بڑی تحقیق وتدقیق سے ثابت کیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات قرآن اور حدیث صحیح بخاری سے ثابت ہے۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرف سے روحانی ملاقات تھی اور آنحضرتﷺ کی طرف سے جسمانی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی آپس میں قسم دوم کی ملاقات تھی۔ یعنی دونوں طرف سے روحانی اور ان کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبیﷺ کی طرح قسم سوم کی ملاقات تھی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی جسمانی قرآنی شہادت سے پکار رہا ہے۔ باقی رہی آنحضرتﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملاقات۔ سو یہ قسم اوّل میں سے تھی۔ یعنی دونوں طرف سے جسمانی۔ کیونکہ حضرت رسول اللہﷺ اور حضرت روح اللہ علیہ السلام دونوں کا معراج جسمانی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ پس معترض کا اعتراض باطل ہوا۔ ملاقات کی تقسیم جو اوپر کی گئی ہے۔ مرزا قادیانی کی طرح از خود نہیں بنائی گئی بلکہ اہل اللہ کے نزدیک مسلّم ہے اور حدیث صحیح بخاری سے ماخوذ ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

''عن ابن عباس قال مر النّبی ﷺ بقبرین فقال انهما لیعذّبان وما یعذبان فی کبیر امّا احدهما فکان لا یستتر من البول وامّا الاخر فکان یمشی بالنّمیمة ثمّ اخذ جریدة رطبةً فشقها نصفین فغرز فی کل قبر واحدة قالوا یا رسول اللّٰه لم فعلت قال لعلّه یخفف عنهما مالم یبسا (صحیح بخاری کتاب الوضؤ) ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے آپﷺ نے فرمایا کہ ان مردوں کو عذاب ہو رہا ہے اور جس گناہ کی بابت ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ اس سے بچنا کوئی بڑی بات نہیں ایک تو پیشاب سے پرہیز نہیں کیا کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ پھر آپﷺ نے ایک ہری ٹہنی لی اور اس

کے دو ٹکڑے کئے ایک کو ایک قبر پر گاڑا اور دوسرے کو دوسری پر۔ صحابہؓ جو ساتھ تھے انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ نے کس لئے ایسا کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا امید ہے کہ جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہو جائیں، ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔

یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے۔ پس یہ متفق علیہ ہونے کی وجہ سے اوّل درجہ کی صحیح حدیث ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو صحابہؓ کے ساتھ قسم اوّل کی ملاقات تھی۔ یعنی ہر دو جانب سے بدنی مصاحبت تھی اور ان مردوں کے ساتھ قسم سوم کی۔ یعنی آپ ﷺ کی طرف سے بدنی تھی اور ان کی طرف سے روحانی۔

اسی طرح جنگ بدر کے مقتول کافروں کو جب گڑھے میں ڈالا گیا تو آپ ﷺ نے کنارے پر کھڑے ہو کر ان کے نام مع ولدیت کے پکار کر کہا کہ کیا اب تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟ کہ تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا دیکھ لیا۔ کیا تم نے بھی وہ وعدہ جو عذاب کے بارے میں تم سے کیا جاتا تھا، سچا پالیا یا نہیں؟ جب آپ ﷺ نے ان لاشوں سے ایسی باتیں کیں تو پاس سے حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ ایسے جسموں سے باتیں کرتے ہیں، جن میں روح نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے تم اس بات کو جو میں ان سے کہتا ہوں۔ ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ یعنی وہ اس وقت بہ سبب صاحب حال ہونے کے میری بات کو بالکل حق الیقین کے مرتبے پر سنتے ہیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی آواز ان کو بطور معجزہ کے سنادی۔

یہ حدیث صحیح بخاری کی ہے اور اس سے بھی تقسیم مذکور واضح ہے۔ پس مرزا قادیانی کا آیات زیر بحث کے ساتھ حدیث معراج کو ملا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وہم کرنا صحیح نہیں۔

قسم سوم میں سے سترہویں آیت اور مرزا قادیانی کی ترتیب کی اکیسویں آیت یہ ہے: ''مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب: ۴۰)'' یعنی محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں۔ مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا نبیوں کا۔

اس آیت کے تحت مرزا قادیانی لکھتے ہیں: ''یہ آیت بھی صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی ﷺ کے کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا۔ پس اس سے بھی بکمال

وضاحت ثابت ہے کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ دنیا میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ مسیح ابن مریم رسول ہے اور رسول کی حقیقت اور ماہیت میں یہ امر داخل ہے کہ دینی علوم کو بذریعہ جبرئیل حاصل کرے اور ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب وحی رسالت القیامت منقطع ہے۔ اس سے ضروری طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسیح ابن مریم ہرگز نہیں آئے گا اور یہ امر خود مستلزم اس بات کو ہے کہ وہ مر گیا۔'' (ازالہ اوہام ص۶۱۴، خزائن ج۳ ص۴۳۱،۴۳۲)

مرزا قادیانی کا یہ استدلال حضرت مسیح علیہ السلام کی موت اور ان کے نازل نہ ہونے کے بارے میں تو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ مرزا قادیانی کا استدلال محض قیاسی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی اور زندگی اور نزول قطعی دلائل سے ثابت ہے۔ ہاں اس آیت سے مرزا قادیانی کا دعویٰ نبوت ضرور جھوٹا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ مذکور ہوگا۔

مرزا قادیانی کا اس آیت سے منشا یہ ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں تو یا تو آپ منصب نبوت سے معزول ہو کر آئیں گے یا نبی ﷺ خاتم النّبیین نہ رہیں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی جدید نبی منع ہے۔ جیسا کہ آپ کے بعد مرزا قادیانی اور آپ کے دوسرے ہم مشربوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر کوئی پچھلا نبی جس کو آپ ﷺ سے پیشتر نبوت مل چکی ہو۔ پھر آئے تو وہ اس کے رو سے منع نہیں۔ جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ ان کو آپ ﷺ سے پیشتر نبوت مل چکی ہوئی ہے اور جب پھر نازل ہوں گے تو ان کی نبوت وہی ہوگی جو پہلے تھی نہ کہ مرزا قادیانی کی طرح نئی نبوت۔ احادیث نبویہ ﷺ سے ایسا ہی ثابت ہے۔

چنانچہ مسند امام احمد میں ہے کہ: ''عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ الرِّسَالَۃَ وَالنُّبُوَّۃَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ (مسند امام احمد رحمۃ اللہ علیہ)'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک رسالت اور نبوت ختم ہو چکی ہے۔ پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا نہ کوئی نبی۔

مسند امام احمد میں بروایت حضرت ابی بن کعب ایک اور حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''میری مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص ایک حویلی تعمیر کرائے، مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ جائے۔ (جب لگے تو وہ حویلی پوری ہو) پس میں پیغمبروں میں اس آخری اینٹ کی مانند ہوں۔ (صحیح بخاری ملخصاً)

ان احادیث اوران کی مانند دوسری احادیث کو زیر نظر رکھنے سے صاف کھل جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہی فرماتے ہیں کہ مجھے نبوت عطاء ہونے کے بعد اب کسی اور شخص کو منصب نبوت نہیں ملے گا۔ نیز مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے اس خدشہ کو اسی طرح دور کیا ہے۔

چنانچہ تفسیر''ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم''میں آیت خاتم النّبیین کے ذیل میں لکھا ہے کہ:''ولا یقدح فیہ نزول عیسٰی بعدہ علیہما السلام لان معنی کونہ خاتم النّبیین انہ لا ینبآء احد بعدہ وعیسٰی ممن نبی قبلہ وحین ینزل امّا ینزل عاملاً علٰی شریعۃ محمد ﷺ مصلیًا الی قبلتہ کانہ بعض امتہ''''آپ ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی اور عیسیٰ علیہ السلام تو ان میں سے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے نبی بنائے گئے ہیں، دیگر یہ کہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ﷺ ہی کی شریعت پر عمل کریں گے اور آپ ﷺ ہی کے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔ گویا وہ آپ ﷺ کی امت میں سے ہیں۔''(پس اس لحاظ سے بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوا)

اسی طرح دیگر تفاسیر میں ہے۔ مثلاً بیضاوی، خازن، مدارک اور فتح البیان۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت میں کچھ حرج ہوتا ہے تو کیا مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت سے حرج نہیں ہوتا؟ اور اگر مرزا قادیانی بروز کا (جو باطل ہے) عذر کر کے اس زد سے بچ سکتے ہیں تو کیا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ عذر کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے نبی ہیں اور آیت میں اور حدیث میں کسی نئے نبی کی بابت نفی ہے، صحیح نہیں؟ انصاف! انصاف! انصاف!

اگر عدل وانصاف سے سوچا جائے تو جس صورت سے مرزا قادیانی نے اور آپ کے متقدمین دجالوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی تردید ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آیا ہے کہ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ میری امت میں سے قریباً تیس دجال نہ ہولیں۔ جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔''اس حدیث کو حدیث:''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ''اور آیت:''خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ''کے ساتھ رکھ کر انصاف کریں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مرزا قادیانی کا دعویٰ

نبوت وہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ ان مدعیان نبوت کو دجال اور کذاب کہتے ہیں۔ پس آیت زیر بحث کی رو سے آپ کا دعویٰ غلط نکلا، نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے انکار میں مرزا قادیانی کے پاس کوئی معقول وجہ اور دلیل نہیں۔ صرف شکوک وشبہات ہیں۔ جن سے لوگوں کو بہکاتے ہیں اور اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک یہ شبہ بھی ڈالا کرتے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام پھر نازل ہوں گے تو کیا ان کی نبوت چھینی جائے گی؟ اور وہ کس شریعت پر عمل کریں گے؟ عیسوی شریعت پر یا محمدی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت چھینی نہیں جائے گی۔ کیونکہ اہل سنت کے نزدیک نبوت ایک ایسا منصب ہے جو چھینا نہیں جاتا۔ (دیکھو تمہید ابی الشکور سالمی) اور نہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت منسوخ ہوگی۔ بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی اپنی پچھلی نبوت سے نازل ہوں گے اور شریعت محمدی پر عمل کریں گے اور اسی کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اس کی حکمت اور راز پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔ نیز یہ کہ ایک وقت میں دو نبیوں کا ہونا اور ایک کا امام ہونا اور دوسرے کا تابع ہونا ممتنع نہیں۔ بلکہ قرآن شریف سے بالتصریح ثابت ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام دونوں ایک وقت میں ہوئے ہیں اور دونوں نبی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اصل صاحب شریعت اور امام تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے تابع اور خلیفہ تھے۔

چنانچہ سورہ فرقان میں فرمایا: ’’وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی الْکِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَہٗ اَخَاہُ ھَارُوْنَ وَزِیْرًا (فرقان:۳۵)‘‘ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر بنایا۔

اسی طرح سورہ اعراف میں فرمایا: ’’وَقَالَ لِاَخِیْہِ ھَارُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (اعراف:۱۴۲)‘‘ کہ جب موسیٰ علیہ السلام حسب وعدۂ الٰہی کوہ طور پر چلے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو کہنے لگے کہ میرے بعد میری قوم میں میرا خلیفہ رہنا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں اور قوم کو صرف اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام بھی نبی تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ’’وَوَھَبْنَا لَہٗ مِنْ رَّحْمَتِنَا اَخَاہُ ھَارُوْنَ نَبِیًّا (مریم:۵۳)‘‘ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون علیہ السلام نبی کے بخشا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت لوط علیہما السلام دونوں ایک وقت میں ہوئے ہیں اور دونوں نبی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اصل صاحب شریعت اور امام تھے اور حضرت لوط علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے ان کے تابع تھے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کی نبوت ورسالت کی بابت فرمایا: ''وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (الصافات:۱۳۳)'' یعنی بے شک حضرت لوط علیہ السلام بھی رسولوں میں سے ہیں۔ اوران کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہونے کی بابت فرمایا: ''فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (عنکبوت:۲۶)'' یعنی حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہما السلام پر ایمان لائے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہما السلام دونوں ایک وقت میں نبی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے تابع تھے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات میں فرمایا: ''مُصَدِّقًاۢ بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران:۳۹)'' یعنی حضرت یحییٰ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔

پس اسی طرح جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو اس وقت شریعت محمدی ﷺ منسوخ نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ اصل صاحب شریعت اور امام جناب رسول اللہ ﷺ ہی ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اور وزیر اور تابع بھی ہوں گے اور نبی بھی ہوں گے۔ اسی لئے صحیح مسلم کی حدیث میں جو حضرت نواس بن سمعان کی روایت سے ہے۔ اس میں آپ کو چار دفعہ نبی اللہ کہا گیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ ایسے نبیوں کی بابت ہے جو ایک زمانے میں دنیا پر موجود تھے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صورت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ نبی ﷺ دنیا میں تشریف نہیں رکھتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صورت میں یہ تو امر بطریق اولیٰ جائز ہے۔ کیونکہ جب حقیقۃً دو نبی اکھٹے ہو سکتے ہیں تو زمانہ اور زندگی کے لحاظ سے یہ کیوں منع ہے۔ یعنی یہ کہ ایک تو باعتبار زمان نبوت کے ہو اور دوسرا اپنی حقیقی زندگی سے موجود ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لو آپ کی تسلی کے لئے ہم یہ امر بھی قرآن شریف سے ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ (بقرہ:۸۷)'' ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس کے بعد اس کے قدم بقدم کئی رسول بھیجے۔

اسی طرح سورۂ مائدہ میں فرمایا: ''اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرَاۃَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا (مائدہ:۴۴)'' ہم نے توریت نازل کی، اس میں ہدایت اور نور تھا۔ اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے، خدا کے فرمانبردار نبی۔

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شریعت موسوی کے تابع کئی رسول مبعوث کئے گئے اور وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوئے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے آئین وشریعت پر کئی نبیوں کے ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی حکمت اور ضرورت پہلے باب میں گزر چکی ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ پر نبوت ختم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ نہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو آپ ﷺ سے پیشتر نبوت مل چکی ہوئی ہے، نہیں آئیں گے۔ بلکہ اس آیت سے مرزا قادیانی کی نبوت صاف جھوٹی ثابت ہوتی ہے اور ان لوگوں جیسی ہے، جن کو رسول اللہ ﷺ نے دجال اور کذاب کہا ہے اور ان کی تعداد تیس کے قریب بتلائی ہے، جن میں سے بہت سے گزر چکے ہیں۔

قسم سوم میں سے اٹھارہویں آیت یہ ہے: ''فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء:۷)'' مرزا قادیانی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: ''یعنی اگر تمہیں ان بعض امور کا علم نہ ہو جو تم میں پیدا ہوں تو اہل کتاب کی طرف رجوع کرو اور ان کی کتابوں کے واقعات پر نظر ڈالو تاکہ اصل حقیقت تم پر منکشف ہو جائے۔ سو جب ہم نے موافق حکم اس آیت کے اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا اور معلوم کرنا چاہا کہ کیا گر کسی نبی گزشتہ کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہو تو وہی آجاتا ہے یا ایسی عبارتوں کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں تو معلوم ہوا کہ اسی امر متنازعہ فیہ کا ہم شکل ایک مقدمہ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام آپ ہی فیصل کر چکے ہیں اور ان کے فیصلے کا ہمارے فیصلے کے ساتھ اتفاق ہے۔ دیکھو کتاب سلاطین وکتاب ملاکی نبی اور انجیل جو ایلیا کا دوبارہ آسمان سے اترنا کس طور سے حضرت مسیح علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔'' انتہیٰ بالفاظہٖ! (ازالہ اوہام ص۶۱۶، ۶۱۷، خزائن ج۳ ص۴۳۳)

مرزا قادیانی کی عبارت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اہل کتاب کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم کرتا ہے۔ پس اس آیت کے حکم سے ہم نے بائبل پر نظر کی تو اس میں حضرت ایلیا کا آسمان سے اترنا چاہا۔ مگر اس کی صورت حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ بیان

فرمائی کہ ایلیا کا آنا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے پورا ہوگیا ہے۔ پس اسی طرح احادیث میں جو حضرت مسیح علیہ السلام کا آسمان سے اترنا آیا ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ کوئی شخص مثیل مسیح علیہ السلام آئے گا۔ چنانچہ وہ میں آ گیا ہوں اور حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہوئے ہوں۔

مرزا قادیانی کا استدلال بالکل غلط ہے اور وہ آیت کے صحیح مطلب کو ہرگز نہیں سمجھے۔ اس آیت زیر بحث کی صحیح تفسیر ان شاء اللہ تعالیٰ ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے مرزا قادیانی کی مراد کے موافق فرض کر کے ان کے استدلال کو غلط ثابت کرتے ہیں۔

اوّل: اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اہل کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم اس شرط سے کیا ہے کہ ہم کو اپنی شریعت میں وہ بات معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ صاف ارشاد فرمایا: ’’اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل:۴۳)‘‘ یعنی اگر تم نہیں جانتے۔ پس جب آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات حقیقی اور رفع آسمانی اور نزول عینی ثابت ہے اور ہمیں اس میں کوئی تردد اور بے علمی کا خدشہ نہیں تو ہم اہل کتاب کی کتابوں کی طرف کیوں رجوع کریں۔ کیا آسمانی اور حق اور محفوظ اور غیر محرّف کتاب کو چھوڑ کر بندوں کی بنائی ہوئی اور محرّف کتابوں کے پیچھے لگنا: ’’اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ ھُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ (بقرہ:۶۱)‘‘ کا مصداق نہیں۔ (یعنی کیا تم بہتر چیز کے بدلے میں ادنیٰ چیز کو لیتے ہو)

دوم: اس طرح کہ الیاس علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور وہاں سے پھر اترنے کا مسئلہ قرآن وحدیث سے کہیں بھی ثابت نہیں۔ نہ حقیقتاً اور نہ مثالاً۔ پس مرزا قادیانی اس پر اپنی مماثلت کی بنا نہیں رکھ سکتے۔ قرآن شریف سے یہی ثابت ہوا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی بابت کبھی کوئی پیش گوئی نہیں کی گئی۔ یہ یہودیوں کا من گھڑت عذر تھا اور نیز یہ بھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے مثیل نہ تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کی تعریف ان لفظوں سے سنائی تھی۔

’’اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (آل عمران:۳۹)‘‘ (اے زکریا) اللہ تعالیٰ تجھ کو ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ وہ کلمۃ اللہ کی یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی (جو ان سے بعد پیدا ہوئے) تصدیق کرنے والا ہوگا اور اپنی قوم کا سردار ہوگا اور عورتوں سے علیحدہ رہنے والا اور بہت پاکباز ہوگا اور صالحین انبیاء میں سے ہوگا۔

پس اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت الیاس علیہ السلام کے نزول کی پیش گوئی ہوئی ہوتی اور اس کا پورا ہونا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے ہوتا تو یہ امر حضرت زکریا علیہ السلام کو ضرور معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس وقت آپ ہی بوجہ نبی ہونے کے کامل العلم تھے اور دوسرے لوگ آپ کے علم کے محتاج تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت یوں سناتا کہ یہ وہ مولود مسعود ہے جو مدتوں سے منتظر وموعود ہے تاکہ حضرت زکریا علیہ السلام اپنے بیٹے سے اس پیش گوئی کے پورا ہونے سے زیادہ خوش ہوں۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے باوجود سبب کے موجود ہونے کے اس امر کا ذکر نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ نہ الیاس علیہ السلام کا نزول خدا کی طرف سے بتلایا گیا تھا اور نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ان کا مثیل ہونا درست ہے۔

اسی طرح سورت مریم علیہ السلام میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفت میں فرمایا: ”لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا (مریم:۷)“ یعنی ہم نے اس سے پیشتر اس کا ہم نام بنایا ہی نہیں۔ سمّی کے معنی نظیر وشبیہ اور مثیل کے بھی ہیں۔ جیسا کہ اسی سورت میں آگے آتا ہے۔ ”هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (مریم:۶۵)“ یعنی کیا تو کوئی ایسا شخص جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا نظیر ہو۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پیشتر ان کا ہم نام ومثیل بنایا ہی نہیں تو اب مرزاقادیانی ان کو حضرت الیاس علیہ السلام کا مثیل کس طرح قرار دیتے اور کس طرح اس پر اپنے دعویٰ مماثلت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں؟

سوم: اس طرح کہ انجیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نہ تو مثیل الیاس ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ وہ تھے بلکہ یہودیوں کے پوچھنے پر اس سے صاف انکار کیا۔

جیسا کہ (انجیل یوحنا باب اوّل آیت ۱۹تا۲۱) تک لکھا ہے: ”(۱۹) اور یوحنا کی گواہی یہ تھی، جب کہ یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لادیوں کو بھیجا ہے کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے۔ (۲۰) اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ مسیح نہیں ہوں۔ (۲۱) تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا: میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے، اس نے جواب دیا: نہیں۔“

اس عبارت اور اس سے بعد کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کا انجیلی نام یوحنا ہے۔ کاہنوں کے سوال پر اپنے مثیل الیاس ہونے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ پس مرزاقادیانی کا دعویٰ مماثلت بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر یہ عذر کیا جائے کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے اعتراض پر حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کی بابت حضرت یحییٰ علیہ السلام کا آنا پیش کیا تھا تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ یہ انجیل سے ثابت نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پیش کیا۔ دوم! اگر تسلیم بھی کر لیں تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اپنے انکار کے مقابلے میں ہو بہو ''مدعی سست گواہ چست'' کا معاملہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ خود حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے آپ کو مثیل الیاس قرار دے سکتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ کیا پھر حضرت مسیح علیہ السلام نے غلط جواب دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی سے سمجھا سکتا ہے کہ یہ معاملہ بالکل من گھڑت ہے۔

چہارم: اس طرح کہ اگر بالفرض اسے تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی نسبت پیشین گوئی کی گئی تھی اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے پوری ہوئی تو پھر بھی یہ ایک نظیر ہی بنے گی، نہ کہ علت موجبہ کہ اس کے رو سے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی بھی اسی رنگ میں پوری ہو۔ یہ نکتہ اہل علم پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ دوسرا واقعہ خواہ مخواہ پہلے معاملہ کی مانند ہو۔

اس سارے بیان سے واضح ہوگیا کہ مرزا قادیانی نے اپنے دعویٰ مماثلت کے متعلق جس امر کو بنا قرار دیا تھا۔ وہ بالکل غلط ہے اور ان کو کسی طرح مفید نہیں۔ پس اس آیت زیر بحث سے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہ ہوسکی۔

اب ہم اس آیت: ''فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل: ۴۳)'' کا صحیح مطلب بیان کر کے ناظرین کو قرآنی نکتوں سے مسرور کرتے ہیں۔

اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں کے متعلق ہم صرف وہی کچھ نقل کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں جو کچھ شیخ علی مہائمی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: ''اے پیغمبر ہم نے تو تجھ سے پیشتر جو رسول بھیجا ہے۔ وہ (انسانوں میں سے) مرد ہی تھا اور بشریت اور رسالت میں کس طرح منافات ہوسکتی ہے۔ کیونکہ رسالت کے لئے تو آسمان سے اترنا شرط نہیں۔ بلکہ صرف اس قدر کافی ہے کہ ہم ان کی طرف فرشتہ بھیجنے سے ان کو وحی کرتے رہے ہیں۔ پس اگر یہ معاملہ شیطان کے نزول سے ملتبس ہو جائے تو تم اہل الذکر کو جو بڑے پائے کے علماء ہیں۔ پوچھ دیکھو۔ اگر خود قصور نظر کے سبب اس میں فرق نہیں جان سکتے اور انبیاء پر فرشتے نازل ہونے میں یہ بھی شرط نہیں کہ وہ بشریت سے بالکل باہر ہو جائیں۔ کیونکہ اس کی ایک صورت تو

یہ ہے کہ وہ جماد یعنی بے جان ہو اور یہ باطل ہے۔ کیونکہ ہم نے ان پیغمبروں کو پتھروں کی طرح بے جان جسم نہیں بنایا کہ کھائیں نہیں۔ کیونکہ جمادات کو ملائکہ سے کوئی نسبت نہیں۔ پس صرف طعام ترک کر دینے سے ان کی مناسبت کامل نہیں ہوسکتی اور یا یہ صورت ہے کہ وہ پیغمبر حیات کے کمال کے رو سے ایسے ہوں کہ مریں نہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں۔ (پس کفار کا اعتراض درست نہیں) پیغمبروں کے لئے تو یہی شرط ہے کہ دلائل کے رو سے ان کی سچائی ثابت کی جائے۔ سو ہم نے ایسا کر دیا۔ پھر ہم نے ان کے متعلق اپنے وعدوں کے سچا کرنے سے بھی ان کو سچا ثابت کر دیا کہ ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا اور اس پر یہ دلیل ہے کہ ان کو ہم نے بچالیا باوجود اس کے کہ وہ بھی ان ہلاک شدوں کے بیچ میں بستے تھے اور ان کے ساتھ کے مومنوں کو بھی بچالیا۔ (جن کے بچانے کے متعلق ہماری مشیّت ہوا کرتی ہے)

آیت: ’’فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ‘‘ کے متعلق صحیح تفسیر یہی ہے۔ جو لکھی گئی۔ مرزا قادیانی اس کا نہ صحیح مطلب سمجھتے ہیں اور نہ ان کا استدلال صحیح ہے۔ بلکہ اس آیت میں مرزا قادیانی کی صریح تکذیب پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ ان وعدوں کا سچا ہونا ضروری فرماتا ہے۔ جو پیغمبروں کے ساتھ ان کے دشمنوں کی ہلاکت کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی جب کسی کو کوئی ڈر سناتے ہیں تو وہ اس سے محفوظ رہتا ہے اور اگر تجربہ سے طاعون کے دنوں میں کچھ ہلچل مچا کر لوگوں کو اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں تو ان کے اپنے مخلص مرید بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس سے آپ کا جھوٹا ہونا عام لوگوں میں مشہور اور واضح ہو چکا ہے اور اسی طرح کبھی آپ زلزلہ کو دیکھ کر کچھ اپنے تجربہ سے اور کچھ تجربہ کار لوگوں سے سن سنا کر دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کر دیتے ہیں اور مریدوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دیتے ہیں اور خود بھی باہر نکل جاتے ہیں تاکہ آپ کے ایسے فعل اور تاکیدی حکم سے دوسرے لوگوں پر کچھ اثر پڑے۔ مگر نہ زلزلہ آتا ہے اور نہ کچھ اور ہوتا ہے اور مفت میں آپ فضیحت اٹھاتے ہیں۔ بلکہ اس سے لوگ اور آپ کی تکذیب پر مضبوط ہو جاتے ہیں اور ان کا ایمان سلامت رہتا ہے۔

قسم سوم میں سے انیسویں آیت اور مرزا قادیانی کی ترتیب کے رو سے انتیسویں آیت یہ ہے: ’’مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (حشر:۷)‘‘ یعنی رسول ﷺ جو کچھ تمہیں علم اور معرفت عطاء کرے وہ لے لو اور جس سے منع کرے وہ چھوڑ دو۔

اس آیت کے رو سے مرزا قادیانی نے بعض احادیث نبویہ ﷺ سے استدلال کیا ہے اور اپنی الٹی منطق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر گئے ہیں۔

پہلی حدیث یہ ہے: ''**عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰه ﷺ اعمار امتی ما بین الستین الی السبعین واقلهم من یجوز ذالک رواه الترمذی وابن ماجه** (مشکوٰۃ) ''یعنی اکثر عمریں میری امت کی ساٹھ سے ستر برس تک ہوں گی اور ایسے لوگ بہت کم تر ہوں گے جو ان سے بھی تجاوز کریں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: ''ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم اس امت کے شمار میں ہی آگئے ہیں، پھر اتنا فرق کیونکر ممکن ہے کہ اور لوگ تو ستر برس تک مشکل سے پہنچیں اور ان کا یہ حال ہو کہ وہ ہزار کے قریب ان کی زندگی کے برس گزر گئے اور اب تک مرنے میں نہیں آتے۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا میں آکر پھر چالیس یا پینتالیس برس زندہ رہیں گے۔'' (ازالہ اوہام ص۶۲۳، خزائن ۳ ص۴۳۶)

دوسری حدیث مرزا قادیانی نے یہ پیش کی ہے: ''**عن جابر قال سمعت النّبی ﷺ یقول قبل ان یموت بشهر تسئلونی عن الساعة انما علمها عند اللّٰه واقسم باللّٰه ما علی الارض من نفس منفوسة یأتی علیها مائةسنة وهی حیة** (رواه مسلم) ''اور روایت ہے جابر رضی اللہ عنہ سے کہ سنا میں نے پیغمبر خدا ﷺ سے کہ وہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ کوئی ایسا زمین پر مخلوق نہیں کہ اس پر سو برس گزریں اور وہ زندہ رہے۔''

چونکہ مرزا قادیانی جانتے ہیں کہ یہ حدیث بوجہ ''**علی الارض** '' کی قید کے ہمارے مفید مطلب نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لئے اس کے معنی بدلنے اور خلاف مراد تاویل کرنے میں بہت زور لگایا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص زمین کی مخلوقات میں سے ہو، وہ شخص سو برس کے بعد زندہ نہیں رہے گا اور ''ارض '' کی قید سے مطلب یہ ہے کہ تا آسمان کی مخلوقات اس سے باہر نکالی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم آسمان کی مخلوقات میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ زمین کی مخلوقات اور ''**ما علی الارض**'' میں داخل ہیں۔'' (ازالہ اوہام ص۶۲۵، خزائن ج۳ ص۴۳۷)

اس آیت زیر بحث اور دونوں حدیثوں کے جواب میں اوّل تو یہ عرض ہے کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی اور آپ کا نزول آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ مرفوعہ سے ثابت ہے اوران آیات واحادیث میں ان کی موت کا کوئی ذکرنہیں۔ مرزاقادیانی کا اپنا نیا اجتہاداوررائے وقیاس ہے جونصوص قطعیہ کے مقابلہ میں پیش نہیں ہوسکتا۔

دیگر یہ کہ اس آیت کے ترجمے میں مرزاقادیانی نے علم ومعرفت کی تخصیص کہاں سے نکالی۔ کیونکہ اگرآیت کے ماقبل پرنظرکریں تو ذکر فئے اور غنیمت کا چلاآرہاہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ غنیمت اور فئے میں جو کچھ تم کورسول اللہ ﷺ دیں اسے لے لو۔

اوراگرکلمہ ’’ھا‘‘ کے ابہام اورعموم پرنظرکریں تو ہر معاملہ میں خواہ علم کے متعلق ہو، خواہ عمل کے، خواہ کسی امر کے فیصلے کے ہو۔ اس آیت کا حکم لیا جائے گا۔ پس اس آیت کے رو سے تو عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر ہونا اوراس سے نازل ہونا ثابت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ احادیث میں آپ کے آسمان سے نازل ہونے کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا یہ آیت ہمارے مفید مطلب ہوئی نہ کہ مرزاقادیانی کے۔

سوم یہ کہ ساٹھ ستر سال عمرکی حدیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرنی عجب طرح کی بے استادی ہے۔ کیونکہ اوّل تو حدیث میں صاف کہا گیا ہے کہ بعض کی اس سے زیادہ بھی ہوگی اوراس زیادتی کی انتہائی حدنہیں بتائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمرکواس سے متجاوز سمجھ کر آپ کوفوت شدہ تصور کرلیں اورعمرطبعی کی تردید پیچھے مفصل گزرچکی ہے۔ دیگر یہ کہ امتی کا لفظ صاف بتلارہاہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ سب کچھ اپنی امت کے لوگوں کی بابت فرمارہے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام آپ کی امت کے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مستقبل نبی ہیں اورنزول کے وقت نبی ہی ہوں گے، مطلق خلافت دیگرامر ہے اورامت میں سے ہونا دیگرامرہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا امت میں سے نہ ہونا حدیث مسلم میں بصراحت ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ حق پر رہے گا اوراپنے مخالفوں کے مقابلے میں غالب رہے گا۔ پس عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو جوشخص اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا (یعنی امام مہدی علیہ السلام) وہ کہے گا کہ آیئے حضرت! ہمیں نماز پڑھایئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جماعت کرانے سے انکار کریں گے اورکہیں گے کہ تمہاراامام تم ہی سے ہے۔ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے اسی امت کوبخشی ہے۔ صاف ظاہر کررہاہے کہ آپ اس امت کے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ ورنہ یہ عذرٹھیک نہیں۔ اس

حدیث سے مرزا قادیانی کی مماثلت کا رنگ بھی اڑ گیا۔ کیونکہ مسیح موعود علیہ السلام اس امت کے لوگوں میں سے نہیں اور مرزا قادیانی اس امت کے لوگوں میں سے ہیں۔ پس اس حدیث کے رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کو کم سمجھنا نہایت غلطی ہے۔ دیگر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی آسمانی زندگی زمینی زندگی میں معدود نہیں۔ جیسا کہ ''وکھلا'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس امت میں سے نہ ہونے کے بارے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے۔ مرزا قادیانی بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بات ان کی اپنی عبارت سے ظاہر ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں: ''یہ ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم اس امت کے شمار میں ہی آ گئے ہیں۔''

''شمار میں ہی آ گئے ہیں۔'' پنجابی اردو ہے۔ صحیح اس طرح ہے ''شمار میں آ گئے ہیں۔'' خیر کچھ ہو، شمار ہی میں آ جانا اور فی الحقیقت ہونے میں فرق ظاہر ہے۔ پس ہمارا مطلب ثابت ہے۔ دیگر یہ کہ اگر بالفرض مرزا قادیانی کی اس بارے میں ساری باتیں مان بھی لیں تو بھی مرزا قادیانی کی مراد پوری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس حدیث کے رو سے وفات مسیح علیہ السلام کی بنا مرزا قادیانی کے قیاس ورائے پر ہے اور آپ کے نزول عیسیٰ کی بناء صحیح حدیث کی تصریح سے ہے۔ پس عیسیٰ علیہ السلام اس حدیث کے حکم سے مستثنٰی رہیں گے۔

دوسری حدیث کا جواب: یہ ہے کہ حدیث میں کلمہ ''علی الارض'' شہادت دے رہا ہے کہ یہ حکم ان زندہ چیزوں کے بارے میں ہے۔ جو زمین پر موجود ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہیں۔ اس لئے اس حدیث کے حکم میں نہیں آ سکتے اور مرزا قادیانی کا ''علی الارض'' کے معنی زمینی مخلوق کرنا زبان عربی کے محاورات کے خلاف ہے۔ مرزا قادیانی نے لکھتے وقت صحیح مسلم کی شرح پر تو نظر کر لی ہوتی تا کہ آپ کو ''علی الارض'' کے استعمال کا موقع معلوم ہو جاتا۔ مرزا قادیانی خوب پہچانتے ہیں کہ اس حدیث سے مراد کسی طرح پوری نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ادھر ادھر کھینچ تان کر کے حدیث کے مطلب کو بگاڑنا چاہا ہے۔ مگر اہل علم پر آپ کا یہ دھوکا اور مغالطہ مخفی نہیں رہتا۔

قسم سوم میں سے بیسویں آیت اور مرزا قادیانی کی ترتیب کی رو سے تیسویں اور آخری آیت یہ ہے: ''قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل:۹۳)'' یعنی کفار کہتے ہیں کہ تو آسمان پر چڑھ کر ہمیں دکھلا۔ تب ہم ایمان لائیں

گے۔ ان کو کہہ دے کہ میرا خدا اس سے پاک تر ہے کہ اس دارالابتلا میں کھلے کھلے نشان دکھلا دے اور میں بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوں، مگر ایک آدمی۔

مرزا قادیانی نے اس آیت کے ترجمہ میں اپنی طرف سے زیادتی کی ہے اور قرآن کے الفاظ کی پابندی نہیں کی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: ’’اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کفار نے آنحضرتﷺ سے آسمان پر چڑھنے کا نشان مانگا تھا اور انہیں صاف جواب ملا کہ یہ عادت اللہ نہیں کہ کسی جسم خاکی کو آسمان پر لے جائے۔ اب اگر جسم خاکی کے ساتھ ابن مریم کا آسمان پر جانا صحیح مان لیا جائے تو یہ جواب مذکورہ بالا سخت اعتراض کے لائق ٹھہرے گا اور کلام الٰہی میں تناقض اور اختلاف لازم آئے گا۔ لہٰذا قطعی اور یقینی امر یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بجسدہ العنصری آسمان پر نہیں گئے۔ بلکہ موت کے بعد آسمان پر گئے ہیں۔‘‘

(ازالہ اوہام ص۶۲۵،۶۲۶ خزائن ج۳ ص۴۳۷)

اس کے بعد مرزا قادیانی نے حضرت یحییٰ اور حضرت آدم اور حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہم السلام کا ذکر کر کے کہا ہے کہ: ’’جس طرح معراج کی رات میں رسول اللہﷺ کو یہ نبی ملے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ملے۔ پس جس طرح موت کے بعد یہ سب اٹھائے گئے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی موت کے بعد اٹھائے گئے ہیں۔‘‘

آنحضرتﷺ کے معراج کی رات میں دیگر انبیاء سے ملاقات کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ملاقات کرنے کا بیان بالتفصیل پہلے گزر چکا ہے۔ اب اس آخری آیت زیر بحث کا جواب سنئے کہ مرزا قادیانی نے اس آیت کے ماقبل پر نظر نہیں کی اور نہ اس کی صحیح تفسیر سمجھی ہے۔ صرف اپنی پرانی عادت یعنی خواہش نفسانی سے جس طرح چاہا۔ قرآن شریف کے مطلب کو بگاڑ کر اپنا مطلب پورا کرنا چاہا ہے۔

تفصیل وبیان اس اجمال کی یہ ہے کہ سوالات کفار جن کے جواب میں کلمہ جامعہ ’’هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ تعلیم کیا گیا ہے، یہ ہیں: ’’وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا. اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيْرًا. اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا. اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي

السَّمَاءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۰تا۹۳) ’’کفار کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ تو ہمارے لئے زمین سے چشمے جاری کردے یا تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں یا تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا برسادے۔ جیسا کہ تو کہا کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ضامن لے آئے یا تیرے لئے کوئی گھر سونے کا بنایا ہوا ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کو نہیں مانیں گے۔ جب تک کہ وہاں سے کوئی ایسی کتاب نازل کرے، جسے ہم خود پڑھ لیں۔ اے پیغمبر ﷺ! ان کو ان سوالات کے جواب میں یہی کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے (کہ کوئی اس پر زور و تحکم کرے، میں تو صرف ایک (فرمانبردار) بندہ اور رسول ہوں۔‘‘

ان آیات میں کفار کی ان اقتراحات کا ذکر ہے۔ اوّل آنحضرت ﷺ کا اعجازی قوت سے زمین سے چشمے جاری کرنا۔ دوم آنحضور سرور عالم ﷺ کے لئے خرما و انگور کا باغ موجود ہونا اور اس میں نہروں کا بہتے ہونا۔ سوم آسمان کا ٹکڑا عذاب کے لئے گر پڑنا۔ چہارم اللہ سبحانہ، وتعالیٰ اور ملائکہ کی ضمانت تصدیق یا ان کو سامنے لانا۔ پنجم آن حضرت ﷺ کے لئے سونے کا محل ہونا۔ ششم آنحضرت سیّد الرسل وافضل البشر کا آسمان پر چڑھ جانا اور وہاں سے کتاب کا اتارنا جسے کفار خود پڑھ لیں۔

یہ بالکل بدیہی اور مصرح امر ہے کہ ان سب سوالات کے جوابات میں ایک ہی کلمہ ’’سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ تعلیم کیا گیا ہے۔ اگر یہ جواب امر ششم یعنی آسمان پر چڑھ جانے کے محال ہونے پر دلالت کرتا ہے تو باقی سب امور بھی مستبعد و ناممکن ماننے پڑیں گے۔ کیونکہ جملہ سوالات کا ایک ہی جواب سکھایا گیا ہے۔ پس واضح ہو کہ ان کل امور کا ممکن اور غیر ممتنع ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے اور ایسے خوارق کا ذوات بابرکات انبیاء علیہم السلام سے باذن الٰہی واقع ہونا محل استبعاد نہیں۔ کیونکہ معجزہ یعنی خرق عادت ممکن ہے۔ پہلے ہم ان سب امور کو قرآن کریم سے ممکن ثابت کرتے ہیں اور پھر ’’قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ کی صحیح تفسیر بیان کریں گے اور اس کے بعد یہ ذکر کریں گے کہ باوجود ان امور کے ممکن ہونے کے پھر کفار کی طلب پوری کیوں نہ کی گئی۔

<u>امر اوّل:</u> یعنی پیغمبر برحق کے معجزے سے زمین میں سے چشموں کا پھوٹ پڑنا

آیت:’’فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا (بقرہ:۶۰)‘‘سے ثابت ہے۔یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑنا اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں سے فوّارے جاری ہو پڑنا اور نیز حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کی ضربوں سے آبِ زمزم کا پیدا ہونا امر مطلوب کے ممکن ہونے کی بڑی بھاری دلیل ہے اور ان ہر دو امور کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔

امر دوم اور پنجم: یعنی پیغمبر برحق کے لئے باغات وانہار ومحلّات کے میسّر ہونے کی دلیل بھی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں کفار کے اس سوال کو ذکر کر کے جواب فرمایا ہے:’’تَبَارَکَ الَّذِیْ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِکَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ وَیَجْعَلْ لَّکَ قُصُوْرًا (فرقان:۱۰)‘‘وہ اللہ بہت برکت والا ہے جو اگر چاہے تو تیرے لئے ایک چھوڑ کئی باغات ان باغوں سے بہتر مہیّا کر دے کہ ان کے تلے نہریں بھی چلتی ہوں اور تجھے ایک چھوڑ کئی محل بھی میسر کر دے۔

نیز حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی اور ان کے لئے جڑاؤ شیش محل کا میسر ہونا سورۂ نمل میں مذکور ہے اور اسی طرح شیاطین کا آپ کے لئے مسخر ہونا اور آپ کے لئے سمندروں میں سے بیش بہا موتی نکالنا اور طرح طرح کے مکلّف اسباب خانگی تیار کرنا سورہ انبیاء، سبا اور ص میں مذکور ہے۔

سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام تو بہترین خلائق ہوتے ہیں۔ان کے لئے خزانہ الٰہی میں کس چیز کی کمی ہے۔ یہ فریبندہ اسباب تو دیگر افراد بنی نوع بلکہ کفار کے لئے بھی اس دنیا میں میسر ہوسکتے ہیں۔ بلکہ بعض کو حاصل ہیں۔

چنانچہ سورہ زخرف میں فرمایا:’’وَلَوْلَا اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّکِئُوْنَ وَزُخْرُفًا (زخرف:۳۳تا۳۵)‘‘اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ کفر ہی پر کمر باندھ لیں گے تو ہم منکرین کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیں اور دروازے اور تخت اور تکیہ گاہ سب کچھ چاندی کے کر دیتے اور اسی طرح دیگر اسباب بھی سب کچھ سونے کا عطاء کر دیتے۔

اس آیت میں کفار کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیں اور دروازے اور تخت اور تکیہ

گاہ اور دیگر اسباب طلائی میسر ہو سکنے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ ان اسباب کا حاصل کر لینا (بتوفیقہ تعالیٰ) طاقت بشریہ سے خارج نہیں ہے۔ پس جب عامہ خلائق کے لئے ممکن ہوا تو انبیاء جو خواص دربار ایزدی ہوتے ہیں، ان کے حق میں کس طرح محال ہوگا۔ خواص کا ایسے اسباب فانیہ کو محبوب نہ جاننا امر دیگر ہے اور ان کے حق میں معاذ اللہ! محال ومستبعد ہونا امر دیگر ہے۔

امر سوم: یعنی آسمان سے کوئی ٹکڑا عذاب کے طور نازل ہونا کفار کے مقولہ ''کَمَا زَعَمْتَ '' سے ظاہر ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی ان کو اس عذاب سے ڈرایا تھا۔ جس پر کفار نے مطالبہ کے وقت اس کا حوالہ دیا ہے اور وہ ڈر جوان کو سنایا گیا تھا سورہ سبا میں مذکور ہے: ''اِنْ نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (السبا:۹)'' اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل کر دیں۔

اسی طرح سب آسمانوں اور زمین کا سقوط وزوال ممکن ہونا کئی آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (فاطر:۴۱)'' آسمان اور زمین کو صرف اللہ تعالیٰ ہی نے تھاما ہوا ہے اور اگر وہ نہ تھامے اور وہ گرنے کو ہوں تو پھر ان کو کوئی بھی نہ تھام سکے۔

بلکہ قیامت کو یہ سب آسمان وزمین فنا کر دیئے جائیں گے اور یہ امر قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے۔ چنانچہ تبدیل زمین وآسمان کی نسبت سورۂ ابراہیم کے آخیر میں فرمایا: ''يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراھیم:۴۸)'' جس دن زمین اور آسمان نئے تبدیل کئے جائیں گے۔

پس آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل ہونا بھی ناممکن ومحال نہ ہوا۔

امر چہارم: یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور ملائکہ کو ضامن کر کے صداقت نبوت کو ثابت کرنا اس میں کون سا استبعاد ہے۔ قرآن شریف اس سے بھرپڑا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ''لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (نساء:۱۶۶)'' اللہ تعالیٰ تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس نے اس قرآن شریف کو تجھ پر اپنے علم سے سچ سچ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور شہادت کے لئے تو اللہ ہی کافی ہے۔

اور اگر قبیلاً بمعنی قبلاً سمجھیں تو بھی مستبعد نہیں۔ کیونکہ ’’اتیان باری بِکَیْفِیَةٍ تَلِیْقُ بِشَانِہٖ الْعَظِیْمِ ‘‘ممتنع بالغیر ہے اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اوّل میں ثابت ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ’’هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّاتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ (بقرہ:۲۱۰) ‘‘اور ’’جَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (فجر:۲۲) ‘‘وغیرہما اور احادیث نزول باری سبحانہٗ۔

امر ششم: یعنی آسمان پر بارادہ الٰہیہ چڑھ سکنا عامہ بشر بلکہ کفار کے حق میں بھی ممکن ہے۔

چنانچہ سورہ حجر کے شروع میں فرمایا: ’’وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْا اِنَّمَا سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (حجر:۱۴) ‘‘اور اگر ہم کفار پر آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں دن ہوتے چڑھ بھی جائیں تو پھر ہم بھی کہیں گے کہ ہم کو کسی نے جادو کر دیا ہے۔

پس عباد صالحین وحضرات مرسلین جو بہت اعز واکرم ہیں۔ ان کے لئے کس طرح محال ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کتاب کا لکھی ہوئی صورت میں آسمان سے اتر سکنا سورہ انعام کی آیت سے ثابت ہے۔

جیسا کہ فرمایا: ’’وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ کِتَابًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (انعام:۷) ‘‘اور اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کریں اور یہ کفار اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیں تو بھی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

الغرض یہ سب آیات طیبہ صاف بتلا رہی ہیں کہ امور مسئولہ کفار ممکن وغیر ممتنع ہیں تو پھر آیت: ’’سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ‘‘سے عذر استحالہ کس طرح بجا ہے؟ اس صورت میں تو قرآن حکیم میں تعارض ہوگا۔ ’’وَهٰذَا بَاطِلٌ ‘‘اگر اسی آیت کو بغور دیکھیں تو اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار معترضین کو اس امر کا علم تھا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ معراج جسمانی کے مدعی ہیں ’’اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ‘‘کے بعد ’’وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتَابًا نَقْرَؤُهٗ (اسراء:۹۳) ‘‘اسی لئے کہا کہ آپ پچھلے معراج کا حوالہ نہ دے دیں۔ مزید بریں کفار کا سوال کرنا ہی اس امر پر دال ہے کہ وہ ان امور خارقہ عادات کا ظہور ذوات بابرکات انبیاء علیہم السلام سے ممکن جانتے تھے۔ اسی لئے یہ امور پیش کئے کہ

اگر آپ ان ممکنات کو واقعات کر دکھائیں تو آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کی رسالت کی تصدیق کریں گے۔

پھر اگر یہ سوال ہو کہ اگر سب امور مقترحہ ممکنات میں سے ہیں تو ’’سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ کی صحیح تفسیر جس سے یہ جواب ہر امر کے ساتھ منطبق ہو جائے کس طرح ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی صحیح تفسیر جس کی دوسری آیات مؤید ومصدّق ہیں۔ یہ ہے جو تفسیر ابن کثیر وسراج منیر سے نقل کی جاتی ہے: ’’وقوله تعالیٰ. سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ای سبحانه وتعالیٰ وتقدس ان یتقدم احد بین یدیه فی امر من امور سلطانه وملکوته بل هو الفعال لما یشاء ان شاء اجابکم الیٰ ما سألتم وان شاء لم یجبکم وما ان الّا رسول الیکم ابلغّکم رسالات ربّی وانصح لکم وقد فعلت ذلک وامرکم فیما سألتم الی اللّٰه عزوجل (ابن کثیر)‘‘ اس آیت: ’’سُبْحَانَ رَبِّیْ‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس کی بادشاہی میں پیش دستی یا اس کے سامنے بڑھ کر بات کر سکے بلکہ جس امر کو چاہتا ہے، خود کرتا ہے۔ پس اگر وہ چاہے گا تو تمہارا سوال قبول کرے گا ورنہ نہیں اور میں تو صرف اس کے حکم کا مطیع اور اس کا رسول ہوں۔ میرا کام صرف تبلیغ رسالت ہے جو میں کر چکا ہوں اور جو کچھ تم نے سوال کئے ہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

اسی طرح تفسیر سراج منیر میں بھی بوضاحت اس امر کو محقق کیا ہے: ’’ولمّا تم تعنّتهم وکان لسان الحال طالباً من اللّٰه تعالیٰ الجواب عنه امر اللّٰه تعالیٰ بجوابهم بقوله قل ای لهٰؤلاء البعداء الاشقیاء سبحان ربی ای تعجباً من اقتراحاتهم وتنزیها للّٰه من ان یاتی احد یتحکم علیه او یشارکه احد فی القدرة وقرأ ابن کثیر وابن عام بصیغة الماضی والباقون قل بصیغة الامر وهل کنت الا بشراً رسولاً کما کان من قبلی من الرسل وکانوا لا یأتون قومهم الا بما یظهره اللّٰه علی ایدیهم بما یلائم حال قومهم ولم یکن امر الآیٰت الیهم الا لهم ان یتحکموا علی اللّٰه حتی یتخیروها هذا هو الجواب المجمل وما التفصیل فقد ذکر فی اٰیات اخر کقوله تعالیٰ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِأَيْدِيْهِمْ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ونحو ذلک‘‘

اور جس وقت کفار کی سرکشی اور کج بحثی حد کو پہنچ گئی تو آپ ﷺ کی زبان حال اللہ تعالیٰ سے اس بات کا جواب طلب کررہی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے جواب سکھایا کہ ان بدبختوں سے کہو کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس پر حکم وزور کر سکے یا قدرت میں اس کا شریک ہو سکے۔ میں اپنے اختیار سے یہ امر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں تو ایک رسول ہوں اور مجھ سے پہلے جتنے رسول ہوئے تھے۔ اپنے اختیار سے کوئی بھی معجزہ نہ دکھاتا تھا بلکہ صرف وہی جو اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر ظاہر کرے اور ان کی قوم کے حال کے موافق ہوں اور معجزات کا دکھانا رسولوں کے اختیار میں نہیں ہوتا تھا اور نہ ان کو یہ قدرت ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ پر حکم اور زور کر کے اپنی مرضی سے معجزے طلب کریں۔ اس آیت میں یہ جواب مجمل دیا گیا ہے اور تفصیل کے ساتھ دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً آسمان سے کتاب اتارنے کا جواب سورہ انعام میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کرتے اور یہ منکر لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیتے تو بھی یہ منکر اس کو جادو کہہ کر انکار کر دیتے اور آسمان پر چڑھنے کا جواب سورہ حجر میں فرمایا کہ اگر ہم ان کفار کے لئے آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور یہ لوگ اس پر چڑھ بھی جائیں، تب بھی یہ منکر کہیں گے کہ ہم کو کسی نے جادو کر دیا ہے اور اسی طرح اور سوالات کے تفصیلی جواب دیگر آیات میں دیئے ہیں۔

تفسیر سراج منیر نے تو بے شک ظلمات و وساوس وشبہات کو دور کر دیا اور قلب مومن کو منور کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یہ امر ممتنعات میں سے نہیں۔ بلکہ اعراض صرف ان کے تعنّت کی وجہ سے ہے اور نیز یہ کہ یہ جواب مجمل سب امور مسئولہ عنہا کا جواب ہے اور ہر امر کا بالتفصیل جواب دیگر آیات میں مذکور ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر دو امر صعود الی السماء اور تنزیل کتاب کے امکان میں وہی آیتیں ذکر کیں۔ جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور باقی امور کے جواب کی تفصیل کی طرف و نحو ذٰلک سے اشارہ کر دیا کہ طالب تفصیل خود قرآن شریف میں تدبر و تفحص کر کے ڈھونڈ لے۔ **فالحمد علی نعمائه الشاملة والآئه الکاملة!**

تفسیر کبیر میں بھی اس جواب کی اسی طرح تقریر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”تقریر الجواب: ان یقال امّا ان یکون مرادکم من هذا الاقتراح انکر طلبتم الاتیان من عند نفسی بهذ الاشیاء او طلبتم من ان اطلب من الله تعالٰی اظهارها علی یدی لتدل علٰی کونی رسولاً حقاً من عندالله والاوّل

باطل لا نی بشر والبشر لا قدرة له علٰی هذه الاشیاء والثانی ایضاً باطل لانی قداتیتکم بمعجزة واحدة وهی القرآن والدلالة علٰی کونها معجزة فطلب هذه المعجزات طلب لما لا حاجة الیه ولا ضرورة فکان مجری التعنت والتحکم وانا عبد مامور لیس لی ان اتحکم علی اللّٰه فسقط هذه السوال فثبت ان قوله قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا جواب کاف فی هذا الباب (تفسیر کبیر)''

اس جواب کی تقریر اس طرح ہے کہ کفار کے سوال کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ امور کو اپنے اختیار کر دکھاؤں۔ دوم یہ کہ ان امور کو اپنے اختیار سے کر دکھاؤں۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ سے طلب کروں کہ وہ میری صداقت کے لئے ان امور کو ظاہر کرے۔ پس یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلے تو اس لئے کہ میں بشر ہوں اور اپنے اختیار سے ان اشیاء پر قادر نہیں ہوں اور دوسری اس وجہ سے کہ معجزہ تو میں تمہارے پاس لا چکا ہوں۔ کیونکہ یہ قرآن شریف میری نبوت کی تصدیق کے لئے کافی معجزہ ہے۔ پس تمہارے معجزہ کی طلب محض تعنّت اور تحکم ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ کا مطیع بندہ ہوں۔ میں اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ تحکم اور زور سے کوئی امر اس سے طلب کروں۔ پس یہ سوال کفار مردود ہے اور ثابت ہوگیا کہ: ''**قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا**'' اس بارے میں کافی جواب ہے۔

جو تقریر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم سے اس جواب کے بارے میں نقل کی گئی ہے۔ وہ بالکل حق اور مراد الٰہی کے عین مطابق ہے اور دیگر آیات اس کی تائید وتصدیق کرتی ہیں۔ پس یہ تفسیر، تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔ اصل اس سارے مضمون کا آیت سورۂ مومن ''**وَمَا کَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّأْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** (مومن:۷۸)'' یعنی کوئی رسول بغیر اذن الٰہی کوئی نشان ومعجزہ نہیں دکھا سکتا۔ کیونکہ معجزہ مقدور بشر سے خارج شئے کا نام ہے اور رسول بھی بوجہ بشر ہونے کے بذات خود بالاستقلال خرق عادت پر قادر نہیں ہوتے۔ **الّا باذن اللّٰه!**

ایسے امور جن سے دیگر عاجز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول برحق کے دست مبارک پر ظاہر کرتا ہے اور وہ اس کی صداقت کے دلائل ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت روح اللہ علیہ السلام اپنی رسالت کی صداقت کے بارے میں ''**اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ** (آل عمران:۴۹)'' اور موسیٰ علیہ السلام اپنی رسالت کی تصدیق میں فرعون کے سامنے ''**اَوَلَوْ جِئْتُکَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ**

(الشعراء:۳۰) ’’فرماتے ہیں اور فرعون اس پر طلب کرتا ہے اور کہتا ہے: ’’فَأْتِ بِهَا اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰادِقِیْنَ (الاعراف:۱۰۶)‘‘ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے وسیلے کچھ عجائب جو مقدور بشر سے خارج ہوں، ظاہر کیا کرتا ہے۔ یہ ان کے صدق پر دلیل ہوا کرتے ہیں اور ایسے عجائب کوئی رسول بغیر اذن الٰہی کے دکھا نہیں سکتا۔

اب قرآن شریف کے چند مقامات ذکر کئے جاتے ہیں۔ جن میں اسی طرح کفار نے اقتراحی آیات کا مطالبہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہی جواب تعلیم کیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میرا کام اتباع وحی اور تبلیغ رسالت ہے۔ معجزات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ چاہے تو دکھائے ورنہ نہ دکھائے۔ اس میں اس پر میرا کوئی تحکم وتغلب تو نہیں کہ بزور معجزہ طلب کروں۔

چنانچہ فرمایا: ’’وَاِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (اعراف:۲۰۲تا۲۰۴)‘‘ اور اے پیغمبر ﷺ جس وقت تم ان کو ان کی طلب کے موافق کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں از خود بنا لیتا۔ ان کو جواب دو کہ میں تو صرف وحی الٰہی کا تابع ہوں۔ یہ قرآن شریف تمہارے رب کی طرف سے کافی معجزہ ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سبب ہے اور جب میں اس کو پڑھا کروں تو تم اس کو چپ چاپ غور سے سنا کرو کہ تم بھی مؤمن ہوکر رحمت میں داخل ہو جاؤ۔

دیکھو اس آیت میں کیسے صاف طور پر فرمادیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں امر الٰہی کے تابع ہوں۔ اپنی حول وقت سے کچھ نہیں دکھا سکتا اور منصب تبلیغ رسالت سے ہرگز سرمو تجاوز نہیں کرسکتا اور اگر تمہاری غرض طلب آیات سے طلب حق ہے اور ہدایت حاصل کرنا ہے تو تصدیق رسالت کے لئے قرآن شریف کافی دلیل ہے اسے غور سے چپ چاپ سنتے رہو۔ امید ہے کہ تم کو ہدایت نصیب ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ’’وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اَوَ لَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَةً وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (عنکبوت:۵۰،۵۱)‘‘ اور یہ کفار کہتے ہیں کہ اس پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا۔ اے

پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ معجزات تو اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں ہیں۔ میں تو ایک ڈرسنانے والا ہوں۔ اے پیغمبر ﷺ کیا ہم نے ان پر ایسی کتاب نازل نہیں کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے اور ان کو تصدیق رسالت کے لئے اعجازی رہبری کرتی ہے۔ پس وہ رسالت کا کافی ثبوت ہے اور مومنین کے لئے موجب رحمت اور نصیحت ہے۔

ناظرین! غور کریں کہ سورۂ اعراف کی آیات اور یہ آیات کیسے بالاتفاق ایک ہی مضمون کو ادا کرتی ہیں اور یہ جواب کچھ ہمارے رسول ﷺ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ انبیاء سابقین سے بھی یہی منقول ہے اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم اپنی مرضی سے بغیر اذن الٰہی نشان نہیں دکھا سکتے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم علیہ السلام میں فرمایا: ''وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (ابراھیم: ۱۱)''یعنی ہم بغیر اذن الٰہی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔

ان آیات سے صاف معلوم ہو گیا کہ کفار کے اقتراح آیات کے جواب میں ''قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسراء: ۹۳)'' کی تعلیم کرنا اس وجہ سے نہ تھا کہ یہ امور ناممکن تھے۔ بلکہ یہ تعلیم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ اپنی سلطنت میں کسی کی مرضی پر انتظام کرے یا کوئی شخص اس پر تحکم کرے اور حسب اقتراح اس سے آیات طلب کرے۔ اگر غرض ان کفار کی طلب حق ہے تو تصدیق رسالت کے لئے کافی دلائل ظاہر ہو چکے ہیں اور دلیل کافی پر زیادتی طلب کرنا تعنّت وتحکم ہوتا ہے۔ پس اس سے اعراض کرنا چاہئے اور منصب رسالت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مطلب اس آیت کا یہ تھا جو بیان کیا گیا۔ خوش فہم لوگوں نے اور کا اور سمجھ لیا اور کہاں کی کہاں بے تکی ہانک دی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ امور ممکن تھے اور نبی برحق کے معجزہ سے بعید نہ تھے تو پھر کیوں ان کو پورا نہ کر دکھایا تو اس کا جواب وہ ہے جو اجمالاً اوپر گزر چکا ہے اور وہ خود قرآن شریف نے تعلیم کیا ہے کہ قرآن شریف تصدیق رسالت کے لئے کافی ثبوت ہے۔ اس پر غور کرو تو تمہارا مطلب ومقصود پورا ہو جائے گا۔ یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ تم کہتے جاؤ اور احتمالات بعیدہ سے ردّ کرتے جاؤ۔ میں ہر روز اسے پورا کرنے کے لئے تیار رہوں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ رسول مدعی رسالت کو کچھ پیش کرتا ہے اسے دعویٰ رسالت سے مناسبت وتعلق ہے یا نہیں اور وہ اثبات نبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو پھر اس پر زیادتی کی طلب کیوں کی جاتی ہے۔ معجزے سے غرض تو یہ ہے کہ تصدیق رسالت کی طرف ہدایت کر سکے۔ پس

قرآن شریف اپنے اعجاز سے تم کو ساکت وملزم کر رہا ہے اور تصدیق رسالت کے لئے بصدائے بلند پکار رہا ہے ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (فتح:۲۹)‘‘

آیات مذکورہ سے ناظرین کے خاطر نشین ہوگیا ہوگا کہ کفار مکہ کے متعنتانہ سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے رسالت محمدی کے لئے قرآن شریف کو پیش کیا ہے۔ آپ کے مزید اطمینان کے لئے اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ سورہ بنی اسرائیل میں جن سوالات کے جواب میں ’’سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ تعلیم کیا گیا ہے۔ ان آیتوں کے پہلے بھی قرآن مجید کے معجز اور بے مثل ہونے کو بڑے ہی پرزور دعویٰ اور تحدی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ’’قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا. وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا. وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ (الی) قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل:۸۸تا۹۳)‘‘ اے پیغمبر! ان کو سنا دو کہ اگر تمام انسان اور جن مجتمع ہوکر اور ایک دوسرے کی امداد پر کمر باندھ کر کوشش کریں کہ اس قرآن عظیم کی نظیر بھی لاسکیں تو ہرگز نہیں لا سکیں گے۔ بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کا بیان نصیحت واضح طور پر پھیر پھیر کر بیان کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ انکار ہی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اے پیغمبر ان کو کہہ دو کہ میرا رب اس بات سے پاک ہے کہ کوئی اس پر تحکم کر سکے میں تو صرف ایک بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

آیت ماقبل کو ساتھ ملانے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ سورہ بنی اسرائیل میں بھی سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت کی طرح طلب معجزات کے جواب میں قرآن شریف ہی پر کفایت کی گئی ہے۔ پس اس جواب ’’سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا‘‘ کہ جن معنوں میں مرزا قادیانی نے لیا تھا وہ ہرگز صحیح نہیں۔ اس جواب کا صحیح مطلب وہی ہے جو تفسیر کبیر وغیرہ سے پیشتر گزر چکا ہے۔ تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ!

۱۶؍جون ۱۹۵۸ء

تصحیح کردہ: عبدالقیوم میر

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

سُلَّمُ الوُصُولِ

اِلٰی

اِسْرَاءِ الرَّسُولِ ﷺ

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لآ الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

’’الحمدللہ الاوّل الاحد الواحد الملک العدل الصمد الحکم الواسع الودود المصور السلام العلام المحمود. مکسور الدھور مصلح الامور ومصور الصور ھو اللہ لااله الا ھوولا مالک ولا مولٰی للماسور سواہ. محآء للمعآرّ والاٰصار. وعلام الاسرار ومسھل الااوطار وممطر الامطار مصحح الدآء وارحم الرحمآء سامع العود والھود والدعآء وسامح المکارم والاٰلآء لہ لحول والعلآء ولہ الطول والعطآء اعلٰی سمک السمآء وسطح المھاد واسرالمآء رکد المھاد وطودّ الاطواد. علم دم الاسماء کلھا. وحمل اولادہ سھلاً ومآء احمدہٗ حمداً لاحد ولا امدلہ وامدحۂ مدحا لا عدلہ ولا کد معہ بامدہ کل ماسور وسائلہ کل عاسور. والسلام اکمل الاعم علی رسولہ الاکرم ومرسلہ المکرم مودود کل صالح ومحسود کل طالح ارسلہ اللہ العلام مسدد العمائد الاسلام وممھد المسالک صوالح الاحکام ومحددا لحدود الحلال والحرام ومھدداً لاعداء الاسلام. اعطاہ صروع الاٰلآء واصعدہ مصاعد السمآء حصل لہ المرام وکمل علاہ الاکرام وعدہ اللہ الودود المورد الاطھر والمحل المحمود ولوآء الحمد والعطآء الموعود المعھود وعلٰی اعراسہ امام اھل الاسلام واٰلہ الاطھار الکرام ورھطہ الاحرار اولی الاحلام وسائر رسلہ واملاکہ اولی العلاء والاکرام‘‘

امابعد! پس واضح ہوکہ رسالہ ’’شہادت القرآن‘‘ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بجسدہٖ العنصری آسمان پر اٹھایا جانا بغایت تحقیق ونہایت تدقیق معقولاً ومنقولاً ثابت کردیا گیا ہے اور لفظ توفی کی نسبت بڑی عجیب ودلچسپ بحث سے بحوالہ کتب لغت ومحاورات عرب وتفاسیر معتبرہ محقق کردیا گیا ہے کہ اس لفظ کے معنی ’’بحسب الوضع اخذ الشئی وافیاً‘‘ یعنی کسی چیز کو پورا پورا پکڑ لینا اور براہین قویہ قاہرہ سے ’’رفع الی السمآء‘‘ کو معقولی طور پر ممکن الوقوع ثابت کر دکھایا ہے اور حضرت روح اللہ علیہ السلام کے رفع آسمانی اور نزول عیسیٰ کی

حکمت لطیف طور پر قرآن شریف سے بیان کی گئی ہے۔ جس کے بعد سلیم الفطرت انصاف پسند محقق شخص کو کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا اور مخالف کے پاس اس کے نقض وتردید میں بجز انواع حیل کاسدہ واوہام فاسدہ کے اور کچھ نہیں۔

چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی رسول اللہ ﷺ کے معراج جسمانی کا انکار حضرت روح اللہ علیہ السلام کے انکار رفع الی السماء کے ضمن میں کیا ہے اور ان کے انکار کی بھاری وجہ بھی یہی ہے کہ تا معراج جسمانی کے اقرار سے رفع عیسوی کا بھی اقرار لازم نہ آوے۔ ورنہ ان کا معراج جسمانی کا انکار کسی دلیل نقلی یا عقلی پر مبنی نہیں ہے اور نیز مرزا قادیانی کے بعض مرید عوام الناس کو اس مغالطہ میں ڈالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے رفع الی السماء سے جناب رسول اللہ سید الثقلین ﷺ کی کسر شان لازم آتی ہے۔ اس لئے رسالہ ''شہادت القرآن'' مثبتہ حیات ورفع عیسوی کے لکھنے کے ایاّم میں عزم مصمم کرلیا کہ اس کتاب کے ختم ہونے پر ایک رسالہ مثبتہ معراج جسمانی بھی جلدی تیار کیا جاوے۔ تاکہ آنحضرت ﷺ کا معراج جسمانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع یعنی معراج کی نظیر بھی ثابت ہو جائے اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ حضرت خاتم النّبیین ﷺ کو معراج عیسوی سے بڑھ کر اعلیٰ وارفع معراج ہوا تھا۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء میں آپ ﷺ کی کوئی منقصت نہیں۔ مگر چونکہ رسالہ شہادت القرآن کے ایام طبع ہی میں اس عاجز کو سفر حج کا اتفاق پڑا جو اللہ تعالیٰ کے بہت بھاری احسانات میں سے ہے اور اس میں قریباً چھ ماہ لگے۔ اس لئے اتنی مدت تک اس رسالہ معراج کی بابت اہتمام نہ ہوسکا۔ اب باسلامت واپس آنے پر سب سے پہلا کام اسی رسالہ معراج کا لکھنا مناسب سمجھا۔ لیکن بہ سبب چند عوائق وموانع کے اہتمام طبع نہ ہوسکا۔

''والالتماس من کرام الناس ان یعفوا الزلل ویسدوا الخلل لان جهد المقل مشکور وباذل الوسع معذور وانا العبد الحقیر الراجی رحمة ربه الکریم الکبیر العاجز محمد ابراهیم میر السیالکوتی. اللهم تقبل منی کما تقبلت من خلیلک الحنیف الاواه الحلیم انک انت السمیع العلیم واغفرلی خطیئتی یوم الدین وارحم من احسن الی من المسلمین ولا تخزنا یوم یبعثون یوم لا ینفع مال ولا بنون الّا من اتی الله بقلب سلیم واجعل لی لسان صدق فی الاخرین واجعل اعمالی کلها صالحة خالصة

لوجھک الکریم. اللھم انت عضدی ونصیری بک احول وبک اصول فکن لی جاراً من شر من عادانی من المعاندین واحفظنی من فتنة الشیطان وحزبه کما تحفظ عبادک الصٰلحین‘‘

اس کتاب میں ایک مقدمہ اور ایک وصل اور دو فصلیں ہیں۔

مقدمہ میں اس امر کا بیان ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اکابر اولیائے کرام قویٰ جسمانیہ وروحانیہ میں خلقۃً واستعداداً دیگر افراد بنی آدم سے ممتاز ہوتے ہیں۔ وصل میں آیت ’’ولن تجد لسنتنا تحویلاً (فاطر:۴۳)‘‘ وغیرہا کی صحیح تفسیر ذکر کی گئی ہے۔ فصل اوّل میں معراج جسمانی کو آیات کتاب اللہ وحدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت کیا گیا ہے اور اس کے بعد علمائے امت اسلام واخلاف کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ دوسری فصل میں منکرین معراج کے شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔

مقدمہ

اللہ تعالیٰ منعم حقیقی وجواد مطلق نے انسان کو قوی روحانیہ وجسمانیہ ہر دو قسم عنایت فرمائے ہیں تاکہ بوقت حاجت انہیں رفیق راہ بنائے اور بتوفیق ایزدی اپنے مطلب ومقصود کو پائے۔ اگرچہ یہ سب اسباب ہم جنسوں میں ایک ہی باغ کے خوشبال پودے ہیں۔ مگر حدیقہ پیرائے قدرت ہر ایک کی تربیت مناسب اسباب اور مناسب مقدار سے کرتا ہے اور اس کی حکمت بالغہ اسی امر کی مقتضی ہے۔ تفاوت طبائع کا مسئلہ حکمائے سلف وخلف میں بالاتفاق مسلم ہے۔ ان ہم جنسوں میں بعض افراد ایسے بھی معلوم ومشاہد ہیں جو کسی نہ کسی خصوصیت میں دیگر بنی نوع سے ممتاز ومتمیز ہیں اور یہ امر تفاوت وتفصیل صرف روحانی قوت اور ادراک میں ہی نہیں۔ بلکہ قویٰ محرکہ میں اس سے بھی زیادہ واضح وظاہر ہے اور ایسا عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ اسی طرح ہر انسان کی شکل وصورت، قد وقامت، قوت وطاقت، شجاعت وہمت، ادراک وتمیز اور اخلاق وعادات میں فرق بیّن ہے اور ان امور مذکورہ میں بعض کا بعض سے افضل واعلیٰ ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

یہ تفاوت وتفصیل صرف نوع انسانی ہی میں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس کارخانہ قدرت میں جس طرف نظر اٹھاؤ۔ اس حکیم کی صنعت عجیبہ وحکمت غریبہ نادر طور پر تمہارے علم کو محدود اور تمہاری عقل کو حیران کرتی جائے گی۔ چنانچہ سورۂ ملک میں فرمایا: ’’ثم ارجع البصر کرتین

ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر (ملک:۴) ’’یعنی ہماری قدرت میں بار بار نظر کر تو تیری نظر کھسیانی ہوکر تیری طرف لوٹ آئے گی اور کوئی نقص نظر نہ آئے گا۔

شاہ پر خیال (بلند پرواز) سے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر پرواز کر کے اس کی قدرت کے کرشموں کا مشاہدہ کرلو کہ بعض پہاڑ اپنی بلندی کے اعتبار سے اور بعض قیمتی اشیاء کی کانوں کی وجہ سے دیگر ہم جنسوں پر کس طرح فوقیت رکھتے ہیں۔ غواص توجہ کو سمندر کی تہہ میں غوطہ دو اور اپنی آنکھوں دیکھ لو کہ بعض سمندر دوسروں پر قیمتی موتیوں کے مخزن ہونے کا کیسا فخر رکھتے ہیں۔ سمند رفکر کو روئے زمین کے وسیع میدانوں میں جولان دو اور معائنہ کرلو کہ بعض ریگستان ہیں۔ بعض چٹیل میدان، بعض سنسان جنگل ہیں اور بعض میں انواع واقسام کے طیور وبہائم جو صبح وشام اس سبوّح قدوس کی تسبیح گا کر جنگل میں منگل منا رہے ہیں۔ اسی طرح اجرام فلکیہ کی طرف نظر اٹھاؤ تو اس میں بھی آفتاب وماہتاب ایسے نظر آئیں گے۔ جن کے سامنے دیگر سب ستارے بے حقیقت ہوکر مات پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسانی میں اس خالق حکیم نے بہت سے ایسے افراد پیدا کئے ہیں۔ جن کے نفوس طیبہ ان قیمتی موتیوں اور ان کے صدور صافیہ ان لعل خیز معدنوں اور ان کے قلوب نورانیہ کے فیض اس عالمتاب نیرّ اعظم اور ان کی برکات اس رونق بخش بادلوں سے بدرجہا افضل واعلیٰ ہیں۔ بلکہ ان اشیاء کی ان کی برکات وفیوض کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں۔ کیونکہ ان اشیاء کا مفید ہونا بغیر اختیار وارادہ کے ہے اور خود یہ محض بے جان ہیں۔ یہ افراد صلوات اللہ علیہم وسلامہ حسب استعداد فیوض رحمانیہ سے مستفیض ہوتے ہیں اور اپنی فطرت کے مطابق انعامات جزیلہ ومواہب جلیلہ کے موارد بنتے ہیں۔ ان افراد سے میری مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین میں سے اکابر اولیائے عظام ہیں کہ مخلوق الٰہی میں ان کے میزان پر اور کوئی نہیں تل سکتا۔ انبیاء علیہم السلام کا قویٰ روحانیہ ومدرکہ میں ایسا ممتاز ہونا کہ دیگر افراد بنی آدم کیا، اکابرین صدیقین اور کیا اور سب کے سب ان کی تربیت کے محتاج ہوں۔ ہر مقرّ نبوت کے نزدیک مسلم ہے۔ لہٰذا اس امر کو اس کتاب میں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن، متبع سنت مقتفی آثار سلف کے لئے تفاسیر وکتب حدیث میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کا نماز میں صحابہ کی صفوں کو بحالت امامت اپنے پیچھے سے دیکھ سکنا (صحیح بخاری) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا چیونٹی کی آواز کو سن اور سمجھ لینا اور ان کے اکابر متبعین میں سے ایک کا بلقیس شہزادی کے تخت کو آنکھ

جھپکنے میں ان کے سامنے لا حاضر کرنا۔ (سورہ نمل) اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو کا بہت بعید فاصلہ سے پہنچ جانا اور ان کا باوجود مدت مدید کی مفارقت کے اسے پہچان لینا وغیرہ اور ان کے دیگر کمالات اعجازی طور پر دوسروں سے بدرجہا قوی اتریں گے۔ گو ان کے جسم اور اعضاء بالکل دوسروں کی مانند نظر آتے ہیں۔

وصل

بعض لوگ آیت:''ولن تجد لسنة الله تحویلا (فاطر:۴۳)'' کو معجزہ اور کرامت کے انکار کا بہانہ بتاتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اس قول وخیال میں سخت غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اس آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ سارے قرآن شریف میں جہاں کہیں سنت اللہ پر عدم تبدیل کا حکم لگایا گیا ہے۔ ان سب مقامات میں سنت اللہ سے مراد عذاب الٰہی ہے اور قرآن شریف میں اس امر کا ایسا التزام کیا گیا ہے کہ سارے قرآن شریف میں ایک مقام بھی اس سے خالی نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ اس عذاب مہلک کی نسبت فرماتا ہے کہ میرے بھیجے ہوئے عذاب کو نہ تو کوئی بدل سکتا ہے اور نہ کوئی ٹال سکتا ہے۔ اس امر کے سمجھنے کا آسان طریق یہ ہے کہ انصاف پسند طالب وہ سب مقامات جہاں یہ الفاظ یا ان کے ہم معنی الفاظ وارد ہوئے ہیں، نکال کر ماقبل ومابعد پر بغور نظر کرے تو بفضلہ تعالیٰ ان الفاظ کے ساتھ ہی عذاب الٰہی کا ذکر بالتصریح موجود ہوگا۔ پس قاعدہ نظم وارتباط قرآن کریم اس کو اس امر کی تسلیم پر مجبور کردے گا کہ ان سب آیات میں سنت اللہ سے مراد عذاب الٰہی ہے۔ چنانچہ وہ سب مواضع ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ناظرین بنظر انصاف ملاحظہ فرمائیں اور حق کی داد دیں۔

موضع اوّل

''وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منها واذا لا یلبثون خلفک الا قلیلا سنة من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا (بنی اسرائیل:۷۶،۷۷)'' اے پیغمبر! کفار مکہ تو تم کو سرزمین مکہ سے اکھیڑ ہی چلے تھے کہ تم کو اس سے باہر نکال دیں اور ایسا ہوتا تو تمہارے گئے پیچھے یہ لوگ بھی چند روز سے زیادہ نہ رہنے پاتے۔ تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے، ان سب کے متعلق ہماری یہی سنت رہی ہے اور تم ہماری سنت کو کبھی بھی ٹلتے ہوئے نہ پاؤ گے۔

اس مقام پر صاف مذکور ہے کہ کفار مکہ پیغمبر ﷺ کو مکہ شریف سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی کہ اگر آپ کو یہاں سے نکال دیں گے تو آپ کے پیچھے یہ لوگ خود بھی تھوڑا ہی بسیں گے۔ کیونکہ دشمنان انبیاء سے ان کا انتقام لینا ہماری قدیمی سنت ہے اور یہ کبھی بھی محول نہ ہوگی۔ اس سورت کے اخیر رکوع میں فرعون کی نسبت فرمایا: ''فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جمیعاً وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنو الارض (اسراء:۱۰۳،۱۰۴)'' فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو ملک میں سے اکھیڑ کر باہر کرے اور ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ کے تھے، سب کو غرق کر دیا۔

گویا پہلے دشمنان انبیاء میں سے ایک دشمن فرعون کا ذکر کر کے سنۃ جاریہ کی ایک نظیر و مثال بھی ذکر فرمادی۔

موضع ثانی

''لئن لم ینتہ المنٰفقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الا قلیلا. ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتّلوا تقتیلاً. سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (احزاب:۶۰،۶۱)''

منافق اور وہ لوگ جن کی نیتیں بد ہیں اور جو لوگ مدینہ میں جھوٹی افواہیں اڑایا کرتے ہیں۔ اگر اپنی حرکات سے باز نہ آئیں گے تو اے پیغمبر ہم تم ہی کو (ایک نہ ایک دن) ان پر مسلط کر دیں گے۔ پھر یہ لوگ مدینہ میں تمہارے پاس رہنے نہیں پائیں گے۔ مگر چند روز (عارضی طور پر) پھر ان کا یہ حال ہوگا کہ ہر طرف سے پھٹکارے ہوئے جہاں ملے پکڑا اور مار کر ٹکڑے اڑا دیئے۔ جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور اے پیغمبر تم خدا کے دستور میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے۔

اس میں بھی عذاب الٰہی کا ایسا صریح ذکر ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

موضع سوم

''ولا یحیق المکر السیئی الا باھلہ فھل ینظرون الا سنۃ الاوّلین

فلن تجد لسنة اللّٰہ تبدیلا ولن تجد لسنة اللّٰہ تحویلا. اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلھم (فاطر:۴۳،۴۴)‘‘اور بری تدبیر (الٹی) بری تدبیر کرنے والے پر ہی پڑتی ہے تو کیا یہ لوگ اسی سنت کے منتظر ہیں جو اگلے لوگوں کے ساتھ برتی گئی تو پھر اے پیغمبر تم خدا کی اس سنت کو ہرگز بدلتی اور ٹلتی نہ پاؤ گے۔ کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں، کہ جو لوگ ان سے پہلے ہوگزرے ہیں۔ ان کا کیسا خراب انجام ہوا۔

اس مقام پر بھی عذاب صاف طور پر مذکور ہے۔ لہٰذا تفصیل کی ضرورت نہیں۔

موضع چہارم

’’ولو قاتلکم الذین کفروا لولّوا الادبار ثم لا یجدون ولیا ولا نصیرا. سنة اللّٰہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة اللّٰہ تبدیلاً (فتح:۲۲،۲۳)‘‘اور اگر کافر اس وقت تم مسلمانوں سے لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے۔ پھر ان کو نہ کوئی حامی ہی ملتا اور نہ مددگار۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو پہلے سے ہوتی چلی آئی ہے اور اے پیغمبر! تم اللہ کی سنت کو تبدیل ہوتے نہ پاؤ گے۔

اس آیت میں بھی کفار کی سخت پستی اور کسمپرس حالت اور ہلاکت کا ذکر ہے۔ پس سنت اللہ پر عدم تبدیل کا حکم جن مواضع میں لگایا گیا ہے۔ وہ بھی چار آئتیں ہیں جو اوپر ذکر ہوئیں۔ علاوہ اس کے اس مضمون عدم تبدیل عذاب الٰہی کو مواضع کثیرہ میں بالفاظ دیگر بیان کیا ہے۔ گویا وہ آیات تفسیر ہیں، سنت اللہ کی۔

چنانچہ سورۂ مومن کے اخیر میں فرمایا:’’فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا باسنا سنة اللّٰہ التی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکفرون (مومن:۸۵)‘‘جب انہوں نے ہمارے عذاب کو آتے دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان لانا کچھ بھی مفید نہ ہوا۔ یہ سنۃ اللہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری ہے اور نزول عذاب کے وقت کافر ہی خسارے میں رہے۔

اسی طرح سورہ انعام اور سورہ یوسف میں فرمایا:’’ولا یرد باسہ عن القوم المجرمین (انعام:۱۴۷) ولا یرد بأسنا عن القوم المجرمین (یوسف:۱۱۰)‘‘ کہ مجرم لوگوں کے سر پر سے ہمارا عذاب کسی صورت سے نہیں ٹل سکتا۔

اس بیان وتفصیل سے ناظرین انصاف گزیں پر روشن ہوگیا کہ متعلقین کا انکار معجزہ وکرامت کے لئے آیت:''ولن تجد لسنة اللّٰه تحویلا''وغیرہ سے تمسک کرنا بغایت ضعیف ونہایت سخیف ہے۔قوانین الٰہیہ کا کوئی شخص احاطہ نہیں کرسکتا۔اس نے ہر امر کے لئے قانون اور وقت مقرر کئے ہیں۔جن کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ ان کی حقیقت وکیفیت کو پہنچ سکتے ہیں۔معجزہ اور کرامت بھی ایک قانون ہے جو وہ اپنی قدرت کاملہ کے ظاہر کرنے اور منکرین پر اپنی حجت بالغہ کو پورا کرنے کے لئے وقت مقرر پر ظاہر کرتا ہے۔پس معجزہ وکرامت کو داخل وموافق قانون قدرت سمجھنا چاہئے نہ کہ خلاف وخارج۔ہاں خلاف عادت ضرور ہوتے ہیں اور اسی بات سے اس کی بالا دست قدرت انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔جس سے وہ غیر لوگوں اور جھوٹے مدعیان نبوت سے متمیز ہوجاتے ہیں۔اس مضمون کو ہم نے رسالہ''شہادت القرآن''میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔طالب تفصیل اس کا مطالعہ کرے۔

فصل اوّل

(دربیان اثبات معراج جسمانی از قرآن وحدیث)

''سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِهِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهُ لِنُرِیَهُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (اسراء:۱)''وہ (خدا عجز ودرماندگی کے عیب سے) پاک ہے جو اپنے بندے (محمد) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں دے رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کے چند نمونے دکھائیں۔وہ خدا سب کی باتیں سننے اور سب کو دیکھنے والا ہے۔

سبحان الذی: اللہ تعالیٰ علیم حکیم نے قرآن شریف کی سورتوں کو مختلف مناسب مناسب عنوانوں سے شروع کیا ہے اور یہ انواع افتتاح تعداد میں دس ہیں۔اوّل ان میں سے حمد وثنائے الٰہی ہے اور ثناء دوقسم پر ہے۔تحمید اور تسبیح۔تحمید تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صفات جلال ونعوت کمال کے ساتھ موصوف جانا جائے اور تسبیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صفات نقص سے منزہ ومبرّا مانا جائے۔سو پانچ سورتیں فاتحہ، انعام، کہف، سبا اور فاطر۔کلمہ الحمدللہ سے اور بنی اسرائیل، حدید، حشر، صف، جمعہ، تغابن اور اعلیٰ کے ابتدا میں عنوان تسبیح ہے۔پس ہر دو تحمید اور تسبیح سات سات سورتوں کے شروع میں وارد ہوئیں۔تسبیح ایک ایسا کلمہ ہے جسے ذات

باری نے صرف اپنی ذات کے لئے خاص کیا ہے اور غیر پر اس کا اطلاق جائز نہیں اور چونکہ قصہ معراج میں اللہ سبحانہ، کے کسی مکان میں متحیز ہونے کا وہم ہوسکتا تھا۔ جو شان الٰہی کے شایان نہیں۔ اس لئے اس سورت اسراء کو لفظ سبحان سے شروع کر کے وہم تحیز وتمکن کو دور کردیا۔ دیگر یہ کہ معجزہ ایک ایسا عظیم امر ہے کہ بوجہ خلاف وخارق عادت ہونے کے بہت سے کوتاہ نظر متعلقین کے لئے موجب حیرانی و باعث سرگردانی ہوتا ہے اور سیر معراج رسول اللہ ﷺ کا اعجازی کمال ہے اور اس میں جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانا ان کے نزدیک مستبعد، اس لئے بھی اللہ تعالیٰ حکیم علیم نے اس سورۂ اسراء کو عنوان سبحان سے بیان فرمایا اور ہر دو وہم دور کردیئے۔ یہ دونوں وجہیں جو مذکور ہوئیں، معراج جسمانی کی بڑی بھاری تائیدیں ہیں۔ کیونکہ تسبیح کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے۔ جب کوئی امر عظیم خارق عادت مذکور ہو۔ ورنہ امر موافق عادت مستمرہ کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا ہی تفسیر ابن کثیر میں بھی ہے۔ چنانچہ عن قریب ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

اسریٰ: فعل اسراء متعلق جوارح کے ہے، نہ ارواح کے۔ چنانچہ علامہ فیومی مصباح میں فرماتے ہیں: ''**سریت اللیل وسریت به سریا والاسم السرایة اذا قطعته بالسیر**'' اور لسان العرب میں اسی آیت ''**سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ**'' کے معنی سیّر عبدہ نقل کئے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اسراء نبوی ﷺ جسمانی تھا نہ کشفی ومنامی۔ قرآن شریف میں دیگر مقامات میں یہ لفظ انتقال مکانی ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء:۵۲ میں فرمایا: ''**و اوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی**'' یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ میرے بندوں یعنی بنی اسرائیل کو راتوں رات لے چل اور اسی طرح سورہ حجر:۶۵ میں فرمایا: ''**فاسر باھلک بقطع من اللیل**'' یعنی اے لوط! اپنے اہل وعیال کو کچھ رات رہے اس بستی سے لے نکل۔ ناظرین پر واضح ہوگیا کہ ان آیتوں میں اسراء کے معنی اپنے بدن کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے ہیں۔ **وھذا ھو المراد!**

دیگر یہ کہ ذات باری سبحانہ، نے فعل اسراء کی اسناد اپنی طرف کی نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ کیونکہ یہ سیر معراج جسمانی اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی قدرت سے مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظر بر قدرت باری سبحانہ، اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ اسی طرح حضرت روح اللہ علیہ السلام کے رفع سماوی کے بارے میں رفع کی نسبت اپنی طرف کی نہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف۔ کیونکہ

آسمانوں پر زندہ چڑھ جانا اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوت سے بعید ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ عزیز حکیم کی قدرت کے آگے کچھ چیز نہیں۔'' افاد ذلک الامام الرازی تحت قوله تعالیٰ بل رفعه الله اليه كما نقلنا ذلک فی رسالتنا شهادت القرآن فلينظر ثمه''

بعبدہ فرمایا:'' بروح عبده '' نہیں کہا۔ کیونکہ عبد سے مراد روح مع جسم ہوا کرتا ہے، نہ مجرد روح۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے:'' فان العبد عبارة عن مجموع الروح والجسد وقد قال اسریٰ بعبده '' اور امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس امر کو بہ بسط محقق کیا ہے۔

قرآن شریف میں رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کے لئے دیگر مواضع میں بھی لفظ عبد اور عبداللہ وارد ہوئے ہیں اور ان مواضع میں مراد جسم مع روح ہے۔ جیسے سورۂ علق:۹،۱۰ میں فرمایا:'' ارأیت الذی ینهی عبداً اذا صلّی '' یعنی اے پیغمبر ﷺ کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر کی ہے جو ہمارے ایک بندے کو جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو منع کرتا ہے۔ نماز وغیرہ اعمال وافعال کے متعلق جسم ہوتے ہیں نہ متعلق روح۔ دوسری آیت سورہ جن:۱۹ میں فرمایا:'' وانه لما قام عبدالله کادوا یکونون علیه لبداً '' یعنی جب بندہ خدا (محمد) عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اس کے گرداگرد ہوکر چمٹ جانے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں بھی ذات بابرکات آنحضرت ﷺ کو عبداللہ کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قیام بالدعا وغیرہ جسم کا کام ہے نہ مجرد روح کا اور لوگوں کا اجتماع جسم کے گرد ہوتا ہے نہ روح کے۔ پس جب معراج کی بابت بھی بعبدہٖ کہا تو ثابت ہوا کہ جسمانی تھا۔

لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی: جملہ کتب نحو میں یہ امر مصرح ہے کہ من ابتداء کے لئے آتا ہے اور الیٰ انتہاء غایت کے لئے۔ پس جب اس سیر کی ابتداء اور انتہاء ذکر کی تو قول بالکشف باطل ہوا اور صاف ظاہر ہوگیا کہ یہ سیر بصورت '' انتقال من مکان الی مکان آخر '' تھا۔ کیونکہ حالت کشفیہ کے ذکر میں ابتداء اور انتہاء سے بحث نہیں کی جاتی۔ بلکہ صرف شئی مکشوف کا ذکر ضروری ہوتا ہے اور بس۔ جیسا کہ اسی معراج کے بعد سوال کفار کے وقت بیت المقدس کو مرفوع کر کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا اور اس ذکر میں ابتداء اور انتہاء کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اسی طرح حضرت فاروق

اعظم ؓ کا حالت خطبہ میں ساریہ بن زنیم کو ندا کرنا بھی کشفی حالت ہے اور اس میں ابتداء وانتہاء کا ہرگز ذکر نہیں۔ کیونکہ کشف کی حقیقت یہ ہے کہ درمیانی حجاب جو شئی مکشوف کے دیکھنے سے مانع ہوتے ہیں۔ مرفوع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ بینائی میں ایسی قوت بخش دے کہ شئی مکشوف کا ادراک حسب ارادہ الٰہیہ اچھی طرح سے ہو سکے۔ پس جب اس قصہ اسراء میں اس سیر کی ابتداء اور انتہاء ذکر کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ انتقال مکانی بالجسد تھا نہ کسی اور طرح سے۔ فافہم وتدبر اور باوجود اسریٰ میں معنی رات کے موجود ہونے کے پھر لیلاً کی تصریح اس لئے کی کہ تاکہ معلوم ہو جاوے کہ اس سیر کی ابتداء وانتہاء اور ذہاب وایاب ہر دو رات کے کچھ حصہ میں ہوئے۔ کیونکہ اگر لیلاً کی تصریح نہ کی جاتی تو یہ وہم باقی رہتا کہ بے شک اسراء کی ابتداء تو رات کو ہوئی۔ مگر اس کی انتہاء حسب عادت مستمرہ ہوئی۔ پس اسراء معجزہ ثابت نہ ہوتا۔ **فسبحان الله ما افصح کتابه!**

اس تفصیل وبیان سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ قرآن شریف سے یہی ثابت ہے کہ اسراء نبوی ﷺ آپ کو جسمانی کرایا گیا تھا اور نبی ﷺ نے اسی امر کا کفار کے سامنے اظہار کیا۔ چنانچہ حدیث صحیح مسلم اس امر کی بالتوضیح مظہر ہے کہ جب کفار مکہ نے معراج کے بارے میں آپ کی تکذیب کی اور انہوں نے معاذ اللہ! آپ کے دعویٰ معراج جسمانی کو باطل کرنے کے لئے آپ سے بعض علامات بیت المقدس کی نسبت سوال کئے تو اس وقت کی بابت آنحضور ﷺ فرماتے ہیں: ’’**فکربت کربة ما کربت مثله قط**‘‘ یعنی مجھے ایسا کرب واضطراب اور غم ہوا کہ اس سے پیشتر کبھی ایسا شدید غم اور قلق نہ ہوا تھا۔ پس اگر آپ کا دعویٰ سیر کشفی یا روحانی ومنامی کا تھا تو اس گھبراہٹ اور غم کی کیا وجہ تھی۔ آپ ﷺ نہایت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ میرا دعویٰ سیر جسمانی کا تو نہیں کہ علامات کا بتانا ضروری ہو۔ دیکھتے نہیں آج کل کے متعقل لوگ مخالفین کے سامنے یہی عذر کر کے مخلصی چاہتے ہیں تو کیا رسول اللہ ﷺ صاحب حال کو ایسا نہ سوجھا؟ **فتدبر!**

اس جگہ ایک اور نکتہ قابل ذکر ہے کہ کفار کے ان سوالات معروضہ کے جواب کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو مرفوع کیا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ اسے دیکھ دیکھ کر علامات بتانے لگے۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف میں اس کے آگے یوں فرماتے ہیں ’’**فرفعه الله لی انظر الیه ما یسئلونی عن شئ الا انباتهم به**‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ نے میرے لئے بیت المقدس کو

میرے سامنے اونچا کر دیا کہ میں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر جو سوال وہ کرتے تھے، اس کا جواب دیتا تھا۔ بیت المقدس کا آپ کے سامنے مرفوع کر دینا بھی کوئی امر مستبعد نہیں۔ کیونکہ اس کی نظیر رفع تخت بلقیس ملکہ سبا قرآن شریف میں موجود ہے اور اسے اہل اصطلاح اعدام اور ایجاد کہتے ہیں۔ اس سیر کے سواری براق جو صحیح بخاری سے ثابت ہے۔ نیز اس امر کی مؤید قوی ہے کہ یہ سیر آپ کو جسم مبارک کے ساتھ کرایا گیا تھا۔ کیونکہ سواری کی حاجت جسم کو ہوتی ہے، نہ کہ روح کو۔ کیونکہ روح ایک ایسی لطیف شئی ہے کہ اپنی حرکت کے لئے کسی سواری وغیرہ کی محتاج نہیں ہوتی۔

اثبات معراج آسمانی: اس بیان وتفصیل کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرے کہ سورہ بنی اسرائیل میں صرف مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سیر کا ذکر ہے اور آسمان کا ذکر نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف میں کسی جگہ ایجاز واختصار ہوتا ہے اور کسی جگہ اطناب واسہاب۔ کہیں کوئی امر مذکور ہوتا ہے اور کہیں محذوف۔ اس کے نظائر قصص انبیاء میں خصوصاً قصص حضرت کلیم اللہ وخلیل اللہ ویوسف علیہم السلام میں بکثرت ہیں۔ دیگر یہ کہ نزد بعض محدثین اسراء سے مراد مسجد اقصیٰ تک کا سیر ہے۔ جو اس سورت میں مذکور ہے اور معراج سے مراد سیر آسمانی ہے جو سورہ نجم میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام المحدثین امام بخاری علیہ سحائب رحمۃ الباری نے اپنی صحیح میں ہر ایک کے لئے علیحدہ باب باندھا ہے۔ پس ہر دو سیر یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور مسجد اقصیٰ سے آسمان سے اوپر تک مثبت بالقرآن ہوئے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم:۱۳تا۱۸ میں فرمایا: ''ولقد راٰہ نزلۃ اخری عند سدرۃ المنتہیٰ عندھا جنۃ الماوی اذ یغشی السدرۃ ما یغشیٰ ما زاغ البصر وما طغیٰ لقد رایٰ من اٰیات ربہ الکبری'' بے شک اس پیغمبر نے جبرئیل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں جنۃ الماویٰ ہے ایک اور دفعہ بھی ان کی اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے۔ جب اس سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ یعنی انوار تجلیات الٰہیہ اس وقت بھی پیغمبر کی نظر نہ کسی طرف کو بہکی اور نہ مقصود سے اچٹی۔ کچھ شک نہیں کہ پیغمبر نے اس موقع پر اپنے رب کی قدرت کے بڑے عجائبات دیکھے۔

مفسرین رحمۃ اللہ علیہم اس امر پر متفق ہیں کہ یہ آیتیں سیر معراج آسمانی کا قصہ ہیں اور یہ آیات معراج کے جسمانی اور آسمانی ہونے پر صاف شہادت دے رہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ

نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اپنی ملکی صورت میں دو دفعہ دیکھا ہے۔ ایک بار تو اوائل وحی میں جیسا کہ اس سورت کے شروع میں فرمایا ''**فاستویٰ وھو بالافق الاعلیٰ**'' یعنی جس وقت وہ فرشتہ (آسمان کی طرف) اچھی اونچی جگہ میں تھا تو اپنی اصلی صورت میں سارے کا سارا پیغمبر ﷺ کے سامنے آ کھڑا ہوا اور نیز سورہ تکویر میں اس امر کو ذکر کیا۔ ''**ولقد راٰہ بالافق المبین**'' یعنی بے شک ہمارے پیغمبر نے جبرئیل فرشتہ کو آسمان کے مطلع صاف میں دیکھا ہے۔ دوسری دفعہ آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کا ذکر ان آیات میں ہے۔ ''**ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ عند سدرۃ المنتھیٰ**'' اور سدرۃ المنتہیٰ کا ساتویں آسمان پر ہونا صحیح بخاری کی حدیث معراج میں مذکور ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ ساتویں آسمان پر پہنچنے کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: ''**ثم انطلق بی حتی انتھیٰ بی الی السدرۃ المنتھیٰ وغشیھا الوان لا ادری ما ھی (بخاری)**'' پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے تو اس جگہ میں نے اس سدرہ کو ایسے انوار و تجلیات ڈھانکتے دیکھے۔ جن کی ماہیت کو میں پا نہیں سکتا۔

بلکہ انہیں آیات معراج سے ثابت ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ آسمان پر ہے۔ چنانچہ اس کے آگے فرمایا: ''**عندھا جنۃ الماویٰ**'' یعنی اس سدرہ کے پاس جنۃ الماویٰ ہے اور چونکہ جنت بھی آسمان پر ثابت ہوئی اور اس کو المنتہیٰ سے اس لئے موسوم کیا کہ: ''**الیہ ینتھی علم الخلائق**'' یعنی ملائکہ وغیرہ مخلوق کا علم وہاں تک ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کے آگے کی بابت کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نسبت یہاں پہنچنے کی بابت فرماتے ہیں: ''**انتھیٰ بی الی السدرۃ المنتھیٰ**'' یعنی حضرت جبرئیل بھی یہیں تک ساتھ رہے اور اس سے آگے ان کو بھی رسائی نہ ہوئی۔ انہی معنوں کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں ظاہر کیا ہے:

شبے برنشست ازفلک برگزشت ۔۔۔ بتمکین وجاہ از ملک درگزشت
چناں گرم در تیہ قربت براند ۔۔۔ کہ در سدرہ جبرئیل زد باز ماند
بدوگفت سالا بیت الحرام ۔۔۔ کہ اے حامل وحی بر تر خرام
چو در دوستی مخلصم یافتی ۔۔۔ عنانم زصحبت چرا تافتی
بگفتا فراتر مجالم نماند ۔۔۔ ربماندم کہ نیر رے بالم نماند
اگر یک سر موئے بر تر پرم ۔۔۔ فروغ تجلی بسوزد پرم

پس جب رسول اللہ ﷺ حضرت جبرئیل کے ساتھ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان کے اوپر ہے تو رسول اللہ ﷺ کے معراج آسمانی وجسمانی میں کیا شک باقی رہا۔ ’’**فما ذا بعد الحق الا الضلال**‘‘

مضمون ماسبق کو امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تبیان فی اقسام القرآن میں انہی آیات کے ذیل میں فرماتے ہیں: ’’**ثم اخبر سبحانه عن رویته لجبرئیل مرة اخری عند سدرة المنتهیٰ فالمرة الاولیٰ کانت دون السمآء بالافق الاعلیٰ والثانیة کانت فوق السمآء عند سدرة المنتهیٰ** (تبیان فی اقسام القرآن) ‘‘ کہ اس کے بعد اللہ سبحانہ نے رسول اللہ ﷺ کے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ایک اور مرتبہ دیکھنے کا ذکر کیا۔ یعنی سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ پس پہلی دفعہ تو آسمان کے نیچے افق پر دیکھا اور دوسری بار آسمان کے اوپر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔

دیگر یہ کہ آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے اوپر رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں جو کچھ عجائبات دیکھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کیفیت یوں فرماتا ہے: ’’**اذ یغشی السدرة ما یغشیٰ ما زاغ البصر وما طغیٰ لقد رأی من اٰیات ربه الکبریٰ** (النجم:۱۶تا۱۸) ‘‘ جب اس سدرہ پر چھا رہا تھا۔ جو چھا رہا تھا یعنی انوار وتجلیات الٰہیہ تو پیغمبر کی نظر اس وقت بھی نہ کسی طرف کو بہکی اور نہ مقصود سے اچٹی۔ بے شک پیغمبر ﷺ نے اس موقع پر اپنے رب کی قدرت کے بڑے عجائبات دیکھے۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان انوار وتجلیات کی عظمت کو ما یغشیٰ سے ایسے لطیف طور پر سمجھایا کہ سننے والے کے دل میں اس کی عظمت وشان خوب بیٹھ جائے اور نیز: ’’**ما زاغ البصر وما طغیٰ** ‘‘ میں رسول اللہ ﷺ کے کمال اور نہایت قوت وحوصلہ کا بیان فرمایا کہ عجائبات قدرت کے دیکھنے اور انوار وتجلیات الٰہیہ کے مشاہدہ سے اتنی حیرت میں بھی نہ پڑے کہ آپ کی چشم مبارک نہ تو کسی طرف کو بہکی اور نہ مقصود سے اچٹی۔ بلکہ اسی طرف لگی رہی جس طرف مالک الملک ذوالجلال والاکرام نے لگانی چاہی اور ان سب عجائبات قدرت اور انوار وتجلیات الٰہیہ کو بڑے ادب وحوصلہ سے مشاہدہ کیا اور چونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لفظ البصر فرمایا ہے یعنی آنکھ اور معلوم ہے کہ بصر آلات ذات وجسم میں سے ہے جس طرح دیگر اعضاء بدن ہیں نہ کہ آلات روح میں سے۔ اس لئے قرآن شریف سے یہی ثابت ہوا کہ معراج آسمانی آپ ﷺ کو جسم مبارک کے ساتھ کرایا گیا تھا۔

مضمون ماسبق کو امام حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تبیان فی اقسام القرآن میں یوں فرماتے ہیں: ''ما زاغ البصر وما طغی قال ابن عباس رضی اللہ عنہ ما زاغ البصر یمیناً وشمالا فنفی عن نبیه ما یعرض للرای الذی لا ادب له بین یدی الملوک من التفاته یمیناً وشمالاً ومجاوزة البصر لما بین یدیه واخبر عنه بکمال الادب فی ذلک المقام وفی تلک الحضرة اذ لم هلتفت جانبا ولم یمد بصره الی ما اری من الأیٰت وما هناک من العجائب بل قام مقام العبد الذی اوجب ادبه اطرافه واقباله علی ما اری دون التفاته الیٰ غیره ودون تطلعه الی مالم یره مع ما فی ذٰلک من اثبات الجاش وسکون القلب وطمانینة وهذا غایة الکمال وزیغ البصر'' کہ حبر امت افقہ الناس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ''ما زاغ البصر وما طغیٰ'' کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی نظر (ان انوار وتجلیات وعجائبات قدرت) سے بالکل ادھر ادھر نہ ہوئی اور جس طرف دیکھنے کا حکم ہوا اسی طرف لگی رہی۔ پھر امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ سب مفسرین اسی بات کے قائل ہیں۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی بہت تعریف کی ہے۔ کیونکہ جو شخص شاہانہ مجالس کے آداب نہیں جانتا وہ ادھر ادھر بھی دیکھا کرتا ہے اور اس کی نظر مقصود پر نہیں ٹھہرتی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی اس امر سے تنزیہہ کر دی تو اس میں آپ کی دربار ایزدی احکم الحاکمین میں کمال ادب کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ آپ بادشاہ حقیقی کے درگاہ میں آیات وعجائبات قدرت دیکھ کر اور حیرت میں آکر ادھر ادھر دیکھنے نہیں لگ پڑے تھے۔ بلکہ ایک نہایت فرمانبردار غلام کی طرح اپنے تن من سے اپنے مالک کے دربار میں کمال ادب اور اطمینان اور حوصلہ سے کھڑے رہے اور مطلقاً کسی اور طرف التفات بھی نہ کی۔

اس کے بعد امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورت نجم کے متعلق ایسے عجیب وباریک نکات ذکر کئے ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کی کمال درجہ کی مدح وتعریف ثابت ہوتی ہے اور میرے جیسے عاشق قرآن اور مذاق قرآنی کی لٹک والے مومن عش عش کر اٹھتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ''فنزّہ عن رسوله فی هذاالسورة علمه عن الضلال وقصده ونیته عن الغیّ ونطقه عن الهویٰ وفواده عن تکذیب بصره وبصره عن الزیغ والطغیان (تبیان)'' پس اللہ تعالیٰ نے اس سورہ نجم میں اپنے رسول ﷺ کے علم کو ضلالت

سے اور آپ کے قصد اور نیت کو غوایت سے اور آپ کے کلام کو خواہش نفسانی سے اور آپ کے دل کو آنکھ کے جھٹلانے سے یعنی جو کچھ دیکھا۔ دل سے سچ جانا اور آپ کی آنکھ کو بھٹکنے اور مقصود سے اچٹ جانے سے پاک بیان کیا۔

ناظرین! ایک طرف قرآن شریف میں سے سورۂ نجم نکال کر سامنے رکھیں اور دوسری طرف امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر کو پیش نظر کر کے بغور ملاحظہ فرماویں تو اگر قرآن شریف کی فصاحت اور خوبی بیان اور رسول اللہ ﷺ کی جلالت قدر اور عظمت شان کے گرویدہ ہو کر اس امام ہمام کی قرآن دانی پر فریفتہ نہ ہوں تو کہئے ہاہ! افسوس ان خفاغیش بے بصیرت پر جن کی آنکھیں اس آفتاب علم وہدایت کے سامنے نہیں کھلتیں انہی کے مناسب حال شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھا کہا ہے:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمہ آفتاب راچہ گناہ

اس سورۂ نجم میں رسول اللہ ﷺ کے ان سب کمالات وانعامات کے ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قصۂ معراج کو اس آیت پر ختم کیا ہے: ’’لقد رای من ایٰت ربه الکبریٰ‘‘ یعنی بے شک ہمارے پیغمبر ﷺ نے اپنے رب کے بڑے بڑے عجائبات قدرت مشاہدہ کئے اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اس قصہ کو ان لفظوں پر ختم کیا ہے: ’’لنریه من ایاتنا‘‘ یعنی ہم نے اپنے بندے محمد کو یہ سیر اس لئے کرایا کہ تا کہ اس کو اپنی عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرائیں۔

سبحان اللہ! کیسے عجیب طور پر دونوں سورتوں میں اس قصہ معراج جسمانی کو ایک ہی امر پر ختم کیا ہے اور ظاہر کر دیا کہ ان دونوں سورتوں میں ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے۔ پس بیت اللہ شریف سے بیت المقدس تک کا ذکر سورہ اسراء میں ہے اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک کا بیان سورہ نجم میں ہے۔

’’فلما تجلی ربه للجبل جلعه دکاً وخر موسیٰ صعقاً فلما افاق قال سبحانک تبت الیک وانا اوّل المؤمنین (اعراف:۱۴۳)‘‘ اس جگہ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا کہ جس وقت ان کا پروردگار اس پہاڑ پر جلوہ فرما ہوا تو اس کو چکنا چور کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے۔ پھر ہوش میں آئے تو عرض کی کہ اے پروردگار تیری ذات پاک ہے میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں فرمایا ’’ما زاغ البصر وما طغٰی لقد راٰی من اٰیٰت ربہ الکبریٰ (النجم:۱۷،۱۸)‘‘ کہ انوار وتجلیات الٰہیہ کو دیکھ کر نہ تو آپ کی نظر کسی طرف کو بہکی اور نہ مقصود سے اچٹی۔ پس اس میں رسول اللہ ﷺ کے ادب درگاہ الٰہی اور قوت تحمل تجلیات الٰہیہ کا کامل ثبوت ہے۔ اللھم صل علٰی محمد وعلٰی اٰلہ وبارک وسلم!

ائمہ مفسرین ومحدثین کی محققانہ عبارتیں

جمہور سلف وخلف اہل سنت اسی معراج جسمانی ہی کے قائل ہیں اور مصنّفین اسلام کیا متقدمین اور کیا متاخرین سب کے سب بالاتفاق اسی معراج جسمانی ہی کو ثابت کرتے چلے آئے ہیں اور اہل سنت کی کوئی معتبر کتاب ایسی نہیں جس میں معراج کشفی یا روحانی یا منامی کو صحیح وثابت قرار دیا ہو۔ بلکہ منکرین معراج کو کافر اور ضال اور مبتدع لکھتے ہیں۔

چنانچہ تفسیر فتح البیان میں ہے: ’’والذی دلت علیہ الاحادیث الکثیرۃ ھو ما ذھب الیہ معظم اسلف والخلف من الاسرآء بجسدہ وروحہ یقظۃ الی بیت المقدس ثم الی السمٰوٰت ولا حاجۃ الی التاویل وصرف ھذا النظم القرآنی وما بماثلہ من الفاظ الاحادیث الی ما یخالف الحقیقۃ ولا مقتضی لذلک الا مجرد الا استبعاد وتحکیم محض العقول القاصرۃ عن فھم ما ھو معلوم من انہ لا یستحیل علیہ سبحانہ شئ ولو کان ذلک مجرد رویا کما یقولہ من زعم ان الاسرآء کان بالروح فقط وان رؤیا الانبیآء حتی لم یقع التکذیب من الکفرۃ للنبی ﷺ عند اخبار لھم بذلک حتی ارتد من ارتد ممن لم یشرح بالایمان صدراً فان الانسان قد یریٰ فی نومہ ما ھومستبعد بل ھو محال ولا ینکر ذلک احد واما التمسک لمن قال بان ھذا الاسرآء انما کان بالروح علی سبیل الرؤیا بقولہ وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس فعلی تسلیم ان المراد بھذہ الرؤیا ھو ھذا الاسرآء فالتصریح الواقع ھنا بقولہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً والتصریح فی الاحادیث الصحیحۃ الکثیرۃ بانہ اسری بہ لا یقصر عن الاستدلال علی تاویل ھذہ الرؤیا الواقعہ فی الأیۃ لرویۃ العین فانہ قد

یقال لرؤیة العین رؤیا وکیف یصح حمل ھذا الاسرآء علی الرویا مع تصریح الاحادیث الصحیحه بان النبی ﷺ رکب البراق وکیف یصح وصف الروح بالرکوب وھکذا کیف یصح حمل الاسرآء علی الرؤیا مع تصریحه ﷺ بانه کان عند ان اسری به بین النائم والیقظان فالاولٰی ما ذھب الیه الجمھور اذ لا فضیلة للحالم ولا مزیة للنائم (فتح البیان)''

جمہور علمائے سلف وخلف کا بھی یہی مذہب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سیر معراج عالم بیداری میں جسم اور روح دونوں کے ساتھ مکہ شریف سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے آسمانوں تک کرایا گیا اور بہت سی احادیث صحیحہ اسی پر دلالت کرتی ہیں اور نظم قرآنی اور الفاظ احادیث کو خلاف حقیقت تاویل کرنے کی کوئی حاجت نہیں اور تاویل صرف استبعاد اور عقل قاصر الفہم کو حاکم بنالینے کا نتیجہ ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے نزدیک کوئی شئی محال نہیں ہے اور اگر یہ سیر معراج صرف ایک خواب ہی ہوتا تو کفار مکہ جب نبی ﷺ نے ان کو اس امر کی خبر دی۔ آپ کی اس بارے میں تکذیب نہ کرتے حتیٰ کہ کئی ضعیف الایمان مرتد ہوگئے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات انسان خواب میں ایسے امور دیکھتا ہے جو دوراز قیاس بلکہ محال ہوتے ہیں۔ مگر کوئی بھی اس کی تکذیب نہیں کرتا اور آیت:''وما جعلنا الرؤیا'' سے تمسک کر کے سیر معراج کو عالم خواب میں روحانی طور پر کہنے کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض تسلیم کر بھی لیویں کہ یہ آیت اسی قصہ معراج کی حکایت ہے تو بھی''سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلاً'' کی تصریح اور اسی طرح احادیث صحیحہ کا بیان اس لفظ رؤیا کو رویت چشم کے معانی میں معین کر دے گا۔ کیونکہ رؤیا رویت چشم کے معنوں میں بھی آیا ہے اور جب احادیث صحیحہ اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ نبی ﷺ براق پر سوار ہوئے اور سوار ہونا روح کے اوصاف میں سے نہیں ہے۔ بلکہ جسم کے خواص میں سے ہے تو پھر کس طرح سے اس سیر معراج کو عالم خواب کا ایک قصہ بتاسکتے ہیں اور علاوہ بریں خود رسول اللہ ﷺ بالصراحة فرماتے ہیں کہ میں ابھی سویا نہیں تھا۔ کیونکہ خواب دیکھنے والے اور سوتے میں سیر کرنے والے کی کوئی فضیلت نہیں۔

اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں ہے:''فالاکثرون من العلماء علی انه اسری ببدنه وروحه یقظة لامناما ولا ینکر ان یکون رسول اللّٰہ ﷺ رأی قبل ذلک مناما وراه بعده یقظة لانه کان علیہ السلام لا یری رؤیا الاجآء ت مثل فلق

الصبح والدليل على هذه قوله تعالٰى سبحان الذى اسرىٰ بعبده ليلاً من المسجد الحرام الى المسجد الاقصٰى الذى باركنا حوله فالتسبيح انما يكون عند الامور العظام فلو كان مناما لم يكن فيه كبير شئ ولم يكن مستعظما ولمابادرت كفار قريش الى تكذيبه ولما ارتدت جماعت ممن قد اسلم وايضاً فان العبد عبارة عن مجموع الروح والجسد وقال اسرى بعبده وقد قال تعالٰى وما جعلنا الرؤياالتى ارينٰك الا فتنة للناس قال ابن عباس هى رؤيا عين اريها رسول اللهﷺ روه البخارى. وقال ما زاغ البصر وما طغٰى والبصر من الأيات الذات لا الروح وايضاًفانه حمل على البراق وهو دابة بيضآء براقة لها لمعان وانما يكون هذا للبدن لا للروح لانها لا تحتاج فى حركتها الى مركب تركب عليه (ابن كثير) ’’اکثر علماء اس بات پر ہیں کہ سیر معراج آپﷺ کو عالم بیداری میں کرایا گیا تھا نہ کہ خواب میں اور اگر پہلے کبھی بطور خواب دیکھا ہو اور اب پھر بیداری میں اس کے مطابق سیر کیا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ کیونکہ آنحضرت جو خواب دیکھتے تھے وہ عین بعین صبح صادق کی طرح ظاہری واقعہ بھی ہو جاتا تھا اور اس معراج جسمانی کی دلیل یہ قول الٰہی ہے: ’’سبحان الذى اسرىٰ بعبده ‘‘یعنی پاک ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے محمدﷺ کو سیر کرایا۔ کیونکہ تسبیح کی ضرورت کسی امر عظیم خارق عادت کے ذکر میں ہوا کرتی ہے اور اگر یہ واقعہ ایک خواب ہی ہوتا تو کچھ بڑی بات نہ تھی۔ پس تسبیح کی بھی کچھ ضرورت نہ رہتی اور نیز یہ کہ کفار قریش دربارہ معراج آپ کے جھٹلانے میں جلدی نہ کرتے اور نیز یہ کہ بعض ضعیف الایمان لوگ مرتد نہ ہوجاتے اور نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعبدہ فرمایا اور بروح عبدہ نہ کہا۔ کیونکہ عبد روح مع جسم کو کہتے ہیں اور یہ جو فرمایا: ’’وما جعلنا الرؤيا التى ‘‘تو اس رویاء سے مراد آنکھ کا دیکھنا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم میں فرمایا: ’’ما زاغ البصر وما طغى ‘‘اور معلوم ہے کہ آنکھ آلات جسم میں سے ہے نہ کہ روح میں سے اور نیز یہ کہ آپﷺ براق پر سوار کئے گئے اور براق سفید چمکتا ہوا ایک جانور ہے اور ظاہر ہے کہ سواری بدن کے اوصاف میں سے ہے اور روح اپنی حرکت میں سواری کی محتاج نہیں ہوتی۔

نیز تفسیر ابن کثیر میں صحابہؓ میں سے ان اصحاب کے اسمائے گرامی درج فرمائے

ہیں۔ جنہوں نے حدیث معراج کو روایت کیا اور جو اس معراج جسمانی سے انکار و اعراض کرے، اسے زندیق وملحد لکھا ہے...... چنانچہ فرمایا:’’وقد تواترت الروایات فی حدیث الاسرآء عن عمر بن خطاب وعلی وابن مسعود وابی ذر ومالک ابن صعصعة وابی هریرة وابی سعید وابن عباس وشداد بن اوس وابی ابن کعب وعبدالرحمن بن قرظ وابی حبة وابی لیلیٰ الانصاریین وعبدالله بن عمرو وجابر وحذیفة وبریدة وام هانی وعائشة واسمآء ابنتی ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہم منهم من ساقه بطوله ومنهم من اختصره علی ما وقع فی المسانید وان لم تکن روایة بعضهم علی شرط الصحة فحدیث الاسراء اجمع علیه المسلمون واعرض عنه الزنادقة والملحدون یریدون لیطفؤا نور الله بافواههم. الایة‘‘ معراج کی حدیث مندرجہ ذیل صحابہ رضی اللہ عنہم سے بالتواتر روایت کی گئی ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، ابوذر، مالک بن صعصہ، ابوہریرہ، ابوسعید، ابن عباس، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبدالرحمٰن بن قرظ، ابوحبۃ اور ابولیلیٰ انصاری، عبداللہ بن عمرو، جابر بن عبداللہ، حذیفہ، بریدہ، ام ہانی، حضرت عائشہ اور حضرت اسمآء رضی اللہ عنہم۔ بعضوں نے پوری روایت کی ہے اور بعض نے مختصر۔ اگرچہ بعض کی سند میں مقال ہے۔ مگر معراج کی حدیث پر کل مسلمانان اہل سنت کا اجماع ہے اور زندیق اور ملحدین اس سے منہ موڑتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنی پھونکوں سے بجھادیں۔ مگر اللہ اپنے نور کو ضرور پورا کرے گا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:’’والحق الذی علیه اکثر الناس ومعظم السلف وعامة المتاخرین من الفقهآء والمحدثین والمتکلمین انه اسری بجسده صلی اللہ علیہ وسلم والآثار تدل علیه لمن طالعها وبحث عنها ولا یعدل عن ظاهرها الا بدلیل ولا استحالة فی حملها علیه فیحتاج الی تاویل (ج ۱ ص ۹۱)‘‘ حق یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہی کرایا گیا تھا اور اسی اعتقاد پر جمہور بزرگان سلف گذرے ہیں اور متاخرین سے عام فقہاء ومحدثین ومتکلمین کا بھی یہی مذہب ہے اور احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں اور ان الفاظ کو حقیقی معنوں سے پھیر کر تاویل کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح جملہ کتب عقائد اہل سنت میں اسی اعتقاد کو حق لکھا ہے۔ مثلاً فقہ اکبر میں امام الائمہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ’’وخبر المعراج حق ومن ردّہ فهو مبتدعٌ ضالٌ‘‘ اور ملا علی قاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ’’وخبر المعراج ای بجسد المصطفٰی ﷺ یقظة الی السمآء ثم الٰی ما شاء الله تعالٰی فی المقامات العلٰی حق ای حدیثهٗ ثابت بطرق متعددة فمن ردّہ ای ذلک الخبر ولم یؤمن بمقتضٰی ذلک الاثر فهو ضال مبتدع ای جامع بین الضلالة والبدعة (شرح فقه اکبر)‘‘ کہ معراج کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کے جسم مبارک کے ساتھ عالم بیداری میں آسمان تک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا یعنی جنت اور عرش تک سیر کرایا گیا، حق ہے اور جو کوئی اس کو ردّ کرے اور اس کے مطابق ایمان نہ رکھے وہ شخص گمراہ اور بدعتی ہے۔

اسی طرح دیگر کتب عقائد مثل قصیدہ امالی اور اس کی شرح اور تمہید ابی الشکور سالمی میں بھی ہے۔ چنانچہ شرح عقائد نسفی جو عقائد اہل سنت کی مستند اور مشہور ومعروف درسی کتاب ہے اس میں لکھا ہے: ’’والمعراج لرسول الله ﷺ فی الیقظة بشخصه الی السمآء ثم الی ما شاء الله تعالٰی من العلٰی حق ای ثابت بالخبر المشهور حتی ان منکرہ یکون مبتدعاً وانکارہ وادعآء استحالته انما یبتنٰی علی اصول الفلاسفة والا فالخرق والالتیام علی السمٰوٰت جائز والاجسام متماثلة یصح علٰی کل ما یصح علی الأخر والله تعالٰی قادر علی الممکنات کلها فقوله فی الیقظة اشارة الی الرد علی من زعم ان المعراج کان فی المنام علی ما روی عن معاویة انه سئل عن المعراج فقال کانت رویا صالحة وروی عن عائشة رضی اللہ عنہا انها قالت ما فقد جسد محمدعم لیلة المعراج وقد قال الله تعالٰی وما جلعنا الرویا التی ارینک الا فتنة للناس واجیب بان المراد الرؤیا بالعین والمعنی ما فقد جسدہ عن الروح بل کان مع روحه وکان المعراج للروح والجسد جمعیاً وقوله بشخصه اشارة الی الرد علی من زعم انه کان للروح فقط ولا یخفی ان المعراج فی المنام او بالروح لیس مما ینکر کل الانکار والکفرة انکروا امر

المعراج غایته الانکار بل کثیر من المسلمین قد ارتدوا بسبب ذلک وقوله الی السمآء اشارة الی الرد علی من زعم ان المعراج فی الیقظة لم یکن الا الی بیت المقدس علی ما نطق به الکتاب (شرح عقائد نسفی) ’’رسول اللہ ﷺ کو سیر معراج آسمان تک اور پھر جہاں تک اللہ نے چاہا عالم بیداری میں جسم کے ساتھ کرایا گیا تھا اور یہی حق ہے اور منکر اس کا بدعتی ہے اور اس کے محال ہونے کا دعویٰ کرنا صرف فلاسفہ یونان کے اصول پر ہے۔ ورنہ آسمان کا پھٹ جانا اور مل جانا جائز وممکن ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے۔ فی الیقظة میں اس شخص کے رد کی طرف اشارہ ہے جو کہے کہ حضرت معاویہ ؓ اور حضرت عائشہ ؓ کے قول کے موافق معراج خواب میں تھا اور نیز اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ ؓ اور حضرت عائشہ ؓ کا مطلب خواب نہیں ہے بلکہ امیر معاویہ کے قول میں رؤیا کے معنی رؤیت چشم کے ہیں اور حضرت عائشہ ؓ کے قول کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اور روح میں جدائی نہ ہوئی تھی۔ بلکہ آپ کا جسم روح کے ساتھ ہی تھا اور معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوا اور اگر کوئی صرف روح کے ساتھ کہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ معاملہ روحانی اور خوابی ایسا نہیں ہوتا کہ اس پر سخت انکار کر سکے۔ حالانکہ کفار نے سخت انکار کیا اور کئی ضعیف الاعتقاد مسلمان بھی مرتد ہوگئے اور الی السماء میں یہ اشارہ ہے کہ معراج صرف بیت المقدس تک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ آسمان تک ہوا تھا۔

غرض اس معراج جسمانی پر ہر چہار مذاہب کا اجماع ہے اور کوئی ایسی کتاب نہیں ہے۔ جس میں معراج جسمانی کو رد کیا ہو۔ بلکہ جمیع کتب حدیث وتفسیر میں اسی کو تحقیق کیا ہے۔ چنانچہ امام ابن القیم ؒ زاد المعاد میں فرماتے ہیں: ’’ثم اسری برسول اللہ ﷺ بجسده علی الصحیح من المسجد الحرام الی بیت المقدس راکباً علی البراق صحبه جبرئیل...... ثم عرج به تلک اللیلة من بیت المقدس الی السمآء والدنیا الی ان قال بعد ذکر السمآء السابعة رفع الی السدرة المنتهٰی ثم رفع له البیت المعمور ثم عرج الی الرب جل جلاله فدنا منه حتی قاب قوسین او ادنٰی فاوحٰی الی عبده ما اوحٰی. (زاد المعاد ج۱) ’’صحیح مذہب یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سیر معراج آپ کے بدن مبارک سے کرایا گیا تھا اور آپ براق پر سوار ہوئے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ تھے۔ پھر

بیت المقدس سے اسی رات پہلے آسمان پر چڑھائے گئے۔ چنانچہ ساتویں آسمان کا ذکر کر کے کہا ہے کہ پھر سدرۃ المنتہیٰ تک چڑھائے گئے اور پھر بیت المعمور کو دیکھا اور جناب الٰہی میں حاضر ہوئے حتی کہ اتنے نزدیک ہوئے کہ دو کمانوں کے گوشوں کا فرق باقی رہ گیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اس وقت جو وحی کرنی تھی کی۔

اور تبیان فی اقسام القرآن میں بیت معمور کی نسبت فرماتے ہیں: ''اما البیت المعمور فالمشھور انہ الصراح الذی فی السمآء الذی رفع للنبی ﷺ لیلۃ الاسراء (تبیان ص ۵۶) '' کہ بیت معمور جمہور علماء کے نزدیک ساتویں آسمان پر ایک محل ہے جو شب معراج میں نبی ﷺ کو دکھایا گیا تھا۔

حکمت معراج جسمانی

اگر سیر معراج کی حکمت اور ضرورت پر نظر کی جائے تو سوائے معراج جسمانی کے سب کچھ باطل نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا سورۂ شوریٰ میں: ''وما کان لبشر ان یکلمہ اللّٰہ الا وحیا او من ورآئ حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہٖ ما یشآء انہ علی حکیم (شوریٰ:۵۱) '' اللہ تعالیٰ جو بہت بلند اور بڑی حکمت والا ہے کسی بشر کے ساتھ کلام نہیں کرتا مگر اس صورت میں کہ اس کو خفیہ وحی کے ذریعہ کچھ بتاوے یا پس پردہ کوئی بات سناوے یا اپنا فرشتہ بھیجے جو اس کے اذن سے اس بشر کو پیغام پہنچاوے۔

اور چونکہ یہ امر ثابت ومسلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ سید المرسلین وخاتم النّبیین ہیں۔ پس آپ ﷺ کی نبوت درجہ کمال کے اوپر کے نقطہ پر ہے اور اس سے اوپر بشر کے لئے کوئی رتبہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہر سہ امور آپ میں بالضرور ثابت ہونے چاہئیں۔ صورت اوّل یعنی مجرد وحی سے اکثر احادیث نبویہ ہیں اور صورت سوم سے یعنی بواسطہ حضرت جبرئیل یہ کلام معجز نظام قرآن مجید نازل ہوا اور صورت دوم سے یعنی جب اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان صرف ایک پردہ سا ہو۔ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ سے سوائے شب معراج کے کبھی ہم کلام نہیں ہوئے۔ پس یہ درجہ حاصل ہونے کے لئے ضرور ہے کہ معراج جسمانی ہو۔ دیگر یہ کہ جو جو کمالات دیگر انبیاء علیہم السلام میں فرداً فرداً موجود تھے۔ وہ سب کے سب اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات میں یک جا جمع کر دیئے اور اسی معنی میں کیا خوب کہا گیا ہے:

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اللّٰھم صل علٰی محمد وعلٰی اٰل محمد کما صلیت علٰی ابراھیم وعلٰی اٰل ابراھیم انک حمید مجید

اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے کوہ طور پر ہم کلام ہونا بنص تصریح ’’وکلم اللہ موسٰی تکلیما (النساء:۱۶۴)‘‘ اور کلمہ ربہ ثابت ہے اور رفع جسمی حضرت روح اللہ کا آیت:’’بل رفعه الله الیه (النساء:۱۵۸)‘‘ سے محقق ہے۔ اس لئے حکمت الٰہیہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ اپنے حبیب ﷺ کو یہ دونوں کمال بوجہ اتم واحسن ایک وقت میں عطاء کرے۔ پس یہ کمالات اسی شب معراج کو حاصل ہوئے۔ اس کیفیت سے کہ تکلم حضرت کلیم اللہ کے تکلم سے ارفع تھا اور عروج حضرت روح اللہ کے عروج سے اعلیٰ۔ ان کمالات کا حصول بغیر رفع جسمی کے نہیں ہوسکتا۔ فافہم وتدبر!

فصل ثانی
(در ازالہ بعض شبہات منکرین معراج جسمانی)

بعض لوگ آیت:’’قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولاً (اسراء:۹۳)‘‘ کو پیش کر کے رفع عیسوی اور معراج نبوی ﷺ سے انکار کی گنجائش نکالتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت شناسی سے بالکل بے خبر ہیں اور ان کے اذہان مراد صحیح تک پہنچنے سے نہایت قاصر ہیں۔ نہ سلسلہ کلام پر نظر کرتے ہیں اور نہ سیاق وسباق عبارت پر غور وفکر’’لا تقربو الصلٰوۃ‘‘ جیسی بے تکی ہانکے جاتے ہیں اور اتنا بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ جادہ اعتدال سے دور افتادہ ہیں۔ تفصیل وبیان اس اجمال کی یہ ہے کہ سوالات کفار جن کے جواب میں کلمہ جامعہ’’سبحان ربی ھل کنت الا بشر رسولا‘‘ تعلیم کیا گیا ہے، یہ ہیں:’’و قالوا لن نؤمن لک حتّٰی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنة من نخیل وعنب فتفجر الانہار خللٰھا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملائکة قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السمآء ولن نومن لرقیک حتّٰی تنزل علینا کتابا نقرؤہ قل سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا (اسراء:۹۰تا۹۳)‘‘ کفار کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ تو ہمارے لئے زمین سے چشمے جاری کردے یا تیرے پاس

کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں یا تو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا برسا دے۔ جیسا کہ تو کہا کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ضامن لے آوے یا تیرے لئے کوئی گھر سونے کا بنا ہوا ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کو نہیں مانیں گے۔ جب تک کہ وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ نازل کرے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ اے پیغمبر ﷺ ان کو ان سوالات کے جواب میں یہی کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے (کہ کوئی اس پر زور و تحکم کرے) میں تو صرف ایک (فرمانبردار) بندہ اور رسول ہوں۔

ان آیات میں کفار کی ان افتراحات کا ذکر ہے۔ اوّل: آنحضرت ﷺ کا اعجازی قوت سے زمین میں چشمے جاری کرنا۔ دوم: آنحضور سرور عالم ﷺ کے لئے خرما وانگور کا باغ موجود ہونا اور اس میں نہروں کا بہتے ہونا۔ سوم: آسمان کا ٹکڑا عذاب کے لئے گر پڑنا۔ چہارم: اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور ملائکہ کی ضمانت تصدیق یا ان کو سامنے لانا۔ پنجم: آنحضرت ﷺ کے لئے سونے کا محل ہونا۔ ششم: آنحضرت سید الرسل وافضل البشر کا آسمان پر چڑھ جانا اور وہاں سے کتاب کا اتارنا جسے کفار خود پڑھ لیں۔

یہ بالکل بدیہی اور مصرح امر ہے کہ ان سب سوالات کے جواب میں ایک ہی کلمہ ''سبحان ربی هل کنت الا بشراً رسولا'' تعلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ جواب امر ششم یعنی آسمان پر چڑھ جانے کے محال ہونے پر دلالت کرتا ہے تو باقی سب امور بھی مستبعد و ناممکن ماننے پڑیں گے۔ کیونکہ جملہ سوالات کا ایک ہی جواب سکھایا گیا ہے۔ پس واضح ہو کہ ان کل امور کا ممکن اور غیر ممتنع ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے اور ایسے خوارق کا ذوات بابرکات انبیاء علیہم السلام سے باذن الٰہی واقع ہونا محل استبعاد نہیں۔ کیونکہ معجزہ یعنی خرق عادت ممکن ہے۔ پہلے ہم ان سب امور کو قرآن شریف سے ممکن ثابت کرتے ہیں اور پھر ''قل سبحان ربی هل کنت الا بشراً رسولا'' کی صحیح تفسیر بیان کریں گے اور اس کے بعد یہ ذکر کریں گے کہ باوجود ان امور کے ممکن ہونے کے پھر کفار کی طلب پوری کیوں نہیں کی گئی۔

امر اوّل: یعنی پیغمبر برحق ﷺ کے معجزہ سے زمین میں سے چشموں کا پھوٹ پڑنا آیت: ''فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا (بقرہ:۶۰)'' سے ثابت ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں سے فوّارے جاری ہو پڑنے اور نیز حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کی

ضربوں سے آب زم زم کا پیدا ہونا امر مطلوب کے ممکن ہونے کی بڑی بھاری دلیل ہے اور ان ہر دو واقعات کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔

امر دوم اور پنجم: یعنی پیغمبر حق کے لئے باغات وانہار ومحلّات کا میسر ہونے کی دلیل بھی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں کفار کے اس سوال کو ذکر کر کے جواب فرمایا ہے: ''تبارک الذی ان شاء جعل لک خیرا من ذلک جنٰت تجری من تحتها الانهار ویجعل لک قصورا (فرقان:۱۰)'' وہ اللہ بہت برکت والا ہے، اگر چاہے تو تیرے لئے ایک چھوڑ کئی باغات ان باغوں سے اچھے مہیا کر دے کہ ان کے تلے نہریں بھی چلتی ہوں اور تجھے ایک چھوڑ کئی محل بھی میسر کر دے۔

نیز حضرت سلیمان علیہ السلام کی عام بادشاہی اور ان کے لئے جڑاؤ شیش محل کا میسر ہونا سورہ نمل میں مذکور ہے اور اسی طرح شیاطین کا آپ کے مسخر ہونا اور آپ کے لئے سمندروں سے بیش بہا موتی نکالنا اور طرح طرح کے مکلّف اسباب خانگی تیار کرنا سورہ انبیاء، سبا اور صٓ میں مذکور ہے۔

سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام تو بہترین خلائق ہوتے ہیں۔ ان کے لئے خزانہ الٰہی میں کس چیز کی کمی ہے۔ یہ فرمیندہ اسباب تو دیگر افراد بنی نوع بلکہ کفار کے لئے بھی اس دنیا میں میسر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بعض کو حاصل ہیں۔

چنانچہ سورہ زخرف میں فرمایا: ''ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمن لبیوتهم سقفاً من فضة ومعارج علیها یظهرون ولبیوتهم ابوابا وسررا علیها یتکئون وزخرفا (زخرف:۳۳تا۳۵)'' اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ کفر ہی پر کمر باندھ لیں گے تو ہم منکرین کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیں اور دروازے اور تخت اور تکیہ گاہ سب کچھ چاندی کے کر دیتے اور اسی طرح دیگر اسباب بھی سب کچھ سونے کا عطاء کر دیتے۔

اس آیت میں کفار کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیں اور دروازے اور تخت اور تکیہ گاہ اور دیگر اسباب طلائی میسر ہو سکنے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ ان اسباب کا حاصل کر لینا (بتوفیقہ تعالیٰ) طاقت بشری سے خارج نہیں ہے۔ پس جب عامہ خلائق کے لئے ممکن ہوا تو انبیاء جو خواص دربار ایزدی ہوتے ہیں۔ ان کے حق میں کس طرح محال ہوں گے؟

خواص کا ایسے اسباب فانیہ کو محبوب نہ جاننا امر دیگر ہے اور ان کے حق میں معاذ اللہ محال ومستبعد ہونا امر دیگر ہے۔

امر سوم: یعنی آسمان سے کوئی ٹکڑا عذاب کے طور نازل ہونا خود کفار کے مقولہ ''کما زعمت'' سے ظاہر ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی ان کو اس عذاب سے ڈرایا تھا۔ جس پر کفار نے مطالبہ کے وقت اس کا حوالہ دیا ہے اور وہ ڈر جوان کو سنایا گیا تھا، سورہ سبا میں مذکور ہے: ''ان نشاء نخسف بهم الارض او نسقط عليهم كسفاً من السمآء (السبا: ۹)'' اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل کردیں۔

اسی طرح سب آسمانوں اور زمین کا سقوط وزوال ممکن ہونا کئی آیات سے ثابت ہوتا ہے: ''ان الله يمسك السمٰوٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسكهما من احد من بعده (فاطر: ۴۱)'' آسمان اور زمین کو صرف اللہ تعالیٰ ہی نے تھاما ہوا ہے اور اگر وہ نہ تھامے اور وہ گرنے کو ہوں تو پھر ان کو کوئی بھی نہ تھام سکے۔

بلکہ قیامت کو یہ سب آسمان وزمین فنا کر دیئے جائیں گے اور یہ امر قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے۔ چنانچہ تبدیل زمین وآسمان کی نسبت سورۂ ابراہیم: ۴۸ کے اخیر میں فرمایا: ''يوم تبدل الارض غير الارض والسمٰوٰت'' جس دن زمین وآسمان نئے تبدیل کئے جائیں گے۔ پس آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل ہونا بھی ناممکن ومحال نہ ہوا۔ وھذاھو المراد!

امر چہارم: یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور ملائکہ کو ضامن کر کے صداقت نبوت کو ثابت کرنا۔ اس میں کونسا استبعاد ہے۔ قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''لكن الله يشهد بما انزل اليك انزله لعلمه والملائكة يشهدون وكفى بالله شهيدا'' اللہ تعالیٰ تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس نے اس قرآن شریف کو تجھ پر اپنے علم سے سچ سچ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور شہادت کے لئے تو اللہ ہی کافی ہے۔

اور اگر قبیلاً بمعنی قبلاً سمجھیں تو بھی مستبعد نہیں۔ کیونکہ ایتان باری ''بكيفيه تليق بشانه العظيم'' ممتنع بالغیر ہے اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے۔ جیسا کہ شہادت القرآن میں ثابت ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات: ''هل ينظرون الا ان يأتيهم الله

فی ظلل من الغمام والملائکۃ (بقرہ:۲۱۰)‘‘اور’’جاء ربک والملک صفاً صفاً (فجر:۲۲)‘‘وغیرہما اور احادیث نزول باری سبحانہ۔

امر ششم: یعنی آسمان پر بارادہ الٰہیہ چڑھ سکنا عامہ بشر بلکہ کفار کے حق میں بھی ممکن ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر کے شروع میں فرمایا:’’ولو فتحنا علیھم باباً من السمآء فظلوا فیہ یعرجون لقالوا انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون (حجر:۱۴،۱۵)‘‘اور اگر ہم کفار پر آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں دن ہوتے چڑھ بھی جائیں تو پھر بھی کہیں گے کہ ہم کو کسی نے جادو کر دیا ہے۔

پس عباد صالحین وحضرات مرسلین جو بہت اعزواکرم ہیں۔ ان کے لئے کس طرح محال ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کتاب کا لکھی ہوئی صورت میں آسمان سے اتر سکنا سورت انعام کی آیت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا:’’ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھذا الا سحر مبین (انعام:۷)‘‘اور اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کریں اور یہ کفار اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیں تو بھی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ بلکہ توریت کا نزول شہادت وقوعی قائم کر رہا ہے۔

الغرض یہ سب آیات طیبہ صاف بتلا رہی ہیں کہ امور مسئولہ کفار ممکن وغیر ممتنع ہیں تو پھر آیت:’’سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا‘‘ سے عذر استحالہ کس طرح بجا ہے؟ اس صورت میں تو قرآن حکیم میں تعارض ہوگا۔ وھذا باطل! اگر اسی آیت کو بغور دیکھیں تو اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار معترضین کو اس امر کا علم تھا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ معراج جسمانی کے مدعی ہیں:’’او ترقی فی السمآء‘‘کے بعد’’ولن نؤمن لرقیک حتّٰی تنزل علینا کتابا نقرؤہ‘‘اسی لئے کہا کہ مبادا آپ پچھلے معراج کا حوالہ دے دیں۔ مزید بریں کفار کا سوال کرنا ہی اس امر پر دال ہے کہ وہ ان امور خارقہ عادات کا ظہور ذوات بابرکات انبیاء علیہم السلام سے ممکن جانتے تھے۔ اسی لئے یہ امور پیش کئے کہ اگر آپ ان ممکنات کو واقعات کر دکھائیں تو آپ پر ایمان لے آویں گے اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کریں گے۔

پھر اگر یہ سوال ہو کہ اگر سب امور مقترحہ ممکنات میں سے ہیں تو’’سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا‘‘ کی صحیح تفسیر جس سے یہ جواب ہر امر کے ساتھ منطبق ہوجائے۔ کس طرح ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی صحیح تفسیر جس کی دوسری آیات مؤید

ومصدق ہیں۔وہ ہے جو تفسیر ابن کثیر وسراج منیر سے نقل کی جاتی ہے:’’وقولہ تعالیٰ سبحان ربی هل کنت الّا بشراً رسولا ای سبحانه وتعالیٰ وتقدس ان یتقدم احد بین یدیه فی امر من امور سلطانه وملکوته بل هو الفعال لما یشاء ان شاء اجابکم الیٰ ما سألتم وان شآ لم یجبکم وما انا الا رسول الیکم ابلغکم رسالات ربی وانصح لکم وقدفعلت ذٰلک وامرکم فیما سألتم الی الله عزوجل (ابن کثیر) ‘‘اس آیت سبحان ربی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس کی بادشاہی میں پیش دستی یا اس کے سامنے بڑھ کر بات کر سکے۔ بلکہ جس امر کو چاہتا ہے خود کرتا ہے۔ پس اگر وہ چاہے گا تو تمہارا سوال قبول کرے گا، ورنہ نہیں اور میں تو صرف اس کے حکم کا مطیع اور اس کا ایلچی ہوں۔ میرا کام صرف تبلیغ رسالت ہے جو میں کر چکا ہوں اور جو کچھ تم نے سوال کئے ہیں۔ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

اسی طرح تفسیر سراج منیر میں بوضاحت اس امر کو محقق کیا ہے’’ولما تم تغشهم وکان لسان الحال طالبا من الله تعالیٰ الجواب عنه امر الله تعالیٰ بجوابهم بقوله قل ای لهٰؤلآء البعدآء الاشقیاء سبحان ربی ای تعجبا من اقتراحاتهم وتنزیها لله من ان یاتی احد یتحکم علیه او یشارکه احدفی القدرة وقرء ابن کثیر وابن عامر بصیغة الماضی والباقون قل بصیغة الامر وهل کنت الا بشراً رسولا کما کان من قبلی من الرسل وکانوا لا یاتون قومهم الا بما یظهره الله علیٰ ایدیهم بما یلائم حال قومهم ولم یکن امر الأیات الیهم ولا لهم ان یتحکموا علی الله حتّٰی یتخیروها هذا هو الجواب المجمل واما التفصیل فقد ذکر فی اٰیات اخر کقوله تعالیٰ ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس فلمسوه بایدیهم ولو فتحنا علیهم بابا ونحو ذلک ‘‘اور جس وقت کفار کی سرکشی اور کج بحثی حد کو پہنچ گئی تو آپ ﷺ کی زبان حال اللہ تعالیٰ سے اس بات کا جواب طلب کر رہی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے جواب سکھایا کہ ان بدبختوں سے کہو کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس پر حکم وزور کر سکے یا قدرت میں اس کا شریک ہو سکے۔ میں اپنے اختیار سے یہ امر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں تو ایک رسول ہوں اور مجھ سے پہلے جتنے رسول ہوئے ہیں، اپنے اختیار سے کوئی بھی معجزہ نہ دکھاتا تھا

بلکہ صرف وہی جو اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر ظاہر کرے اور ان کی قوم کے حال کے موافق ہوں اور معجزات کا دکھانا رسولوں کے اختیار میں نہیں ہوتا تھا اور نہ ان کو یہ قدرت ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ پر حکم اور زور کر کے اپنی مرضی سے معجزے طلب کریں۔

اس آیت میں یہ جواب مجمل دیا گیا ہے اور تفصیل کے ساتھ دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً آسمان سے کتاب اتارنے کا جواب سورہ انعام میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کرتے اور یہ منکر لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیتے تو بھی انہوں نے اس کو جادو کہہ کر انکار کر دینا تھا اور آسمان پر چڑھنے کا جواب سورہ حجر میں فرمایا کہ اگر ہم ان کفار کے لئے آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور یہ لوگ اس میں چڑھ بھی جائیں۔ تب بھی یہ منکر کہیں گے کہ ہم کو کسی نے جادو کر دیا ہے اور اسی طرح اور سوالات کے تفصیلی جواب دیگر آیات میں دیئے ہیں۔

تفسیر سراج منیر نے تو بے شک ظلمات وساوس وشبہات کو دور کر دیا اور قلب مومن کو منور کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یہ امور ممتنعات میں سے نہیں، بلکہ اعراض صرف ان کے تعنت کی وجہ سے ہے اور نیز یہ کہ یہ جواب مجمل سب امور مسئولہ عنہا کا جواب ہے اور ہر امر کا بالتفصیل جواب دیگر آیات میں مذکور ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر دو امر صعود الی السماء اور تنزیل کتاب کے امکان میں وہی آیتیں ذکر کیں جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور باقی امور کے جواب کی تفصیل کی طرف ونحو ذلک سے اشارہ کر دیا کہ طالب تفصیل خود قرآن شریف میں تدبر وتفحص کر کے ڈھونڈ لے۔ **فالحمد للّٰہ علٰی نعمآئہٖ الشاملۃ واٰلآئہ الکاملۃ!**

تفسیر کبیر میں بھی اس جواب کی اس طرح تقریر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

’’تقریر الجواب ان یقال اما ان یکون مرادکم من ھٰذا الاقتراح انکم طلبتم الایتان من عند نفسی بھذ الاشیاء او طلبتم من ان اطلب من اللّٰہ تعالٰی اظھارھا علی یدی لتدل علی کونی رسولا حقا من عند اللّٰہ والاوّل باطل لانی بشر والبشر لا قدرۃ لہ علی ھذہ الاشیاء والثانی ایضا باطل لانی قد اتیتکم بمعجزۃ واحدۃ وھی القرآن والدلالۃ علی کونھا معجزۃ فطلب ھذا المعجزات طلب لما لاحاجۃ الیہ ولا ضرورۃ فکان مجری التعنت والتحکم وانا عبد مامور لیس لی ان اتحکم علی اللّٰہ

فسقط هذا السوال فثبت ان قوله قل سبحان ربی هل کنت الّا بشراً رسولا جواب کاف فی هذا الباب (تفسیر کبیر) ’’اس جواب کی تقریر اس طرح ہے کہ کفار کے سوال کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل: یہ کہ ان امور کو اپنے اختیار سے کر دکھاؤں۔ دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ سے طلب کروں کہ وہ میری صداقت کے لئے ان امور کو ظاہر کرے۔ پس یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلی تو اس لئے کہ میں بشر ہوں اور اپنے اختیار سے ان اشیاء پر قادر نہیں ہوں اور دوسری اس وجہ سے کہ معجزہ تو میں تمہارے پاس لا چکا ہوں، کیونکہ یہ قرآن شریف میری نبوت کی تصدیق کے لئے کافی معجزہ ہے۔ پس تمہارے معجزہ کی طلب محض تعنت اور تحکم ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ کا مطیع بندہ ہوں۔ میں اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ تحکم اور زور سے کوئی امر اس سے طلب کروں۔ پس یہ سوال کفار مردود ہے اور ثابت ہوگیا کہ: ’’قل سبحان ربی هل کنت الا بشراً رسولا‘‘ اس بارے میں کافی جواب ہے۔

جو تقریر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم سے اس جواب کے بارے میں نقل کی گئی ہے وہ بالکل حق اور مراد الٰہی کے عین مطابق ہے اور دیگر آیات اس کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ پس یہ تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔ اصل اس سارے مضمون کا آیت سورہ مومن:۷۸ ’’وما کان لرسول ان یاتی بآیة الا باذن الله‘‘ ہے۔ یعنی کوئی رسول بغیر اذن الٰہی کوئی نشان و معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ کیونکہ معجزہ مقدور بشر سے خارج شئی کا نام ہے اور رسول بھی بوجہ بشر ہونے کے بذات خود بالاستقلال خرق عادت پر قادر نہیں ہوتے۔ ’’الّا باذن الله‘‘ ایسے امور جن سے دیگر افراد عاجز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول برحق کے دست مبارک پر ظاہر کرتا ہے اور وہ اس کی صداقت کے دلائل ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت روح اللہ علیہ السلام اپنی رسالت کی صداقت کے بارے میں ’’انی اخلق لکم من الطین (آل عمران:۴۹)‘‘ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی رسالت کی صداقت میں فرعون کے سامنے ’’اولو جئتک بشئ مبین‘‘ فرماتے ہیں اور فرعون اس پر طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: ’’فأت به ان کنت من الصادقین‘‘ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے وسیلے کچھ عجائبات جو مقدور بشر سے خارج ہوں، ظاہر کیا کرتا ہے اور وہ ان کے صدق پر دلیل ہوا کرتے ہیں اور ایسے عجائبات کوئی رسول بغیر اذن الٰہی کے دکھا نہیں سکتا۔

اب قرآن شریف کے چند مقامات ذکر کئے جاتے ہیں۔ جن میں اسی طرح کفار

نے اقتراحی آیات کا مطالبہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہی جواب تعلیم کیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ میرا کام اتباع وحی اور تبلیغ رسالت ہے، معجزات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، چاہے تو دکھاوے ورنہ نہ دکھاوے۔ اس میں اس پر میرا کوئی تحکم وتغلب تو نہیں کہ بزور معجزہ طلب کروں۔

چنانچہ فرمایا: ''**واذا لم تأتهم بآیة قالوا لولا اجتبیتها قل انما اتبع ما یوحٰی الی من ربی هذا بصائر من ربکم وهدی ورحمة لقوم یؤمنون واذا قرئ القرآن فاستمعوله وانصتوا لعلّکم ترحمون** (اعراف:۲۰۳،۲۰۴)'' اور اے پیغمبر جس وقت تم ان کو ان کی طلب کے موافق کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں از خود بنا لیتا، ان کو جواب دو کہ میں تو صرف وحی الٰہی کا تابع ہوں۔ یہ قرآن شریف تمہارے رب کی طرف سے کافی معجزہ ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سبب ہے تو جب میں اس کو پڑھا کروں، تم اس کو چپ چاپ غور سے سنا کرو کہ تم بھی مومن ہو کر رحمت میں داخل ہو جاؤ۔

دیکھو! اس آیت میں کیسے صاف طور پر فرما دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں امر الٰہی کے تابع ہوں۔ اپنی حول وقوت سے کچھ نہیں دکھا سکتا اور منصب تبلیغ رسالت سے ہرگز سر مو تجاوز نہیں کر سکتا اور اگر تمہاری غرض طلب آیات سے طلب حق ہے اور ہدایت حاصل کرنا ہے تو تصدیق رسالت کے لئے قرآن شریف کافی دلیل ہے۔ اسے غور سے چپ چاپ سنتے رہو، امید ہے کہ تم کو ہدایت نصیب ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ''**وقالوا لولا انزل علیه اٰیة من ربه قل انما الاٰیٰت عندالله وانما انا نذیر مبین اولم یکفهم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیهم ان فی ذلک لرحمة وذکری لقوم یؤمنون** (عنکبوت:۵۰،۵۱)'' اور یہ کفار کہتے ہیں کہ اس پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوتا۔ اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ معجزات تو اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں ہیں۔ میں تو صرف ڈرسنانے والا ہوں۔ اے پیغمبر! کیا ہم نے ایسی کتاب نازل نہیں کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے اور ان کو تصدیق کے لئے اعجازی رہبری کرتی ہے۔ پس وہ رسالت کا کافی ثبوت ہے اور مؤمنوں کے لئے موجب رحمت اور نصیحت ہے۔

ناظرین! غور کریں کہ سورہ اعراف کی آیات اور یہ آیات کیسے بالاتفاق ایک ہی مضمون کو ادا کرتی ہیں۔ یہ جواب کچھ ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ انبیاء سابقین سے بھی ہے اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم اپنی مرضی سے بغیر اذن الٰہی نہیں دکھا سکتے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم:۱۱ میں فرمایا: ''**وما کان لنا ان ناتیکم بسلطان الا باذن اللہ**'' یعنی ہم بغیر اذن الٰہی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوگیا کہ کفار کے اقتراح آیات کے جواب میں: ''**قل سبحان ربی ہل کنت الا بشراً رسولا**'' کی تعلیم کرنا اس وجہ سے نہ تھی بلکہ یہ تعلیم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ اپنی سلطنت کا لوگوں کی مرضی پر انتظام کرے یا کوئی شخص اس پر تحکم کرے اور حسب اقتراح اس سے آیات طلب کرے۔ اگر غرض ان کفار کی طلب حق ہے تو تصدیق رسالت کے لئے کافی دلائل ظاہر ہو چکے ہیں اور دلیل کافی پر زیادتی طلب کرنا لغو ہوتا ہے۔ پس ان سے اعراض کرنا چاہئے اور منصب رسالت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مطلب اس آیت کا یہ تھا جو بیان کیا گیا۔ خوش فہم لوگوں نے اس کو غلط سمجھ لیا اور کہاں کی کہاں بے تکی ہانک دی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ امور ممکن تھے اور نبی برحق کے معجزات نہ تھے تو پھر کیوں ان کو پورا نہ کر دکھایا تو اس کا جواب وہ ہے جو اجمالاً دیا جا چکا اور وہ خود قرآن شریف نے تعلیم کیا ہے کہ قرآن شریف تصدیق رسالت کے لئے کافی ثبوت ہے۔ اس پر غور کرو تو تمہارا مطلب ومقصود پورا ہو جائے گا۔ یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ تم کہتے جاؤ اور احتمالات بعیدہ سے رد کرتے جاؤ۔ میں ہر روز اسے پورا کرنے کے لئے تیار رہوں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ رسول مدعی رسالت جو کچھ پیش کرتا ہے، اسے دعویٰ رسالت سے مناسبت وتعلق ہے یا نہیں اور وہ اثبات نبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو پھر اس پر زیادتی کی طلب کیوں کی جاتی ہے۔ معجزہ سے غرض تو یہ ہے کہ تصدیق رسالت کی طرف ہدایت کر سکے۔ پس قرآن شریف اپنے اعجاز سے تم کو ساکت وملزم کر رہا ہے اور تصدیق رسالت کے لئے بصدائے بلند پکار رہا ہے۔ **محمد رسول اللہ!**

آیات مذکورہ سے ناظرین کے خاطر نشین ہوگیا ہوگا کہ کفار مکہ کے متعنتانہ سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تصدیق رسالت محمدی ﷺ کے لئے قرآن شریف کو پیش کیا ہے،

آپ کے مزید اطمینان کے لئے اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ سورہ بنی اسرائیل میں جن سوالات کے جواب میں: ''سبحان ربی ہل کنت الا بشرا رسولا ''تعلیم کیا گیا ہے۔ان آیتوں کے پہلے بھی قرآن مجید کے معجزاور بیمثل ہونے کو بڑے ہی پرزوردعویٰ اورتحدی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔چنانچہ فرمایا:''قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً ولقد صرفنا للناس فی ھذا القرآن من کل مثل فابیٰ اکثر الناس الا کفوراً وقالوا لن نؤمن لک. قل سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا (بنی اسرائیل:۸۸تا۹۳) ''اے پیغمبر!ان کو سنادو کہ اگر تمام انسان اور جن مجتمع ہوکراور ایک دوسرے کی امداد پر کمر باندھ کر کوشش کریں کہ اس قرآن عظیم کی نظیر بھی لاسکیں تو ہرگز نہیں لاسکیں گے۔بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کا بیان نصیحت واضح طور پر پھیر پھیر کر بیان کیا ہے۔مگر اکثر لوگ انکار ہی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لاویں گے......اے پیغمبر!ان کو کہہ دو کہ میرا رب اس بات سے پاک ہے کہ کوئی اس پر تحکم کر سکے میں تو صرف ایک بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

آیت:''ما قبل ''کو ساتھ ملانے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ سورہ بنی اسرائیل میں بھی سورہ اعراف اور عنکبوت کی طرح طلب معجزات کے جواب میں قرآن شریف ہی پر کفایت کی گئی ہے۔پس اس جواب:''سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ''کو جن معنوں میں منکرین معراج نے لیا تھا۔وہ ہرگز صحیح نہیں۔اس جواب کا صحیح مطلب وہی ہے جوتفسیر ابن کثیر وغیرہ سے پیشتر گزر چکا ہے۔

ازالہ شبہ ثانی

بعض لوگ اس آیت سے تمسک کر کے سیر معراج کو ایک خواب کا معاملہ قرار دیتے ہیں کہ:''وما جعلنا الرؤیا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس (بنی اسرائیل:۶۰) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور وہ رؤیا جو ہم نے تجھ کو دکھائی تھی تو اس میں صرف لوگوں کی آزمائش تھی۔سو اس کا جواب دو طریق سے ہے۔اوّل اس طرح کہ یہ آیت سیر معراج کے متعلق نہیں ہے۔بلکہ صلح حدیبیہ کی خواب کی حکایت ہے جس کی نسبت سورت فتح

میں بھی فرمایا: ’’لقد صدق اللہ رسوله الرؤیا بالحق (فتح:۲۷)‘‘ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جو کچھ خواب میں دکھایا تھا اسے سچ کر دکھایا۔

طریق دوم یہ ہے کہ اگر اس آیت کو سیر معراج ہی کے متعلق کریں تو پھر بھی سیر معراج خواب نہیں بنتا بلکہ جسمانی ہی ثابت رہتا ہے۔ اس کا بیان اس طرح ہے کہ لفظ رؤیا خواب کے لئے موضوع نہیں ہے۔ بلکہ لغت میں رؤیا اور رویت دونوں کے معنی دیکھنا ہے، عام اس سے کہ خواب میں ہو یا بیداری میں۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر وفتح البیان کی عبارتوں میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ لہٰذا جمہور مفسرین نے اسی امر کو ترجیح دی ہے کہ اس آیت میں رؤیا سے رویت چشم مراد ہے۔ مفسرین کا یہ قول بالکل حق اور نقل اور لغت کے بالکل مطابق ہے۔ لغت کے مطابق اس طرح کہ متنبّی جس کی عربی زبان دانی مسلم ہے۔ اس نے اس لفظ کو رویت چشم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

جیسا کہ: ’’ورؤیاک احلٰی فی العیون من الغمض (فتح الباری)‘‘

نقل کے مطابق اس طرح کہ صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ’’عن ابن عباسؓ وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنة للناس قال ھی رؤیا عین اریھا رسول اللہ ﷺ لیلة اسری به (صحیح بخاری)‘‘ کہ اس رؤیا سے مراد رویت چشم ہے جو رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں دکھایا گیا تھا۔

پس واضح ہوگیا کہ سیر معراج کو عالم خواب کا واقعہ کہنے والوں کے لئے اس آیت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ تفسیر کبیر میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: ’’القول الرابع وھو الاصح وھو قول اکثر المفسرین ان المراد بھا ماراٰہ اللہ تعالٰی لیلة الاسراء واختلفوا فی معنی ھذہ الرؤیا فقال الا کثرون لا فرق بین الرؤیة والرؤیا فی اللغة یقال رایت بعینی رویته ورؤیا وقال الاقلون ھذا یدل علی ان قصة الاسرآء انا حصلت فی المنام وھذا القول ضعیف باطل علی ما قررناہ فی اوّل ھذہ السورة وقوله الا فتنة للناس معناہ انه ﷺ لما ذکر لھم قصة الاسراء کذبوہ وکفربه کثیر ممن کان اٰمن به وازداد المخلصون ایمانا فلھذا السبب کان امتحانا (تفسیر کبیر ج۵)‘‘ کہ یہی بہت صحیح ہے کہ اس آیت میں ان عجائبات

ومشاہدات کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شب معراج میں دکھائے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے کہ رویت اور رؤیا کے لفظ میں لغت کے رو سے کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ رایت بعینی یعنی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا رویۃ اور رؤیا ہر دو کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے اور جن بہت سے تھوڑے لوگوں نے اس آیت سے سیر معراج کو عالم خواب کا واقعہ سمجھا ہے، ان کا قول بالکل باطل اور ضعیف ہے۔ اس کے وجوہات ہم شروع سورت میں ذکر کر آئے ہیں اور اس سیر معراج کو لوگوں کے لئے فتنہ اور آزمائش بنانے کا بیان اس طرح ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس سیر معراج کا ذکر کیا تو کفار نے اس امر میں آپ ﷺ کو معاذ اللہ جھوٹا جانا اور بہت سے ضعیف الاعتقاد مسلمان مرتد ہوگئے اور مخلصوں کا ایمان زیادہ ہوا۔

جب اس رؤیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک امتحانی امر قرار دیا تو سیر معراج عالم خواب کا واقعہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس کو خواب کا معاملہ ماننے میں آزمائش کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ وہ دلائل جو معراج کو صاف جسمانی ثابت کرتے ہیں اور پیشتر گزر چکے ہیں۔ رؤیا کو بمعنی رویت چشم لینے کے لئے بڑے قوی قرائن ہیں۔ پس اس آیت سے بھی معراج جسمانی ہی ثابت ہوا۔

ازالہ شبہ سوم

بعض لوگ معراج جسمانی کے ماننے میں یہ عذر پیش کیا کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب ہے کہ معراج خواب میں ہوا تھا۔ سوان کا یہ عذر صحیح اور قابل پذیرائی نہیں۔ اس کا بیان کئی وجوہ سے ہے۔ اوّل یہ کہ جب الفاظ قرآنیہ واحادیث صحیحہ مرفوعہ سے ثابت ہوگیا کہ سیر معراج جسمانی تھا تو اس کے مقابلہ میں غیر نبی کے قول کو پیش کرنا سراسر نبوت کی ناقدرشناسی ہے۔ کیونکہ یہ امر بالاتفاق مسلم ہے کہ حدیث مرفوع کے مقابلہ میں موقوف پیش نہیں ہوسکتی۔ پس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول سے معراج جسمانی کا انکار ہرگز جائز نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ صاحب معاملہ وصاحب وحی صادق مصدوق جن کا بیان خواہش نفسانی سے بالکل پاک ذکر ہو چکا ہے۔ جب ان کی اپنی زبان مبارک سے فرمائے ہوئے الفاظ معراج کو روز روشن کی طرح صاف جسمانی بتا رہے

ہیں اور آپ ﷺ کے بیان کو اسی سبب سے کفار نا ہنجار آپ کے سامنے جھٹلا رہے ہیں اور ضعیف الاعتقاد لوگ جن کے دلوں میں حلاوت ایمانی ابھی نہیں رچی تھی، مرتد ہورہے ہیں اور نبی ﷺ ان کے شبہات دور کرنے کے لئے اپنے سیر معراج کو کبھی بھی عالم خواب کا واقعہ قرار نہیں دیتے تو اس کے خلاف کسی اور کا قول اور قیاس کس طرح پیش ہوسکتا ہے۔

دوم یہ کہ آپ کو جس سال سیر معراج کرایا گیا، اس وقت کی بابت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں میں سے کسی کو کچھ بھی خبر نہیں۔ کیونکہ ایک روایت کے موجب تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا معراج کے سال تک ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے اور اگر اس وقت پیدا شدہ بھی ہوں تو اس قدر چھوٹی عمر کی تھیں کہ آپ کو اس واقعہ کا کوئی بھی علم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ چھ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی اور نو سال کی عمر میں ہجرت کے بعد مدینہ شریف میں جا کر نبی ﷺ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ معراج مکہ شریف میں ہوا تھا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں کسی طرح پیش نہیں ہوسکتا۔

سوم یہ کہ علامہ سعدالدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح عقائد نسفی سے منقول ہوچکا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول میں رؤیا کے معنی رویت چشم کے ہیں جیسا کہ ثابت کیا گیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اور روح میں جدائی نہ ہوئی تھی، بلکہ آپ کا جسم روح کے ساتھ ہی تھا اور معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوا۔ پس اس وجہ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی مثل دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے معراج جسمانی ہی کے قائل ٹھہرے۔

چہارم یہ کہ میں تفسیر ابن کثیر سے منقول ہوچکا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کو اس معراج جسمانی کے پہلے روحانی یا منامی طور پر معراج کرایا گیا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ جو خواب دیکھتے تھے وہ عین بعین صبح صادق کی طرح ظاہری واقعہ بھی ہوجاتا تھا۔ پس ممکن ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس تمہیدی معراج کو روحانی قرار دیا ہو جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے۔ پس منکرین معراج جسمانی کے پاس کوئی ایسی قوی دلیل نہیں ہے جس سے ان کو انکار کی گنجائش مل سکے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

نزول الملائکة

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

’’الحمد للہ فاطر السمٰوات والارض جاعل الملٰئکۃ رسلاً اولی الاجنحۃ مثنٰی وثلث ورباع یزید فی الخلق ما یشآء ان اللہ علٰے کل شئ قدیر. والصلوٰۃ والسلام الاتمان الاکملان علی رسولہ وخیر خلقہ محمد النبی العاقب البشیر النذیر وعلٰی اٰلہ واصحابہ الذین قاتلوا الکفار المکذبین فامدھم اللہ باٰلاف من الملٰئکۃ المسوّمین فضربوھم فوق الاعناق وضربوا منھم کلّ بنان وما النصر الا من عند اللہ رب العٰلمین‘‘

اما بعد! پس بندۂ ضعیف ملتجی الیٰ اللہ الکریم محمد ابراہیم سیالکوٹی اصحاب دانش وانصاف کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس زمان بغی وطغیان میں ظلمت فلسفہ بہت چھاگئی ہے اور اصول دین سے دن بدن بے خبری بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ حال میں مرزاغلام احمد قادیانی نے منجملہ دیگر عقائد اہل سنت کے نزول ملائکہ کا انکار کیا ہے اور جو کچھ مانا ہے وہ محض ان کے خیالی فرشتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں ملائکہ کی وہ حقیقت وکیفیت نہیں ہے۔ چنانچہ ان کی بعض عبارتیں اس جگہ نقل کی جاتی ہیں اور اس کے بعد حکمائے یونان کا مذہب ذکر کیا جائے گا اور پھر اسلامی اعتقاد کتب معتبرہ سے نقل کیا جائے گا جس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ مرزاقادیانی کا اعتقاد کفار یونان کے موافق ہے اور قرآن وحدیث کے بالکل مخالف۔

چنانچہ توضیح المرام میں لکھتے ہیں: ’’پس اصل بات یہ ہے کہ جس طرح آفتاب اپنے مقام پر ہے اور اس کی گرمی، روشنی زمین پر پھیل کر اپنے خواص کے موافق زمین کی ہر ایک چیز کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اسی طرح روحانیات سماویہ خواہ ان کو یونانیوں کے خیال کے موافق نفوس فلکیہ کہیں یا دساتیر اور وید کی اصطلاحات کے موافق ارواح کواکب سے ان کو نامزد کریں یا نہایت سیدھے اور موحدانہ طریق سے ملائک اللہ کا ان کو لقب دیں۔ درحقیقت یہ عجیب مخلوقات اپنے اپنے مقام میں مستقر اور قرار گیر ہے۔ الخ!‘‘ (توضیح المرام ص۳۲،۳۳، خزائن ج۳ ص۶۷)

’’پس اس میں کچھ شک نہیں کہ بوجہ مناسبت نوری وہ نفوس طیبہ ان روشن اور نورانی ستاروں سے تعلق رکھتے ہوں گے کہ جو آسمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس تعلق کو ایسا نہیں سمجھنا چاہئے کہ جیسے زمین کا ہر ایک جاندار اپنے اندر جان رکھتا ہے بلکہ ان نفوس طیبہ کو بوجہ مناسبت اپنی نورانیت اور روشنی کے جو روحانی طور پر انہیں حاصل ہے۔ روشن ستاروں کے

ساتھ ایک مجہول الکنہ تعلق ہے اور ایسا شدید تعلق ہے کہ اگر ان نفوس طیبہ کا ان ستاروں سے الگ ہونا فرض کرلیا جائے تو پھر ان کے تمام قویٰ میں فرق پڑ جائے گا۔ انہیں نفوس کے پوشیدہ ہاتھ کے زور سے تمام ستارے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں اور جیسے خدا تعالیٰ تمام عالم کے لئے بطور جان کے ہے۔ ایسا ہی (مگر اس جگہ تشبیہ کامل مراد نہیں) وہ نفوس نورانیہ کواکب اور سیارات کے لئے جان کا ہی حکم رکھتے ہیں اور ان کے جدا ہو جانے سے ان کی حالت وجودیہ میں بکلی فساد راہ پا جانا لازمی اور ضروری امر ہے۔'' (توضیح المرام ص۳۷،۳۸، خزائن ج۳ ص۷۰)

''یا یوں کہو کہ اس وقت جبرئیل اپنا نورانی سایہ اس مستعد دل پر ڈال کر ایک عکسی تصویر اپنی اس کے اندر لکھ دیتا ہے۔ تب جیسے اس فرشتہ کا جو آسمان پر مستقر ہے، جبرئیل نام ہے۔ اس عکسی تصویر کا نام بھی جبرئیل ہی ہوتا ہے یا مثلاً اس فرشتہ کا نام روح القدس ہے تو عکسی تصویر کا نام بھی روح القدس ہی رکھا جاتا ہے۔ سو یہ نہیں کہ فرشتہ انسان کے اندر گھس آتا ہے بلکہ اس کا عکس انسان کے آئینہ قلب میں نمودار ہو جاتا ہے۔'' (توضیح المرام ص۷۰، خزائن ج۳ ص۸۷)

''اور جبریلی نور کا چھیالیسواں حصہ تمام جہان میں پھیلا ہوا ہے جس سے کوئی فاسق اور فاجر اور پرلے درجہ کا بدکار بھی باہر نہیں بلکہ میں یہاں تک مانتا ہوں کہ تجربہ میں آچکا ہے کہ بعض اوقات ایک نہایت درجہ کی فاسقہ عورت جو کنجریوں کے گروہ میں سے ہے جس کی تمام جوانی بدکاری ہی میں گزری ہے۔ کبھی سچی خواب دیکھ لیتی ہے اور زیادہ تر تعجب یہ ہے کہ ایسی عورت کبھی ایسی رات میں بھی کہ جب وہ بادہ بسر وآشنا ببر کا مصداق ہوتی ہے کوئی خواب دیکھ لیتی ہے اور وہ سچی نکلتی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ جبریلی نور آفتاب کی طرح جو اس کا ہیڈ کوارٹر ہے تمام معمور عالم پر حسب استعداد ان کی اثر ڈال رہا ہے۔'' (توضیح المرام ص۸۴،۸۵، خزائن ج۳ ص۹۵)

ان سب عبارات سے پُر ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی ملائکہ کو نفوس فلکیہ جانتے ہیں اور اجرام فلکیہ کے ساتھ ان کا ایسا تعلق مانتے ہیں جیسا جسم کا جان کے ساتھ اور ان کی تاثیرات کے بھی اسی طرح قائل ہیں جس طرح دیگر طلسمات والے اور نیز حضرت جبرئیل کے نزول کو ان کے عکس کی ایک صورت قرار دیتے ہیں۔ اس امر کے ثبوت کے لئے کہ ملائکہ کی نسبت یہ خیال مذاہب باطلہ کا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارتیں نقل کی جاتی ہیں۔

چنانچہ شرح مقاصد میں ہے کہ فلسفیوں کے نزدیک ملائکہ عقول مجردہ اور نفوس

فلکیہ کا نام ہے۔’’زعموا ان الملائکة هم العقول المجردة والنفوس الفلكية وزعموا ان لكل فلك روحاً يتشعب منه ارواح كثيرة‘‘ (شرح مقاصد)

اسی طرح اس کے بعد ملائکہ کی نسبت طلسمات والوں کا مذہب ذکر کیا ہے کہ:’’ان کے نزدیک ہر فلک کی ایک روح ہے جس میں سے اور بہت سے ارواح نکلتے ہیں۔‘‘

اسی طرح تفسیر کبیر میں صائبین یعنی ستارہ پرستوں کا مذہب لکھا ہے کہ:’’ان الكواكب هى المدبرة المافى هذه العالم من الخير والشرو الصحة والمرض (تفسير كبير جلد ۱)‘‘ان کے نزدیک اس دنیا کی خوشحالی اور بدحالی اور تندرستی اور مرض غرض ہر امر کی تدبیر یہی ستارے کرتے ہیں۔

اسی طرح تفسیر کبیر میں ملائکہ کی نسبت بت پرست لوگوں کا خیال کھا ہے کہ:’’(ثانيها) وهو قول طوائف من عبدة الاوثان وهو ان الملائكة هيى الحقيقة فى هذه الكواكب الموصوفة بالاسعاد والانحاس (تفسير كبير ج ۱)‘‘ان کے نزدیک ملائکہ ان ستاروں کی حقیقت وجان کا نام ہے جن کے متعلق دنیا کی برکت اور نحوست ہے۔

ان سب عبارات سے مرزا قادیانی کے اعتقاد کا فلاسفہ یونان اور مذاہب باطلہ کے موافق ہونا ظاہر ہے۔ اب ملائکہ کی نسبت اسلامی اعتقاد کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی حقیقت بتائی جاتی ہے۔

چنانچہ شرح مقاصد میں ملائکہ کی نسبت لکھا ہے کہ:’’وعندنا ان الملائكة اجسام لطيفة تتشكل باشكال مخلفة شانهم الخير والطاعة والعلم والقدرة على الاعمال الشاقة (شرح مقاصد ج ۲)‘‘ہمارے یعنی اہل سنت مسلمانوں کے نزدیک ملائکہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف جسم ہیں جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ ان کا کام نیکی اور فرمانبرداری اور علم ہے اور وہ بڑے بھاری کام کر سکنے کی قوت رکھتے ہیں۔

شرح مقاصد میں اس کے بعد مفصل طور پر معقولی بحث سے ملائکہ کی اس حقیقت مذکورہ کو ثابت کیا ہے اور منکرین کے اعتراضات وتوہمات کا ازالہ کیا ہے۔ ہم ان عبارات کو بخوف تطویل نقل نہیں کر سکتے۔ جملہ کتب عقائد میں ملائکہ کی نسبت اہل سنت کا یہی مذہب ذکر کیا گیا ہے۔

شرح مقاصد کا یہ بیان بالکل حق اور قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ہم اس کے ہر امر کو قرآن وحدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

قولہ: ’’اجسام ‘‘یعنی ملائکہ جسم ہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں ان کو عباد مکرمون یعنی ’’اللہ تعالیٰ کے عزت دیتے ہوئے بندے‘‘ کہا گیا ہے اور نیز ان کی صفت رات دن عبادت میں مشغول رہنا قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے اور نیز سورۂ فاطر کے شروع میں ان کے دو دو اور تین تین اور چار چار اور زیادہ بھی پر بتاتے ہیں اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے چھ سو پر مذکور ہیں۔ یہ سب احوال جسم کے متعلق ہیں۔

قولہ: ’’لطیفہ ‘‘یعنی لطیف جسم میں جو دیکھنے میں نہیں آتے۔ مگر اسی شخص کو اور اسی وقت جب کہ اللہ تعالیٰ اس کی نظر میں وہ قوت پیدا کر دیوے جس سے ان کو دیکھ سکے یا جب کسی دوسری شکل میں متشکل ہو کر سامنے آویں جیسے جن وغیرہ!

جس طرح اللہ تعالیٰ کی وسیع قدرت کی کوئی نہایت نہیں، اسی طرح اس کی مخلوق جس کے متعلق اس کی قدرت کا ظہور ہے، اس کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس نے ہر طرح کی مخلوق مرئی یعنی جو دیکھنے میں آتی ہے اور غیر مرئی یعنی جو دکھائی نہ دے پیدا کی ہے۔

چنانچہ سورۂ مدثر میں فرمایا کہ: ’’وما یعلم جنود ربک الا ھو (المدثر:۳۱)‘‘ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سواء کوئی نہیں جانتا۔

قولہ: ’’متشکل باشکال مختلف ‘‘فرشتوں کا مختلف شکلوں میں متشکل ہو کر حسب ارادہ واذن الٰہی بعض اشخاص پر ظاہر ہونا بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری لے کر آئے اور صورت بشری میں تھے۔ چنانچہ سورۂ مریم میں فرمایا کہ: ’’فارسلنا الیھا روحنا فتمثّل لھا بشرا سوّیا ‘‘ہم نے اپنا روح القدس یعنی جبرئیل مریم کے پاس بھیجا تو وہ ایک پورے جوان بشر کی شکل میں اس کے سامنے آیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس جو فرشتے آئے وہ بھی بصورت بشر تھے۔ چنانچہ ان کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

فرشتہ کے بصورت بشری نبی کے پاس آنے کو رسول اللہ ﷺ نے وحی کی ایک قسم فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ: ’’واحیانا یتمثل فی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول ‘‘کبھی وہ صاحب وحی فرشتہ یعنی جبرئیل میرے پاس آدمی کی صورت میں ہو کر آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔

ملائکہ کا مختلف شکلوں میں متمثل ہونا جملہ کتب عقائد میں لکھا ہے۔اس کے واقعات فصل ثانی رسالہ ہذا میں ملاحظہ کریں۔

قولہ: ’’شانهم الخير والطاعة والعلم ‘‘یعنی ان کا کام نیکی کرنا اور فرمانبرداری اور علم ہے۔اس قید سے جنوں اور شیطانوں کو خارج کیا۔ کیونکہ وہ بھی لطیف جسم ہیں اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔مگر وہ سارے مطیع نہیں ہیں۔ یہ امر بھی قرآن شریف سے ثابت ہے۔

چنانچہ سورۂ تحریم میں فرمایا کہ: ’’لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون (تحریم:۶) لا يسبقونه بالقول وهم بامره يعملون (انبياء:۲۷)‘‘ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی نہیں کرتے اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑھ کر بات نہیں کرتے۔اسی طرح ان کا ہمیشہ تسبیح وتحمید ذات باری میں مشغول رہنا قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے۔

قولہ: ’’والقدرة على الاعمال الشاقة ‘‘یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے بڑے کام کر سکنے کی طاقت بخشی ہے۔ یہ بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اس کے واقعات کتب تفسیر اور حدیث میں بالخصوص کفار کے عذاب مہلک کے وقت میں بہت ہیں۔ مثلاً قوم عاد اور ثمود کو جبرئیل علیہ السلام کے ایک آواز سے ہلاک کرنا اور قوم لوط پر ان کی بستی کو الٹا دینا۔وغیرہ وغیرہ!

مقاصد کی عبارت مذکورہ بالا کے بعد شرح میں اتنا اور بڑھایا ہے کہ: ’’مسكنها السمٰوات هم رسل الله الى انبيآئه عليهم السلام وامنائه على وحيه يسبحون الليل والنهار لا يفترون لا يعصون الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون ‘‘ان کے رہنے کی اصل جگہ آسمان ہے۔انبیاء کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس کی وحی کے امین ہیں۔ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور ہرگز نہیں اکتاتے۔اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی نہیں کرتے اور کرتے وہی ہیں جو ان کو حکم ہو۔

بیان بالا سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ مرزا قادیانی کا عقیدہ دربارہ حقیقت ملائکہ اہل سنت کے بالکل خلاف ہے اور ان کو نفوس فلکیہ اور ارواح کواکب قرار دے کر مؤثرات عالم کہنا فلاسفہ

اور اصحاب طلسمات کا خیال ہے اور ان کے نزول کو ان کے عکس سے تعبیر کرنا بھی اسلامی اعتقاد کے بالکل مخالف ہے۔ فرشتوں کا مختلف شکلوں میں متمثل ہوسکنا عقل سے بعید نہیں ہے۔ کیونکہ جسم کی صورت حقیقت شئی میں داخل نہیں ہوتی بلکہ بمنزلہ لباس و پوشاک کے عوارض میں سے ہوتی ہے۔ پس اس جسم وصورت کا حقیقت شئے سے منفک ہونا ممکن ہوا اور جب فرشتے اپنے اصل جسم سے کسی بشر کی شکل میں متمثل ہوتے ہیں تو ان کی حقیقت ملکی منتزع نہیں ہوتی بلکہ حقیقت وہی رہتی ہے۔ صرف انسانی صورت کے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ مشابہت صوری سے اتحادِ ذوات لازم نہیں آتا۔ جیسے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بصورت بشری آئے اور اس کے بعد کہا کہ: ''میں تیرے رب کا فرشتہ ہوں۔''

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس جو فرشتے آئے وہ بھی بشر کی صورت میں تھے اور باوجود بشری صورت میں ہونے کے پھر کہتے ہیں: ''انا رسل ربک'' یعنی ''ہم تیرے رب کے فرشتے ہیں۔'' ان آیات سے واضح ہوگیا کہ دوسری شکل میں متمثل ہونے سے حقیقت ملکی دور نہیں ہوتی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ نزول جبریلی حقیقی ہوتا تھا۔ عکس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے نظائر وامثال کتب حدیث وقصص اولیائے عظام میں بکثرت ہیں اور اصطلاح صوفیائے کرام میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بارہا بصورت بشری خاص کر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آنا کتب حدیث میں بالتفصیل مذکور ہے۔ جیسا کہ فصل ثانی کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا۔

فرشتوں پر ایمان لانا فرض ہے۔ لہٰذا صفات ایمان میں اس کو شامل کیا گیا ہے۔ امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں: ''یجب ان یقول اٰمنت باللّٰہ وملائکتہ...... الخ!'' امام صاحب کا یہ قول بالکل حق اور قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ سورۂ نساء میں فرمایا: ''ومن یکفر باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر فقد ضلّ ضلالاً بعیدا (النساء:۱۳۶)'' اور جو شخص اللہ کا منکر ہوا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روز آخرت کا، تو وہ راہ راست سے بڑی دور بھٹک گیا۔

فصل ثانی

دراثبات نزول ملائکہ ازقرآن کریم وحدیث

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو زمین پر خاص خاص کاموں کے لئے نازل کرتا ہے۔

اوّل: تبلیغ رسالت کے لئے۔

دوم: دشمنان دین کے ہلاک کرنے کے لئے۔

سوم: بندوں کے اعمال لکھنے کے لئے۔

چہارم: قبض ارواح کے لئے۔

پنجم: مردوں کے حساب کے لئے۔

ششم: مؤمنوں کے ساتھ ذکر الٰہی میں شامل ہونے کے لئے۔

ہفتم: لوگوں کو آفات سے محفوظ رکھنے کے لئے۔

ہشتم: میدان جنگ میں مؤمنوں کی مدد کے لئے۔

نہم: رسول اللہ ﷺ پر درود پہنچانے کے لئے۔

امور مذکورہ کا ثبوت حسب ترتیب بالاقرآن وحدیث سے اس طرح ہے:

۱...... انبیاء علیہم السلام کو وحی پہنچانے کی خدمت بعض فرشتوں کے متعلق ہے۔ چنانچہ سورۂ فاطر کے شروع میں فرمایا: ''**الحمد لله فاطر السمٰوات والارض جاعل الملٰئكة رسلا اولى اجنحة مثنٰى وثلٰث ورباع يزيد فى الخلق ما يشآء ان الله علٰى كل شئ قدير** (فاطر:۱)'' ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جس نے محض عدم سے آسمان وزمین بنا نکالے اور اسی نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر ہیں۔ اپنی مخلوقات کی بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں فرمایا: ''**وما كان لبشر ان يكلمه الله الّا وحيا او من ورائ حجاب او يرسل رسولا فيوحى باذنه ما يشآء انه علىّ حكيم** (شوریٰ:۵۱)'' اللہ تعالیٰ جو بہت بلند اور بڑی حکمت والا ہے، کسی بشر کے ساتھ کلام نہیں کرتا۔ مگر اس صورت میں کہ اس کو خفیہ وحی کے ذریعہ کچھ بتاوے یا پس پردہ کوئی بات سناوے یا اپنا فرشتہ بھیجے جو اس کے اذن سے اس بشر کو پیغام پہنچاوے۔

اسی طرح یہ خدمت خاص کر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سپرد ہے۔ان کا نزول بشکل انسانی ایسا بیّن اور روشن ہے کہ مخالف کو جائے دم زدون نہیں تیئس سال تک برابر بحکم الٰہی رسول اللہ ﷺ پر وحی لاتے رہے۔اصحاب رسول اللہ ﷺ ان کو آپ کے پاس بیٹھے اور باتیں پوچھتے دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔کبھی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں متمثّل ہو کر آتے اور کبھی کسی مسافر کی صورت میں۔ یہاں تک کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو نہ پہچانتے اور خود رسول اللہ ﷺ ان کو بتاتے کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔سو جبرئیل علیہ السلام کا نزول بشکل انسانی بنص صریح قرآنی وحدیثی ثابت ہے۔لہٰذا اس کا انکار کفر ہے اور دیگر ملائکہ کا بھی ویسا ہی نزول صاف صاف عبارت میں قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔اس لئے ان کا انکار بھی کفر ہے۔فرشتوں پر ایمان لانا فرض ہے۔لہٰذا صفات ایمان میں اس کو شامل کیا گیا۔فرشتوں پر ایمان اس صورت میں پورا ہوتا ہے جب اس طرح مانا جاوے جس طرح شارع علیہ السلام منوائے اور اللہ تعالیٰ فرمائے اور اگر کوئی فرشتوں کو تو مانتا ہے مگر اپنے خیال سے ارواح کواکب یا قویٰ کو۔سو وہ اپنی ہوائے خواہش کا متبع ہے۔شارع علیہ السلام کے نزدیک ایسا ایمان معتبر اور مقبول نہیں ہے۔اجمال بالا کی تفصیل بذریعہ دلائل نقلیہ حسب ذیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو نبوت عطاء ہونے کی کیفیت صحیح بخاری میں اس طرح لکھی ہے کہ:''**فجاء الملک فقال اقرء قال ما انا بقارئ قال فاخذنی فغطّنی حتی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرء قلت ما انا بقارئ فاخذنی فغفطّنی الثانية حتّٰی بلغ منی الجهد ثم ارسلنی فقال اقرء قلت ما انا بقارئ فاخذنی فغطّنی الثالثه ثم ارسلنی فقال اقرء باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرء وربک الاکرم (صحیح بخاری)**''رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ کچھ دنوں کا کھانا لے جاتے اور غار حرا میں کئی روز تک ملّت حنیفیہ کے موافق اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے۔حتیٰ کہ آپ کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہنے لگے کہ پڑھ۔آپ نے فرمایا میں تو پڑھا ہی نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے آپ کو خوب زور سے بھینچا۔حتیٰ کہ آپ کا یا اس فرشتے کا سارا زور لگ گیا۔پھر اس فرشتے نے آپ کو چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ۔آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر اس نے دوبارہ بھینچا پھر چھوڑ کر کہا پڑھ۔آپ نے پھر بھی فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر تیسری دفعہ اس نے اسی طرح

زور سے بھینچا۔ پھر چھوڑ کر کہا پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے خون سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا بزرگ ہے۔

دیکھو! اس حدیث سے کیسا صاف صاف نظر آرہا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے رسول خدا ﷺ کے جسم مبارک کو زور کے ساتھ بھینچا اور زبان مبارک سے فرمایا کہ پڑھ۔ کیا بھینچنے والا کوئی سایہ یا چھاؤں تھی؟ معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! ایسا اعتقاد تو ہندوؤں کا ہے کہ فلاں فلاں چیز کا سایہ انسان پر پڑ جاتا ہے تو وہ انسانی ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ ایسا اعتقاد سخت گمراہی ہے۔ نبی ﷺ کا فرشتہ کو اپنی آنکھ سے اپنے روبرو دیکھنا بڑی ضروری بات ہے۔ کیونکہ اس سے موانست اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد کچھ مدت تک وحی بند رہی۔ اسے زمانہ فترت کہتے ہیں۔ پھر وحی متواتر طور پر ہوتی رہی۔ چنانچہ اس کی نسبت صحیح بخاری میں اس طرح مروی ہے کہ: ’’**بینا انا امشی اذ سمعت صوتا من السمآء فرفعت بصری فاذا الملک الذی جاء نی بحراء جالس علی کرسی بین السمآء والارض فرعبت منه** (صحیح بخاری) ‘‘رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں باہر چل رہا تھا، جاتے جاتے آسمان سے ایک آواز سنی جب نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حرا میں آیا تھا زمین وآسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ پس میں اس سے ڈر گیا۔ یہ واقعہ دوسری دفعہ کی وحی کا ہے۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اپنی ملکی صورت میں دو دفعہ دیکھا ہے۔ ایک بار تو اوائل وحی میں، جس کا بیان اوپر کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ اسی کی نسبت سورۂ تکویر میں فرمایا: ’’**ولقد راٰه بالافق المبین** (تکویر:۲۳) ‘‘بے شک ہمارے پیغمبر ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام فرشتہ کو آسمان کے مطلع صاف میں دیکھا ہے۔

اور اسی کی بابت سورۂ نجم کے شروع میں فرمایا کہ: ’’**فاستویٰ بالافق الا علیٰ** (النجم:۶،۷) ‘‘جس وقت وہ فرشتہ آسمان کی ایک طرف اچھی اونچی جگہ میں تھا تو اپنی اصلی صورت میں سارے کا سارا پیغمبر ﷺ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

دوسری دفعہ شب معراج میں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔

چنانچہ اس کا بیان بھی سورۂ نجم میں اس طرح فرمایا: ’’**ولقد راٰه نزلة اخریٰ عند سدرة المنتهیٰ عندها جنت الماویٰ** (النجم:۱۳تا۱۵) ‘‘بے شک اس

پیغمبر ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں جنت الماویٰ ہے ایک اور دفعہ بھی ان کی اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں اس رویت کا ذکر بھی آیا ہے۔ بغرض اختصار اس جگہ نقل نہیں کیا گیا۔

صحیح بخاری باب بدء الوحی میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے تو آپ نے منجملہ اور صورتوں کے ایک یہ فرمائی کہ:''واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول (صحیح بخاری)'' کبھی میرے پاس وہ فرشتہ آدمی کی صورت میں ہوکر آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔

اسی طرح صحیح بخاری کے اسی باب میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: ''فاذا انطلق جبریل قرء النبی کما قرء (بخاری)'' جب جبرئیل قرآن شریف سکھا کر آپ کے پاس سے چلے جاتے تو پیچھے نبی ﷺ پڑھا کرتے۔ جس طرح جبرئیل نے پڑھا ہوتا۔

اسی طرح صحیح بخاری کے اسی باب میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: ''کان رسول اللہ ﷺ اجود الناس وکان اجود مایکون فی رمضان حین یلقاہ جبریل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القرآن (صحیح بخاری)'' رسول اللہ ﷺ عموماً سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خاص کر رمضان شریف میں جب آپ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے تو بہت ہی سخاوت کرتے اور جبرئیل علیہ السلام کا معمول تھا کہ رمضان میں ہر رات آپ ﷺ کے پاس آتے اور قرآن شریف کا دور کرتے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ ایک شخص بڑے سفید کپڑوں والا اور بڑے سیاہ بالوں والا آیا۔ اس پر کوئی اثر سفر کا بھی معلوم نہ ہوتا تھا اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاس دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ اپنے زانو آپ ﷺ کے زانوؤں سے ملا دیئے اور اپنے ہاتھ رانوں پر رکھے اور آپ ﷺ سے اسلام پھر ایمان پھر احسان کی بابت سوال کر کے قیامت کی بابت پوچھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کے ہر سوال کا جواب فرماتے اور وہ اس کی تصدیق کرتا۔ پھر وہ شخص چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا:''یا عمر اتدری من السائل'' یعنی اے عمر! کیا تو جانتا ہے کہ یہ پوچھنے والا کون تھا؟ میں نے عرض

کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی جانے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جبرئیل تھا۔ تم کو دین سکھانے کے لئے آیا تھا۔

اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی اپنی کتاب میں روایت کیا۔ نیز ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام بیت اللہ کے پاس دو دفعہ میرے امام بنے۔ دیکھو یہاں کس طرح صریح صریح نزول ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ چھاؤں یا عکس کے پیچھے نماز تو وہی پڑھے گا جو مخبوط الحواس ہو۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے برابر دس نمازیں جبرئیل علیہ السلام کے پیچھے پڑھیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں آگے مذکور ہے اور یہ حدیث تعلیم اوقات کی ہے۔ اس کا اصل بخاری اور مؤطا امام مالک میں بھی ہے۔ یہ ایک ایسی بیّن دلیل ہے کہ عقلمند کو اس کے ماننے سے چارہ نہیں ہے۔

معراج کی حدیث حضرت ابوذر اور انس بن مالک اور مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہم سے بخاری اور مسلم میں روایت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور مجھے براق پر سوار کر کے پہلے بیت المقدس میں لے گئے۔ پھر پہلے آسمان پر پھر دوسرے آسمان پر، اسی طرح ساتویں آسمان پر پہنچ کر اپنے مقام معلوم یعنی سدرۃ المنتہٰی پر ٹھہر گئے۔ معراج جسمانی کا ثبوت رسالہ ''سلم الوصول'' میں بہت تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ شائق تفصیل اس کا مطالعہ کرے۔

حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کی بشارت کے لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے نزول کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں اس طرح بیان فرمائی کہ: ''فارسلنا الیھا روحنا فتمثّل لھا بشراً سویّا (المریم:۱۷)'' ہم نے اس کے پاس روح القدس یعنی جبرئیل کو بھیجا۔ پس وہ مریم کے سامنے ایک پورے جوان بشر کی شکل میں آ کھڑا ہوا۔

اب سب آیات واحادیث سے نزول جبریلی ایسا عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

۲...... ملائکہ کی دوسری خدمت دشمنان خدا ورسول کو ہلاک کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ قرآن شریف میں تیرہ جگہ وارد ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ کچھ فرشتے بصورت بشری حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپ نے ان کو مہمان تصور کیا اور بہت جلدی ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر کے اور اس کے کباب بھون کر ان کے

سامنے لا حاضر کیا۔ جب آپ نے ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہ دیکھے تو آپ ڈرے کہ مبادا دشمن ہوں۔ انہوں نے کہا: ڈرو نہیں ہم تو تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں۔ آپ کو ایک لڑکے یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دینے اور لوط علیہ السلام کی قوم کو عذاب کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان سے عذاب کے بارے میں گفتگو کی۔ پھر وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس گئے۔ ان کی قوم ان کو خوبرو لڑکے دیکھ کر ان کے اندر گھس آئی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے منت کی کہ میرے مہمانوں کو نہ ستاؤ۔ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ آپ کچھ خوف نہ کریں ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ آپ تک ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔ ہم اس بستی کو الٹا کر ہلاک کرنے کے لئے آئے ہیں۔ پس ایسا ہی ہوا۔

یہ سارا قصہ قرآن شریف میں موجود ہے۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہے کہ فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔ ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے معلوم کرنے میں غلطی نہ لگتی اور آپ ان کے سامنے بچھڑا کباب کر کے نہ رکھتے اور قوم لوط ان کو خوبصورت لڑکے تصور کر کے ان پر نہ کود پڑتی۔ کیا یہ سب معاملے چھاؤں یا عکس کے ساتھ کئے گئے؟ عقل! عقل!!

۳...... تیسری قسم کی خدمت کتابت اعمال ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ انفطار میں فرماتا ہے کہ: ’’وان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون (انفطار:۱۰،۱۱)‘‘ ہم نے تم پر محافظ کراماً کاتبین بزرگ فرشتے لکھنے والے چھوڑے ہوئے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں۔

بخاری باب الملائکہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ’’الملائکة یتعاقبون ملائکة باللیل وملائکة بالنهار ویجتمعون فی صلٰوة الفجر والعصر ثم یعرج الیه الذین یأتوا فیکم فیسالهم وهوا علم فیقول کیف ترکتم فیقولون ترکناهم یصلون واتیناهم یصلون (بخاری باب الملائکة)‘‘ کچھ فرشتے دن کو اور کچھ رات کو یکے بعد دیگرے اترتے ہیں اور عصر اور فجر کے وقت آپس میں ملتے ہیں۔ یعنی عصر کے وقت رات کے آتے ہیں اور دن کے چلے جاتے ہیں اور فجر کو رات کے چلے جاتے ہیں اور دن کے آجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے باوجود جاننے کے ان سے پوچھتا ہے کہ میرا بندہ کس حال میں تھا؟ وہ کہتے ہیں کہ الٰہی ہم جب گئے تھے تب بھی وہ نماز میں تھا اور جب آئے ہیں تب بھی نماز میں تھا۔ دیکھو! اس تبدیلی اور جانے آنے سے جسمانی نزول ثابت ہوتا ہے یا عکس۔ اگر عکس ہی نازل ہوتا ہے تو اس تبدیلی کے کیا معنی؟

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ ہر بندے پر دو فرشتے ہیں جو اعمال لکھتے جاتے ہیں۔ ایک نیکی اور دوسرا بدی۔ نیکی والا دائیں کندھے پر اور بدی والا بائیں کندھے پر ہے۔

اسی طرح سورۂ ق میں فرمایا کہ:''ما یلفظ من قول الالدیه رقیب عتید (ق)''انسان جو کچھ بولتا ہے لکھنے والا فرشتہ جو اس پر ایک تیار محافظ ہے اس کو جھٹ لکھ لیتا ہے۔

۴...... ملائکہ کی چوتھی خدمت مردوں کا حساب ہے۔ ان کو منکر نکیر کہتے ہیں۔ چنانچہ جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ مردے کو دفن کر کے واپس آ جاتے ہیں تو اس کے پاس دو فرشتے سیاہ رنگ والے نیلی آنکھوں والے آتے ہیں ایک کا نام منکر ہے اور دوسرے کا نکیر۔ اس حدیث کا اصل صحیح بخاری میں ہے۔

۵...... ملائکہ کی پانچویں خدمت قبض ارواح ہے۔ چنانچہ سورۂ الٓم السجدة میں فرمایا:''قل یتوفّٰکم ملک الموت الذی وکلّ بکم ثم الی ربکم ترجعون (الٓم سجده:۱۱)'' اے پیغمبر ﷺ ان سے کہہ دو کہ تم کو قبض کرلے گا ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

جان کندن اور حساب قبر کی کیفیت حدیث شریف میں اس طرح آئی ہے:''عن البراء بن عازب ؓ قال خرجنا مع النبی ﷺ فی جنازة رجل من الانصار فانتهینا الی القبر ولما یلحد فجلس رسول اللہ ﷺ وجلسنا حوله کان علیٰ رؤسنا الطیر وفی یده عو دینکت به فی الارض فرفع رأسه فقال استعیذوا باللہ من عذاب القبر مرتین اوثلٰثا ثم قال ان العبد المؤمن اذا کان فی انقطاع من الدنیا واقبال من الاٰخرة نزل الیه ملائکة من السمآء بیض الوجوه کان وجوههم الشمس معهم اکفان من اکفان الجنة وحنوط من حنوط الجنة حتی یجلسوا منه مد البصر ثم یجئ ملک الموت حتی یجلس عند رأسه فیقول ایتها النفس الطیبة اخرجی الی مغفرة من اللہ ورضوان قال فتخرج تسیل کما تسیل القطرة من السقاء فیاخذها فاذا اخذها لم یدعوها فی یده طرفة عین حتی یاخذوها ویجعلوها فی ذالک الکفن وفی ذالک الحنوط وتخرج منها کاطیب نفحة مسک وجدت علی وجه الارض قال فیصعدون بها فلا یمرون یعنی بها علی ملاء من الملائکة الا قالوا ما هذا الروح الطیب فیقولون فلان بن فلان باحسن الاسمآء التی کانوا یسمونه بها فی الدنیا حتی ینتهوا بها الی السمآء الدنیا

فیستفتحون له فیفتح لهم فیشیعه من کل سمآء مقربوها الی السمآء التی تلیها حتی ینتهی به الی السمآء السابعة فیقول الله اکتبوا کتاب عبدی فی اعلیٰ علیین واعیدوه الی الارض فانی منها خلقتهم وفیها اعیدم ومنها اخرجهم تارة اخریٰ قال فتعاد روحه فی جسده قیاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربک فیقول ربی الله فیقولان ما دینک فیقول دینی الاسلام فیقولان له ما هذا الرجل الذی بعث فیکم فیقول هو رسول الله ﷺ فیقولان له وما علمک فیقول قرأت کتاب الله فاٰمنت به وصدقت فینادی عناد من السمآء ان صدق عبدی فافرشوه من الجنة والبسوه من الجنة وافتحوا له بابا الی الجنة قال فتاتیه من روحها وطیبها فیفسح له فی قبره مدبصره قال ویاتیه رجل حسن الوجه حسن الشیاب طیب الریح فیقول البشنر بالذی یرک هذا یومک الذی کنت توعد فیقول له من انت فوجهک الوجه یجیئ بالخیر فیقول رب اقم الساعة حتی ارجع الی اهلی ومالی قال وان العبد الکافر اذا کان فی انقطاع من الدنیا واقبال من الاٰخرة نزل الیه من السمآء ملائکة سوادا الوجوه معهم المسوح فیجلسون منه مد البصر ثم یحیئ ملک الموت حتّٰی یجلس عند رأسه فیقول ایتها النفس الخبیثة اخرجی الیٰ سخط من الله قال فتفرق فی جسده فینتزعها کما ینزع المسفود من الصوف المبلول فیاخذحا فاذا اخذها لم یدعوها فی یده طرفة عین حتی یجعلوها فی تلک المسوح وتخرج منها کانتن ریح جیفة وجدت علی وجه الارض فیصعدون بها فلا یمرون بها علےٰ ملاء من المائکة الّٰا قالوا ما هذ الروح الخبیث فیقولون فلان بن فلان باقبح اسمآئه التی کان یسمی بها فی الدنیا حتی ینتهی به الی السمآء الدنیا فیستفتح له فلا یفتح له ثم قرٔ رسول الله ﷺ لا تفتح لهم ابواب السمآء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط (الاعراف:۴۰) فیقول الله عزوجل اکتبوا کتابه فی سجین فی الارض السفلی فتطرح روحه طرحا ثم قرأ ومن یشرک بالله فکانما خرمن السمآء فتخطفه الطیر اوتهوی به الریح فی مکان سحیق فتعاد روحه فی جسده ویاتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له من ربک فیقول هاه هاه لا ادری فیقولان له ما

دینک فیقول ھاہ ھاہ لا ادری فیقولان له ماھذا الرجل الذی بعث فیکم فیقول ھاہ ھاہ لا ادری فینادی مناد من السمآء ان کذب فافرشوہ من النار وافتحو اله بابا الی النار فیاتیه من حرھا وسمومھا ویضیق علیه قبرہ حتی تختلف فیه اضلاء ویاتیه رجل قبیح الوجه قبیح الثیاب منتن الریح فیقول البشر بالذی یسؤک ھذا یومک الذی کنت توعد فیقول من انت فوجھک الوجه یجیٔ بالشر فیقول انا عملک الخبیث فیقول رب لاتقم الساعة وفی روایة نحوہ وزاد فیه اذا اخرج روحه صلے علیه کل ملک بین السمآء والارض وکل ملک فی السمآء وفتحت له ابواب السمآء لیس من اھل باب الاوھم یدعون اللّٰه ان یعرج بروحه من قبلھم وتنزع نفسه یعنی الکافر مع العروق فیلعنه کل ملک بین السمآء والارض وکل ملک فی السمآء وتغلق ابواب السمآء لیس من اھل باب الاوھم یدعون اللّٰه ان لا یعرج روحه من قبلھم (رواہ احمد، مشکوٰۃ)‘‘

براء بن عازب کہتے ہیں کہ ہم انصار یعنی مدنی اصحاب میں سے ایک شخص کے جنازے پر نبی ﷺ کے ساتھ گئے۔ ہم قبر پر پہنچ گئے اور ابھی وہ دفن نہیں کیا گیا تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے گرد ایسی حالت میں بیٹھ گئے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے ہیں۔ یعنی نہایت ادب کے ساتھ چپ چاپ بیٹھے تھے اور آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس کے ساتھ متفکرانہ طور پر زمین میں کریدتے تھے اور خط کھینچتے تھے تو پھر آپ نے اپنا سر اٹھا کر دو یا تین بار فرمایا کہ عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔ پھر فرمایا کہ جس وقت کوئی مؤمن دنیا سے علاقہ توڑ کر آخرت میں جانے کو ہوتا ہے تو اس کی طرف فرشتے اترتے ہیں۔ ان کے چہرے آفتاب کی طرح نورانی ہوتے ہیں اور ان کے پاس بہشت کے کپڑوں سے کفن اور جنت کی خوشبو ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اس قریب المرگ مؤمن کے سامنے نظر کی دوری تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے پاک جان! چل اللہ تعالیٰ کی بخشش اور خوشنودی کی طرف۔ پس وہ پاک جان ایسی سہولت سے نکلتی ہے جس طرح پانی کی مشک سے قطرہ۔ پس ملک الموت اس جان کو قبض کر لیتا ہے اور اس سے وہ دوسرے فرشتے جھٹ سے ایک لحہ میں لے لیتے ہیں اور اس کفن اور خوشبو میں لپیٹ لیتے ہیں اور اس سے ایسی عمدہ کستوری کی خوشبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر کہیں پائی نہ جائے۔ پس وہ اس کو

لے چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں وہ سب کہتے ہیں کہ کیا ہے یہ پاک روح؟ وہ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں کی روح ہے اور اس کو اس نیک لقبوں سے یاد کرتے ہیں جن سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا۔ اسی طرح سوال وجواب ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کو پہلے آسمان تک لے پہنچتے ہیں۔ پس ان کے لئے آسمان کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ پس ہر آسمان کے بعض مقرب فرشتے دوسرے آسمان تک اس روح کے ساتھ ہولیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کو ساتویں آسمان تک لے پہنچتے ہیں اور جناب الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کا اعمال نامہ علیّین میں ثابت رکھو اور اس کی روح کو زمین کی طرف جہاں اس کا بدن مدفون ہے واپس لے جاؤ۔ کیونکہ میں نے ان کے بدنوں کو مٹی ہی سے پیدا کیا ہے اور اسی میں پھر بھیجتا ہوں اور پھر دوسری بار قیامت کو اسی سے نکالوں گا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس کی روح بدن کی طرف واپس لائی جاتی ہے۔ پس اس کے پاس دو فرشتے منکر اور نکیر آتے ہیں اور اس کو بٹھلاتے ہیں۔ پھر اس سے پوچھتے ہیں: کون ہے رب تیرا؟ وہ مؤمن کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ پھر پوچھتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ پھر پوچھتے ہیں کہ جو شخص تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا وہ کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ہے۔ پھر فرشتے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کس طرح جانا۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کی دل سے تصدیق کی۔ پس آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ پس اس کے لئے جنت میں سے بچھونا بچھاؤ اور اس کو جنت ہی کا لباس پہناؤ اور اس کے لئے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ پس اس کو جنت کی ہوا اور خوشبو آتی ہے اور اس کی قبر اس کی نظر کی دوری تک کشادہ ہو جاتی ہے اور اس کے پاس ایک شخص خوبصورت اچھے لباس والا خوشبو والا آتا ہے اور اس کو کہتا ہے: تجھے ان چیزوں کی خوشخبری ہو جن سے تو خوش ہووے۔ یہ وہی دن ہے جس کا تجھ کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ پس وہ مؤمن اس خوبرو شخص کو پوچھتا ہے تو کون ہے تیرا چہرہ بہت اچھا ہے اور بھلائی کی خبر لاتا ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ میں تیرا عمل صالح ہوں۔ پس وہ شخص کہتا ہے کہ الٰہی مجھے تھوڑی مہلت دے تا میں اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ جاؤں اور ان کو اس حال سے خبردار کروں اور اپنا مال تصدق کروں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت کافر آدمی دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جانے کو ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے فرشتے آتے ہیں۔ ان کے منہ سیاہ ہوتے ہیں اور ان کے پاس ٹاٹ

ہوتے ہیں۔ پس نظر کی دوری تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ اے خبیث جان! چل اللہ کے غضب کی طرف پس وہ ناپاک جان بدن میں چھپتی پھرتی ہے۔ پس ملک الموت اس کو اس طرح سختی سے کھینچتا ہے جس طرح گیلے صوف میں سے لوہے کی گرم سلائی کھینچی جائے اور وہ صوف اس کے ساتھ چمٹ جاتی ہے اور میخ صفائی کے ساتھ نکل نہیں سکتی۔ پس ملک الموت اس جان کو لے لیتا ہے اور وہ دوسرے فرشتے جھٹ ایک لمحہ میں اس سے لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں۔ پس اس روح سے مردار کی سی ایسی گندی بدبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر کہیں پائی جائے۔ پس اس کو اوپر لے چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں۔ وہ سب کہتے ہیں کہ کیا ہے یہ خبیث روح۔ پس وہ فرشتے کہتے ہیں کہ فلاں بن فلاں کی روح ہے اور اس کو ان برے ناموں اور لقبوں سے یاد کرتے ہیں جن سے وہ دنیا میں بلایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کو پہلے آسمان تک لے پہنچتے ہیں۔ پس اس کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے سورۂ اعراف کی آیت پڑھی کہ ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ جس طرح کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ نہیں گزرسکتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ثابت رکھو اعمال نامہ اس کا سجین میں۔ پھر اس کی روح زور سے پھینکی جاتی ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے سورۂ حج کی یہ آیت پڑھی اور جو شخص شریک بناوے ساتھ اللہ کے پس گویا کہ وہ گرا آسمان سے پس اچک لیتے ہیں اس کو پرندے یا پھینک دیتی ہے اس کو ہوا کسی دور کے مکان میں۔ پس اس کی روح پھر اس کے جسم میں پھونکی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور وہ اس کو سیدھا بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کافر کہتا ہے: ہاہ، ہاہ! میں نہیں جانتا۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ہاہ، ہاہ! میں نہیں جانتا۔ پھر وہ پوچھتے ہیں کہ جو شخص تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا اس کی نسبت تیرا کیا اعتقاد ہے؟ وہ کہتا ہے: ہاہ، ہاہ! میں نہیں جانتا۔ پس ایک آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے کہ اس نے سب کچھ جھوٹ کہا۔ پس اس کے لئے دوزخ کا فرش بچھاؤ اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو۔ پس اس کو دوزخ کی گرم اور زہریلی ہوا آتی ہے اور اس کی قبر یہاں تک تنگ کی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں مقابل میں ایک دوسری میں پھنس جاتی ہیں اور اس کے پاس ایک شخص نہایت بری شکل والا گندے لباس والا گندی بو والا آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس چیز کی خبر سن جو تجھے بری لگے۔ پس وہ کافر اس کو پوچھتا

ہے تو کون ہے کہ تیرا چہرہ برائی لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے تیرا برا عمل ہوں۔ پس وہ کہتا ہے کہ اے میرے رب قیامت قائم نہ کیجو۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا: رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ پر نکلے تو آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کو سوار دیکھ کر فرمایا: ''الاتستحیون ان ملائکة الله علی اقدامهم وانتم علی ظهور دوابکم'' یعنی کیا تم حیا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے پیدل چلتے ہیں اور تم سواریوں پر ہو۔

دیکھو حدیث کیسی وضاحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ فرشتے اپنے جسم کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں۔

۶...... بعض فرشتے مؤمنوں کے ساتھ ذکر الٰہی میں شامل ہونے کے لئے زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری کے باب الملائکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''اذا کان یوم الجمعة کان علی کل باب من ابواب المسجد الملائکة یکتبون الاول فالاول فاذا جلس الامام طووا صحفهم وجأ ویستمعون الذکر (بخاری)'' جمعہ کے دن مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے ہوتے ہیں جو آنے والے نمازیوں کے نام لکھتے رہتے ہیں۔ پس جب امام خطبہ پڑھنے لگتا ہے تو ان کتابوں کو لپیٹ لیتے ہیں اور وعظ سنتے ہیں اور ذکر میں مؤمنوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ ذکر اور احادیث میں بھی ہے۔

۷...... بعض فرشتے لوگوں کو آفات سے محفوظ رکھنے کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ رعد میں فرمایا کہ: ''له معقبٰت من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر الله (الرعد:۱۱)'' اللہ تعالیٰ نے انسان کے آگے اور پیچھے فرشتے مقرر کئے ہیں جو اللہ کے امر سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

۸...... بعض فرشتے میدان جنگ میں مؤمنوں کی مدد کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ''اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملٰئکة مردفین (الانفال:۹)'' جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کی کہ ہم لگاتار ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے۔

تفسیر جامع البیان میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ: ''فقد نقل عن

علی ؓ ان جبریل فی الف عن میمنة النبی ﷺ وفیها ابوبکر ومیکائیل فی الف سنن میسرته وانا فیها (جامع البیان) ’’حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے دائیں طرف ایک ہزار فرشتے کے سردار لشکر حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اور حضرت ابوبکر ؓ بھی اس طرف تھے اور بائیں طرف حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتے کو لئے ہوئے تھے اور میں ان میں تھا۔ دیکھو حضرت علی ؓ نے ان سب کو دیکھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ہم پر کوئی کافر چڑھ کر آتا تو رستے ہی میں اس کا سر کٹ جاتا۔ ہم حیران ہوتے (دو قاتل فرشتے ہی تھے) ایک اور روایت میں ہے کہ ہم فرشتوں کو دیکھتے تھے کہ سیاہ پگڑیاں ان کے سر پر ہیں اور ہمارے دشمنوں کو مار رہے ہیں۔

۹...... بعض فرشتے صرف اس کام پر لگے ہوئے ہیں کہ مؤمنوں کی طرف سے جو کچھ درود شریف پڑھا جاتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ سنن نسائی میں ہے: ’’ان ﷲ ملٰئکة سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام‘‘ یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض فرشتے ایسے ہیں جو زمین میں سیر کرتے رہتے ہیں اور جہاں کوئی میری امت میں سے مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچاتے ہیں۔

الغرض قرآن شریف کی کئی آیات اور کئی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ فرشتے اپنے جسم کے ساتھ زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ دیگر آیات واحادیث بوجہ اختصار اس جگہ نہیں لکھی گئیں۔

اعلان

اگر مرزا قادیانی ان رسائل ثلاثہ یعنی شہادت القرآن اور سلم الوصول اور نزول الملائکہ کے دلائل کو ضعیف اور غلط ثابت کر کے ان رسائل کے مدعا کے خلاف کو بدلائل قرآنیہ پایۂ ثبوت تک پہنچا دیں تو بندہ اپنے قلم کو توڑ دے گا اور مسیح علیہ السلام کے رفع آسمانی اور رسول اللہ ﷺ کے معراج جسمانی کے خلاف پر اعتقاد کر لینے میں ہرگز تأمل نہیں کرے گا اور میں اس امر کو نہایت زور سے بآواز بلند ظاہر کرتا ہوں کہ مرزا قادیانی اس امر میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے اور ہرگز نہیں ہوسکیں گے۔ رسالہ شہادۃ القرآن کا جواب مرزا قادیانی کی لیاقت علمی سے باہر ہے۔

’’وانا العبد المفتقر الی ﷲ الکریم محمد ابراهیم السیالکوٹی‘‘

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

کھلی چٹھی

یہ قادیانی غلام رسول راجیکی کے نام
مولانا محمد ابراہیم نے لکھی

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(بخدمت دوست قدیمی مولوی غلام رسول صاحب احمدی حال وارد سیالکوٹ شہر)

''احمدیہ ینگ فوک ایسوسی ایشن'' نے ایک دوورقہ نمبر۵ شائع کیا ہے جسے آپ کے قلم کا لکھا ہوا ظاہر کیا گیا ہے۔ سیکرٹری صاحب نے اس کے دوسرے صفحہ پر اپنی طرف سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے: ''آپ نے محلّہ اراضی یعقوب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مرزا قادیانی کو قرآن نہیں آتا تھا۔ کوئی مرزائی قرآن تک صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ میں مولوی غلام رسول کو مناظرہ کے لئے چیلنج کرتا ہوں۔''

مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اظہار صداقت کے لئے آپ کو ایک زریں موقعہ عطاء فرمایا ہے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ مکرمی مولوی غلام رسول صاحب قرآن تک صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ مگر وہ نہ صرف آپ سے بلکہ علماء سیالکوٹ میں سے کسی مدعی علم وفضل کے ساتھ عربی زبان میں تحریری مناظرہ بالمشافہ بیٹھ کر پرچہ لکھنے کی صورت میں کرنے کے لئے تیار ہیں۔

سیکرٹری صاحب نے مجھے مخاطب کر کے ستم یہ کیا کہ یہ دوورقہ یا اپنا خطابی رقعہ مجھ تک نہ پہنچایا۔ یہ کہنا کہ آخرتم کو کسی نہ کسی طریق سے پہنچ ہی گیا۔ درست نہیں ہوگا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ میں بھی قدیمی دوستی آپ سے براہ راست گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ رپورٹر نے میرا مطلب درست طور پر نقل نہیں کیا۔ میں نے اراضی یعقوب کے وعظ میں یہ کہا تھا کہ مرزا قادیانی کی کتابوں میں کثرت سے ایسی عبارات پائی جاتی ہیں جن کو آیات قرآنیہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہ اس ترتیب سے جو مرزا قادیانی نے لکھی ہے قرآن شریف میں نہیں ہیں یا تو یہ تحریف کتاب اللہ ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا قادیانی کو قرآن نہیں آتا تھا اور یہ بات مرزا قادیانی ہی پر موقوف نہیں بلکہ ان کی جماعت کے جن علماء سے مجھے مناظرہ کا واسطہ پڑا۔ میں نے ان کو قرآن شریف کی آیات غلط پڑھتے ہی پایا۔ حتیٰ کہ میرے قدیمی دوست مولوی غلام رسول صاحب جو آج کل سیالکوٹ میں نزول فرما ہیں۔ ان کو بھی قرآن شریف کی بعض آیات غلط پڑھتے پایا۔ اس کے جواب میں یہ لکھنا کہ آپ مباحثہ کے لئے تیار ہیں، درست نہیں۔ کیونکہ میرا قول ایک خاص امر کی حکایت میں ہے جس کا صدق وکذب شہادات پر موقوف ہے نہ کہ آپ کے عربی دان عالم ہونے یا نہ ہونے پر۔ بلکہ صحیح طریقہ تحقیقات کا یہ

ہے کہ اگر آپ واقعات مندرجہ............................

(ایک سطر ہمارے پاس موجود نسخہ میں کٹی ہوئی ہے۔مرتب!) آیات نکال کر حفاظ کے سامنے پیش کر دیں۔ پس میرا دعویٰ کہ مرزا قادیانی نے کتاب اللہ کی تحریف کی یا ان کو قرآن شریف کی آیات صحیح طور پر یاد نہ تھیں، غلط ہو جائے گا اور قرآن شریف میں سے نہ دکھا سکنے پر آپ کو دونوں باتوں میں سے یعنی تحریف کتاب اللہ یا حفظ کی خرابی جو آسان نظر آوے قبول کر لیں۔ بس قصہ ختم! اور آپ کی ذات خاص اور دیگر علماء احمدیہ کی نسبت جن سے مجھے مباحثات کا واسطہ پڑا جو میں نے آیات قرآنیہ کا غلط پڑھنا ذکر کیا ہے۔اس کی تحقیقات بھی شہادات سے ہونی چاہئے۔ چونکہ اب آپ سیالکوٹ میں مقیم ہیں۔ اس لئے سیالکوٹ میں قریب تر جو مباحثہ قلعہ سرکاری پر ہوئے تھے، ان کی تحقیقات کے لئے سیالکوٹ کے ان حفاظ کو جو ان مباحثات میں موجود تھے، ایک عام مجلس میں جمع کر کے آپ کے انکار کے بعد ان حفاظ سے شہادتیں لے جائیں گی کہ احمدی علماء قرآن شریف کی آیات غلط پڑھتے تھے یا نہیں؟ اور حفاظ ان کو ٹوکتے تھے یا نہیں؟

حفاظ کی شہادت سے پیشتر آپ کو حلفاً پوچھا جائے گا کہ آیا قلعہ والے مباحثات میں آپ کے جملہ مناظر علماء کے آیات پڑھنے پر حفاظ، ان کو اکثر موقع پر ٹوکتے تھے یا نہیں۔ جس پر آپ لوگ فریاد مچاتے تھے یا نہ، کہ دیکھو جی ہماری تقریر میں خلل ڈالتے ہیں اور حافظ لوگ اس کا یہ جواب دیتے تھے یا نہیں؟ کہ جب نماز کے اندر لقمہ دینے کی اجازت ہے تو مباحثہ میں آیات قرآنی کی تصحیح کیوں منع ہے۔ آپ اپنے علماء احمدیہ کو کیوں نہیں کہتے کہ وہ قرآن شریف کی آیات صحیح پڑھیں۔ مرزا قادیانی کی بعض غلط آیات اس جگہ بطور نمونہ لکھی جاتی ہیں۔ آپ مباحثہ کی مجلس سے پیشتر تحریری طور پر ہی قرآن شریف کی ورق گردانی کر کے اور حفاظ سے دریافت کر کے ان کا پتہ بتا دیں تو سارے قصے ختم ہو جائیں گے۔ وہ آیات یہ ہیں:

نمبر شمار	تحریف کردہ یا غلط آیت	مرزا قادیانی کی کتاب
۱	یایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً ویجعل لکم نوراً تمشون بہ	(آئینہ کمالات یا دافع الوساوس ص۱۷۷، ایڈیشن اوّل) اس کے علاوہ اسی کتاب میں متعدد جگہ اسی طرح لکھا ہے۔

۲	یوم یأتی ربک فی ظلل من الغمام	(حقیقت الوحی ص۱۵۴، ایڈیشن اوّل)
۳	جادلھم بالحکمة والموعظة الحسنة	(البلاغ یا فریاد درد ص۸، نیز ص۱۰، ونیز ص۲۳، ایڈیشن اوّل)
۴	جادلھم بالحکمة	(البلاغ یا فریاد درد ص۱۷، ایڈیشن اوّل)
۵	الم یعلموا انه من یجادد اللہ ورسوله یدخله ناراً خالداً فیھا ذالک الخزی العظیم	(حقیقت الوحی ص۱۳۰، ایڈیشن اوّل)
۶	عسٰی ربکم ان یرحم علیکم	(براہین احمدیہ ج۱ حاشیہ ص۵۰۵، ایڈیشن اوّل)
۷	اٰمنت بالذی اٰمنوا به بنوا اسرائیل	(رسالہ استفتاء حاشیہ ص۲۲، ایڈیشن اوّل)

یہ چند حوالے بطور نمونہ کے لکھے گئے ہیں۔ اگر آں مکرم ان کے حوالے صحیح بتادیں گے تو یہ عاجز آپ کا شکرگزار ہوکر دوسری قسط میں دیگر حوالہ جات بھی دریافت کر کے پیش کر دے گا۔

ان غلط یا تحریف کردہ آیات کے متعلق یہ عذر کہ سہو کاتب سے غلط لکھی گئی ہیں۔ درست نہیں ہوگا کیونکہ اوّل تو بعض آیات مرزا قادیانی نے متعدد جگہ اسی طرح لکھی ہیں۔ کاتب ہر جگہ پر عین وہی غلط الفاظ نہیں لکھا کرتا۔ دیگر کہ مرزا قادیانی نے ان کا جو ترجمہ خود لکھا ہے وہ عربی عبارت کے مطابق ہے۔ کیا اسے بھی کاتب نے بدل ڈالا۔ **فافھم ولا تکن من القاصرین!**

<u>نوٹ دیگر:</u> اور آں مکرم (مولوی غلام رسول صاحب احمدی) نے ٹریکٹ نمبر۲ کے تیسرے صفحہ پر جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ سورۂ تکویر ....

(یہاں نسخہ میں ایک سطر کٹی ہوئی ہے۔ مرتب!) ان سورتوں میں سے جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ ایسے الفاظ دکھادیں جن کا ترجمہ یہ ہو۔ یہ نشانات مسیح موعود کے زمانہ ظہور کے ہیں۔ اگر نہ دکھا سکیں تو واضح ہو جائے گا کہ آپ لوگ بانیٔ سلسلہ سے لے کر اس کے متبعین تک قرآن شریف کی تحریف لفظی ومعنوی ہر دو کے مرتکب ہیں۔

جواب کا منتظر: آپ کا دوست قدیمی

محمد ابراہیم میراز سیالکوٹ مؤرخہ: ۴؍ستمبر ۱۹۳۸ء

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

رحلت قادیانی
بمرگ ناگہانی

حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

رحلت قادیانی بمرگ ناگہانی

(رحلت قادیانی بمرگ ناگہانی اور فیصلہ ربانی برمرگ قادیانی)

(مصنفہ خاکسار ابراہیم مالک واڈیٹر رسالہ الہادی سیالکوٹ۔ اندر پریس سیالکوٹ میں طبع ہوئی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''سُبْحَانَہٗ مَا اَعْظَمَ شَانَہٗ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ. وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ وَھُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ھُوَ الْحَقُّ وَوَعْدُہُ الصِّدْقُ لَا یُخْلِفُ وَلَا یَکْذِبُ فَلَا شَکَّ فِیْہِ وَلَا اِرْتِیَابَ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی الَّذِیْ لَا یُعْجِزُہٗ شَیْءٌ وَمَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ کَامِلُ الْعِلْمِ وَوَاسِعُ الْقُدْرَۃِ وَبَالِغُ الْحِکْمَۃِ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اَلْاَتَمَّانِ الْاَکْمَلَانِ مَادَامَ الْقَمَرَانِ عَلٰی صَفْوَۃِ خَلْقِہٖ وَنُخْبَۃِ رُسُلِہٖ وَخَاتَمِ اَنْبِیَائِہِ الْمُرْسَلِ بِالْکِتَابِ النَّاطِقِ بِالْحَقِّ وَالصَّوَابِ وَاُوْتِیَ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَخُلَفَائِہِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ وَسَائِرِ الْاَصْحَابِ وَعَلٰی اَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اِلٰی یَوْمِ الْحِسَابِ''

اللہ اللہ! عجیب شان خداوندی ہے کہ جس طرح اس کی ذات کی کنہ میں عقل حیران ہے اور اس کی صفات کی کیفیت میں فکر پریشان ہے، اسی طرح اس کی حکمت میں بھی فہم وقیاس سرگردان ہے۔

''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ. تُوْلِجُ اللَّیْلَ فِیْ النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِیْ اللَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ''

کہیں دن ہے تو کہیں رات ہے، کبھی اجالا ہے اور کبھی اندھیرا ہے، کسی کو اوج عزت پر چڑھاتا ہے اور کسی کو قعر ذلت میں گراتا ہے، اس کو راحت بخشتا ہے تو اس کو گرفتار بلاء وعنا کرتا ہے، ایک کو پیدا کر کے صفحۂ ہستی پر لاتا ہے اور دوسرے کو فنا کر کے اس کی ہستی کو مٹاتا ہے۔

بسا پادشاہاں سلطان نشان بسا پہلوانان کشور ستان
بسا تند گردوان لشکر شکن بسا شیر مردان شمشیر زن
بسا ماہرویان شمشاد قد بسا نازنینان خورشید قد
بسا خوبرویان نو خاستہ بسا نو عروسان آراستہ
بسا نامدار و بسا کامدار بسا سرو قد و بسا گلعذار
کہ کردند پیراہن عمر چاک کشیدند سر در گریبان خاک
چناں خرمن عمر شان شد بباد کہ ہرگز کسے زاں نشانے نداد

اگرچہ اس تحریر کا اصل مقصود یہ ہے کہ مرزا قادیانی کی بعض پیش گوئیوں پر بحث کر کے اس کے دعویٰ رسالت ونبوت اور مسیحیت ومہدویت کو باطل ثابت کیا جائے لیکن چونکہ اس ضمن میں کئی ایک آیات اور خاص کر وعدہ الٰہی کی آیات محققانہ اور عالمانہ طریق پر بیان کر کے قادیانی قرآن دانی کی قلعی بھی کھولی گئی ہے۔ اس لئے اس تحریر کا آئینہ قادیانی کے ساتھ ضم کرنا غیر موزوں نہیں ہے۔

۲۷/ اپریل ۱۹۰۸ء کو جب خاکسار مع برادر مکرم مولوی ثناء اللہ صاحب فاتح قادیان[۱] جلسہ سالانہ انجمن نصرت الاسلام دینا نگر ضلع گورداسپور سے واپس آ رہا تھا تو راستہ میں اسٹیشن بٹالہ سے بعض قادیانی بھی سوار ہوئے، جن کی زبانی معلوم ہوا کہ مرزا قادیانی تبدیل آب وہوا کے لئے کچھ ایام لاہور میں قیام فرمائیں گے۔

اس کے بعد جب خاکسار ۷/ مئی ۱۹۰۸ء کو مکرمی جناب ڈپٹی محمد شریف کے فرزند ارجمند انعام الرحمٰن سلمہ المنان کے عقیقہ کی تقریب پر امرتسر کو جا رہا تھا تو اس دن سیالکوٹ کے کئی ایک مرزائی، مرزا قادیانی کی قدم بوسی کے لئے لاہور جا رہے تھے اور جب خاکسار

[۱] مولوی صاحب ممدوح وفاتح قادیان اس لئے کہا کہ جب آپ حسب طلب مرزا قادیانی ان کی پیش گوئیوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے قادیان میں جا پہنچے تو مرزا قادیانی، چوں موش درسوراخ، بیت الخلوت میں ایسے اینٹھے کہ ہرگز باہر ہی نہ نکلے۔ خیر اب تو باہر نکلنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ مرزا قادیانی اس سے قبل پیش گوئی کر چکے تھے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب قادیان میں نہیں آئیں گے۔ پس چونکہ مولوی صاحب بلائے بے درماں کی طرح قادیان میں جا براجے تو پیش گوئی غلط ہوگئی۔ (ابراہیم میر)

۱۲؍مئی کو امرتسر سے واپس آرہا تھا، تب بھی سیالکوٹ کے بعض مرزائی لاہور سے واپس آرہے تھے، جن سے دریافت کیا کہ لاہور کی آب وہوا عموماً اور موسم گرما میں خصوصاً اس قابل نہیں کہ کوئی شخص اپنے وطن مالوف اور مکان مانوس کو، جہاں اسے ہر طرح کا امن وامان اور ہر قسم کی راحت وآسائش حاصل ہو، چھوڑ کر اس جگہ تبدیل آب وہوا کے لئے قیام کرے۔ اس میں خاکسار نے الحکم اور بدر قادیانی اخباروں کے اس عنوانی شعر کی طرف تعریض کی تھی۔

چہ گوئم با تو گر آئی چہادر قادیان بینی دوا بینی شفا بینی غرض دارالاماں بینی

اور الزاماً کسی ترکی بترکی کہنے والے کے اس جواب کی طرف اشارہ کیا تھا۔

چہ گوئم با تو گر آئی چہادر قادیاں بینی وبا بینی دغا بینی غرض دارزیاں بینی

ناظرین! اس دفعہ امرتسر سے واپس آنے پر خاکسار کی طبیعت ناساز ہوگئی تھی اور بہ سبب ضعف دماغ اور دوران سر کے ہر طرح کی دماغی محنت چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن لاہور کے بعض معزز احباب کے طلب کرنے پر اس خیال سے مجبوراً جانا پڑا کہ لاہور کا جانا وقتی ضرورت ہے۔ اگر اس وقت نہ گیا اور صحت کے انتظار میں رہا اور اس اثناء میں مرزاغلام احمد، قادیان کو رحلت فرما ہوگئے تو لاہور میں جانا لاحاصل ہوگا۔ پس صحت پر لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا جو ہو سو ہو، اس ضرورت کو صحت پر مقدم سمجھنا چاہئے۔ خیر تو کلاً علی اللّٰہ! ۲۲؍مئی ۱۹۰۸ء کو روانہ ہو پڑا۔

۲۳؍مئی کو وہاں کے بعض عمائد نے اشتہار طبع کراکر عام طور پر مشتہر کیا کہ علی التواتر کئی روز تک خاکسار (محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) اور کئی ایک دیگر واعظ بمقام سڑک کیلیانوالی (متصل فرودگاہ مرزاقادیانی) وعظ بیان کیا کریں گے۔

خاکسار کو ۲۶؍مئی تک قبل مغرب اور بعد مغرب ہر روز دو دفعہ موقع ملتا رہا اور علی الترتیب مضامین: (۱) ولادت حضرت مسیح، (۲) آپ علیہ السلام کے معجزات، (۳) تردید صلیب، (۴) آپ علیہ السلام کی رفع سماوی کا ثبوت، بیان ہوئے اور نیز جو دلائل مرزاقادیانی نے اپنے ازالہ اوہام میں حضرت مسیح کی وفات کے متعلق بیان کئے ہیں، ان کے جوابات بھی بیان کئے گئے۔ ان بیانات میں حسب عادت خاکسار ابراہیم نے التزام کیا تھا کہ اثبات دعویٰ کے لئے کوئی امر بھی خارج از قرآن شریف بیان نہیں کیا اور ایسا ہی مرزاقادیانی کے دلائل پر نقض کرنے میں بھی لغت عرب اور قرآن عربی سے ہرگز الگ نہ ہوا۔

غرض حاضرین کے سامنے ان شرائط سے ان مضامین کو بیان کیا۔ ان مضامین کا جو اثر سامعین پر پڑا تھا، اسے وہی جانتے ہیں یا وہ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے یہ مضامین خاکسار کی ناقص زبان سے کبھی سنے ہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

ان بیانات کے علاوہ خاکسار ابراہیم نے بوساطت ڈاکٹر ایم.اے سعید صاحب مالک ڈاکٹر آف انڈیا، میڈیکل لاہور، مرزاقادیانی سے مسئلہ حیات ورفع عیسوی پر تحریری بحث کے لئے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری کیا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۲۵؍مئی کو بعد دوپہر مرزاقادیانی کی جناب میں حاضر ہوکر خاکسار کا رقعہ پہنچایا۔ جس پر مرزاقادیانی نے مولوی محمد احسن صاحب امروہی (قادیانی) کہن سال صاحب تجربہ کو اس خاکسار نوعمر سے گفتگو کے لئے فرمایا۔

مولوی محمد احسن نے بہت جلدی سے فرمان واجب الاذعان قبول کیا۔ اگرچہ اس سے پیشتر جب مرزاقادیانی سیالکوٹ میں آئے تھے اور اسی مسئلہ حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خاکسار سے مولوی صاحب کی تحریر شروع ہوئی تھی تو آپ کو ماشاء اللہ! پہلی ہی تحریر پر ایسا اضطراب وقلق ہوا کہ آپ نے بخار کا بہانہ کر کے سیالکوٹ کو الوداعی سلام کہہ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا کہ مرزاقادیانی کے مولوی محمد احسن کو متعین فرمانے پر مولوی صاحب نے عرض کی کہ ابراہیم (خاکسار میر سیالکوٹی) نے جو گزشتہ رات یہ کہا ہے کہ: ''وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ (المائدہ:۱۱۰)'' صاف پکار رہی ہے کہ عیسیٰ صلیب کے نزدیک تک بھی نہیں گئے، نہ آپ نے اس کی شکل ہی دیکھی۔ چہ جائے کہ اس پر لٹکائے جائیں۔

اس کا تحقیقی جواب کیا ہے؟ سو اس کے متعلق مرزاقادیانی اور مولوی نورالدین سے کچھ بھی بن نہ آیا تو مرزاقادیانی نے گفتگو کا رخ اور طرف پھیر دیا۔ غرض مولوی محمد احسن نے ڈاکٹر ایم.اے سعید صاحب سے کہا کہ اس رقعہ (از خاکسار ابراہیم میر) میں کل تک کی مہلت لکھی ہے، تو ہم اس کا جواب کل دیں گے۔

آہ! ۲۵؍مئی کے بعد ۲۶؍مئی ۱۹۰۸ء کا کل کیا تھا؟ ساری کل ہی بگڑ گئی۔ بات ہی کچھ اور ہوگئی۔ حالت ہی کچھ دگرگوں بدل گئی۔ نہ وہ سمان نہ سامان، اور مرزائیوں کے لئے تو نہ وہ زمین اور نہ آسمان۔

رات کے پچھلے پہر قبل طلوع فجر مرزا قادیانی مدعی مسیحیت صاحب دارالامان کی طبیعت نے نالش کی اور مبتلائے ہیضہ ہوگئے۔

دعویٰ مسیحائی وخود آپ ہیں بیمار

دست شروع ہوئے۔ دو ہی دست آئے کہ حالت بگڑ گئی۔ ضعف بڑھنے لگا۔ رطوبتیں جذب ہوگئیں۔ یہاں تک کہ صبح ہوتے زبان بند ہوگئی۔ کرب واضطراب سے دل بے چین ہوگیا اور مرزا قادیانی دس بجے صبح کے بعد چھ گھنٹے ہی بیمار رہ کر اپنے معتقدین کے سینوں پر داغ مفارقت لگا کر اور اس جہان کو ان کی نظروں میں تیرہ کر کے بغیر سلام وکلام ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

بیوی، بچے، بہوئیں، سرہانے بیٹھے بحر غم میں غرق ہو رہے ہیں اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مرزا قادیانی چپ چاپ چل دیئے۔ نہ کلمہ، نہ کلام، نہ وصیت، نہ سلام۔ بیوی زبان حال سے یہ کہہ رہی تھیں ؎

قَلْبِیْ کَلِیْمٌ بِمُوْسٰی الْبَیْنِ وَ اتَلَقٰی　　اِنْ کَانَ جُرْحُ فِرَاقِیْ غَیْرَ مُنْدَمِلٍ

(یعنی میرا دل جدائی کے استرے سے زخمی ہو رہا ہے۔ اگر میرے فراق کا زخم بھر آنے والا نہ ہوا)

اور اس مضمون کا نقشہ کھڑا کرتی تھیں ؎

شَوْقِیْ اِلَیْکَ شَدِیْدٌ　　کَمَا عَلِمْتَ وَ اَزْیَدُ
وَ کَیْفَ اَذْکُرُ شَیْئًا　　بِہٖ ضَمِیْرُکَ یَشْھَدُ
لَااَمْلِکُ الذَّھَابَ مَعَکَ　　کَمَا اَنَّہٗ رَدُّکَ اَبْعَدُ

(یعنی میرا شوق تیری طرف بہت سخت ہے۔ جیسا کہ تو جانتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ میں اس امر کو کس طرح ذکر کروں جس کی بابت تیرا دل گواہی دیتا ہے۔ لیکن میں تیرے ساتھ چلنے کی مالک نہیں ہوں۔ یعنی موت کی راہ، جیسے کہ تیرا واپس آنا اس سے بھی زیادہ دور ہے)

مریدوں کے لئے خود ان کی جدائی ایک واقعہ جانکاہ وحادثہ ہوشربا تھا۔ غضب تو یہ ٹوٹا کہ ان پیش گوئیوں کے پورا نہ ہونے سے پہلے ہی کوچ کر گئے جن کی نسبت نہایت وثوق

وپختگی سے قسمیں کھا کھا کر الہام ووحی سناتے رہے تھے کہ ان واقعات کا وقوع میری زندگی ہی میں ہوگا۔

ہاہ! ناظرین! مصیبت کے وقت دشمن کو بھی چڑانا نہ چاہئے۔ واقعی اس وقت مرزائیوں کی حالت ترسناک کیا بلکہ ناگفتہ بہ تھی۔ مرزا قادیانی مسیح بے درمان، نبی بے نشان کی مفارقت کے زخموں پر مخالفوں کے سرکوب طعنے اور ملامتیں اور ان کی سینہ سوز اور جگر دوز لعنتیں جن کا سبق خود مرزا قادیانی نے لوگوں کو دوسروں کی موت پر سکھایا تھا۔ نمک پاشی کا کام کرتی تھیں، آہا! کیا سچ کہا گیا ہے ؎

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ　　وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

(یعنی تیروں کے زخم تو بھر آتے ہیں لیکن زبان کے زخم بھرنے میں نہیں آتے)

غرض یہ واقعہ مرزائیوں کے لئے مصیبت پر مصیبت اور آفت پر آفت تھا۔

نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن　　نہ گوش شنفتن نہ زبان گفتن

نہ دل برداشتن و نہ ہمت برخواستن

کئی ایک نے مرزا قادیانی کی زندگی ہی میں مولوی ثناء اللہ صاحب اور ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب پٹیالوی کے مرجانے پر شرطیں باندھ رکھی تھیں، اور اشتہار تبصرہ، جو سچ مچ تبصرہ ثابت ہوا، فریموں میں رکھ کر دیواروں پر لٹکا رکھا تھا۔ مگر ہائے افسوس! موت ایک ایسی زبردست شئے ہے کہ کسی اپنے پرائے کا کچھ بھی تو لحاظ نہیں دیکھتی اور وقت اور بے وقت نہیں پہچانتی۔ ۲۶؍مئی کی آمد نے وہ ساری امنگیں ملیامیٹ کر دیں اور تمام آرزوئیں خاک میں ملا دیں، طبیعت کے جوش فرو ہوکر پژمردگی اور غم سے مبدل ہوگئے اور تعصب اور تعسف دور ہوکر تلہف وتأسف سے بدل گئے۔ ''سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ'' عجب شان ہے تیری ''تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ''

جن مخالفین کو کل نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ آج ان سے نظر چھپانے لگے اور جن کو برسرراہ ٹوکا کرتے تھے۔ آج ان سے روپوش ہونے لگے۔

کسی کو کیا معلوم کل کیا ہوگا؟ ''وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا (لقمان:۳۴)'' اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں مرے گا۔ ''وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان:۳۴)''

مرزا قادیانی کی بے وقت وفات پر ہندو مسلمان اور عیسائی سب فرقوں نے مضمون تحریر کئے اور اپنے اپنے مذاق پر سب نے یہی نتیجہ نکالا کہ مرزا قادیانی اپنی پیش گوئیوں کی رو سے بے وقت مرے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ خبریں منجانب اللہ نہ تھیں۔ لہٰذا مرزا قادیانی فرستادہ خدا اور خدا تعالیٰ سے تعلیم پائے ہوئے نہیں تھے بلکہ ایک مفتری علی اللہ تھے۔ ان تحریروں میں کسی نے تو درشتی سے کام لیا اور کسی نے نرمی سے دبایا یا کسی نے تحقیقاً لکھا اور کسی نے تقلیداً رقم کیا۔ غرض ہر ایک نے اپنے مبلغ علم اور مذاق طبع کے موافق لکھ کر ظاہر کر دیا کہ مرزا قادیانی اپنے دعاوی مخصوصہ میں صادق نہ تھے۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است، مشہور ومسلّم بات ہے۔ سو ہم بھی اپنے مذاق کے مطابق اس موضوع پر کچھ قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔

مرغان چمن بہر صباحے تسبیح کنند در اصطلاحے

چونکہ خاکسار (ابراہیم میر) کی غرض اظہار حق وازہاق باطل ہے۔ اس لئے بفضلہٖ تعالیٰ حسب عادت تقلیداً نہیں لکھے گا بلکہ جو کچھ قرآن کریم اور حدیث شریف میں ہے، اسی کو ظاہر کرے گا اور اپنے دعویٰ کے ثابت کرنے اور فریق مخالف پر گرفت کرنے میں قرآن وحدیث اور اصول مقررہ اور قواعد ممہدہ سے باہر نہیں ہوگا۔

دیگر یہ کہ قادیانی اخباروں میں جو تحریریں اس موضوع پر نکلی ہیں، چونکہ وہ سب غالباً ایک ہی سرچشمہ مرزا قادیانی کے خلیفہ اور امت مرزائیہ کے امیر وپیشواء حکیم نورالدین اور کچھ ان کے ثانی اثنین مولوی محمد احسن امروہی کے مضامین کی نقل یا خوشہ چینی ہیں۔ اس لئے ہر دو بزرگان ملت کی تردید پر سب تحریروں کی تردید ہو جائے گی اور ہر ایک کہ اور مہ کے مضمون کی طرف التفات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس وقت خاکسار (ابراہیم میر) کے زیر نظر خاص کر یہ اخبارات ورسائل ہیں۔ اخبار الحکم واخبار بدر، رسالہ ریویو آف ریلیجنز اور رسالہ تشحیذ الاذہان، آئینہ کمالات اسلام، ازالہ اوہام، رسالہ وصیت، اشتہار تبصرہ وغیرہ اوراق قادیانیہ ’’وَاِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (ہود:۸۸)‘‘

تقسیم معجزات

مضمون، ہندوستان کے دو پیغمبر (الہادی ج۳ نمبر۶، ۷، بابت ماہ جون جولائی ۱۹۰۷ء) میں ہم نے کسی قدر تفصیل سے ثابت کر دکھایا ہے کہ نبوت کا ثبوت معجزہ سے ہوتا ہے اور ہر نبی

کے لئے معجزہ ضروری ہے اور سچے مدعی نبوت اور کاذب میں اسی سے کھلم کھلا امتیاز ہوتا ہے۔ اس تحریر میں ہم معجزہ کی تقسیم ذکر کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو مقصود کے سمجھنے اور تصدیق میں مدد ملے۔ معجزہ اس امر کا نام ہے جس کا دکھانا انسان کی طاقت سے خارج ہو۔ چونکہ نبی کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے ہوں اور ہوتا وہ بھی ایک انسان ہے اور ایسے امور پر جو انسان کی طاقت سے خارج ہیں۔ باذن الٰہی اس کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں، اس لئے وہ اموراس کی صداقت نبوت پر دلیل ہوتے ہیں۔ یہ معجزات تین طرح پر ہیں: قولی، فعلی، علمی۔

معجزہ قولی: یہ ہے کہ نبی ایسے امور کے وقوع کی خبر دے جو آئندہ واقع ہونے والے ہوں اور ان کا ادراک عقل وقیاس سے خارج ہو۔ اسے اخبار بالغیب کہتے ہیں۔ ایسے امور داخل معجزہ اس لئے ہیں کہ غیب کا علم سوائے اس ذات واحد علاّم الغیوب کے کسی کو نہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: ’’قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (نمل:۶۵)‘‘ ﴿کہہ دو کہ آسمان وزمین میں سوائے خدا کے کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو۔﴾

اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیب دانی خاصہ خداوندی ہے۔ اسی طرح کسی رسول برحق کو کوئی غیب کی بات جتادینے کی بابت فرمایا: ’’وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران:۱۷۹)‘‘ ﴿خداوندتعالیٰ ایسا نہیں کہ تم لوگوں (غیر نبیوں) کو غیب پر مطلع کر دے لیکن خداوندتعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔﴾

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا: ’’عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن:۲۶،۲۷)‘‘ ﴿خدا ہی عالم الغیب ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو بھی واقف نہیں کرتا۔ مگر اسے جسے وہ جنس رسولوں میں سے پسند کر لیوے۔﴾

ان آیتوں میں خداتعالیٰ نے دونوں امر بتادیئے ہیں کہ عالم الغیب تو میں خود ہی ہوں، لیکن کبھی کبھی کسی رسول کو کوئی بات بتادیتا ہوں۔

تنبیہ: ان آیتوں کے متعلق اگر شبہ پڑے کہ جب ان آیتوں میں اﷲتعالیٰ نے فرمادیا کہ میں غیب پر سوائے رسولوں کے کسی کو بھی واقف نہیں کرتا، تو بعض وقت اولیاء اﷲ کی باتیں بھی سچی ہو جاتی ہیں۔ پس یا تو ان کو بھی نبی اور رسول ماننا چاہئے یا اس امر کو ثبوت نبوت

نہیں جاننا چاہئے یا اولیاء اللہ کی نسبت ایسا اعتقاد نہیں رکھنا چاہئے کہ بعض دفعہ کوئی بات ان کو بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

تو اس کا حل اس طرح ہے کہ ’’اظہار علی الغیب‘‘ جسے ان تینوں آیتوں میں نبیوں سے مخصوص کیا ہے اور غیروں سے اس کی نفی کی ہے، الگ امر ہے اور ’’اظہار الغیب علی احد‘‘ جو رتبہ اولیاء کو بھی حاصل ہوتا ہے جدا امر ہے جو پہلے رتبہ سے نیچے ہے اور جو رتبہ انبیاء کے رتبے سے نیچے ہو وہ اولیاء کو حاصل ہونا منع نہیں ہے۔

دیگر یہ کہ معجزہ کے ثبوت ہونے کے لئے دعویٰ نبوت شرط ہے۔ جیسا کہ مضمون ہندوستان کے دو پیغمبر میں گزر چکا ہے۔ پس چونکہ ولی مدعی نبوت نہیں ہوتا اور نہ وہ دعویٰ نبوت کر سکتا ہے اور نہ دعویٰ نبوت پر وہ ولی رہ سکتا ہے اور اگر دعویٰ کرے تو اس سے کرامت ظاہر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے ظہور کرامت پر ولی کو نبی نہیں کہہ سکتے۔

اخبار بالغیب یعنی پیش گوئی کی نسبت ہم نے یہ جو کہا کہ اس کا علم عقل وقیاس کے متعلق نہ ہو، اس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ جو بات عقل اور قیاس سے معلوم ہو سکے، اسے غیب نہیں کہتے۔ کیونکہ غیب کی تعریف ہے: ’’مالا یدرک بالحس‘‘ یعنی غیب وہ ہے جو حس ظاہری یا باطنی ہر دو میں سے کسی سے بھی معلوم نہ ہو سکے۔ پس اگر کسی امر کو اپنے عقل یا قیاس سے معلوم کر کے کہہ دیا اور وہ مطابق کہنے کے واقع بھی ہو گیا، تو اسے اخبار بالغیب نہیں کہیں گے۔ لہٰذا وہ مثبت نبوت بھی نہیں ہوگی۔

پس پیش گوئی کے متعلق یہ قید کہ اس کا ادراک عقل اور حس انسان کے متعلق نہ ہو، ضروری ہوئی۔ دیگر یہ کہ بسا اوقات ہم قیاس سے ایک امر کے امکان کو جان جاتے ہیں اور امکان میں وقوع اور لاوقوع ہر دو امر کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسی صورت کے اسباب مہیا ہو جائیں وہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے وقوع کے اسباب مہیا ہو گئے تو واقع ہو گیا ورنہ نہیں۔ پس ایسی صورت میں ہمارے پاس اس بات کے یقین کر لینے کی کوئی سند نہیں کہ مخبر نے یہ بات ضرور ضرور خداوند تعالیٰ سے علم پا کر بتائی تھی۔ کیونکہ اس کی ایک صورت عقل اور قیاس بھی ہے۔ لہٰذا ایسی خبر اثبات نبوت میں مفید نہیں۔

اخبار بالغیب کی ایک مثال یہ ہے کہ زمان برکت نشان آنحضرت ﷺ میں ایران

اور روم میں جنگ شروع ہوئی۔ ابتداء میں ایران زبردست ظاہر ہوا اور روم مغلوب رہا۔ مشرکین عرب نے صورت حال کو دیکھ کر کہا کہ اگر روم غالب آ گیا تو مسلمان سچے، کیونکہ ان کا دین، دین عیسوی سے ملتا ہے اور اگر ایران غالب رہا تو ہم سچے۔ کیونکہ اہل ایران آتش پرست ہیں اور ہم بت پرست۔ خدائے علیم نے جو انجام کار سے واقف ہے، اپنے رسول برحق پر یہ آیات نازل کیں: ''الٓمّٓ. غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ. فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ. بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَاءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (الروم:۱تا۵)''

﴿الٓمّٓ۔ اہل روم تھوڑے سے علاقہ میں مغلوب ہو گئے ہیں لیکن وہ چند ہی سال میں اپنے مغلوب ہوئے پیچھے ہی آخر کار غالب ہو جائیں گے۔ پہلے اور پیچھے ہر وقت ہر امر خدا ہی کے اختیار میں ہے اور اس روز مؤمن خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے نصرت کرتا ہے اور وہ غالب اور رحم والا ہے۔﴾

اس آیت کے بیان ہی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ نے یہ پیش گوئی ایسی حالت میں کی جب قرائن اور واقعات اس بات کے مقتضی تھے کہ اگر آپ قیاس سے کہتے تو فارس کے غلبہ کی خبر دیتے لیکن آپ نے برخلاف اس کے روم کے غالب آنے کی اور فارس کے مغلوب ہو جانے کی خبر دی اور اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے آپ کے پاس کوئی عقلی قرینہ اور قیاسی بات نہ تھی۔

چونکہ آپ کا دعویٰ منجانب اللہ ہونے کا تھا اور یہ بات قیاس سے معلوم نہیں ہوسکتی تھی اور آپ کے خبر دینے کے مطابق واقع بھی ہوئی اس لئے آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔

''رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِیْنَ (آل عمران:۵۳)''

<u>معجزہ فعلی:</u> یہ ہے کہ مادی اشیاء میں بغیر استعمال اسباب کے باذن خدا حقیقتاً کوئی ایسا انقلاب ظاہر کیا جائے جو طاقت بشری سے خارج ہو۔ امر معجزہ اس جہت سے ہے کہ قلب ماہیت یعنی کسی شئے کی ماہیت کا بدل دینا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ پس جب ایسا امر کسی مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے تو وہ اس کے صدق دعویٰ کی دلیل ہے۔

اس کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ طیور ہے کہ آپ گیلی مٹی لے کر کسی جانور کی صورت بناتے اور اس میں پھونک مارتے، تو وہ بحکم خدا زندہ پرندہ ہو جاتی۔ (آل عمران ومائدہ) نیز اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے کہ آپ اس کو زمین پر ڈالتے تو وہ بحکم خدا سانپ ہو جاتا اور نیز آپ نے اس عصاء کو دریا میں مارا تو پانی جس میں عادۃً خرق نہیں ہوتا، پھٹ گیا۔ اس طرح آنخضرت ﷺ کا معجزہ شق القمر ہے کہ آپ کے اشارے سے چاند دوٹکڑے ہو گیا۔ حالانکہ عادۃً اجرام فلکیہ میں خرق محال ہے۔ اسی طرح آپ کے دیگر معجزات جو کتب حدیث میں صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔

معجزہ علمی: معجزہ علمی یہ ہے کہ ایک شخص دعویٰ نبوت کے ساتھ ایسے علوم حقّہ بیان کرے اور ایسی حکیمانہ تعلیم کرے جو فاسد اعتقادوں سے نکال کر صحیح اعتقادات پر پہنچائے اور برے اخلاق سے کھینچ کر اخلاق فاضلہ پر عمل کرائے اور ایسا زبردست کلام پیش کرے جو ظاہری حسن کلام اور عمدگی بیان اور باطنی خوبی تعلیم میں لاجواب ہو اور کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی عالم وفاضل اور حکیم اور دانا کیوں نہ ہو، اس کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو اور خود مدعی نبوت کے پاس بظاہر کوئی ایسا ذریعہ نہ ہو، جس سے وہ ایسے علوم معلوم کر سکے اور ایسے کلام پر قادر ہو سکے۔ اس کی نظیر قرآن شریف ہے جو آنخضرت ﷺ کا معجزہ علمی ہے اور قائم رہنے والا ہے اور مادی معجزات کی طرح ظاہر ہو کر پھر نہ رہنے والا نہیں اور اسی کے ثابت کرنے کے لئے ہم نے خدا کے فضل سے کتاب ’’اعجاز القرآن‘‘ لکھی ہے۔

اس علمی معجزہ کے مثبت نبوت ہونے کے متعلق قرآن کریم میں کئی مقامات پر ذکر ہے۔ چنانچہ انہی میں سے ایک یہ ہے: ’’اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیَاتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ. فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (هود:۱۳،۱۴)‘‘ ﴿کیا یہ لوگ ایسا کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر ﷺ) نے اس (قرآن) کو از خود بنا کر خدا کے ذمہ لگا دیا ہے۔ (اے پیغمبر) ان سے کہو اگر تم اس بات میں سچے ہو تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں از خود بنا لاؤ اور خدا کے سواء جس کو بلا سکو، مدد کے لئے بلا لو۔ پس اگر وہ سب تمہاری بات پوری نہ کریں تو یقین جانو کہ یہ کتاب (قرآن) خدا کے علم سے اتری ہے۔﴾

آمدم برسر مطلب

مرزا قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور میدان ثبوت میں مادی اور فعلی معجزات سے تو بالکل بالکل انکار ہی کر دیا۔ بلکہ ان کی تحقیر کرتے رہے۔

(ازالہ اوہام ص۳۰۱ تا۳۰۴، خزائن ج۳ ص۲۵۴،۲۵۵)

اور یہ انکار تحقیق علمی پر مبنی نہیں تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ہو نہیں سکتے تھے۔ ان کی مثال اس لومڑی کی مثال ہے جو انگور نہیں اتار سکتی تھی تو کچھ سعی و کوشش کے بعد اکتا کر کہنے لگی ابھی کچے ہیں، کون دانت کھٹے کرے۔

ہاں! (مرزا قادیانی) پیش گوئیاں پیش کرتے رہے جو محض قیاسی ڈھکوسلے اور اوہام تھے۔ مگر افسوس ان میں بھی کوئی پیش نہ گئی۔ سب کی سب جھوٹی نکلتی رہیں۔ کیونکہ ان کی نباء تعلیم الٰہی پر نہ تھی، بلکہ ان کی خود ساختہ بات ہوتی تھی۔

اور اگر سچ پوچھو تو ان کی حقیقت محض گپ بازی ہوتی تھی، جو عوام کو دھمکانے اور جھوٹ موٹ ڈرا کر ان کو اپنی طرف کھینچنے اور اپنے دام افتادوں میں ایک چرچا جاری رکھنے کے لئے ہوتی تھیں۔ ورنہ اللہ اکبر! کجا قادیانی مسکین اور کجا تعلیم رب العالمین۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ انہی میں سے بعض وہ ہوئیں جن کو مرزا قادیانی کی موت سے تعلق ہے اور اس وقت ہم ان پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ’’وَاِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ (ھود:۸۸)‘‘

اصول قادیانی

حکیم نورالدین اور مولوی محمد احسن نے ان پیش گوئیوں کے مرزا قادیانی کی زندگی میں پورا نہ ہونے کے متعلق جو عذر کئے ہیں، ان کی بناء ایک اس اصول پر ہے کہ (معاذ اللہ) بعض مواعید الٰہیہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی کئے جاتے ہیں۔ (اخبار بدر قادیان مؤرخہ۲؍جون۱۹۰۸ء ص۸)

اور اگر کوئی پیش گوئی پوری بھی نہ ہو، تو اس سے نبی کی نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ اصل جس پر ان حضرات نے اپنے عقائد کی بناء رکھی ہے ان کا خود ساختہ نہیں ہے، بلکہ ان کے پیر و مرشد مرزا قادیانی کا سکھایا ہوا ہے جس کے مان لینے کے بعد ان کے عقائد میں تزلزل نہ آنا کوئی بعید امر نہیں۔

پس جب یہ امر قادیانی مذہب کے اصول میں ہے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ٹل بھی جاتا ہے اور نبی کی پیش گوئی غلط بھی ہو جاتی ہے اور اس سے نبی کی نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا تو اب اگر مرزا قادیانی کی پیش گوئیاں غلط نکلیں تو مرزائی مرزائیت سے کیسے پھر سکتے ہیں؟ اس مقام پر ہم اپنے ناظرین کی حیرانی دور کرنا چاہتے ہیں کہ مرزائی لوگ ایسے کھلے کھلے فیصلے کے بعد بھی تائب کیوں نہیں ہوئے؟

سو جب تک ان کے اس اصل کو بے اصل ثابت نہ کیا جائے، تب تک مرزائیوں کی توبہ موہوم ہے۔ کسی مدعی نبوت کی پیش گوئی کے صحیح یا غلط نکلنے کا جو اثر دعویٰ نبوت پر پڑتا ہے، اس کو ناظرین مضمون بالا تقسیم معجزات سے سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان پر مفصل بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس سب سے پہلے وعدہ الٰہی کے متعلق عقلاً اور نقلاً ثابت کیا جاتا ہے کہ خدا کے سب وعدے سچے ہوتے ہیں اور ان کے سچے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ واقع میں بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہے جاتے ہیں۔ ان میں ہرگز تخلف نہیں ہوتا۔ وعدہ خلافی نہایت مذموم صفت ہے جس سے شان خداوندی پاک ہے اور نتیجہ اس تفصیل کا یہ ہوگا کہ چونکہ مرزا قادیانی کی پیش گوئیاں غلط نکلیں اس لئے وہ خدا کے فرستادہ نہیں تھے بلکہ مفتری اور کاذب تھے اور نیز یہ کہ مرزا غلام احمد، قرآن فہمی سے کوسوں دور تھے۔ خصوصاً جب وہ صفات خداوندی کی آیات کو بھی نہیں سمجھتے تھے تو ان کو خدا تعالیٰ کا فرستادہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟

وعدہ اور عہد پورا کرنے کی خوبی اور پورا نہ کرنے کی برائی

وعدہ اور عہد ایک اقرار ہے جو کسی کو آئندہ کوئی فائدہ پہنچانے یا اسے نقصان سے بچانے کی نسبت کیا جائے۔ اس کا پورا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جس سے وعدہ کیا ہے وہ اس کے ایفاء کا منتظر رہتا ہے۔ اگر وقت پر پورا نہ کیا جائے تو اسے سخت پریشانی اور حیرانی لاحق ہوتی ہے اور جس سے کم از کم اتنا عہد کیا ہے کہ اسے نقصان نہیں پہنچائیں گے اسے اعتبار ہو جاتا ہے اور اگر اس سے عہد شکنی کی جائے تو اس کی نہایت دل شکنی ہوتی ہے۔ کیونکہ خلاف توقع امر سے انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور طبیعت مکدّر رہتی ہے اور کسی شخص کو کسی چیز کی امید دلا کر اس کے خلاف کرنا اور عہد کر کے اسے اعتبار کرانا اور پھر پورا نہ کرنا بے وفائی اور غدر ہے اور یہ صفت نہایت مذموم ہے۔

اگر وعدہ خلافی اور عہد شکنی کو درست قرار دیا جائے تو زبان کا اعتبار اٹھ جائے اور دنیا مین عجیب فتور مچ جائے، کیونکہ دنیا کے اکثر معاملات صرف زبان ہی کے اعتبار وقرار پر چلتے اور طے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس میں تخلف ہرگز درست نہیں۔ عہد نبھانے اور پورا کرنے کو وفا کہتے ہیں اور پورا نہ کرنے کو خلاف اور بے وفائی اور غدر کہتے ہیں۔ وفا نیکوں کی صفت ہے اور غدر بروں کی۔ لہٰذا وفا ایک خوبی ہے اور خلاف وعدہ اور غدر ایک برائی ہے۔

قرآن میں عہد، وعدہ پورا کرنے کی تاکید، وعدہ خلافی اور عہد شکنی کی ممانعت

عام معاش کے معاملات کا مدار غالباً ان پانچ امروں پر ہے: (۱) امانت داری، (۲) عدل وانصاف، (۳) سچا بول، (۴) پورا تول، (۵) وعدہ کا پورا کرنا اور عہد کا نبھانا۔

قرآن مجید میں جابجا ان امروں میں پختہ رہنے کی تاکید کی ہے اور ان کی خلاف ورزی کی ممانعت ہے۔ چنانچہ امانت داری اور عدالت کی نسبت فرمایا: ’’اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ (نساء:۵۸)‘‘ ﴿(مسلمانو!) خدا تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہلوں کو ادا کر دیا کرو اور جب تم لوگوں میں کوئی فیصلہ کرنے لگو تو عدل ونصاف سے کرو۔ خدا تعالیٰ تم کو جس امر کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت عمدہ ہے۔﴾

اسی طرح ماپ تول اور سچے بول اور عہد کو پورا کرنے کی نسبت فرمایا: ’’وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ، لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی، وَبِعَھْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (انعام:۱۵۲)‘‘ ﴿اور آلہ ماپ اور تول کو انصاف سے (مقدور بھر) پورا کرو ہم کسی کو اس کی مقدر سے باہر تکلیف نہیں دیتے اور جب تم کچھ کہو تو انصاف سے کہو۔ اگرچہ کوئی صاحب قرابت ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔ خدا تم کو ان باتوں کی تاکید اس لئے کرتا ہے کہ تم تذکر کرو۔﴾

اس آیت میں اللہ نے لفظ ’’تذکرون‘‘ پر ختم کیا ہے اور اس موقع پر اس کا ذکر عجیب لطف دیتا ہے اور قرآن شریف کی فصاحت وبلاغت ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ شرط بلاغت یہ ہے کہ کلام کو فصیح جملوں میں مقتضائے حال کے مطابق اور مقصود کے موافق بیان کیا جائے۔ سو اس مقام میں مقصود الٰہی عزاسمہ یہ ہے کہ ان امور مذکورہ کی خوبی اور ان کے خلاف ورزی

کی برائی لوگوں کے ذہن کے قریب کر کے ان کو عمل میں پختہ اور چست و چالاک کیا جائے۔ لہٰذا لفظ ''تذکر'' کو استعمال کیا۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں: کسی امر کو یاد کر کے سنبھل جانا اور غلطی اور قصور سے بچ جانا۔ چنانچہ فرمایا: ''اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّیْطَانِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُبْصِرُوْنَ (الاعراف: ۲۰۱)'' ﴿بے شک جو لوگ متقی ہیں ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ گزرتا ہے تو وہ تذکر کرتے ہیں۔ پس وہ ناگاہ دیکھنے والے ہو جاتے ہیں۔﴾

آیت بالا میں ان امور کی تاکید ہے: (۱) یتیموں کے مال کی حفاظت، (۲) ماپ اور تول میں حتیٰ الوسع کمی بیشی نہ کرنا، (۳) سچ بولنا اور سچی گواہی دینا اور انصاف کی بات کہنا، (۴) عہد کا پورا کرنا۔

پس ''تذکر'' سے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اگر ان امروں میں کوئی شخص تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے جیسا کہ حکم ہے تو تم یاد کر لو کہ تم اسے ہرگز گوارا نہیں کرو گے۔ پس تم کو بھی نہ چاہئے کہ تم کسی دوسرے سے ان حکموں کے خلاف سلوک کرو۔ چنانچہ یتیموں کی نسبت جو زیادہ تر قابل رحم ہیں دوسرے مقام پر اسی ''تذکر'' کو صراحت سے بیان کیا ہے: ''وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ لَوْ تَرَکُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّیَّةً ضِعَافًا خَافُوْا عَلَیْهِمْ فَلْیَتَّقُوْا اللّٰهَ وَلْیَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا (النساء: ۹)'' ﴿وہ لوگ جن کو یہ خوف ہو کہ اگر ہم چھوٹی چھوٹی اولاد چھوڑ مریں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ یتیموں کے مال میں دست اندازی کرنے سے ڈرنا چاہئے اور ان کو غضب خدا سے ڈرنا چاہئے اور چاہئے کہ (انصاف سے) پختہ بات کہیں۔﴾

کیسی پاک تعلیم ہے اور کیسے حکیمانہ اسلوب سے سمجھایا ہے اور لطیف پیرایہ میں سمجھایا ہے کہ بس تذکر کے ہوتے ہی انسان گرتا گرتا بھی سنبھل سکتا ہے۔

عہد کا نبھانا امور تقویٰ میں سے ہے

عہد کا نبھانا یہاں تک ضروری ہے کہ خداتعالیٰ نے اسے ''متقین'' کی صفت بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''فَاَتِمُّوْا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (التوبة: ۴)'' ﴿پس ان کی مدت تک ان کے عہد کو پورا کرو۔ کیونکہ اللہ متقین سے

محبت رکھتا ہے۔﴾

’’فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (التوبۃ:۷)‘‘ ﴿پس جب تک وہ تمہاری رعایت میں عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کی خاطر قائم رہو کیونکہ خدا متقین کو پیارا جانتا ہے۔﴾

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بدعہدی اور وعدہ خلافی سے زبان کا اعتبار جاتا رہتا ہے اور بدعہد شخص بہت برا جانا جاتا ہے۔ اسی طرح شریعت حقّہ نے بھی بدعہدی اور وعدہ خلافی کو (۱)موجب فساد، (۲) کذب، (۳) خیانت، (۴) خلاف تقویٰ، (۵) مؤجب نفاق اور نفاق کی علامت، (۶) فسق، (۷) مؤجب لعنت، (۸) شیطان کی صفت کہا ہے اور اس سے سخت منع کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان سب امور کو قرآن سے بیان کرتے ہیں۔

بدعہدی کی ممانعت اور مذمت اور اس کا مؤجب فساد ہوتا

سورۂ نحل میں فرمایا:’’اَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عَاھَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ (النحل:۹۱،۹۲)‘‘ ﴿اور خدا کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کرو اور اپنی قسموں کو پختہ کرنے کے بعد توڑا نہ کرو۔ حالانکہ تم اپنے (قول وقرار) پر خدا کو ضامن کر چکے ہو۔ بے شک اللہ جو تم کرتے ہو جانتا ہے اور (عہد شکنی کر کے) تم اس عورت کی طرح نہ بنو جو اپنے کاتے ہوئے سوت کو پختہ کرنے کے بعد توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اپنے عہدوں اور قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ بناتے ہوئے (عہد شکنی نہ کرو)﴾

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے عہد کے پورا کرنے کا حکم کیا اور اس کے توڑنے سے منع فرمادیا اور شان الوہیت اور جلالت الٰہی کو ملحوظ رکھنے کا اشارہ کیا اور عہد شکن آدمی کی مثال اس احمق عورت سے دی جو اپنے کاتے ہوئے سوت کو توڑ تاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور ساری محنت ضائع و برباد کردے۔

ایسی احمق عورت کو کوئی بھی کاتنے کو نہیں دیتا۔ صرف سوت ہی کی نسبت بے اعتباری نہیں بلکہ ہر چیز کے متعلق اس سے بے امنی رہتی ہے اور اس کے گھر والے بھی ہر دم

اس سے نالاں وہراساں رہتے ہیں۔ اسی طرح عہد شکن آدمی کا بھی کوئی اعتبار نہیں کرتا اور نہ اس سے کوئی معاملہ ٹھہراتا ہے۔ دیگر لوگ تو کیوں کریں گے اس کے اہل وعیال اور اہل قرابت اور دوست اور ہمسائیوں اور ہم مجلسوں اور ہم مشربوں کو بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ پس عہد شکنی اور وعدہ خلافی بہت بری صفت ہے۔

اس طرح اس آیت کے بعد خدا نے عہد شکنی کا ایک بہت بھاری ضرر بھی بیان کیا ہے جو صرف دنیا کے متعلق ہی نہیں بلکہ دین ایمان اور عاقبت میں بھی خرابی ڈالنے والا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''وَلَا تَتَّخِذُوْا اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوْا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَکُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (النحل:۹۴) '' ﴿اور اپنے عہدوں اور قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ نہ بناؤ پس تمہارے قدم (اسلام سے) بعد پختہ ہونے کے پھسل جائیں گے اور لوگوں کو خدا کے رستے سے روکنے کے سبب تم کو اس برائی کا مزہ چکھنا ہوگا اور تمہیں بڑا عذاب ہوگا۔﴾

اس آیت میں علاوہ اس بات کے کہ عہد شکنی مؤجب فساد ہوتی ہے۔ یہ بھی بیان کیا ہے کہ عہد شکنی اسلام سے برگشتگی کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ خواہ کوئی امر ہو اس کی کثرت مشق اور تکرار فعل سے طبیعت میں اس کے کرنے کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ کام بآسانی ظہور میں آنے لگتا ہے۔ پس باربار کی عہد شکنی سے طبیعت میں ثبات اور استقلال اور استقامت نہیں رہتی اور مذہب کا اختیار کرنا اور اسلام کا اقرار کرنا بھی ایک اعتقاد اور عہد اور دل کا خیال ہے۔ لہٰذا عہد شکنی سے اس کے متعلق بھی بے ثباتی اور لغزش اور ارتداد متصور ہوسکتا ہے۔ نیز اس آیت میں یہ فرمایا کہ تم کو (عہد شکن لوگوں کو) اس سبب سے عذاب عظیم ہوگا کہ تم نے لوگوں کو خدا تعالیٰ کے رستے سے روکا۔

اس کی صورت یہ ہے کہ دوسرے لوگ کسی کی عہد شکنی پر نظر کر کے دین میں طعن کرتے ہیں اور بدظن ہوکر ایمان لانے سے باز رہتے ہیں۔ دیگر یہ کہ عہد شکن اپنے اس فعل بد سے دوسروں کے لئے برا نمونہ بنتا ہے جس سے یہ برائی بکثرت ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اس کا بوجھ اسی بانی برائی پر ہے۔ عہد شکن اور قسم کھا کر خلاف کرنے والے کے لئے اس آیت میں عذاب عظیم جو کہا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد کرنے والا اور قسم کھانے والا بھی بڑی تاکید

اور پختگی سے اور خداتعالیٰ کی عظمت یاد کرا کر دوسرے کو باور کراتا اور اپنا اعتبار جماتا ہے۔ پس اس کے خلاف ورزی کی صورت میں اسے بھی عذاب عظیم ہی چاہئے۔ جزاءً وفاقاً!

عہد شکنی کذب ہے اور مؤجب نفاق ہے

قرآن مجید نے عہد شکنی کو کذب میں شمار کیا ہے اور مؤجب نفاق کہا ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں ہے: ''وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ فَلَمَّا اٰتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُوْنَ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (التوبۃ:۷۵تا۷۷)'' ﴿اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جنہوں نے خداتعالیٰ سے عہد کیا کہ اگر وہ ہم کو اپنے فضل میں سے کچھ عطاء کرے گا تو ہم ضرور صدقہ دیں گے اور صلاحیت والے ہوں گے۔ پس جب خداتعالیٰ نے ان کو اپنے فضل میں سے کچھ عطاء کیا تو اس سے لگے بخل کرنے اور بے رخی کر کے پیٹھ پھیر گئے۔ پس خداتعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق لگا دیا۔ اس دن تک کہ ملیں (یعنی موت تک) اس سبب سے کہ انہوں نے خداتعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا اس کا خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔﴾

اس آیت میں خداتعالیٰ نے علاوہ اس امر کے کہ وعدہ خلافی کو کذب میں شمار کیا ہے۔ اسے مؤجب نفاق بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ جملہ ''فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا'' اسی بیان کے لئے ہے اور اس پر ''ف'' کا لانا اسی مطلب کے لئے ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری، کتاب الایمان)'' ﴿منافق کی علامات تین ہیں۔ جب کوئی بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب امانت رکھا جائے تو خیانت کرے۔﴾

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ وعدہ خلافی علامت نفاق ہے۔

عہد شکنی خلاف تقویٰ اور خیانت ہے

وعدہ خلافی اور عہد شکنی خلاف تقویٰ اور امر خیانت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے فرمایا: ''اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ

لَا یَتَّقُوْنَ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ (الانفال:۵۶تا۵۸)'' ﴿جن سے (اے پیغمبر) آپ نے عہد و پیان کرلیا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے عہد و پیان کو ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں اور بالکل پرہیز نہیں کرتے۔ پس جب کبھی تو لڑائی میں ان پر غالب آجائے تو انہیں ایسی مار مار کہ ان کے پچھلے بھی بھاگ کھڑے ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ عبرت حاصل کریں اور اگر تجھے کسی قوم کی نسبت خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو تو تو بھی ان کو اس عہد کے قائم نہ رہنے کی اطلاع دے دے تاکہ معاملہ برابر رہے۔ کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو اچھا نہیں جانتا۔﴾

عہد شکنی فسق ہے

وعدہ خلافی اور عہد شکنی کے امورفسق میں سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے فرمایا:''وَمَا یُضِلُّ بِہٖ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ. اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ (البقرہ:۲۶،۲۷)''اور اس مثال سے خدا کسی کو بھی گمراہی پر نہیں رکھتا سوائے فاسقین کے جو خدا کے عہد کو اس کے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ نبی آخرالزمان کی نسبت ہر نبی کی معرفت ان کی امتوں سے اقرار لینے کا ذکر کرکے کہا:''فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ (آل عمران:۸۲)'' ﴿پھر جو کوئی اس کے بعد اس عہد سے پھر جائے گا تو وہ سب فاسق ہوں گے۔﴾

وعدہ خلافی موجب لعنت ہے

اسی طرح سورۂ رعد میں وعدہ خلافی کو موجبات لعنت میں سے قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْءُ الدَّارِ (الرعد:۲۵)'' ﴿وہ جو خدا کے عہد کو اس کے پختہ کئے پیچھے توڑ ڈالتے ہیں اور (رشتہ) کے ملانے کا خدا نے حکم کیا ہے اسے قطع کرتے ہیں اور فساد مچاتے ہیں، زمین میں ان کے لئے لعنت ہے اور ان کے لئے برا گھر (جہنم) ہوگا۔﴾

وعدہ خلافی شیطان کی صفت ہے

اسی طرح وعدہ خلافی کا شیطان کی صفت ہونا اس آیت میں مذکور ہے: ’’وَقَالَ الشَّیْطَانُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ (ابراہیم:۲۲)‘‘ ﴿شیطان (بروز قیامت) جب فیصلہ ہو چکے گا (اپنے تابعداروں سے) کہے گا کہ خدا نے تو تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدہ کیا تھا سو میں نے اس کا خلاف کیا۔﴾

اس بیان سے صاف واضح ہو گیا کہ وعدہ خلافی اور عہد شکنی نہایت ہی قبیح اور مذموم امر ہے۔ کیونکہ یہ: (۱) موجب فساد ہے، (۲) کذب ہے، (۳) خیانت ہے، (۴) خلاف تقویٰ ہے، (۵) خدا کے غضب کا سبب ہے، (۶) مؤجب نفاق ہے، (۷) علامت نفاق ہے، (۸) فسق ہے، (۹) موجب لعنت ہے، (۱۰) شیطان کی صفت ہے۔ **تلک عشرۃ کاملۃ!**

پس خدائے رحمان کی شان اس صفت مذموم سے بالکل پاک اور مبرّا ہے۔ کیونکہ وہ سبوح ہے، قدوس ہے، سلام ہے۔ ہر قسم کے عیب ونقص سے منزہ ہے اور ہر طرح کی خوبیاں اور جملہ صفات کمال اور تمام نعوت جلال سے موصوف ہے۔ ’’سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ‘‘

ناظرین! بیان سابق میں بذیل آیت سورۂ نحل پڑھ چکے ہیں کہ عہد شکنی دین ودنیا ہر دو میں بدنتائج پیدا کرتی ہے۔ اسی کے متعلق ہم یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس کا برا اثر عاقبت پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ عبادات ومعاملات۔ لہٰذا معاملات کے متعلق جو تعلیم ہے وہ نصف دین ہے اور معاملات کے متعلق اسلامی تعلیم کو عملی طور پر دکھانا زیادہ تر انہی امور میں ہوتا ہے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی امانت داری، عدل وانصاف، ایفائے عہد، پورا تول، سچا بول اور یہ مسلّم ہے کہ دنیا کے امن کے متعلق عہد کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے اور خداتعالیٰ نے اس کی سخت تاکید کی اور ایفاء وعدہ کو اخلاق سے تو بہت ہی نازک تعلق ہے اور اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وعدہ خلافی سے کئی برائیاں مثل جھوٹ، غدر، فریب وغیرہ پیدا ہوتی ہیں اور اخلاق اور معاملات کا اثر عاقبت پر بھی پڑتا ہے۔ یعنی اگر اخلاق اور معاملات درست ہیں تو عاقبت بالخیر ہے، ورنہ خراب۔ اس لئے وعدہ کا اثر بھی منجملہ معاملات اور اخلاق کے ہے، عاقبت پر پڑتا ہے۔ اس لئے خداتعالیٰ نے فرمایا:

''وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل:۳۴)'' ﴿عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت کو) عہد کی بابت ضرور پرسش ہوگی۔﴾

اس بیان سے روشن ہوگیا کہ عہد کے پورا کرنے میں ہردو عالم کی بھلائی ملحوظ ہے۔ اس میں اصلاح دنیا بھی ہے اور فلاح عقبیٰ بھی۔ لہٰذا یہ دین حق میں ایک ضروری عمل ہے۔ گو بیان بالا ہی سے ناظرین کو معلوم ہوگیا ہے کہ ایفاء وعدہ ایک خوبی اور کمال شرافت ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ذات برحق مستجمع جمیع صفات کمال میں پایا جائے اور وعدہ خلافی ایک قبح اور عیب ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس کی ذات مقدس کو اس سے پاک اعتقاد کیا جائے۔ لیکن ہم مزید توضیح کے لئے آیات بھی ذکر کرتے ہیں جو قرآن شریف میں بالخصوص وعدہ الٰہی کے متعلق وارد ہیں۔ سو معلوم ہو کہ قرآن میں وعدہ الٰہی کے متعلق چار طرح کی آیات ہیں۔

(اوّل) وہ جن میں وعدہ الٰہی کے برحق ہونے اور واقع میں ہو جانے کے متعلق بیان ہے۔ (دوم) وہ جن میں خداتعالیٰ کے وعدہ خلافی نہ کرنے کو تاکیداً بیان کیا ہے۔ (سوم) وہ آیات جن میں نہایت جلالت اور مہابت سے ایفاء وعدہ کو اپنے اخص اوصاف میں سے بیان کیا ہے۔ (چہارم) وہ آیات ہیں جن میں ان وعدوں کا ذکر ہے جو خداتعالیٰ نے اپنے رسولوں سے کئے۔

سو ہم بفضلہ تعالیٰ ان چاروں کے متعلق علی الترتیب بعض کا بیان کر کے ناظرین کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ خداتعالیٰ کے وعدوں میں ہرگز تخلف کی گنجائش نہیں۔ اس ضمن میں ناظرین قرآن کریم کے اعجازی کمال کے متعلق بھی لطائف معلوم کریں گے جس سے ان کے ایمان میں تقویت ہوگی کہ سبحان اللہ! قرآن کریم کا بیان ہر امر میں کیسی عجیب موشگافی اور باریک بینی سے ہوتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے اور اس کی آیات کی نسبت بے اختیار بول اٹھتا ہے: ''مَا اَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ بَصَائِرَ (بنی اسرائیل:۱۰۲)'' ﴿یعنی ان آیات کو سوائے آسمانوں اور زمین کے رب کے کسی نے نہیں اتارا (اور اس نے اتارا بھی ہے تو) بصائر کر کے (اتارا ہے۔ یعنی باطن کی بینائی کر کے)﴾

قسم اوّل کی آیات میں سے ایک یہ ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيْمِ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِيْزُ

اَلْحَکِیْمُ (لقمان:۸،۹)'' ﴿بے شک جولوگ ایمان لائے اورانہوں نے نیک کام بھی کئے ان کے لئے نعمتوں کے باغات ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ان سے سچا وعدہ کیا ہے اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔﴾

اس مقام پر خدا تعالیٰ نے نیکوکار مؤمنوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے اور اس وعدہ کی نسبت کہا ہے کہ وہ حق ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وعدے کے حق ہونے کا ذکر اسی لئے کیا ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ شاید یہ وعدہ ایسا ویسا ہی ہو اور ہم عمل کرتے کرتے تھک جائیں اور آخر کو ملے کچھ بھی نہیں۔ پس اس بیان سے تسلی کردی کہ خدا کے وعدے سچے ہوتے ہیں ضرور ضرور کہنے کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔

اس مقام پر لفظ ''حق'' کے متعلق بھی کچھ ذکر مناسب ہے کہ لغت میں حق اس شئے کو کہتے ہیں جو ثابت اور موجود ہو، اس لئے موجود کو متحقق کہتے ہیں اور اسی لئے خدا تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''الحق'' ہے۔ یعنی وہ ذات جو سچ مچ موجود اور ثابت ہے۔ چنانچہ مجمع البحار میں لکھا ہے: ''الحق تعالٰی الموجود حقیقۃ المتحقق وجودہ والھیتہ والحق ضد الباطل (مجمع البحار ج۱ ص۲۸۲)'' ﴿الحق اللہ کا نام ہے جو حقیقتاً موجود ہے اور اس کی ہستی اور الٰہیت ثابت ہے اور حق باطل کی ضد (بھی) ہے۔﴾

مجمع البحار میں حق کو باطل کی ضد کہا ہے۔ کیونکہ باطل کے معنی ہیں بے قرار اور ضائع اور دور ہونے والی چیز غیر ثابت اور ناقابل اعتبار شئے۔ چنانچہ قرآن میں حق اور باطل کی مثال اس طرح بیان کی ہے: ''أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (الرعد:۱۷)'' ﴿خدا نے آسمان سے پانی اتارا تو نالے ندیاں اپنے اپنے مقدار بھر بہ پڑے پس رو، کے اوپر جھاگ چڑھ آتی ہے اور جس (دھات) کے اوپر سے آگ میں رکھ کر آنچ دیتے ہیں، زیورات یا دیگر اسباب بنانے کے لئے اس میں بھی اسی طرح جھاگ آجاتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے تو جو جھاگ ہوتی ہے وہ تو خشک ہوکر دور ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگوں کے لئے نفع والی چیز ہے۔ یعنی پانی اور چاندی سونا وغیرہ دھاتیں وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہیں۔﴾

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ حق کو خداتعالیٰ نے پانی اور سونے چاندی وغیرہ مفید دھاتوں کی مانند کہا ہے اور ان کی نسبت کہا ہے کہ یہ لوگوں کے لئے مفید ہیں اور ثابت رہتی ہیں۔ اسی طرح حق بھی مفید ہے اور ثابت رہتا ہے اور باطل کی نسبت کہا کہ وہ جھاگ کی طرح ہے جو جلد ضائع اور دور ہو جاتی ہے اور نہ وہ مفید ہے اور نہ اسے قرار ہے۔ پس اس بیان سے ہمارے بیان بالا کو پوری پوری تصدیق ظاہر ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر بھی حق اور باطل کا مقابلہ کیا: ’’قُلْ جَاءَ الْحَقُ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:۸۱)‘‘ ﴿اے پیغمبران سے کہہ دو کہ حق ثابت ہو چکا ہے اور باطل دور ہو گیا ہے۔ بےشک باطل دور ہونے ہی کے قابل ہے۔﴾

اس آیت میں بھی ایک لطف ہے کہ حق کے ساتھ ’’جاءت‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ ’’جاءت‘‘ اس چیز یا امر پر بولتے ہیں جس کا وجود وثبوت یقینی ومتحقق ہو۔ چنانچہ سورۂ ملک میں ہے: ’’سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيْرٌ. قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاءَ نَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا (ملک:۸،۹)‘‘ ﴿کہ دوزخیوں سے دوزخ کے دربان کہیں گے کیا تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا تو وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پاس ضرور ضرور نذیر پہنچا تھا لیکن ہم نے جھٹلایا۔﴾

اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں: ’’يَا اَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَاءَ نِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ (مریم:۴۳)‘‘ ﴿اے میرے پیارے باپ بےشک میرے پاس خدا کی جانب سے ایک ایسا یقینی علم آچکا ہے جو تجھے نہیں ملا۔﴾

اسی طرح دیگر آیات بھی ہیں۔ اوپر کی آیت میں باطل کے ساتھ ’’زھق‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے اور باطل کو ’’زھوق‘‘ کہا ہے۔ کیونکہ لغت میں ’’زھق‘‘ کے معنی بھی دور ہو جانے اور چلے جانے کے ہیں اور ’’بطل‘‘ کے یہ معنی تو پہلے ہی ثابت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں ہے: ’’وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُوْنَ (توبہ:۵۵)‘‘ کہ خدا کا ان منافقوں کی نسبت یہ ارادہ ہے کہ ان کے نفاق اور بدباطنی کے سبب۔ ﴿ان کی جانیں ان کے کافر ہونے کی حالت میں نکلیں﴾

اور صراح میں ہے: ’’زھق، زھوق ونیست شدن‘‘ یعنی زہق کے معنی نیست ہونا بھی ہے۔

www.amtkn.com www.facebook.com/amtkn313 www.emaktaba.info

اس بیان سے ثابت ہوگیا کہ حق اس امر کو کہتے ہیں جو ثابت اور موجود ہو۔ پس جب خدا تعالیٰ نے اپنے وعدے کی نسبت کہا کہ وہ حق ہے تو ضرور ضرور مطابق کہنے کے ثابت اور موجود اور متحقق ہوگا۔ کیونکہ حق کے لئے مطابقت ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ عبداللہ یزدی خطبہ شرح تہذیب میں، جو منطق کی مشہور درسی کتاب ہے۔ بذیل لفظ ''الصدق'' فرماتے ہیں: ''**الصدق الخبر والاعتقاد اذا طابق الواقع کان الواقع ایضاً مطابقاً له فان المفاعلة من الطرفین فمن حیث انه مطابق للواقع بالکسر یسمی صدقا ومن حیث انه مطابق له بالفتح یسمی حقا وقد یطلق الصدق علی نفس المطابقة ایضاً** (شرح تهذیب تحفه شاه جهانی ص ۲۰)''

آیت سورۃ لقمان جس کی وعدہ الٰہی کے متعلق ہم تفسیر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عزیز اور حکیم پر ختم کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان صفات کو امر وعدہ سے بہت بھاری تعلق ہے۔ کیونکہ وعدہ خلافی یا تو اس سبب سے ظہور میں آتی ہے کہ کسی نے کسی سے کسی ایسی شئے یا امر کے متعلق وعدہ کیا جو اس کی قدرت اور وسعت سے باہر ہے۔ پس اس کے عجز کے سبب اس سے وعدہ خلافی متصور ہے۔ اس لئے خدا نے وعدہ کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اللہ ''العزیز'' ہے یعنی وہ ہر امر پر غالب ہے اور ہر شئے کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ پس اس سے وعدہ خلافی ممکن نہیں۔

دوسری وجہ! جس سے وعدہ خلافی ہوسکتی ہے یہ ہے کہ کوئی کسی سے ناعاقبت اندیشی اور سفاہت سے وعدہ کر بیٹھے اور اس کے بعد اس کو معلوم ہو کہ میرا وعدہ کرنا مناسب اور قرین مصلحت نہ تھا۔ پس وہ وعدہ پورا کرنے سے دل چراتا ہے۔ پس فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ ''الحکیم'' ہے۔ یعنی مصلحت بین، عواقب امور سے دانا ہے۔ سفاہت ونادانی سے پاک ہے۔ لہٰذا اس کا وعدہ ایسا ویسا نہیں ہوسکتا۔ سبحان اللہ! کیسی عجیب موشگافی اور باریک بینی ہے اور کیسے حکیمانہ اور فلسفیانہ طریق سے اپنے وعدہ کی حقانیت کو ظاہر کیا ہے۔

تیسری وجہ! جس سے وعدہ خلافی متصور ہوسکتی ہے یہ ہے کہ وعدہ کرنے والا جھوٹ بولنے والا ہو۔ پس ہوسکتا ہے کہ وہ یہ وعدہ بھی عادت کے موافق جھوٹا کرے۔ لیکن خدا تعالیٰ جھوٹ سے بھی پاک ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا (النساء:۸۷)'' ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا (النساء:۱۲۲)'' ﴿اپنی بات میں خدا سے بڑھ کر کون سچا ہے۔﴾

لہٰذا اس اعتبار سے بھی خدا کے وعدے میں تخلف نہیں ہوسکتا۔

چوتھی وجہ! جس سے وعدہ خلافی متصور ہوسکتی ہے یہ ہے کہ وعدہ کرنے والے کو نسیان ہو جاتا ہو یا وہ غلطی یا وہم میں پڑ جاتا ہو اور اس سبب سے وہ وعدہ کو بھول جائے یا اس کی نسبت اس کو کوئی غلطی یا وہم پڑ جائے جس سے وعدہ کو پورا نہ کر سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ عزوجل کی نسبت ایسا بھی خیال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نہ تو اسے نسیان ہوتا ہے اور نہ وہ غلطی اور وہم میں پڑ سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی قرآن میں مذکور ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا: ''لا یضل ربی ولا ینسیٰ (طٰہٰ:۵۲)'' ﴿یعنی میرا رب نہ تو غلطی میں پڑتا ہے اور نہ اسے نسیان ہوتا۔﴾

اسی طرح سورۂ مریم میں ہے: ''وما کان ربک نسیا (المریم:۶۴)'' ﴿یعنی اے پیغمبر! تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے۔﴾

لہٰذا اس اعتبار سے بھی خدا کی نسبت وعدہ خلافی کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اس بیان سے واضح ہوگیا کہ وعدہ خلافی کی جو جو وجہیں ہوسکتی تھیں، خدائے حکیم نے ان سب کو سامنے رکھ کر اور اپنی عزت و حکومت اور صداقت و حکمت کو بیان کر کے اپنے وعدے کی پختگی اور سچائی کا ذکر کیا ہے۔ پس اس کے وعدے میں ہرگز ہرگز تخلف نہیں ہوسکتا۔

آنحضرت ﷺ تہجد کے وقت جو کچھ پڑھا کرتے تھے، اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: ''ووعدک الحق'' یعنی بارخدایا! تیرا وعدہ حق ہے۔

افسوس صد افسوس! مولوی سید محمد احسن امروہی (قادیانی) جو بدیں دعویٰ فضیلت و ہمہ دانی قادیانی تقلید میں پھنس کر معرفت قرآن سے محروم رہے اور ہزار افسوس! حکیم مولوی نورالدین قادیانی پر جو بدیں ادّعائے حکمت و نکتہ شناسی، قادیانی فریفتگی میں مبتلا ہوکر بمصداق ''حبک الشیٔ یعمی ویصم'' وعدہ الٰہی کے متعلق لطائف قرآن مجید سے بے بہرہ رہے۔

اور بے شمار افسوس! مرزا قادیانی پر جو باوجود ادّعائے نبوت و مکالمہ الٰہیہ وعدہ الٰہی کے اسرار تک نہ پہنچ سکے۔

مرزا قادیانی کے ابطال کے لئے تو یہی امر کافی ہے کہ وہ صفات خداوندی کی نسبت صحیح علم و درست اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ انبیاء کرام کی بعثت کے متعلق ایک مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ صفات خداوندی کی بابت صحیح علم و اعتقاد کی تعلیم کریں اور لوگوں کو کشیدگیوں اور

پیچیدگیوں سے نکال کر شاہراہ عقیدت پر لائیں۔ پس جب صفات خداوندی کی نسبت مرزا قادیانی کا علم واعتقاد صحیح نہیں ہے تو وہ نبی نہیں ہوسکتے۔ وعدہ الٰہی کی پختگی اور سچائی اور اس کے ضرور ضرور حق ہونے کو ہم ایک اور طرح بھی ثابت کرتے ہیں کہ خدا ’’**احکم الحاکمین**‘‘ ہے اور سلطنت اور حکومت کو ایفاء وعدہ سے ایسا شدید تعلق ہے کہ گویا یہی امر بادشاہ کی طرف سے رعیت کے لئے امن وامان اور حفاظت ورعایت کی ضمانت ہوتا ہے اور جو بادشاہ بے سخن بدعہد اور زبان کا کچا ہو، اس کی طرف سے رعیت کی رغبت ہٹ جاتی ہے اور طبیعت میں اس کی جانب سے کوئی امید نہیں رہتی۔ بلکہ کسی بات کا بھی اعتبار نہ رہنے سے ہر دم اس سے کھٹکا رہتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ ’’**ملک السموٰات والارض**‘‘ اور ’’**احکم الحاکمین**‘‘ بادشاہ حقیقی مالک تحقیقی وعدے کا سچا اور بات کا پکا ہوتا کہ اس کے ضعیف بندوں اور ناتواں آرزومندوں اور شکستہ خاطر حاجت مندوں کو سہارا رہے اور ہر طرف سے کشیدہ خاطر ہوکر صرف اسی کی آستان رحمت پر امیدوار رہیں۔ اگر (معاذ اللہ) خدا تعالیٰ ایسا متلون مزاج ہو کہ کہے کچھ اور کرے کچھ، نہ تو اس کی بات کا اعتبار ہو اور نہ اس کے قول کا ٹھکانہ تو کوئی مؤمن کس امید پر بھروسہ کر کے صرف اسی پر توکل کرے۔

کیا خداوند تعالیٰ ’’**وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا** (مزمل:۸)‘‘ ﴿سب سے توڑ تاڑ کر صرف اسی سے پیوند کر۔﴾ اسی وعدہ کی عدم پختگی پر کرتا ہے اور نیز: ’’**فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ** (ذاریات:۵۰)‘‘ ﴿سب کوئی خدا تعالیٰ کی طرف لپکو۔﴾ کا حکم اسی وعدہ خلافی پر سناتا ہے؟ ’’**قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ** (منافقون:۴)‘‘

خدا تعالیٰ تو اسی وعدہ کی سچائی پر اپنے دربار کے حاجت مندوں کو تعلیم کرتا ہے کہ اس طرح کہا کرو: ’’**رَبَّنَا اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ** (آل عمران:۱۹۴)‘‘ ﴿اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ کچھ بھی عطاء کرنا جو تو نے اپنے پیغمبروں کی زبانی ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہم کو قیامت کے دن خوار نہ کرنا۔ بے شک تو خلاف وعدہ نہیں کرتا۔﴾

دیکھو! اس آیت میں صاف طور پر اپنے صدق وعدہ پر دعا سکھائی ہے اور وعدہ خلافی نہ کرنا بھی صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ رسولوں کی زبانی مؤمنوں سے خدا کے کئی وعدے ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے: ’’**عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ**

وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (التحریم:۸)'' ﴿امید رکھو کہ تمہارا رب تم سے تمہاری برائیاں مٹادے گا اور ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی جس دن اللہ اس نبی (محمد) کو اور اس کے ساتھ مؤمنوں کو خوار نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے اور پیچھے اور دائیں بائیں چلتا ہوگا۔﴾

اس آیت میں قیامت کے دن مؤمنوں کو رسوا نہ کرنے اور ان کو نور عطاء کرنے کا وعدہ ہے اور اوپر کی آیت میں اس کی بابت دعا سکھائی ہے کہ ایسا کہا کرو۔ دیگر یہ کہ اسی وعدہ کی سچائی نوح علیہ السلام اس صفت احکم الحاکمین کو (جس کے متعلق ہم اس وقت ذکر کر رہے ہیں) یاد کر کے جناب خداوندی میں عرض کرتے ہیں: ''وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ. قَالَ يَا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود:۴۵،۴۶)'' ﴿خداوند! میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ بھی ضرور ضرور سچا ہے۔ کیونکہ تو احکم الحاکمین ہے (تو پھر وہ کیوں ڈوبا) خدا نے فرمایا (کہ بے شک میرا وعدہ تو سچا ہے لیکن) وہ تیرے اہل میں سے نہیں۔ کیونکہ وہ (اپنی بدعملیوں کی وجہ سے مجسم) غیر صالح عمل (ہو چکا) اس لئے غرق کر دیا۔﴾

وعدہ الٰہی کے متعلق اوّل قسم کی آیات میں سے کچھ بیان ہو چکا۔ اب قسم دوم کا بیان کیا جاتا ہے جن میں خداتعالیٰ نے اپنے وعدہ خلافی نہ کرنے کو تاکیداً بیان کیا ہے۔ اس قسم کی آیات دو طرح پر ہیں: اوّل! وہ جو دنیا کے متعلق ہیں۔ دوم! وہ جو عقبیٰ کے متعلق ہیں۔

پہلی قسم! میں سے ایک یہ ہے کہ اہل روم کے غالب ہو جانے کی پیش گوئی پر جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے خداتعالیٰ نے مؤمنوں کو جو خوشی حاصل کرانے کا ذکر کیا ہے، اس کی نسبت قرآن پاک میں فرمایا: ''وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم:۶)'' ﴿(اس امر کا) خدا نے وعدہ کر لیا ہے اور خداتعالیٰ اپنا وعدہ خلاف نہیں کرتا۔ لیکن بہت سے لوگ (اس راز کو) نہیں جانتے۔﴾

یہ خداتعالیٰ نے اہل روم کو اہل فارس پر فتح دینے سے کئی برس پیشتر کہا تھا اور ساتھ ہی زیادہ تسلی واطمینان کے لئے فرمادیا تھا کہ یہ وعدہ ہرگز خلاف نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ مطابق کہنے کے بالکل حق ثابت ہوا اور ہرگز خلاف نہ ہوا۔

اس آیت میں ایک لطف ہے کہ ذکر تو ہو رہا ہے۔ اہل روم کو فتح دے کر مؤمنوں کو خوشی دینے کا اور اس امر کو وعدہ کہا ہے اور اپنے وعدہ میں تخلف نہ ہونے کا ذکر صرف اسی وعدے کی نسبت ذکر نہیں کیا بلکہ عام طور پر کہا ہے: ''لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ'' یعنی خدا اپنا وعدہ خلاف نہیں کرتا۔ ہر ایک سمجھدار جو خدا پر ایمان رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ کسی خاص بات کے موقع پر عام عادت کا ذکر کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ فاعل کی صفت خاص اسی واقعہ کے متعلق نہیں بلکہ اس کا ظہور ہر اس فعل کے متعلق ہے جو اس کی جنس کا ہے۔

اس کے نظائر قرآن شریف میں بکثرت ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کی تعظیم ملحوظ رکھنے کے بیان میں فرمایا: ''اِنْ تُبْدُوْا شَیْئًا اَوْتُخْفُوْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (الاحزاب:۵۴)'' ﴿اگر تم کچھ ظاہر کرو، یا اسے چھپاؤ خدا ضرور ضرور ہر شئے سے واقف ہے۔﴾

اس آیت میں انسان کے ظاہری اقوال وافعال اور نیز باطنی خیالات کا خدا کے علم میں ہونا اس طرح بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ ''کل شیٔ'' سے واقف ہے اور چونکہ ظاہر وباطن بھی ''کل شیٔ'' میں سے ہیں۔ پس خدا ان سے بھی واقف ہے۔

سبحان اللہ! کیسے عجیب اور پختہ طور پر اتنے بڑے مضمون کو مختصر عبارت میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ روم میں بھی جس کی بابت ہم بیان کر رہے ہیں، وعدہ نصرت الٰہی اور فرحت کے ضرور ضرور پورا ہونے اور ہرگز ہرگز خلاف نہ جانے کی نسبت فرمایا: ''وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (الروم:۶)'' یعنی اس (نصرت وفرحت) کا خدا تعالیٰ نے وعدہ کر لیا ہے اور خدا اپنے کسی وعدہ میں بھی خلاف نہیں کرتا۔ (پس اس میں بھی خلاف نہیں کرے گا)

دوسری قسم! کی آیات جو عقبیٰ کے متعلق ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا اور قیامت کو اس کے پورا ہونے کا بیان بھی ساتھ ہی مذکور ہو چکا۔ اس مضمون کی دوسری آیت یہ ہے جو مؤمنوں کے لئے وعدہ جنت کے بارے میں ہے: ''لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّہُمْ لَہُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِہَا غُرَفٌ مَّبْنِیَّۃٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ وَعْدَاللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ (الزمر:۲۰)'' ﴿لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لئے ایسے بالاخانے ہوں گے جن کے اوپر بالاخانے بنے ہوں گے۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس امر کا خدا نے وعدہ کر لیا ہے اور خدا اپنا کوئی بھی وعدہ خلاف نہیں کرتا۔﴾

اس بیان سے واضح ہوگیا کہ خدا کے وعدے خواہ دنیا کے متعلق ہوں خواہ عقبیٰ کے، ان میں تخلف نہیں ہوسکتا۔

قسم سوم! کی وہ آیات ہیں جن میں خداتعالیٰ نے کمال جلال سے اپنے وعدوں کے پورا ہونے اوران میں ہرگز ہرگز تخلف نہ ہونے کا ذکر کیا ہے: ’’إِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِینَ أَنْفُسَھُمْ وَأَمْوَالَھُمْ بِأَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِیْ التَّوْرَاۃِ وَالْإِنْجِیلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (التوبۃ: ۱۱۱)‘‘ ﴿بے شک خدا نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اوران کے مال خرید لئے ہیں اس قیمت سے کہ ان کے لئے جنت ہوگی وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو (کبھی) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل ہوتے ہیں۔ خدا کے ذمے یہ وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں اور خداتعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ پس تم اپنی بیع سے جو تم نے کی خوش ہو اور یہی بڑی کامیابی ہے۔﴾

اس آیت میں نہایت زور سے بطور سوال فرمایا کہ خداتعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ پورا کرنے والا کون ہے یعنی کوئی نہیں۔

اسی طرح سورۂ مریم میں اس وعدے کی پختگی ثابت کرنے کے لئے فرمایا کہ خداتعالیٰ کا وعدہ تو ایسا ہے کہ بس حاصل شدہ۔ چنانچہ فرمایا: ’’جَنّٰتُ عَدْنِ ِۨ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَأْتِیًّا (المریم: ۶۱)‘‘ ﴿جنتیں ہمیشہ رہنے کی جن کا خدا نے اپنے بندوں سے غیب سے وعدہ کیا ہے۔ بے شک اس کا وعدہ حاصل شدہ ہے۔﴾

ظاہر ہے کہ وعدہ سے اس شئے کے حاصل کرانے کی توقع دلائی جاتی ہے جو ابھی حاصل نہ ہوئی ہو۔ باوجود اس کے پھر جو خداتعالیٰ نے اپنے وعدہ کی نسبت فرمایا کہ وہ ضرور ضرور حاصل شدہ ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس میں ہرگز ہرگز تخلف اور التواء کی گنجائش نہیں۔ پس اس طریق بیان میں کمال تاکید ہے۔

اسی طرح سورۂ نساء میں کمال مہابت اور شان سے فرمایا: ’’وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْأَنْھَارُ خَالِدِیْنَ فِیْھَا أَبَدًا وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا وَّمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (النساء: ۱۲۲)‘‘ ﴿اور جو لوگ

ایمان لائے اور انہوں نے عمل نیک کئے ہم ان کو ضرور بہشتوں میں داخل کریں گے۔ ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا نے سچا وعدہ کیا ہے اور خدا سے بڑھ کر کون سچی بات کہنے والا ہے۔﴾

اس آیت میں بھی سورۂ توبہ کی آیت کی طرح نہایت جلال سے اپنے وعدہ کی حقانیت اور اپنی صفت صداقت کو بیان فرمایا اور ظاہر کیا کہ وعدہ خلافی کرنا جھوٹ ہے اور صداقت کے برخلاف ہے اور خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ لہٰذا اس سے وعدہ خلافی متصور نہیں۔

اب قسم چہارم! کی آیات ذکر کی جاتی ہیں جن میں ان وعدوں کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ خاص اپنے بندوں رسولوں سے کرتا ہے اور خاص کر وہ وعدے جو منکرین کے مقابلے میں کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک آیت نہایت زور کی یہ ہے: ''وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ. فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُوْ انْتِقَامٍ (ابراهیم: ۴۶،۴۷)''

﴿اور ان (کفار) نے (ایذا رسانی کی بہت) تدبیریں کیں اور ان کی سب تدبیریں خدا کے علم میں ہیں۔ اگرچہ ان کی تدبیر اس قدر بھی قوی ہو کہ اس سے پہاڑ زائل ہو سکے تو (اے پیغمبر) تو نے خدا تعالیٰ کو اس وعدے میں جو اس نے اپنے رسولوں سے کیا ہے، خلاف کرنے والا ہرگز ہرگز گمان بھی نہ کرنا بے شک خدا تعالیٰ غالب ہے صاحب بدلے کا۔﴾

کلمہ ''ان'' کی بناء پر اس آیت کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر کئے گئے ہیں اور اس صورت میں ''ان'' وصلیہ ہے۔ یعنی اس کے معنی اگرچہ کے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ''ان'' کو نافیہ خیال کریں تو اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کی تدبیر ایسی نہیں ہے کہ اس سے پہاڑ زائل ہو سکے۔ یعنی ضعیف ہے قابل پرواہ نہیں ہے اور اس سے آگے کا ترجمہ وہی ہے جو اوپر کیا گیا۔

بہرحال اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدوں کے خلاف ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ خاص کر ان وعدوں کی جو اپنے پیغمبروں سے کرے۔

علامہ زمخشری نے اس آیت میں ایک نکتہ بیان کیا ہے جو ہمارے مدّعا کو بوجہ احسن ثابت کرتا ہے کہ: ''مخلف وعدہ رسلہ'' میں مفعول اوّل یعنی ''رسلہ'' کو مؤخر اور مفعول ثانی یعنی ''وعدہ'' کو مقدم اس لئے کیا تا ظاہر ہو کہ خدا تعالیٰ ہرگز ہرگز وعدہ خلافی

کرتا ہی نہیں اور جب وعدہ خلافی عام طور پر اس کے شان کے لائق نہیں ہے تو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کس طرح کرے گا جو اس کے برگزیدہ ہیں۔

سبحان اللہ! قرآن شریف کی فصاحت کے قربان جائیں، کیسے لطیف طور پر کیسے باریک اشاروں میں کیسے عمدہ مضامین ذکر کرتا ہے۔ ایک اور لطف یہ ہے کہ اس آیت کو ''عزیز ذوانتقام'' پر ختم کیا۔ یعنی خدا تعالیٰ سے وعدہ خلافی اس لئے متصور نہیں ہے کہ وہ غالب ہے عاجز نہیں اور صاحب بدلے کا ہے۔ یعنی گناہ کا پیچھا کرتا ہے اور بداندیشوں کو ان کے کیفر کردار کو پہنچاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ انعام میں فرمایا: ''اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ وَّمَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ (انعام:۱۳۴)'' ﴿جس امر کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو وہ ضرور ضرور آنے والا ہے اور تم ہرگز عاجز نہیں کر سکتے۔﴾

اس آیت میں منکروں کو ڈرایا ہے کہ خدا کا وعدہ جو عذاب کا ہے وہ ضرور ضرور ہو کر رہے گا۔ اسی طرح سورۂ حج میں منکروں کی جلد بازی کے جواب میں کہا ہے: ''وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (الحج:۴۷)'' ﴿(اے پیغمبر) یہ لوگ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں (ان سے کہہ دے) خدا تعالیٰ اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔﴾

مضمون وعدہ الٰہی پورا ہوا اور ثابت ہو گیا کہ اس میں تخلف اور التواء کی گنجائش نہیں۔ اس تمہیدی تفصیل کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارا مرزا قادیانی پر اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے چند امور کی نسبت پیش گوئی کہ یہ امور اس صورت میں پورے ہوں گے اور ان خبروں کی بنیاد الہام خداوندی پر رکھی۔ چونکہ وہ خبریں حسب قرارداد مرزا قادیانی ان کی زندگی میں پوری نہیں نکلیں۔ اس لئے مرزا قادیانی اپنے دعویٰ الہام میں صادق نہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی خبر و وعدہ میں تخلف نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کے جواب میں وہ یہ عذر کرتے ہیں کہ بعض امور انبیاء کی موت کے بعد پورے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گو مرزا قادیانی نے فرمایا تھا کہ فلاں فلاں امر میری زندگی میں ہوگا اور وہ ایسا نہیں ہوا لیکن امید ہے کہ بعد میں پورا ہو جائے گا۔ اس غیر معقول عذر کا جواب کئی طریق پر ہے:

اوّل: یہ کہ بحث سابق سے معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں التواء کی گنجائش نہیں، پس عذر فضول ہے۔

دوم: یہ کہ قرآن شریف اور حدیث صحیح سے کوئی ایسی مثال ثابت کرو کہ آنحضرت ﷺ یا کسی اور نبی برحق نے کسی امر کی نسبت کہا ہو کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ فلاں امر ہماری زندگی میں فلاں وقت میں فلاں صورت میں واقع ہوگا اور وہ ویسا ان کی زندگی میں واقع نہ ہوا ہو۔ اگر تم کوئی ایسی حدیث پیش کرو جس میں آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں واقع ہونا نہ فرمایا ہو، تو وہ اس بارے میں پیش نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے اپنی زندگی میں واقع ہونے کی بابت کہا تھا۔

سوم: یہ کہ وقت کی جو حد ان واقعات کے وقوع کے لئے بتائی گئی تھی یعنی مرزا قادیانی کی زندگی، اس میں تو یقینی طور پر آپ کے نزدیک بھی وہ امور واقع نہیں ہوئے اور آئندہ کی نسبت کوئی قطعی دلیل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا تمہارا عذر درست نہیں۔ اگر آپ کا عذر درست مانا جاوے تو اس طرح تو کوئی دروغ گو قیامت تک بھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

محل اعتراض یہ امر ہیں:

۱...... محمدی بیگم کا نکاح میں نہ آنا۔

(دافع الوساوس ص۲۸۰، خزائن ج۵ ص۲۸۰، ازالہ اوہام ص۳۹۶، خزائن ج۳ ص۳۰۵)

۲...... مولوی ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری اور ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب پٹیالوی کا مرزا قادیانی کی زندگی میں نہ مرجانا۔ بلکہ مرزا قادیانی کے بیٹے مبارک احمد اور خود بدولت کا ان کے سامنے رحلت کر جانا۔ (مجموعہ اشتہارات ج۳ ص۵۵۸، ۵۷۸، ۵۸۶)

۳...... مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں زلزلہ عظیم جو اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ سے بھی زیادہ ہو، نہ آنا۔ (قادیانی وصیت ص۱۳، خزائن ج۲۰ ص۳۱۴، براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۹۲، خزائن ج۲۱ ص۲۵۳)

۴...... مبارک احمد کی بجائے ایک اور لڑکا پیدا ہونا۔

(قادیانی اشتہار تبصرہ، مجموعہ اشتہارات ج۳ ص۵۸۷)

محمدی بیگم کے نکاح کے متعلق نسخ کا عذر (جیسا کہ مرزا قادیانی نے حقیقت الوحی اور مولوی نورالدین نے وفات مرزا میں لکھا ہے) اس لئے صحیح نہیں کہ الہام میں نکاح ہونے کی خبر ہے اور خبر میں نسخ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ماضی ہو تو اس میں خلاف ہونے سے کذب

لازم آئے گا اور اگر استقبال کی نسبت ہوتو اس سے تخلف وعدہ لازم آتا ہے اور یہ دونوں شان خداوندی کے لائق نہیں۔

اور یہ عذر کہ شاید مرزا قادیانی کی ذریت میں سے کوئی لڑکا، اس لڑکی کی کسی لڑکی، یا اس کی لڑکی کی لڑکی، ''وھلمّ جرّا'' سے نکاح کر لیوے، صحیح نہیں۔ کیونکہ نکاح ذاتی امور میں سے ہے، اشتراکی امر نہیں کہ کسی دوسرے کی شراکت کو دخل ہو اور اس کے ضمن میں کوئی دوسرا بھی مفہوم ہوتا ہو اور اس دوسرے کے کر لینے سے اس متکلم کا کرنا سمجھا جائے، جمع متکلم کے صیغہ کو عربی میں متکلم مع الغیر اسی لئے کہتے ہیں لیکن روشن ہے کہ یہ صورت مرزا قادیانی کی الہامی منکوحہ آسمانی پر نہیں آسکتی۔

اور مولوی ثناء اللہ امرتسری اور ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب پٹیالوی کے نہ مرنے کے عذر میں مسیلمہ کذاب کی مثال بھی درست نہیں۔ کیونکہ اس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے ہرگز نہیں فرمایا تھا کہ وہ میری زندگی میں مرے گا۔ بلکہ فرمایا تھا: ''یقتل بعدی (زادالمعاد)'' یعنی میرے بعد قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جنگ یمامہ میں قتل کیا گیا۔

پس سب عذرات ناقابل سماعت ہیں۔

مولوی محمد احسن اپنے مضمون حیات الانبیاء میں لکھتے ہیں: اکثر وعدہ ہائے فتوح موعودہ بعد وفات آنحضرت ﷺ کے آپ کے نائبوں کے ہاتھ واقع ہوئے۔''

(ریویو آف ریلیجنز ج۷ نمبر۶ ص۲۲۴)

صاحب! یہ عذر بھی درست نہیں۔ کیونکہ کوئی ایسی فتح نہیں ہوئی جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہو کہ میری زندگی میں ہوگی اور پھر آپ کے بعد زمانہ صحابہ میں ہوئی ہو۔ اگر کوئی ہوئی ہو تو وہ حدیث پیش کریں۔

اور قیصر کے خزانے فتح ہونے کی حدیث آپ کے مفید نہیں۔ کیونکہ اس میں ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کی بابت اپنی موجودگی میں فتح ہونے کی خبر دی تھی۔

''تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّهٖ ظَاهِرًا وَّبَاطِنًا''

راقم: محمد ابراہیم سیالکوٹی مالک وایڈیٹر الہادی سیالکوٹ

مشاہیر کے خطباتِ ختم نبوّت

مرتب

مناظرِ ختمِ نبوّت

حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب مدظلہ

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوّت

حضوری باغ روڈ ملتان۔ 061-4783486

www.amtkn.com, www.laulak.info, www.khatm-e-nubuwwat.info,
www.khatm-e-nubuwwat.com, ameer@khatm-e-nubuwwat.com